جھیل، کنارہ، کنکر

نازیہ کنول نازی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

جھیل کنارہ کنکر

نازیہ کنول نازی

عید نمبر عید نمبر عید نمبر عید نمبر عید نمبر عید نمبر عید نمبر عید نمبر عید نمبر عید نمبر

اپنی ہستی مٹا کے بھی تنہا ہوں
میں سب کچھ لٹا کے بھی تنہا ہوں
لوگ دور تک جاتے ہیں کسی کے لیے
اور میں اس کے پاس رہ کر بھی تنہا ہوں

اے شمع کوئے جاناں
ہے تیز ہوا مانا
لو اپنی بچا رکھنا رستوں پر نگاہ رکھنا
ایسی ہی کسی شب میں آئے گا یہاں کوئی
ایک زخم دکھانے کو
ٹوٹا ہوا ایک تارا مٹی سے اٹھانے کو
آنکھوں میں نمی ہوگی چہرے پر دھواں ہوگا
ہاتھوں کی لکیروں میں گزرے ہوئے سالوں کا
اک ایک نشاں ہوگا
بولے گا نہ کچھ لیکن فریاد کناں ہوگا
اے شمع کوئے جاناں
وہ خاک بسر راہی وہ سوختہ پروانہ
جب آئے یہاں اس کو مایوس نہ لوٹانا
ہو تیز ہوا کتنی لو اپنی بچا رکھنا
رستے پر نگاہ رکھنا راہی کا پیار رکھنا

سارے گھر میں گمبھیر خاموشی کا راج تھا۔ گاڑی گیراج میں پارک کرنے کے بعد وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا اذیت و کوفت کی ایک لہر پورے بدن میں سرائیت کرگئی۔ آج زندگی کو اس سے روٹھے کتنے ماہ ہوگئے تھے۔ اسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ جس کے بغیر وہ چند لمحے بڑی مشکل سے گزارتا تھا اس کے بغیر اس نے اتنے ماہ زندہ رہ کر گزار کیسے لیے تھے۔ کسی کے بغیر یہ دن کس اذیت و ٹوٹ پھوٹ میں بسر ہوئے یہ الگ کہانی تھی۔

علی کے کمرے سے ٹی وی چلنے کی آواز آرہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے کمرے میں تھا۔ وہ تھکا تھکا سا لاؤنج میں پڑے صوفے پر ڈھے گیا۔

"صاحب کھانا لگا دوں؟" حفیظ بابا اس کی موجودی کی اطلاع پاتے ہی فوری کچن سے نکل آئے تھے۔ میکال نے سر صوفے کی پشت گاہ سے ٹکا کر پلکیں موند لیں۔

"نہیں بابا! بھوک نہیں ہے۔"

"آپ نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا تھا صاحب کل رات بھی۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا بابا! ابھی ایک پارٹی میں جارہا ہوں۔ وہاں کچھ کھالوں گا۔ آپ فکر مند نہ ہوں علی کو کھانا کھلا کر سلا دیجیے گا اور خود بھی کھا لیجیے گا۔"

اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے حفیظ

بابا کو ہدایت کی تھی۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر کھڑے رہے۔ ابھی وہ شاور لے کر نکلا تھا کہ سیل بج اٹھا تھا۔

"میکال کے بچے کہاں ہو تم پارٹی شروع ہوگئی ہے۔"

کال پک ہوتے ہی مسز رحیم کی تھکی تھکی سی مگر پر شکوہ آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ شرمندہ ہوگیا۔

"ایم سوری آپا بس ابھی نکل رہا ہوں صرف پندرہ منٹ دے دیں پلیز۔"

دوسری طرف جانے اس کی التجا سنی گئی تھی کہ نہیں مگر کال کٹ گئی تھی۔ وہ سیل شرٹ کی جیب میں ڈالتا جلدی جلدی بال سنوارنے لگا۔

پچھلے گزرے چند ماہ نے اسے بہت بدل دیا تھا۔ گورا رنگ سانولے پن میں ڈھل گیا آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے۔ چہرے اور جسم کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ اب بھلا آئینے کے سامنے آنے اور خود کو سنوارنے کا دل ہی کہاں چاہتا تھا۔

بال سنوار کر پرفیوم کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے اس نے آخری نظر آئینے میں اپنے سراپا پر ڈالی اور بیڈ پر بیٹھ کر جوتے پہننے لگا۔ اس سے فارغ ہو کر جلدی سے ٹائی کی ناٹ لگائی اور گاڑی کی چابی اٹھا کر فوراً باہر کی طرف بڑھ گیا۔ صد شکر کہ علی کو اس کی آمد کی خبر نہیں ہوئی تھی وگرنہ اس وقت اس کا یوں اکیلے گھر سے باہر جانا ممکن ہی نہیں تھا۔

خاصی ریش ڈرائیونگ کے ساتھ وہ تقریباً بیس منٹ میں مسز رحیم کے سامنے تھا۔

"تم انتہائی فضول اور اسٹوپڈ شخص ہو میکال۔ تم بھائی ہو تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتی وگرنہ وہ کان کھینچتی کہ یاد رکھتے۔" اسے دیکھتے ہی وہ پھر خفا ہوئی تھیں۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"سوری کہا تو ہے آپا آج بچ میں آفس میں بہت کام تھا۔"

"بس رہنے دو یہ فضول کے بہانے کسی اور کو سنانا۔" وہ کوئی عذر سننے کو تیار نہیں تھیں۔ میکال بے چارگی سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔ تبھی قطعی نادانستہ طور پر اس کی نگاہ سامنے اٹھی تھی اور پھر وہ جیسے وہیں فریز ہو کر رہ گیا تھا۔

زیست کی راہ پر گزرے ہوئے چند لمحوں میں
ہم نے چاہا تھا تیرے ساتھ چلیں
تیرے ہونٹوں پر ہنسی آنکھ میں جگنو بن کر
دل کی دھڑکن میں سما کر تجھے جیتا دیکھیں
تیرے خوابوں کو سجالیں ہم اپنی آنکھوں میں
تیرے چہرے کی اداسی کو خوشی میں بدلیں
اور کچھ رنگ بھی بھر دیں تیرے روز و شب میں
پھر تجھے رنگ بہاروں کے چرانے دیکھیں
زیست کی راہ پر گزرے ہوئے چند لمحوں میں
ہم نے چاہا تھا

آج کی اس تقریب میں وہ بھی شریک تھی۔ میکال کو لگا وہ سانس بھی نہیں لے سکے گا۔ مسز رحیم سے اس کی کیفیت چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ تبھی ایک نظر سامنے موجود بانیہ صفدر پر ڈالتے ہوئے وہ مسکرا کر بولیں۔

"بانیہ آئی ہے بہت اصرار کے بعد بمشکل زبردستی بلوایا ہے اسے صرف تمہارے لیے آج کی اس تقریب کو ارینج کرنے کا مقصد ہی تم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا تھا۔ ساری غلط فہمیاں دور کروانی۔"

"اب نہیں آپا اب بہت دیر ہو چکی ہے۔"

جلتی آنکھوں سے اسے باتوں میں مشغول دیکھتے ہوئے اس نے جیسے خود کلامی کی تھی۔ پھر سر جھٹک کر سائیڈ پر چلا آیا۔ دل کے زخم پھر سے رسنے لگے تھے۔ خدا خدا کر کے تو اسے صبر آیا تھا اور مسز رحیم جیسے پھر سے اس کا صبر آزمانے پر تل گئی تھیں۔

تمہیں ہم کو شکایت اب کسی سے
بس اپنے آپ سے روٹھے ہوئے ہیں
بظاہر خوش ہیں لیکن سچ بتائیں
ہم اندر سے بہت ٹوٹے ہوئے ہیں

پیچھے آ کر وہ ایک خالی نشست پر بیٹھ گیا تھا مگر جلتی سلگتی نافرمان نگاہیں اب بھی اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ چہرہ کہ جسے آنکھ کھلتے ہی دیکھے بغیر اس کی صبح نہیں ہوتی تھی۔ جسے رات سونے سے پہلے پیار کیے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ جب وہ اس کی دسترس میں تھی تو اسے اردگرد کی دنیا میں کشش محسوس ہوتی تھی اب جب وہ دور تھی تو دنیا ویران لگتی تھی۔

وہ کسی بات پر مسکرا رہی تھی اور میکال کو لگا جیسے اس کی مسکراہٹ نے ساری محفل میں رنگ بکھیر دیے ہوں۔ اب کھانا سرو ہو رہا تھا۔ وہ بددل سا وہاں سے اٹھ گیا۔

"میں واپس جا رہا ہوں آپا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"ایسی کی تیسی تمہاری طبیعت کی۔ بیٹھے رہو آرام سے کھانے کے بعد تم نے بانیہ سے بات کرنی ہے۔"

"مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی آپا نہ میرا اب اس کی زندگی سے کوئی لینا دینا ہے پلیز۔" وہ چٹخا تھا۔ مسز رحیم اپنا سر پیٹ کر رہ گئیں۔

میکال چپ چپ سا مسز رحیم کے بلاوے پر ان کی طرف چلا آیا۔

"کہاں جا رہے ہو کھانا لگ گیا ہے کھانا تو کھا کے جاؤ۔" انہوں نے اصرار کیا۔

"سوری مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"بھوک بھی لگ جائے گی تم آؤ تو سہی اور یہ علی کہاں ہے؟"

"گھر پر ہی ہے دیر ہو رہی تھی اس لیے اسے ساتھ نہیں لایا۔"

"چلو جیسی تمہاری مرضی۔"

رسان سے کہتے ہوئے انہوں نے میکال کو زبردستی اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔

کھانے کے بعد مشروب کا دور چلا اور مشروب کے بعد ڈانس کا۔ سب ڈانس کے نام پر یونہی تھرک رہے تھے۔ اس نے دیکھا ایک لڑکا بانیہ کو ڈانس کی آفر کر رہا تھا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا اس وقت اگر وہ اس لڑکے کی آفر قبول کر لیتی تو جانے وہ کیا کر بیٹھتا۔

وہ ڈانس فلور کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ میکال کچھ سوچتے ہوئے اٹھا اور اپنے قریب ہی بیٹھی ایک ماڈرن سی لڑکی کو ڈانس کی آفر کر دی۔ جسے اس لڑکی نے فوراً سے پیشتر قبول کر لیا تھا۔ بانیہ اپنی ٹیبل پر بالکل اکیلی بیٹھی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کی نظریں جونہی سامنے اٹھیں۔ اس کا دل گویا کٹ کر رہ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ وہاں آئے گا وگرنہ شاید وہ وہاں کسی قیمت پر نہ آتی۔

دل کے اندر کہیں طوفان اٹھا تھا اور ایک آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر گالوں پر پھسل آیا۔ اس بار اس نے جو منظر دیکھا اس کے بعد اس میں کچھ اور دیکھنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ وہ اٹھی تھی اور کچھ سوچتے ہوئے مسز رحیم کے پاس چلی آئی تھی۔

"مسز رحیم ایک فیور دیں گی؟" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں سائیڈ پر لے آئی تھی۔

"ہاں بولو میری جان۔"

"مسز رحیم آپ پلیز کچھ دیر تک میکال کو یہیں مصروف رکھیے گا میں گھر جا رہی ہوں اپنے بیٹے سے ملنے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ میں روک لوں گی۔"

[illegible]

تھی جواس کی آنکھوں میں نمی جھلک آئی۔

"تھینکس۔" بوجھل لہجے میں وہ صرف یہی کہہ سکی تھی وہ مسکراتی نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ میکال بانیہ کے اٹھتے ہی ڈانس فلور سے اتر آیا تھا۔

"چلی گئی وہ؟" مسز رحیم کے قریب آ کر اس نے استفسار کیا تو وہ مسکرا کر بولیں۔

"ہاں مگر تمہارے گھر گئی ہے اپنے بیٹے سے ملنے۔"

"اوہ تو وہ یقیناً اسے ساتھ لے جائے گی۔"

"نہیں' کبھی نہیں لے جاسکتی وہ اسے میری ساری محنت پر تو پانی پھیر ہی دیا ہے تم نے اب خدا کا واسطہ ہے تمہیں فوری گھر جاؤ اور اسے منالو۔ یہ فاصلے اگر ابھی نہ سمیٹے تو عمروں کی لمبی جدائی جھیلنی پڑ جائے گی۔ میکال بڑا ذاتی تجربہ ہے میرا وہ ایک ہستی کہ جس کے بغیر دنیا خالی خالی سی بے معنی لگے اسے انا کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہیے۔ ورنہ ساری عمر کی بے سکونی اور رونا نصیب میں لکھا جاتا ہے۔" قدرے اداس لہجے میں وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔ میکال چپ چاپ سا ان کا شکریہ ادا کرتا وہاں سے سیدھا گھر چلا آیا۔

✿......✿......✿

شہر خاموشاں میں اس وقت غروب ہوتے سورج کی نارنجی کرنوں کے ساتھ ہی ایک عجیب سی خاموشی بکھرتی گئی تھی۔ آس پاس سے گزرتے لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی ماند پڑ گیا تھا۔ ہاتھ میں تازہ پھولوں کے گلدستے کے ساتھ جونہی وہ شہر خاموشاں کی حدود میں داخل ہوا اس کی نگاہ سامنے لگے شیشم کے اس پیڑ کی طرف اٹھی تھی جس کے نیچے ابھی چند ہفتے قبل ایک نئی لحد تیار کی گئی تھی۔

چپکے چپکے ... میں عذیر اس کا ... کو روزانہ اسی وقت اس لحد کے نزدیک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے اردگرد سے قطعی بے نیاز بیٹھے دیکھتا تھا۔ روز وہ تازہ پھول اور پانی لاتی' قبر پر پہلے پانی اور پھر پھول بکھیرتی پھر خاموشی سے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر شیشم کے پیڑ کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی۔ ایک طرح سے اس نے اپنے سارے سلسلے مٹی کے اس ڈھیر سے وابستہ کر رکھے تھے۔ عذیر کو اس لمحے بے ساختہ معروف مصنفہ بشریٰ رحمٰن کے وہ چند الفاظ یاد آئے تھے۔ جو انہوں نے کسی کی یاد میں شاید ایسے ہی کسی موقع پر تحریر کیے تھے۔

"شہر خاموشاں میں جانے والے وہاں جا کر اتنے بے پروا کیوں ہو جاتے ہیں جا کر کوئی خیر خیریت کی خبر کیوں نہیں بھیجتے خوابوں میں آتے ہیں تو کھل کر بات کیوں نہیں کرتے سارے سلسلے مٹی کے ایک ڈھیر سے کیوں وابستہ ہو جاتے ہیں۔"

اسے لگتا تھا جیسے اس نے اسے کہیں دیکھا ہے مگر کہاں یہ اسے یاد نہیں آتا تھا۔ شاید اسے علم ہی نہیں تھا کہ عورتوں کا قبرستان میں آنا جانا جائز نہیں۔ وگرنہ شاید وہ یوں روز پابندی سے وہاں نہ آتی۔

جانے چند ہفتے قبل مٹی کے ڈھیر تلے اترنے والی اس ہستی سے اس کا کیا تعلق تھا؟ وہ کیوں اسے کسی اور ہی دیس کی باسی لگتی تھی۔

روز وہ اس کے بارے میں سوچتا تھا اور روز رات گئے تک خود سے الجھتے ہوئے بے چین رہتا تھا۔

☆☆☆

درخت جاں پر عذاب رت تھی نہ برگ جاگے نہ پھول آئے
بہار وادی سے جتنے پنچھی ادھر کو آئے ملول آئے
وہ ساری خوشیاں جو اس نے چاہیں اٹھا کے جھولی میں اپنی رکھ لیں
ہمارے حصے میں عذر آئے جواز آئے اصول آئے

شام ڈھل رہی تھی۔ آسمان پر سیاہ بادل کسی بھی پل برسنے کو تیار دکھائی دے رہے تھے۔ میکال حسن نے تھکی تھکی سی نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور نگاہیں پھر سے عائشہ برہان کے خوب صورت چہرے پر ٹکا دیں۔ جو آسمان کی طرح اپنی آنکھوں کے گہرے بادل لیے کسی گزرے ہوئے طوفان کی مانند خاموش بیٹھی تھی۔

"تو یہ طے ہے کہ ہمیں آج کے بعد نہیں ملنا؟" گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں عائشہ برہان نے ذرا سا رخ پھیر لیا۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو انمول ہیروں کی مانند دمک رہے تھے۔

"ہوں......!"

"زندگی کا اتنا لمبا سفر میرے بغیر طے کرلو گی؟" دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کے سرد ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔ جواب میں اس کی سسکاری نکل گئی۔

"پتا نہیں یہاں زندگی کا اعتبار کسے ہے میکال' ہوسکتا ہے میں ابھی یہاں سے اٹھ کر جاؤں اور صبح تم تک میرے مرنے کی خبر پہنچ جائے۔"

"نہیں......!" وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی میکال تڑپ اٹھا۔

"نہیں عائش' ایسا مت کہو پلیز' میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں ہمیشہ کے لیے کھو نہیں سکتا۔" اس کا سیل بار بار بج رہا تھا مگر اس میں اتنی سی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ پاکٹ سے سیل نکال کر باہر سڑک پر پھینک دے۔ پچھلے پچیس منٹ میں وہ پچاس لاکھ کا نقصان کر بیٹھا تھا۔ مگر اسے پروا نہیں تھی۔ عائشہ برہان کے لفظ اس کا آخری دیدار کسی بھی اہم میٹنگ سے بڑھ کر تھا اس کے لیے۔ عائشہ نے بس ایک نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر فوراً سے پیشتر نگاہیں پھیر لی تھیں۔

"تم میری زندگی میں آنے والے پہلے اور آخری شخص ہو میکال۔ نہ تم سے پہلے کوئی نظر میں بچا نہ تمہارے بعد میں کسی سے دل لگا پاؤں گی شاید میں کبھی تمہیں بھلا بھی نہ سکوں کہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے مگر ایک چیز میرے اختیار میں ہے۔" بوجھل آواز میں بولتے بولتے اچانک اس نے سر اٹھایا تھا۔

"میں تمہیں دفن کرسکتی ہوں یہاں۔" اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی آنکھ سے ایک اور موتی ٹوٹ کر گرا تھا۔

"تم وہ شخص ہو میکال جسے زندگی سے پیار کروانا آتا ہے جسے دلوں میں گھر کرنا آتا ہے۔ کسی بھی لڑکی کے دل کو اپنے قدموں کی آہٹ پر دھڑکانا آتا ہے تم محبت کی نگری کے وہ مسافر ہو میکال جو خواب دکھاتا ہے اور پھر اپنے اسیروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے تصور میں قید کر لیتا ہے اور میں...... میں وہ بد نصیب لڑکی ہوں جو صرف تمہاری رفاقت کے خواب دیکھ سکتی ہے' مگر تمہیں پا نہیں سکتی۔ اس لیے آج میں یہاں تم سے مل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنی یادوں میں قید کر لینا چاہتی ہوں تم سمجھ لینا کہ ہم کبھی ملے ہی نہیں تھے۔"

"کیا تمہارے لیے یہ سمجھ لینا آسان ہے؟"

"نہیں' مگر اس کے سوا کوئی حل بھی تو نہیں ہے۔"

"حل نکالا جاسکتا ہے آخر تم مجھے اپنے گھر والوں سے بات کرنے کیوں نہیں دے رہیں؟" وہ زچ ہوا تھا۔ عائشہ نے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے نکالتے ہوئے آنسو پونچھے۔

"اب اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ تم میری فیملی کو نہیں جانتے۔ یہ لوگ ایک بار اگر کوئی بات طے کرلیں تو پھر مرتے دم تک اس سے پیچھے نہیں ہٹتے اور

میں ان بیٹیوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی خواہشات کے لیے اپنے ماں باپ کے سامنے تن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔" سر جھکائے بہت دھیمے لہجے میں وہ کہہ رہی تھی۔

"میری ماں نے زندگی میں بہت دکھ دیکھے ہیں۔ پاپا کی رحلت کے بعد بہت مشکل سے پال پوس کر بڑا کیا ہے ہمیں۔ میں انہیں مزید کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی میکال۔ میں وہ ہرگز نہیں کرنا چاہتی جو میری آپی نے کیا بہت مشکل سے سنبھالا ہے میری ماں نے خود کو میں دوبارہ انہیں اس اذیت میں نہیں دھکیل سکتی۔"

"اچھی بات ہے مگر میرا کیا قصور ہے۔ کس چیز کی کمی ہے مجھ میں؟ تم اپنے والدین کے عمر بھر کے دکھوں کا مداوا مجھے دکھ سونپ کر کیوں کرنا چاہتی ہو؟" اس بار میکال کے لہجے میں دکھ کی آمیزش تھی۔

"کیا قصور ہے میرا کہ میں ساری زندگی خوشی کے لیے ترستا رہوں تم میری آئیڈیل ہو عائشہ پہلی محبت ہو میری میں یوں آسانی سے تمہیں کھو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بہت شدت سے چاہا ہے میں نے تمہیں۔ زندگی میں کسی کو تمہارا مقام نہیں دے سکوں گا۔ میری زندگی میں کوئی اور لڑکی بھی تمہاری جگہ نہیں لے سکے گی۔ سچ میں مر جاؤں گا۔ تمہیں اپنی ماں کی پروا ہے میری نہیں۔" اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ عائشہ کو لگا وہ سانس بھی نہیں لے پائے گی۔

"ایم سوری میکال رئیلی ویری سوری۔" اس کی آنکھوں سے بھی لہو ٹپک رہا تھا۔ وہ رخ پھیر گیا۔

"نہیں تم ایک سنگدل اور منافق لڑکی ہو میں کبھی تمہیں اس بے وفائی کے لیے معاف نہیں کروں گا۔"

"میکال...... !" بہت شدت سے تڑپ کر اس نے اسے پکارا تھا مگر میکال نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں جا رہی ہوں تم سمجھ لینا تمہیں جس عائشہ برہان سے محبت ہوئی تھی وہ مر گئی۔ خدا حافظ...... ہو سکے تو پلیز مجھے معاف کر دینا اور اپنا بہت خیال رکھنا۔"

اسے جانے کی جلدی تھی وہ ہارے ہوئے شکستہ جواری کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہ گیا۔ شام اپنی تمام تر اداسی کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ اپنی متاع کل لٹا چکا ہو۔ اس میں اتنی سی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ اٹھ کر اسے اس کے گھر تک ڈراپ ہی کر دیتا۔ تاہم اپنی گاڑی کی چابی ضرور اس نے اس کے پرس میں ڈال دی تھی۔ محبت بچھڑ رہی تھی اور وہ جیسے آنکھوں میں ریت بھرے خود اپنی ہی بربادی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔

آخری بار ملو
ایسے کہ جلتے ہوئے دل
راکھ ہو جائیں کوئی اور تقاضا نہ کریں
چاک وعدہ نہ سلے زخم تمنا نہ کھلے
سانس ہموار رہے شمع کی لو تک نہ ہلے
باتیں بس اتنی کہ لمحے بھی انہیں گن جائیں
آنکھ اٹھائے کوئی امید تو آنکھ چھن جائے
اس ملاقات کا اس بار کوئی وہم نہیں
جس سے اک اور ملاقات کا امکاں نکلے
اب نہ ہیجان جنوں کا نہ حکایات کا وقت
اب نہ تجدید محبت نہ شکایات کا وقت
لٹ گئی شہر حوادث میں متاع الفاظ
اب جو کہنا ہو تو کیسے کوئی نوحہ کہیے
آج تک تم سے رگ جاں کے کئی رشتے تھے
کل سے جو ہوگا اسے کون سا رشتہ کہیے
پھر نہ دہکیں گے کبھی عارض و رخسار ملو
ماتمی ہیں دم رخصت در و دیوار ملو
ہم نہ پھر ہوں گے نہ اقرار نہ انکار ملو
"آخری بار ملو۔"

عائشہ برہان جا چکی تھی!

کسی منہ زور آندھی کی طرح وہ اس کی زندگی میں آئی تھی اور پھر چلی بھی گئی مگر وہاں دل پر کبھی نہ مندمل ہونے والا ایک زخم ضرور لگ گیا تھا۔ اس رات اس کی گھر واپسی نہیں ہوئی تھی وہ خود کو ختم کر لینا چاہتا تھا مگر...... نہیں کر پایا۔

❁ ❁ ❁

اگلے روز اس کی آنکھ اسپتال میں کھلی تھی۔

کل عائشہ برہان کے چلے جانے کے بعد جس حال میں اٹھ کر وہ گھر واپسی کے لیے چلا تھا اس کا ایکسیڈنٹ ہو جانا لازمی بات تھی۔ جانے کب سامنے سے آتی گاڑی نے اسے ٹکر ماری۔ اس کے بعد اسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟

آنکھوں کے سامنے یکلخت اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو مسز حسن اس کے بیڈ کے قریب بیٹھی رو رہی تھیں۔

"میکال...... میری جان تم ٹھیک ہو نا؟"

"جی۔" اسے ٹانگ میں شدید درد کا احساس ہو رہا تھا تبھی وہ پھر سے پلکیں موند گیا۔

"کہاں گئے تھے کل؟ تمہیں پتا ہے تمہارے پاپا کتنے پریشان رہے ہیں تمہارے لیے۔ کتنا بڑا نقصان ہوا ہے کل...... !"

"سوری مما...... ایک دوست کی طرف نکل گیا تھا۔"

"اتنا اہم دوست تھا کہ لاکھوں کے نقصان کی پروا نہیں کی۔" وہ متحیر تھیں۔ میکال کے رگ و پے میں شدید درد کی ٹیس سرائیت کر گئی۔ بند پلکوں سے بے ساختہ آنسو چھلکے تھے۔

"میکال کیا بات ہے میری جان سب ٹھیک تو ہے نا۔" اپنے سوال پر اس کے خاموش آنسوؤں نے انہیں بے چین کر دیا تھا۔

"جی...... !" کچھ لمحے کمرے میں خاموشی چھائی رہی تبھی وہ بولا تھا۔

"آپ لوگ چاہتے ہیں ناں مما کہ میں کمال بھائی کی جگہ۔ پاپا کی یو کے والی فرم کا چارج سنبھال لوں۔" زندگی میں پہلی بار مسز حسن اسے اتنا رنجیدہ دیکھ رہی تھیں۔ مسٹر حسن بھی کمرے میں چلے آئے تھے مسز حسن اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"میں آپ لوگوں کی خواہش پر سر جھکانے کے لیے تیار ہوں ماما آپ پاپا سے کہیں کمال بھائی کو واپس بلا لیں۔" اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس نے پھر پلکیں موند لی تھیں۔ جواب میں ریاض حسن صاحب اور ان کی بیگم دونوں شاکڈ رہ گئے تھے۔ وہ تو کسی صورت پاکستان سے جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ اب ایک دم سے کیا ہوا تھا کہ اس نے یہ جاں گسل فیصلہ اچانک کر لیا تھا۔

"میکال...... تم ٹھیک تو ہو نا؟"

مسز حسن پریشانی سے اس پر جھکی تھیں۔ تبھی ریاض حسن صاحب نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں آنکھ کے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی۔ "مصطفیٰ ہاؤس" میں اس رات کوئی فرد بھی سکون کی نیند نہیں سو سکا تھا۔

❁ ❁ ❁

ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور وہ سنگی بینچ پر خاموش بیٹھا جانے کن خیالات میں گم تھا جب بانی نے چپکے سے اس کے پیچھے آ کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ نہال نے ان ہاتھوں کی نرماہٹ کو فوراً پہچان لیا تھا۔

"بانی...... !"

"جی ہاں بانی آج مجھے بتا کر کیوں نہیں نکلے گھر

سے؟'' اس کے شانے پر ہلکا سا مکا رسید کرتی وہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی تھی۔ نہال کے لبوں پر ہلکی سے مسکان بکھر گئی۔

''میری مرضی' تمہیں بتا کر نکلتا ہوں تو سارے رستے فضول سر کھاتی رہتی ہو۔''

''یہ بات ہے؟'' اس نے آنکھیں دکھائی تھیں وہ کھل کر ہنس پڑا۔

''نہیں یار مذاق کر رہا ہوں اصل میں کچھ اپ سیٹ تھا۔''

''کیوں؟''

''بس یونہی میکال بھائی یو کے جارہے ہیں۔''

''تو اس میں اپ سیٹ ہونے کی کیا بات ہے؟''

''بات تو کوئی نہیں مگر وہ اپنی خوشی سے نہیں جا رہے۔ تم عائشہ برہان کے بارے میں تو جانتی ہو کتنے بچی ہیں وہ ان کے معاملے میں۔ مگر کل سے وہ ان کے بارے میں کوئی بات نہیں کر رہے بس اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد سارا دن کمرا بند کیے پڑے رہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ایکسیڈنٹ شدید نہیں تھا۔ ورنہ شاید وہ چل پھر بھی نہ سکتے۔''

''ہوں' ہوسکتا ہے ان کا جھگڑا ہو گیا ہو عائشہ جی سے۔''

''شاید ایسا ہی ہو' مگر...... میرا خیال ہے کہ انہیں شیئر کرنا چاہیے۔ یوں چپ چاپ میدان چھوڑ کر بھاگنا نہیں چاہیے۔''

''صحیح کہا تم نے' خیر چھوڑو چلو گھر چلتے ہیں میرا خیال ہے ابھی تھوڑی دیر میں بارش شروع ہونے والی ہے۔''

اسے میکال حسن اور اس کی عائشہ جی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی تبھی فوری اٹھ کھڑی ہوئی تو نہال کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی...... وہ دونوں یونیورسٹی کے بے حد اچھے دوست تھے اور اس وقت جاگنگ کے لیے نکلے تھے۔ نہال اس روز گھر آ کر بھی میکال حسن کے لیے خاصا اپ سیٹ رہا تھا۔

✿ ...... ✿ ...... ✿

ریاض حسن صاحب ریٹائرڈ کرنل تھے۔ زندگی کا طویل حصہ آرمی جیسی خشک جاب میں بسر کرنے کے باوجود اپنے گھر والوں کے ساتھ ان کا رویہ بے حد نرم شگفتہ اور دوستانہ تھا۔ قدرت نے انہیں زندگی کے ہر میدان میں آسودگی ہی آسودگی سے نوازا تھا۔ بہترین جاب' محبت کرنے والی بے مثال بیوی اور بے حد بچے دار فرماں بردار بچے...... !

وہ اپنے مالک حقیقی کا جتنا بھی شکر ادا کرتے کم تھا۔

کمال حسن ان کے سب سے بڑے ہونہار بیٹے تھے اور شادی شدہ تھے۔ ریاض صاحب نے آرمی سے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا ذاتی کاروبار شروع کردیا تھا۔ جس میں کمال ان کے ہم قدم تھا۔ پچھلے دس سال میں ان کی گتے کی فیکٹری ترقی کرکے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ اسی لیے دو سال قبل ریاض صاحب نے کمال کو اپنی یو کے والی فرم کا چارج سنبھالنے کے لیے وہاں بھیج دیا تھا۔ میکال ان دنوں اپنا ایم بی اے مکمل کرکے نیا نیا بزنس کی طرف آیا تھا۔ وہ بھی ریاض صاحب کی ضد و اصرار پر ورنہ وہ اپنے بل بوتے پر ہی کچھ کرنا چاہتا تھا۔ میکال سے چھوٹا نہال ابھی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ جبکہ مائزہ کالج میں تھی۔

میکال کی طبیعت اپنے دونوں بھائیوں سے قدرے مختلف تھی۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والا بہت ریزرو نیچر کا مالک تھا۔ کمال کی بیوی ضیا ان کی چچا زاد تھی اور بے حد شگفتہ مزاج کی حامل خاتون تھی۔

ضیا کے والد فیاض حسن صاحب کا اپنا بزنس تھا اور وہ ساتھ والے پورشن میں ہی قیام پزیر تھے۔ ضیا کی ایک چھوٹی بہن اور ایک بڑا بھائی سمیر تھا۔ پچھلے پچیس سالوں سے دونوں گھرانوں کی محبت مثالی تھی۔ صبح کا ناشتا ہوتا یا دوپہر کا لنچ یا پھر رات کا ڈنر دونوں گھرانوں کے افراد ایک ہی میز پر مل جل کر کھانا کھاتے تھے۔ مائزہ اور سارا ایک ہی کالج میں پڑھ رہی تھیں اور دونوں کی گہری دوستی تھی۔ نہال اور سمیر آپس میں بہت کلوز فرینڈ تھے۔ گھر میں ہر وقت دھما چوکڑی کا ماحول رہتا تھا مگر میکال اس ماحول کا حصہ نہیں تھا۔ اس کی گھر میں کسی کے ساتھ بھی فرینڈ شپ نہیں تھی۔ جتنا وقت وہ گھر پر گزارتا تھا اس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ اپنے کمرے میں بند رہے۔ ضیا کے ساتھ بھی بس واجبی سی دعا سلام تھی اس کی یہی وجہ تھی کہ ریاض صاحب اسے کمال کی جگہ یو کے بھیجنے پر بضد تھے مگر وہ عائشہ کی وجہ سے ان کی اس ضد کے سامنے اڑ گیا تھا۔

عائشہ اتنی دور بھیجنے کے حق میں نہیں تھی مگر اب تو بازی الٹ گئی تھی۔ یو کے جانے کا فیصلہ کرکے اپنے بند کمرے میں وہ بہت دیر تک بے آواز روتا رہا تھا۔

✿ ...... ✿ ...... ✿

عائشہ برہان نے جس وقت قدم گھر کی دہلیز پر رکھے وہاں عجیب سناٹے کا راج تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کی مرگ ہوئی ہو اور مرگ تو ہوئی تھی خود اپنے آپ کو مار کر باہر دفن کرنے کے بعد ہی وہ گھر واپس لوٹی تھی۔

لاؤنج خالی پڑا تھا وہ کچھ دیر گم صم سی وہیں بیٹھی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر صوفے کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر پلکیں موند لیں۔ ایک عجیب سی تھکن جیسے اس کی رگ رگ میں سرائیت کرگئی تھی۔ عین اسی لمحے اسے اپنی ماں کے کمرے سے اپنی بڑی بہن کے چنگھاڑنے کی آواز سنائی دی تھی۔

''آپ ٹھیک نہیں کر رہی ہیں امی۔ وہ لڑکا کسی بھی طور سے عائشہ کے قابل نہیں ہے۔ دیکھنے سے ہی پاگل لگتا ہے۔ کیسی ماں ہیں آپ؟ خاندان سے رشتا بنائے رکھنے کے لیے اپنی بیٹی کو سولی پر چڑھا دیں گی۔''

اس کا دل چاہا وہ دونوں کانوں پر انگلیاں رکھ لے مگر وہ بے حس بنی بیٹھی رہی۔ بہن کے بعد اب اس کی ماں چیخ رہی تھی۔

''بکواس بند کرو اپنی اور دفع ہو جاؤ یہاں سے کوئی حق نہیں ہے تمہیں اپنی ماں کے فیصلوں میں ٹانگ اڑانے کا۔ تم نے جو کرنا تھا اپنی باری پر کرچکی اب میں اسے کسی پاگل سے بیاہوں یا ہوش مند سے یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے سمجھیں تم؟''

''ظلم کر رہی ہیں آپ اور وہ بھی اپنی سگی اولاد پر۔ ماں سے بڑھ کر اس روئے زمین پر کوئی رشتا خوب صورت اور مخلص نہیں' ماں سے زیادہ اولاد کا غمگسار دوسرا کوئی نہیں' ماں تو بن کہے اپنی اولاد کے دل کا حال جان لیتی ہے۔ آپ کیسی ماں ہیں جو آپ کو اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسو دکھائی نہیں دے رہے۔''

ایک بار پھر اسے اپنی بہن کی آواز سنائی دی اور اس کے فوراً بعد ہی ماں کی۔

''تم بکواس بند کرو گی یا میں دھکے دے کر نکال دوں تمہیں یہاں سے؟''

''نکال دیں یہی کرسکتی ہیں آپ' مجھے تو لگتا ہی نہیں کہ آپ ہماری سگی ماں ہیں مجھ پر داؤ نہیں چلا تو چھوٹی بیٹی کو اپنی جھوٹی انا پر قربان کر رہی ہیں۔''

اس کے حق میں کسی قابل وکیل کی مانند بولتی اس کی بہن از حد جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمرے سے نکل آئی تھی۔ عائشہ نے پلکوں سے ٹوٹ کر گال پر پھسلتے آنسو کو مٹھی میں دبا لیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے سیڑھیوں پر اپنی بہن کی سینڈل کی ٹک ٹک سنائی دی تھی۔ وہ بے جان سی بیٹھی رہی۔ اس کی بہن اب

...موقع سے اس نے پہلو میں سوئے پر... نہیں کی۔

"یوں چپ کر کے بیٹھے رہنے سے زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ سمجھیں تم۔"

"میرے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا کوئی حل نہیں ہے آپا۔"

"کیوں حل نہیں ہے صاف انکار نہیں کر سکتیں؟ تم پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہو وہ شخص جو کسی بھی طرح سے کسی لڑکی کے قابل نہیں ہے تم اس شخص سے شادی کا تصور بھی کیسے کر سکتی ہو؟ اور پھر میکال اس سارے کھیل میں اس کا کیا قصور ہے اسے کس بات کی سزا دے رہی ہو تم؟" عائشہ کی آنکھوں میں خفگی تھی غصہ تھا رنج تھا۔

عائشہ نے آہستہ سے رخ پھیر لیا۔ اس کی آنکھیں اس لمحے جیسے جل رہی تھیں۔

"آج جو میرے ساتھ ہو رہا ہے یہ آپ کا نصیب تھا آپا مگر آپ نے اپنے نصیب سے بغاوت کر کے اپنی پسند کا ہم سفر چن لیا' دو سال پہلے اگر آپ ایسا نہ کرتیں تو آج میں میکال کے لیے کچھ کر سکتی تھی۔ مگر اب نہیں آپا' مجھ میں دو سال پہلے والا تماشا دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"نہیں ہے تو مرو میرا کیا جاتا ہے۔"

عائشہ کے جواب نے اسے تپا دیا تھا تبھی مزید بحث کیے وہ اٹھ گئی تھی مگر عائشہ سر جھکائے ٹپ ٹپ بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہیں بیٹھی رہی۔ اس رات کا ایک ایک لمحہ اس پر کسی عذاب کی صورت نازل ہوا تھا۔

❁ ❁ ❁

اگلی صبح ناشتے کی میز پر اس کا سامنا اپنی ماں سے ہوا تھا۔

سرخ متورم آنکھیں رات بھر رت جگے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ ہلکا ہلکا بخار بھی تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے ٹائم پر بیدار ہو کر کمرے سے نکلی تھی۔ سعد بھی خلاف توقع وہیں موجود تھا۔ تاہم اس کی بہن موجود نہیں تھی۔ رات شدید جنگ کے بعد شاید عائشہ اپنے گھر واپس چلی گئی تھی۔ ناشتے کی میز پر آج خاص اہتمام تھا۔ وہ ماں اور بھائی کو مشترکہ سلام کرتی اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

"کیسی ہو جاب سے ریزائن دے دیا یا نہیں؟" نشست سنبھالتے ہی ماں نے سوال داغ دیا تھا وہ "کیسی ہو" کو یکسر نظر انداز کر گئی۔

"جی... کل شام دے آئی تھی۔"

"شاباش آج گاؤں سے تمہارے سسرالی آ رہے ہیں۔ بہت جلدی ہے انہیں اپنی بہو کو گھر لے جانے کی اگلی اتوار کا ٹائم طے کیا ہے میں نے' تم آج ان کے ساتھ جا کر کچھ شاپنگ وغیرہ کر لینا۔"

"ٹھیک ہے امی۔" اس کا سر جھکا تھا تبھی شاید انہیں خیال آیا۔

"تم خوش ہو نا عائشہ؟"

اور عائشہ کا دل چاہا وہ اس سوال پر خوب ہنسے' مگر اپنے آنسوؤں کی طرح اس نے اپنی ہنسی کا گلا بھی گھونٹ دیا تھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے امی۔ میری خوشی تو آپ کی خوشی میں ہے۔ اگر آپ خوش ہیں تو میں بھی خوش ہوں کیونکہ میرا ایمان ہے کوئی ماں کبھی اپنی اولاد کا برا نہیں چاہ سکتی۔ آپ نے میرے لیے جو طے کیا ٹھیک ہی ہوگا۔ نہ بھی ہوا تو کیا فرق پڑتا ہے آپ مجھے جنم دینے والی ہیں۔ راتوں کو جاگ جاگ کر سنبھالنے اور پیٹ کاٹ کاٹ کر پالنے والی ہیں آپ خدا کا دوسرا روپ ہیں امی میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی کیسے کر سکتی ہوں؟"

"خوش رہو بیٹے؟" اس کے الفاظ نے عائزہ بیگم کے دل پر خاص اثر کیا تھا۔ تبھی انہوں نے اس کا ہاتھ

تھام لیا۔

"عائشہ بکواس کرتی ہے اسے ماں کی قدر نہیں ہے مگر تم وہاں بیاہ کر جاؤ گی تو دیکھو گی تمہاری ماں نے تمہارے لیے کیسا شان دار گھر پسند کیا ہے میں بہت ڈری ہوئی ہوں عائشہ تمہارے ابا کے بعد ساری زندگی ایک ایک چیز کے لیے ترس ترس کر جیسے میں نے عمر پوری کی ہے میں نہیں چاہتی ویسی ہی زندگی تمہیں گزارنی پڑے۔ پھر تمہارے ابا کی وفات کے بعد میں بہت اکیلی پڑ گئی ہوں۔ ایسے میں خاندان والوں سے کٹ کر میں اپنی بیٹیاں غیر خاندان کے سپرد کیسے کر سکتی ہوں۔ اپنا اگر مارے بھی تو چھاؤں میں پھینکتا ہے تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات۔"

"جی امی۔" وہ اگر یہ ساری وضاحت نہ بھی کرتیں تب بھی اسے کہیں بھاگنا نہیں تھا۔

"شاباش سیدھا سادا لڑکا ہے۔ دیکھا ہے میں نے زیادہ چخ چخ نہیں ہے گھر میں ماں بہن تھوڑی تیزی ہے مگر تمہیں تو شوہر کے ساتھ رہنا ہے وہ اگر مٹھی میں ہو تو ساس نندوں کا کیا ہے؟ گھر کی گاڑی ہے زمین ہے اور کیا چاہیے سعد کا ویزہ لگوا دیا ہے تمہارے، پورنے وہ باہر ہی ہوتا ہے۔ اب دیکھنا اس گھر کے حالات بھی چٹکیوں میں بدل جائیں گے۔"

اپنی بیٹی کا سودا کر کے وہ ماں خوش ہو رہی تھی اور عائشہ کو اب پتا لگا تھا کہ اس کا پورا گھر اس رشتے پر خوش کیوں تھا۔ جس کی نسبت اس سے بڑی عائشہ سے طے تھی عائشہ کے انکار اور پھر اپنی مرضی سے گھر والوں کی پسند کے بغیر کورٹ میرج کر لینے کے بعد وہ بڑی خود بخود اس کے گلے میں فٹ ہو گئی تھی۔ سارا خاندان اور برادری الگ منہ بنائے بیٹھے تھے۔ ایسے میں وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

بیٹی رحمت کا روپ بن کر باپ کے گھر جنم لیتی ہے پروان چڑھتی ہے اور پھر اس رحمت کو اس کے وارث جب چاہیں جیسے چاہیں آزمائش کی بھٹی میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ بھی رحمت تھی لہٰذا اس نے بھی دل پر پتھر رکھ کر خود کو اپنے والدین کی طرف سے آزمائش کی بھٹی میں جلانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔

✿ ✿ ✿

اس کی شادی طے ہو گئی تھی۔

پتھر کے بے جان مجسمے کی طرح نکاح کے روز وہ آنکھوں کے سوتے خشک کیے اپنے ساتھ ہونے والا تماشا دیکھتی رہی تھی۔ جس روز اس کا نکاح تھا اس سے دو روز قبل اسے میکال حسن کی طرف سے ایک خط ملا تھا اور اس خط میں سوائے سرخ روشنائی سے تحریر ایک قطعے کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی سوال' نہ گلہ' بس ایک قطعہ۔

عکس پانی کا اگر قید کیا جا سکتا
عین ممکن تھا کہ اس شخص کو میں پا سکتا
کتنی بے سود جدائی ہے کہ دکھ ہے نہ ملال
کوئی دھوکہ ہی وہ دیتا کہ میں پچھتا سکتا

اور عائشہ نے یہ قطعہ بھیگی آنکھوں سے پڑھنے کے بعد ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

✿ ✿ ✿

میکال حسن کو یوکے آئے ہوئے دوسرا سال تھا۔ جب اس روز اسکائپ پر مائرہ نے اس سے رابطہ کیا۔

"السلام علیکم! بھائی کیسے ہیں آپ؟ ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟ آپ کے لیے ایک گڈ نیوز ہے۔" ہر روز آن لائن ہوتے ہی وہ یونہی شروع ہو جاتی تھی۔ میکال جو ابھی کیمرا ایڈجسٹ کر رہا تھا ایک دم سے چونک اٹھا۔

"گڈ نیوز۔"

"جی ہاں گڈ نیوز سنیں گے؟"

"ہوں۔"

"مما نے آپ کے لیے لڑکی پسند کر لی ہے اور پتا ہے لڑکی کون ہے ..... ہانیہ صفدر۔" مسکرا کر مطلع کرتے ہوئے اس نے گویا دھماکا کر ڈالا تھا۔ وہ سرتا پیر ہل کر رہ گیا۔

"واٹ مگر میری مرضی کے بغیر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں ابھی شادی کے حق میں نہیں ہوں۔"

"تو کیا ہوا۔ ہم لوگ تو ہیں نا اور پھر ہانیہ جیسی لڑکی تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ آپ نے تو دیکھا ہی ہوا ہے انہیں۔ کل نہال بھائی کی برتھ ڈے پارٹی میں آئی تھیں۔ اتنی پیاری لگ رہی تھیں کہ بس مت پوچھیں۔ ویسے بھی آپ کو کون سا ان کے ساتھ رہنا ہے۔ وہ تو یہاں رہیں گی ہمارے پاس۔"

مائرہ اپنا راگ الاپ رہی تھی۔ میکال نے تنگ کر لائن ڈسکنکٹ کر دی۔

دو سال ہو گئے تھے مگر آج بھی اس کے دل میں اپنی محبت کا زخم تازہ تھا۔ آج بھی بے دار ہو کر آنکھ کھلتے ہی وہ بے تابی سے موبائل دیکھتا کہ شاید عائشہ کی طرف سے کوئی میسج آیا ہو دن بھر اس کی یاد چٹکی بن کر کاٹتی رہتی۔ رات میں بستر پر لیٹتا تو وہ چھم سے تصور میں آموجود ہوتی۔ اس کی ہر یاد اب بھی اس کے دل سے لپٹی تھی۔

"پتا ہے میکال جب ہماری شادی ہوگی نا تو میں روز تمہیں بہت پیار سے لاڈ کر کے جگایا کروں گی۔"

اس روز وہ دونوں قریبی پارک آئے تھے جب عائشہ نے بہت ترنگ میں اس سے کہا تھا میکال اس کی بات پر مسکرایا تھا۔

"اچھا مثال کے طور پر کیسے جگایا کرو گی؟"

"اوں ..... سوچنے دو ..... ہاں ..... تم سو رہے ہو گے میں کمرے میں آؤں گی تمہیں آواز دوں گی مگر تم آنکھیں نہیں کھولو گے۔ تب میں بیڈ پر تمہارے پہلو میں بیٹھ کر ذرا سا جھکوں گی۔ پھر اپنے لب تمہاری پیشانی پر رکھ دوں گی تم ذرا سا کسمساؤ گے اور میں پیشانی کے بعد تمہاری آنکھوں کو باری باری چوموں گی۔ پھر دونوں گالوں پر پیار کروں گی پھر ......!" وہ شرما بھی رہی تھی اور بتا بھی رہی تھی میکال کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں۔

"ہوں اور تمہیں پتا ہے پھر اس کے بعد میں کیا کروں گا۔"

"نہیں تم بتا دو۔"

"شادی کے بعد بتاؤں گا۔"

عائشہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میکال کا دل چاہا اسے خود میں جذب کر لے۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور اس کی آنکھوں کے گوشے نمی سے بھیگ گئے۔ اسی لمحے اس نے اپنے گھر کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"السلام علیکم امی!" کئی بیلز کے بعد اس کی کال مسز حسن نے ریسیو کی تھی۔

"وعلیکم السلام کیسے ہو بیٹا۔"

"ٹھیک ہوں۔" چاہنے کے باوجود ان سے اپنے لہجے کی نمی چھپا نہیں سکا تھا۔

"مگر مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے ہو کیا تم رو رہے ہو میکال؟"

وہ ماں تھیں اور ماؤں کے دلوں کے ساتھ قدرت نے عجیب سگنل فٹ کیے ہوتے ہیں سمندر پار سے بھی انہیں اپنی اولاد کی آنکھوں میں آنسو دکھائی دے جاتے ہیں۔ میکال نے ان کے سوال پر اپنی آنکھیں رگڑ لیں۔

"نہیں مما ایسی کوئی بات نہیں بس کل سے زکام ہوا ہے تو خیر چھوڑیں آپ اس بات کو مجھے آپ سے کچھ اور بات کرنی تھی۔"

"جی میری جان کہو۔"

"مما مائرہ بتا رہی تھی آپ لوگوں نے میرے لیے کوئی لڑکی پسند کی ہے۔"

"ہاں بہت پیاری بچی ہے بانیہ' تمہارے پاپا کے بہت عزیز دوست کی بیٹی ہے تم جانتے تو ہو انہیں۔ پسند آئی ہے ہمیں' بس میں اور تمہارے پاپا تو رشتا کر آئے ہیں۔"

"مگر مما آپ لوگوں کو مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا۔ میں ابھی شادی نہیں کر سکتا پلیز آپ نہال کی کر دیں۔"

"پاگل ہوئے ہو' اس کی ابھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی ہے۔"

"تو کیا ہوا جب پاپا نے آپ سے شادی کی تھی تو آپ کی بھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی۔"

"عورت اور مرد میں فرق ہوتا ہے بیٹے' ایک لڑکا جو ابھی اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا میں اس کے لیے اس بچی کا ہاتھ مانگ لوں جو ہزاروں نہیں لاکھوں میں ایک ہے اور تم کیا سمجھتے ہو اس کے لیے رشتوں کی کمی ہے۔ ہرگز نہیں' بہت لوگ ہیں اس کے لیے جھولی پھیلانے والے مگر تمہارے پاپا کی محبت کی وجہ سے وہ لوگ ہماری عزت کر رہے ہیں۔"

"جو بھی ہو' میں اس شادی کے لیے تیار نہیں ہوں' سوری۔" اس کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ تبھی حتمی لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس نے لائن کاٹ دی تھی۔

"کیا ہوا مما؟" نہال لاؤنج میں مسز حسن کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے چپ چاپ سی وہیں بیٹھ گئیں۔

"میکال نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں؟"

"مجھے پتا ہے۔" گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب بند کر دی تھی۔ مسز حسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا پتا ہے؟"

"اس کی زندگی میں ایک لڑکی تھی مما' عائشہ' ہمارے پاپا کے آفس میں ہی کام کرتی تھی میکال بہت چاہتا ہے اسے' مگر بدقسمتی سے اس لڑکی کے گھر والوں نے اس کی شادی کہیں اور کر دی اسی لیے وہ گھر اور ملک چھوڑ کر گیا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا ہے یہ سب؟"

"میکال کے دوست نے بتایا تھا آج کل یو کے میں اسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ پل پل کی خبر دیتا رہتا ہے اس کی۔ میکال اپنے ساتھ ٹھیک نہیں کر رہا ہے مما' وہ خود کو تباہ کر رہا ہے۔"

ایک کے بعد ایک یہ کیا انکشاف ہو رہا تھا۔ یہ ساری باتیں سن کر حیران ہوئی تھیں۔ اسی روز رات میں انہوں نے ریاض حسن صاحب سے بات کی۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں؟"

"تم فکر مت کرو' بانیہ بہت پیاری بچی ہے' یقیناً وہ اسے سمیٹ لے گی۔"

"مگر وہ بانیہ سے شادی پر تیار نہیں ہے۔"

"ہو جائے گا' ہم پلاننگ ہی ایسی کریں گے کہ اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ ہی کھلا نہ رہے۔"

"مگر.....!"

"اگر مگر چھوڑو' اللہ بہتر کارساز حقیقی ہے۔ یقیناً وہ سب کچھ بہتر کر دے گا۔" حسن صاحب تھکے ہوئے تھے لہٰذا لائٹ آف کر کے سو گئے۔ تاہم مسز حسن اس رات ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکی تھیں۔

✿.....✿.....✿

تمہاری یاد کی کرنوں کو اکثر ذہن میں رکھ کر
میں اپنی نیند کھوتا ہوں تو یہ میری محبت ہے
ہوا احساس' خوشبو چاندنی کو دیکھ کر اکثر

تیرے جھونکے میں رہتا ہوں تو یہ میری محبت ہے
شب کے چاند تاروں کے حسیں جھرمٹ میں جان جاں
تیرے چہرے کو تکتا ہوں تو یہ میری محبت ہے
میں اپنی زندگی کے سارے جذبوں کو میری جاناں
تمہارے نام کرتا ہوں تو یہ میری محبت ہے!

"یار آخر تم بتا کیوں نہیں دیتیں کہ تمہیں اس شادی پر کیا اعتراض ہے۔ تم یہ شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟" وہ کوئی تیسری بار اس سے پوچھ رہی تھی۔ بادیہ صفدر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ بھیگی ہوئی پلکوں اور سرخ چہرے کے ساتھ وہ رخ موڑے کھڑکی کے قریب کھڑی رہی تھی۔

"بتا دوں گی تو کیا ہو جائے گا کیا تم یہ شادی رکوا دو گی؟"

"ہاں رکوا بھی سکتی ہوں' تمہیں پتا ہے تمہارے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں مگر تم منہ سے کچھ پھوٹو تو سہی۔"

وہ اس کے لیے پریشان تھی۔ بانیہ گہری سانس بھر کر کھڑکی سے پلٹ آئی۔

"یہ شادی رکوا دو بادیہ' جیسے بھی ہو سکتا ہے پلیز نہیں تو میں مر جاؤں گی' دیکھ لینا تم ٹھیک ایک ہفتے کے بعد ان ہاتھوں پر مہندی کی جگہ خون رچے گا۔ ڈولی کی جگہ جنازہ اٹھے گا میرا۔" گلوگیر لہجے میں وہ شروع ہوئی تو پھر بولتی چلی گئی۔

بادیہ نے بے ساختہ اپنا سر پیٹ لیا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو بانی' اور کچھ نہیں یار ماں باپ اولاد کا بھلا سوچتے ہیں ہمیشہ۔"

"بھلا' یہ بھلا سوچا ہے میرے ماں باپ نے میرا۔ ایک شخص جس کے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں' خاص محبت' خاص جذبات کچھ بھی نہیں اس کے ساتھ میرا رشتا جوڑ کر بھلا کیا ہے میرے گھر والوں نے؟ ایسا بھلا کرتا ہے کوئی اپنی سگی اولاد کے ساتھ؟ میں کیا لولی لنگڑی ہوں' اندھی ہوں' پچاس سال سے اوپر عمر ہو گئی ہے میری یا پھر بدکردار ہو گئی ہوں۔ کیوں یہ لوگ کسی بوجھ کی طرح گلے سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں مجھے' کیوں؟" وہ دوبارہ آبدیدہ ہو گئی تھی۔

بادیہ اس بار اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"تم غلط سوچ کی شکار ہو رہی ہو بانیہ' میکال بھائی اتنے بھی برے نہیں ہیں کہ کوئی لڑکی ان سے شادی کے لیے یوں رو رو کر آنکھیں سجا لے اور پھر آج کل اتنے اچھے لڑکے ملتے کہاں ہیں۔ لڑکیوں کے ماں باپ کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں شکر کرو کہ گھر بیٹھے اتنا اچھا بر مل گیا ہے تمہیں ورنہ آج کل حسین سے حسین لڑکیاں صرف ایک نام کے لیے کس کس عذاب کا شکار ہو رہی ہیں تم نہیں جانتیں۔"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتی' کوئی شوق نہیں ہے مجھے شادی وادی کا اور ایک بٹے ہوئے انسان سے شادی کا تو ہرگز نہیں' میں جس حال میں ہوں خوش ہوں۔"

"آج خوش ہو' ساری عمر خوش نہیں رہ سکو گی' پانچ سال دس سال پندرہ سال کتنا عرصہ جوان رہو گی ایک وقت آئے گا جب تم تنہا چلتے چلتے تھک جاؤ گی اور تب تمہارے اندر یہ خواہش بیدار ہو گی کہ کوئی ہو جو زندگی کے سفر میں تمہارے ساتھ چلے مگر تب وقت گزر چکا ہوگا۔ پھر کیا کرو گی؟"

"خودکشی کر لوں گی مگر میکال حسن جیسے کسی فضول انسان سے شادی نہیں کروں گی۔" مرغی کی ایک ٹانگ کی طرح وہ اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹی تھی۔

بادیہ اپنے گال پیٹ کر رہ گئی۔

"کیوں نہیں کرو گی اتنا خوب صورت اور اچھا رشتا ہے۔"

''تمہیں لگتا ہوگا تم کرلو ویسے بھی مشکل میں دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں فلموں کہانیوں میں فرینڈز کیسی کیسی قربانیاں نہیں دیتیں اپنی فرینڈز کے لیے۔ میری تو پھر بھی حقیقی زندگی ہے وہ بھی بے حد مختصر یہاں تو دوسرا جنم بھی نہیں کہ رو دھو کر ایک قطعی ناپسندیدہ شخص کے ساتھ یہ جیون بتالوں اور اگلے جنم میں مجھے میری پسند کا شخص مل جائے۔'' بادیہ بیڈ سے اتر کر صوفے پر اس کے پاس آ بیٹھی۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے محترمہ کہ یہاں میری بھی ایک ہی زندگی ہے وہ بھی بے حد مختصر اور دوسری بات تمہارے علم میں ہے کہ میری نسبت بچپن سے ہی تمہارے عاشق مزاج اسٹوپڈ بھائی کے ساتھ طے نہ ہوتی تو میکال حسن جیسے آئیڈیل شخص کو پانا میری اولین ترجیح ہوتی۔'' چٹخارہ لے کر کہتی وہ یہ جان ہی نہ سکی کہ اس کی بات نے بانیہ کو پھر سے کتنا بے چین کردیا ہے۔ قدرے اضطراب میں لب کاٹتی ہوئی وہ اٹھی تھی اور پھر سے کھڑکی میں جا کر کھڑی ہوگئی۔

''مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ وہ آئیڈیل ہے مگر اس کے کردار نے مجھے غلط ثابت کردیا وہ ایک بنا ہوا شخص ہے بادی چار سال کسی لڑکی کو ٹوٹ کر چاہتا رہا ہے اسے اپنی محبت اور دیوانگی کا احساس دلاتا رہا ہے۔ کوئی اتنا عرصہ کسی کے ساتھ چل کر اس کی جگہ کسی اور کو کیسے دے سکتا ہے۔ کیسے بھلا سکتا ہے اسے ایک دم سے کسی اور کے ساتھ کیسے نئی زندگی شروع کرسکتا ہے۔ جبکہ اس کے پاس دوسرے شخص کو دینے کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔''

شادی سے انکار کی اصل وجہ سامنے آ گئی تھی۔ بادیہ چاپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

''میں بہت صاف گو لڑکی ہوں بادی بہت ایماندار ہوں رشتوں کے معاملے میں مجھ سے منافقت برداشت نہیں ہوتی۔ وہ شخص جو چار سال کسی کی چاہ کسی کی پسند کسی کے خوابوں میں رہا ہے وہ میرا کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا رہا ہوگا میرے لیے اس شخص کے پاس خالص محبت خالص چاہ خالص خواب...... کچھ بھی تو نہیں۔ وہ میرا چہرہ بھی دیکھے گا تو اس چہرے میں تشبیہ اسی کی نظر آئے گی جو اس کی اولین پسند ہے میں برتی ہوئی چیزیں استعمال نہیں کرتی بادیہ۔ برتا ہوا شخص کیسے قبول کرلوں؟ مجھے کسی کی سیکنڈ چوائس بننے کا کوئی شوق نہیں بس...... جو میرا ہم سفر بنے اس کی ہر سانس مجھ سے مخلص ہو میرے ہوتے ہوئے اس کے دل و دماغ پر کسی دوسری لڑکی کی پرچھائی بھی نہ پڑے۔ وہ صرف میرا ہو بادی صرف میرا۔ میرے پہلو میں لیٹ کر اس کے دھیان میں کبھی کسی اور کی یاد کے آسمان کو نہ چھوئیں بس...... !'' ذرا سی جذباتی ہوئی وہ لڑکی اسے بے حد پیاری لگی تھی۔

وہ صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس کھڑکی کے قریب آ کے کھڑی ہوگئی۔

''تمہاری سوچ اور پسند تو بہت اچھی ہے میری جان مگر افسوس جیسا نایاب ہیرو تمہیں مطلوب ہے وہ ساٹھ ستر سال پہلے تو کہیں ملتا ہوگا اب ممکن نہیں ہے کیونکہ موجودہ دور میں صرف ایک لڑکی پر دنیا حرام کرلینا فلموں کہانیوں میں تو چلتا ہے حقیقی زندگی میں نہیں۔ یہاں مرد ہو یا عورت زندگی کے سفر میں ہر نئے موڑ پر نئے ہم سفر کے ساتھ چلنا پسند کرتے ہیں سویٹی۔ ایک ہی محبت کو روگ بنا کر دل سے لگائے نامرد تو خاص طور اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔''

''تو سمجھتے رہیں یار میں شادی کے لیے مری تو نہیں رہی۔'' وہ چڑی تھی بادیہ مسکرا کر رہ گئی۔

''ٹھیک ہے تو چل کر انکل کو یہ بات بتادو سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

"کاش میں ایسا کرسکتی' کاش وہ اتنے سخت باپ نہ ہوتے' کاش......!"

"جب کچھ بھی اختیار میں نہیں ہے تو فضول میں اپنی جان کیوں ہلکان کررہی ہو تین دن ہوگئے تمہیں بھوک ہڑتال کیے کیا یہ اس مسئلے کا حل ہے؟"

"نہیں مگر یہ اذیت' یہ بے چینی' یہ غصہ میری جان لے لے گا بادی میں جب جب میکال حسن کے متعلق سوچتی ہوں میری شریانیں پھٹنے لگتی ہیں۔ وہ شخص مجھے وقت سے پہلے مار دے گا دیکھ لینا تم۔" بانیہ کے لہجے میں گہرا اضطراب تھا۔ بادیہ تڑپ کر رہ گئی۔

"پاگل ہوگئی ہو خبردار جو دوبارہ بھی ایسی بات منہ سے نکالی تو۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں بادی دیکھ لینا تم' اگر یہ شادی نہ رکی تو میری سانس میرا دل ضرور رک جائے گا۔"

"نہیں' ایسا کچھ نہیں ہوگا تم میکال حسن سے شادی نہیں کرنا چاہتیں ٹھیک ہے مت کرنا میں وعدہ کرتی ہوں تمہاری شادی اس سے نہیں ہونے دوں گی۔ مگر تم دوبارہ کبھی مرنے کی بات نہیں کروگی ٹھیک ہے؟" اس کی بے چینی محبت سے مشروط تھی۔ بانیہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"اتنے کم دنوں میں تم کیا کروگی؟"

"کچھ نہ کچھ تو کروں گی اپنی کسی سہیلی کو اس کی پہلی بیوی اور اس کے ڈھیر سارے بچوں کی اماں بنا کر عین نکاح کے وقت سامنے لے آؤں گی۔ ابھی کل ہی کسی کہانی میں یہ سب پڑھا تھا میں نے تم بے فکر رہو سب ٹھیک ہوجائے گا میں ہوں نا۔"

وہ اس کی صحیح درد آشنا تھی بانیہ اس کے گلے لگ کر رو پڑی۔

"تھینکس بادی تم نہ ہوتیں تو جانے میں کب کی مر چکی ہوتی۔"

"اف پھر مرنے کی بات اب تم مار کھاؤ گی مجھ سے اور کچھ نہیں۔"

ایک دھموکا اس کی نازک کمر پر رسید کرتے ہوئے وہ بولی تو بانیہ روتے میں مسکرادی۔

"اب جلدی سے فریش ہوجاؤ میں کھانا بھجوا رہی ہوں اچھی طرح کھا لینا اوکے۔" اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اس نے ہدایات جاری کیں تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتی واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

✿ ✿ ✿

صفدر منیر باجوہ صاحب حال ہی میں آرمی سے کرنل کے عہدے پر ریٹائر ہوئے تھے۔

بانیہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس سے بڑا ان کا صرف ایک بیٹا جاذب تھا۔ جو مڈل کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان کی بڑی بہن کے پاس انگلینڈ چلا گیا تھا۔ بانیہ اس سے پورے سات سال چھوٹی تھی۔ وہ ففتھ میں تھی جب صفدر منیر باجوہ صاحب کی محبوب بیوی "آسیہ بانو" کا انتقال ہوگیا۔ یہ سانحہ ان کے لیے اتنا شدید ثابت ہوا کہ عین بیوی کے سوئم والے دن وہ خود بھی ہارٹ اٹیک کا شکار ہوکر اسپتال جا پہنچے۔ مگر قدرت کو ابھی انہیں زندگی کی نعمت سے نوازنا تھا۔ لہٰذا ایک ہفتہ اسپتال میں رہ کر دوبارہ گھر لوٹ آئے۔

بانیہ اس ایک ہفتے میں رشتہ داروں کی موجودگی کے باوجود ملازمین کے رحم وکرم پر رہی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ صفدر صاحب نے تو خود کو سنبھال لیا۔ مگر بیٹی کے لیے زیادہ حساس ہوتے گئے۔ جاذب اس وقت پندرہ سال کا تھا مگر پھر بھی بانیہ کے کمرے میں گھسا اسے گلے سے لگائے روتا رہتا تھا۔

صفدر باجوہ صاحب کے مزاج میں حاکمیت اور سختی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے بچوں سے فری نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آسیہ بیگم کی رحلت کے بعد جہاں اس گھر سے خوشیاں روٹھی تھیں وہیں رشتہ داروں نے بھی آنا جانا کم کردیا۔ جاذب کو واپس چلے جانا تھا ایسے میں آٹھ سال کی بانیہ کو ملازمین کے رحم وکرم پر چھوڑ کر بے فکر رہنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا خاصی سوچ و بچار کے بعد بالآخر انہیں وہ فیصلہ کرنا پڑا۔ جس کے لیے انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ صرف بانیہ کی زندگی اور مستقبل کے لیے انہیں ذکیہ بیگم کو بیوی بنا کر آسیہ بیگم کی جگہ اس گھر میں لانا پڑا تھا کہ جس کے در و دیوار سے جھلکتی وحشت صاف دکھائی دیتی تھی۔ ذکیہ بیگم کو پہلے شوہر سے طلاق ہوچکی تھی۔ لہٰذا صفدر باجوہ کی زندگی میں آنے کے بعد وہ اگر بہت اچھی ماں ثابت نہیں ہوسکی تھیں تو اتنی بری بھی نہیں تھیں۔

بانیہ "باجوہ ہاؤس" میں ذکیہ بیگم کی آمد کے بعد منیر صاحب سے مزید دور ہوگئی تھی۔ وہ شخص جو صرف اس کی ماں سے محبت کا دعوے دار تھا۔ اسی شخص کو ماں کی وفات کے بعد کسی اور کے ساتھ مطمئن دیکھ کر روز جانے کتنے آتش فشاں تھے جو اس کے اندر پھٹتے تھے۔ مرد ذات سے بدگمانی کا پہلا بیج یہ شادی ہی ثابت ہوئی تھی۔ جس کے لیے وہ قطعی یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ یہ شادی صرف اس کے مستقبل اور تحفظ کے لیے کی گئی ہے۔ وہ سوچتی کہ کاش اس کی ماں زندہ ہوتی تو ہرگز باجوہ صاحب کو اس بے وفائی کے لیے معاف نہ کرتی۔ اندر ہی اندر کی گھٹن اور کھولن نے اس کی ذات میں بہت سے رخنے ڈال دیے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ حساس اور تنہا ہوگئی تھی۔ یہ اس کی حساسیت اور تنہائی کا احساس ہی تھا کہ بہت چھوٹی سی عمر میں اس نے رنگوں سے کھیلنا شروع کردیا۔ اپنے اندر کے غبار کو وہ مختلف مناظر اور تصاویر کے ذریعے باہر نکالتی تھی۔ وہ میٹرک میں تھی جب اس کی پھوپھو زاد بادیہ پاکستان دیکھنے کے شوق میں اس کے پاس چلی آئی اور پھر اس کا دل ایسا لگا پاکستان میں کہ جاذب کی خفگی اور ماں کے اعتراض کے باوجود وہ "باجوہ ہاؤس" کی ہوکر ہی رہ گئی۔ بانیہ کے بی اے کے بعد اس نے بھی مزید تعلیم کے لیے اسی کے ساتھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ دونوں ایک ہی کمرے میں سوتیں اور ہر جگہ اکٹھی رہتیں۔ صحیح معنوں میں بادیہ کے آجانے سے بانیہ کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آئی تھی۔ وہ اب زندگی جینے لگی تھی۔ مارننگ واک' ایوننگ واک' یونیورسٹی کے فلشو میں دل لگانے لگی تھی۔ ذکیہ بیگم خود کو ان دونوں کے معاملات سے دور ہی رکھتیں۔

ریاض مصطفیٰ صاحب' صفدر منیر باجوہ صاحب کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ انہی کے گھر ایک تقریب میں انہیں اور ان کی بیگم کو بانیہ پسند آئی تھی اور دونوں ہی اسے اپنے گھر کی بہو بنانے پر تل گئے۔ صفدر صاحب نے میکال کو دیکھا تھا۔ انہیں وہ پسند تھا۔ لہٰذا ریاض صاحب کے سوال پر انہوں نے اپنی رضامندی کا اظہار کردیا۔

دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں ہورہی تھیں اور دونوں فریق جن کی شادی ہورہی تھی دونوں ہی اس بندھن پر خوش اور راضی نہیں تھے۔

(جاری ہے)

جھیل کنارے کنکر

نازیہ کنول نازی

کبھی ہمت تو کبھی حوصلے سے ہار گئے
ہم بدنصیب تھے جو ہر کسی سے ہار گئے
عجب کھیل کا میدان ہے یہ دنیا بھی
کہ جس کو جیت چکے تھے اسی سے ہار گئے

ادھوری باتیں ہی زندگی ہیں
وہ گزری باتیں ہی زندگی ہیں
اگرچہ دل کی اداس اجڑی ہوئی رتوں میں
بکھر گئی ہیں
کئی زمانوں سے ساری باتیں وہ گزری باتیں
سلگتی شاموں کے جلتے بجھتے الاؤ میں ہی پگھل گئی ہیں
ادھوری باتیں ضروری باتیں
یہ خشک ہوتی ہوئی رگوں کی سیاہ قبروں میں نیم مردہ
ڈسی ہوئی خواہشوں کے ہمراہ پڑی ہوئی ہیں
یہ آنکھ کی پتلیوں میں تھک کے جھلکتی پلکوں پہ سو گئی ہیں
تمام باتیں درست جاناں تمام خدشے بجا ہیں لیکن
ہر ایک امکانِ زندگی میں ......
رگوں میں اور روح کی زمین میں
انہی کی یادیں بھٹک رہی ہیں
انہی کے دم سے لطیف جذبوں نکھرتے جذبوں
بجھی تمناؤں میں رمق ہے
ادھوری باتیں ہی زندگی ہیں وہ گزری باتیں ہی زندگی ہیں
خیال رکھنا......!
ادھوری باتیں بھلا نہ دینا
وہ گزری باتیں بھلا نہ دینا......

خیال رکھنا......!

ٹیوب ویل چل رہا تھا۔

لہلہاتی سرسبز فصلیں ٹھنڈا ٹھار پانی جذب کرتیں ایکدم سے جوان دکھائی دینے لگی تھیں۔

زائر ملک نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھر کر کئی بار منہ پر چھپاکے مارے...... گرمی کا زور انتہا پر تھا۔ وہ ابھی کھڑا ہوا تھا کہ حویلی سے پیغام آ گیا۔

"زائر...... او زائر بڑی حویلی میں چوہدرانی صاحبہ یاد کر رہی ہیں تجھے۔"

"خیر ہے......؟" عقیل مزارع کی اطلاع پر اس نے ہاتھ قمیص کے دامن سے خشک کرتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آہو خیر ہی ہے وہ اصل میں چوہدرانی صاحبہ کی پوتی آ رہی ہے باہر سے اسی کو لینے ائر پورٹ جانا ہے تجھے۔"

"پوتی...... یہ اتنے سالوں بعد چوہدرانی کی پوتی کہاں سے آ گئی؟" وہ حیران ہوا تھا۔ جب عقیل مزارعے نے بتایا۔

"یار کہا تو ہے باہر کے ملک سے آ رہی ہے۔ پہلے تو مجھے بھی نہیں پتا تھا آج ہی حویلی میں سب کو پتا چلا ہے کہ ان کی ایک پوتی بھی ہے۔ آخر ایک ہی تو بیٹا تھا

چوہدرانی صاحبہ کا۔

"ہوں' تم چلو میں آتا ہوں۔"

تازہ شیو والے شفاف چہرے سے پانی کی بوندیں یوں گررہی تھیں جیسے دمکتے موتی ہوں۔ عقیل مزارع اس کی تسلی پر اپنے کندھے پر پڑا پٹکا درست کرتے ہوئے واپس پلٹا تھا۔

"ذرا جلدی آجانا' چوہدرانی صاحبہ بڑی بے صبری سے تیرا انتظار کررہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے آجاتا ہوں' تو جا۔" اب کے اس کے ماتھے پر ہلکی سی شکن ابھری تھی' جواب میں عقیل مزارع بنا مزید کچھ کہے' آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ شیشم کے بڑے سے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"پتراناراں دے......

ساڈا دکھ سن کے روندے پتھر پہاڑاں دے"

اپنی مخصوص ٹون میں' پلکیں موندے' قدرے دھیمی آواز میں وہ گنگنانا شروع ہوا تھا۔ جب کرم داد قریب سے گزرتے ہوئے اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"اوئے زائر یار' پانچ سال ہوگئے تجھے اس کا جوگ لیے ہوئے' اوئے خدا کا واسطہ ہے یار' اب بھول جا اسے' چھوڑ دے اس کا پیچھا۔"

"چھوڑ دیا' مگر اسے بھلانا میرے بس میں نہیں ہے۔" کرم داد کی نصیحت پر فوراً سے پیشتر آنکھیں کھولتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"کیوں نہیں ہے بس میں' وہ دنیا کی آخری لڑکی تو نہیں تھی اور پھر تجھ میں کس چیز کی کمی ہے' کھڑی کھلوتی لڑکی کو اک چک کے دیکھ لے تو سڑ کے سوا ہوجائے' کیوں نہیں سمجھتا تو......"

کرم داد اس کا درد آشنا تھا۔ تبھی ہزار بار پہلے کی ہوئی نصیحت دہراتے ہوئے جذباتی ہوا تھا۔ زائر نے جواب میں پھر سے پلکیں موند لیں۔

"جن کے سنہری خوابوں کو کالی سیاہ تقدیر کے گھور اندھیرے چاٹ جائیں انہی کی بات کی تھی میں نے کرم داد میری خوشیوں اور سنہری خوابوں کو بھی میری تقدیر کے اندھیروں نے نگل لیا ہے۔"

"چھوڑ یار' مت کر ایسی مایوسی کی باتیں' دنیا کسی ایک شخص پر ختم نہیں ہوجاتی۔"

"میری ہوگئی ہے۔"

"خود کی ہے تُو نے' ورنہ آج کل ایسی محبت کوئی نہیں کرتا۔"

"میں تو کرتا ہوں ناں' خیر چھوڑ' حویلی جارہا ہوں میں' چل رہے ہو ساتھ۔"

"نہیں' میں ذرا کھیتوں کی طرف جارہا تھا' پانی کا مسئلہ ہوگیا ہے' تو جا۔"

"چل ٹھیک ہے پھر رب راکھا۔"

"رب راکھا" کرم داد بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اگلے پندرہ منٹ میں اس کے قدم حویلی کے شاندار بیرونی دروازے کو پار کررہے تھے۔

"السلام علیکم چوہدرانی صاحبہ۔"

"وعلیکم السلام زائر' کہاں تھے' میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔"

"خیریت؟"

"ہوں' خیر ہی ہے۔ وہ لندن سے میری پوتی آرہی ہے' اسے لینے کے لیے ابھی فوراً لاہور ائرپورٹ کے لیے نکل جاؤ شاباش۔"

"وہ تو ٹھیک ہے چوہدرانی صاحبہ' لیکن میں انہیں پہچانوں گا کیسے؟"

"ارے...... اس میں کیا مشکل ہے' وہاں جو لڑکی سب سے پیاری ہو سمجھ لینا وہی میری پوتی ہے۔"

اس بار چوہدرانی کے الفاظ پر وہ ذرا سا رخ پھیرتے ہوئے مسکرایا تھا۔

"چوہدرانی صاحبہ شہر کی ساری لڑکیاں ہی خوب صورت اور پیاری ہوتی ہیں' اب سب کی سب تو آپ کی

پوتیاں نہیں ہوسکتی ناں۔"

"ہوں' یہ بھی ٹھیک ہے' اچھا ایک کام کر' یہ فون رکھ اپنے پاس' وہ تجھے خود کال کرکے بتادے گی کہ کہاں ہے' پھر جہاں وہ کہے وہیں چلے جانا' ٹھیک ہے......؟"

"جی ٹھیک ہے؟"

وہ اسی حویلی میں پل بڑھ کر جوان ہوا تھا' تبھی مزید کوئی نقطہ اعتراض اٹھائے چوہدرانی سے گاڑی کی چابی لے کر واپس پلٹ آیا۔ حویلی میں چوہدرانی کو سو بکھیڑے تھے' کچن سے بھانت بھانت کی اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں' کونے کونے کو الگ چمکایا جارہا تھا' وہ اپنی ہی دھن میں سرسری سی ایک نگاہ اطراف میں ڈالتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ آیا۔

"زائر...... جب ہماری شادی ہوگی' تم مجھے بڑی سی گاڑی میں سیر کراؤ گے ناں؟"

"ہاں۔"

کسی کی جگر جگر کرتی ستارے سی روشن نگاہوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اقرار کیا تھا۔

"سچی؟" اس کے اقرار پر وہ بے حد خوش ہوئی تھی۔

"ہوں سچی۔"

"ہائے اللہ' بس پھر تو پکی بات ہے میری شادی تم سے ہی ہوگی۔"

"ان شاء اللہ۔"

اس نے مسکرا کر کہا تھا اور پھر اس مسکراہٹ کا بدلہ لینے کے لیے اس کی تقدیر سالوں اس پر ہنستی رہی تھی۔ بے ساختہ اس لمحے اسے نوجوان شاعر راشد ترین کی ایسی ہی ایک نظم شدت سے یاد آئی تھی۔

بڑے ہی نازوں سے پلنے والی
وفا کے رستے پہ چلنے والی
تمام رشتوں کو توڑ کے تم
ہمیں اکیلا چھوڑ کے تم
کہ غیر لوگوں کا پاس کرکے
ہمارے دل کو اداس کرکے
ہمیں محبت شناس کرکے
کسی سے چاہت جتا رہی ہو
سنا ہے اپنوں سے میں نے جاناں
بڑی حویلی میں جا رہی ہو
وہ ایک لڑکے کی چاہتوں کو
ہماری ساری رفاقتوں کو
جو ایک پل میں بھلا کے تم نے
خطوط سارے جلا کے تم نے
سبھی کو ہم پہ ہنسا کے جاناں
کسی سے الفت نبھا رہی ہو
سنا ہے اپنوں سے میں نے جاناں
بڑی حویلی میں جا رہی ہو
بڑی حویلی کے رہنے والوں کی
زندگانی بھی دیکھ لینا
دلوں پہ کرتے ہیں جبر کیسا
یہ حکمرانی بھی دیکھ لینا
یہ ناز تیرے بجا ہیں لیکن
غیر لوگوں کا کیا بھروسہ
یہ غیر لوگوں کے طنز سارے
کبھی بھی دل پر نہ سہہ سکو گی
بڑے ہی نازوں سے پلنے والی
یہ جشن کیسا منا رہی ہو
سنا ہے لوگوں سے میں نے جاناں
بڑی حویلی میں جا رہی ہو
وہ ایک شاعر کی زندگانی کے
خواب سارے ہی نوچ ڈالے
جو اس نے تیرے لیے بنے تھے
جو اس نے تیرے لیے چنے تھے
اب اس کی قسمت میں فرقتوں کے
اداس موسم کے رتجگے ہیں
تمہیں تو شاید پتا نہیں ہے
یہ سارے قسمت کے فیصلے ہیں

تمہیں پتا ہے وہ تیرا شاعر
کبھی سے کیسے الجھ گیا ہے
جو اس نے لکھے تھے چاہتوں سے
خطوط سارے جلا رہی ہو
سنا ہے اپنوں سے میں نے جاناں
بڑی حویلی میں جا رہی ہو

گاڑی کے ایکسلیٹر پر اچانک اس کا دباؤ بڑھا تھا مگر پھر ایکدم سے ہی اس نے اسپیڈ بڑھادی۔

وہ سمجھتا تھا کہ اس کی چچازاد اور بچپن کی منگ سائرہ افضل ہی اس کی زندگی ہے جس کی خوب صورت آنکھوں کے ہر خواب کو اس نے پورا کرنا ہے مگر...... اس نے غلط سمجھا تھا' وہ اس کی زندگی نہیں تھی۔

◉ ...... ◉ ...... ◉

"پاپا میں آپ کو صاف لفظوں میں کہہ چکا ہوں مجھے یہ شادی نہیں کرنی' کسی قیمت پر بھی نہیں۔" وہ ابھی آدھے گھنٹے قبل ریاض صاحب کے ایمرجنسی بلاوے پر پاکستان آیا تھا اور اب گھر میں شادی کا ماحول دیکھ کر پہلے ٹھٹکا' پھر بڑی بھابی سے اپنے مایوں کا سن کر بدک اٹھا۔ تاہم ریاض صاحب اطمینان سے سگار پیتے رہے تھے جس پر وہ مزید مشتعل ہوا تھا۔

"میں آپ سے کچھ کہہ رہا ہوں پاپا......"

"سن لیا ہے' تم بھی سن لو اس شادی سے تمہاری زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا' یہ صرف پیپر میرج ہوگی اور بس......"

"مگر کیوں' ایسی کون سی افتاد پڑ گئی ہے' اس لڑکی پر جو یوں اس کے گھر والے اسے سر سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔"

"کنٹرول یور سیلف میکال' خبردار اس بچی کے کردار پر کیچڑ مت اچھالنا' یہ میرے دل کی خوشی ہے کہ وہ میرے گھر میری بیٹی بن کر آئے۔"

"اگر یہ آپ کی خوشی ہے تو میرے علاوہ اس گھر میں آپ کا ایک اور بھی کنوارہ بیٹا ہے' یہ فرائض منصبی اسے سونپ دیجیے۔" اس بار اس کا لہجہ گستاخانہ تھا' مسز حسن کو جلال آ گیا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو میکال' اپنے باپ سے بات کر رہے ہو تم' کسی ملازم سے نہیں۔ اور شادی طے ہو چکی ہے' کل برات جانی ہے' اگر تم نے اپنے پاپا کی عزت نہ رکھی تو یاد رکھنا میں تمہیں اپنا دودھ معاف نہیں کروں گی۔"

"یہ صاف بلیک میلنگ ہے مما۔"

"جو بھی سمجھو' ہم بھائی صاحب کی عزت کو رسوا نہیں کر سکتے' ہم نے خود دامن پھیلا کر ان سے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگا ہے' اب کس منہ سے انکار کریں۔" ان کے لہجے میں کسی قسم کی رعایت کی گنجائش نہیں تھی' میکال غصے اور بے بسی سے لب بھینچتا انہیں دیکھتا رہ گیا۔

◉ ...... ◉ ...... ◉

برات آ گئی تھی۔

ہانیہ کو آخری لمحے تک امید تھی کہ ہادیہ اس کی مدد کرے گی' مگر نکاح کے وقت وہ تو گدھے کے سر سے سینگ کی مانند غائب ہو گئی تھی۔ ہانیہ کو اس سے اس دھوکے بازی کی امید نہیں تھی' نہال جو اس کا یونیورسٹی فیلو تھا' وہ بھی کہیں غائب ہو گیا تھا' وہ خون کے گھونٹ پیتی بار بار پلکیں جھپک کر اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

نکاح نامے پر سائن کرتے وقت اس نے پھر سر اٹھا کر سامنے دیکھا' مگر ہادیہ نہیں تھی' اس کا چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ ہو گیا تھا۔ دلہا بنے میکال کا موڈ بھی کچھ خاص خوشگوار نہیں تھا' بھیگی بھیگی سی سرد رات برقی قمقموں کا حصہ بنی دھیرے دھیرے گزر رہی تھی' جب وہ کانچ کی گڑیا سی لڑکی اپنے مکمل سنگھار کے ساتھ' کسی تصویر کی مانند خاموش اسٹیج پر اس کے برابر میں آ بیٹھی۔

اگلے دو گھنٹوں میں اول فضول رسموں کے بعد بالآخر رخصتی کا وقت بھی آ گیا۔ میکال صفدر صاحب اور جاذب کے ساتھ دیگر رشتہ داروں سے مل کر واپس پلٹا' تو اس نے جاذب اور ہادیہ کو ہانیہ کے ساتھ کھڑے روتے ہوئے دیکھا' وہ دونوں اسے گاڑی کے قریب لا رہے تھے' وہ وہیں رک گیا۔

اگلے پانچ منٹ میں جب وہ گاڑی کے پاس پہنچ گئی تھی اس نے ذکیہ بیگم کو دیکھا تھا' بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ وہ ہانیہ کو پیار دینے کے لیے اس کے قریب آئی تھیں' جب اس نے درشتگی سے ان کے بڑھتے ہوئے ہاتھ پرے جھٹک دیے۔

"ڈونٹ ٹچ می' سوتیلی عورت کبھی ماں نہیں بن سکتی' بالآخر یہ ثابت کر دیا آپ نے۔" اس کے لہجے میں غصے کے ساتھ ساتھ غراہٹ تھی۔ میکال جاذب سے مصافحہ کرتے ہوئے ٹھٹک گیا۔

"آج اگر میری ماں زندہ ہوتیں تو کبھی یوں میری خوشی کی پروا کیے بغیر ایک قطعی ناپسندیدہ شخص کے ساتھ میری زندگی کا سودا نہ کرتیں۔" وہ اپنے اندر کا غبار نکال رہی تھی۔ جاذب اور ہادیہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ بھی اس جیسا ہی کیس تھی' یقیناً اس کے ساتھ بھی زبردستی کا سودا ہوا تھا' پھر بھی وہ شدید اذیت و ذلت کا شکار لب بھینچ کر سرخ چہرے کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھا۔ اپنی سسرال سے گھر تک وہ لب بھینچے خاموش بیٹھا رہا تھا۔ مگر گھر واپسی کے بعد وہ کہاں نکل گیا کسی کو خبر نہیں ہو سکی تھی۔

◉ ...... ◉ ...... ◉
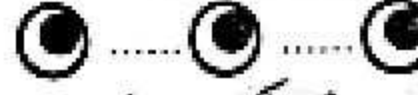
ضبط گریہ سے سرخ آنکھیں لیے چپ چاپ بے آواز روتے ہوئے وہ عائشہ برہان کے سامنے بیٹھا تھا۔ اور وہ جو فقط دو ہی سال میں "رل" کر رہ گئی تھی' یوں صبح سویرے اسے شکستہ پا دیکھ کر ٹھٹک گئی' اندر کو دھنسی آنکھوں میں گہرا کرب آن ٹھہرا تھا' میکال کو روتے دیکھ کر اسے لگا' جیسے اس کا دل کٹ کر رہ گیا ہو۔

"میکال' کیا ہوا ہے' آج تو فرسٹ نائٹ تھی ناں تمہاری شادی کی......؟"

"ہاں......" ضبط کے باوجود اس کا لہجہ بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔

"پھر...... یہاں کیوں چلے آئے......؟"

"بس یونہی۔"

"پاگل ہوئے ہو' کیا سوچ رہی ہوگی وہ' تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا' اور وہ...... جو ساری کائنات کا مالک ہے' کیا اسے ایسا کرنا چاہیے تھا......؟"

ایکدم سے وہ بے حد جذباتی ہوا تھا۔ عائشہ از حد حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"کیوں کرتا ہے وہ ایسے عائش؟ خود ہی دل میں کسی کے لیے محبت ڈال کر' پھر خود ہی دل اجاڑ دیتا ہے کیوں؟ وہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے' ستر ماؤں سے زیادہ بڑھ کر پیار کرنے والا ہے' وہ کیسے دیکھ سکتا ہے مجھے یوں سسکتے ہوئے' کیوں اتنا بے بس کر دیا ہے اس نے مجھے کہ میں چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پا رہا' میں نے جسم نہیں مانگا تھا' اس سے روح مانگی تھی' محبت مانگی تھی' مگر اس نے جسم دے دیا' محبت نہیں دی' کیوں نہیں دیتا وہ محبت' نہیں دینی تھی تو کیوں ہوا پانی خوراک سے بھی زیادہ ضروری بنایا اس نے اسے' کیوں......؟"

جذب کے عالم میں کہتے ہوئے وہ تڑپ اٹھا تھا۔ عائشہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

"گھر جاؤ میکال' یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا گھر جانے کو......"

عائشہ کے آنسو پونچھنے پر وہ پھر کرب انگیز لہجے میں بولا تھا۔ جواب میں وہ افسردہ سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خدا کا واسطہ ہے میکال' یوں اس طرح سے اپنی اور میری زندگی کو مشکل میں مت ڈالو' میں آل ریڈی بہت کٹھن حالات کا سامنا کر رہی ہوں' مجھے اور اذیت مت دو' پلیز۔" وہ ٹھیک کہہ رہی تھی' اسے اچانک اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔

"سوری۔" دائیں ہاتھ سے آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ جونہی کھڑا ہوا' عائشہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میری جان ہے تم میں' یہ یاد رکھنا' اب جاؤ۔"

میکال نے اس کی بات سنی تھی اور بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے پھر گاڑی میں آ بیٹھا تھا۔

کوئی میرے دل دا حال نہ جانے او ربا
رورو کے سکھ گئے نین تمانے او ربا
کوئی میرے دل دا حال نہ جانے او ربا

وہ عائشہ برھان کو پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب اس کی گاڑی میں سلو ڈرائیونگ کے ساتھ گونجتی راحت فتح علی خان کی آواز اسے اپنے دل کی ترجمان لگ رہی تھی۔

جیہڑے ٹر جاندے پیچھاں مڑ کے نئیں تکدے
ہویا کی قصور ساتھوں اے وی تے نئیں دسدے
کیتھے جاکے لائے اونھے اپنے ٹھکانے او ربا
کوئی میرے دل دا حال نہ جانے او ربا
حال نہ جانے او ربا......!!!!

گاڑی کی اچانک بریک کے ساتھ ہی اس کا طلسم بھی ٹوٹا تھا' ریاض حسن صاحب اس کی ذہنی کیفیت سے آگاہ تھے تبھی انہوں نے گھر میں سب کو منع کردیا تھا کہ وہ اسے کچھ نہ کہیں۔

صبح کی سپیدی خاصی پھیل چکی تھی' وہ بے دلی سے گاڑی پارک کرنے کے بعد تیزی سے سیڑھیاں کراس کرتا اوپر اپنے کمرے میں آیا اور بنا کسی بھی تبدیلی کو اہمیت دیئے وارڈ روب سے اپنے کپڑے لے کر واش روم میں گھس گیا۔

نیچے ناشتے کی میز پر صفدر صاحب کی فیملی کی طرف سے ناشتا آچکا تھا' مگر وہ مروتاً بھی نیچے نہیں آیا تھا۔ ہانیہ بیدار ہونے کے بعد اپنے متوقع حال پر بنا واویلا کیے' وارڈ روب کی طرف چلی آئی۔

میکال واش روم سے نکلا تو وہ اپنے کپڑے لے کر واش روم میں گھس گئی۔ اگلے پندرہ منٹ کے بعد وہ فریش ہو کر کمرے میں واپس آئی تو میکال بستر پر آڑھا ترچھا لیٹا سونے کی تیاری کررہا تھا۔ وہ ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالتی اپنے بال سلجھانے لگی۔

⊙ ...... ⊙ ...... ⊙

شہر خاموشاں میں اس روز معمول سے کہیں بڑھ کر سناٹا تھا۔

وہ بے قرار سا ادھر اُدھر نگاہ دوڑاتا اپنی ماں کی قبر کے قریب آ کھڑا ہوا۔ انتہائی رقت و محبت کے ساتھ فاتحہ پڑھ کر وہ ابھی چہرے پر ہاتھ پھیر رہا تھا جب اس کی بھٹکتی بے قرار نگاہ اس پر پڑی تھی۔

ہر روز کی طرح سیاہ چادر میں لپٹی وہ سبک رو ہوا کی مانند' خراماں خراماں چلتی اپنی مطلوبہ قبر تک گئی تھی' پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کیا' اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ہاتھ میں پکڑے شاپر سے تازہ پھولوں کی پتیاں نکال کر اس قبر پر بکھیر دی تھیں' اس نے ذرا سی ترچھی نگاہ کرکے دیکھا' وہ اب قبر کے پہلو میں بیٹھی' بہت محبت اور عجیب یاسیت کے ساتھ اس پر بکھری تازہ گلاب کی پتیوں کو اپنے دائیں ہاتھ سے محسوس کرتی' قبر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

عذیرے سے صبر نہ ہوسکا۔

فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد' وہ بہت سوچتے ہوئے اس قبر کے قریب آیا تھا۔

''ایکسکیوز می۔'' اس کی پکار پر اس لڑکی کی محویت ٹوٹی تھی' وہ یوں چونکی تھی گویا کسی گہرے خواب سے بیدار ہوئی ہو۔

''جی......'' بنا پلٹ کر دیکھے اس نے چادر کو چہرے پر مزید پھیلا لیا تھا۔

''میرا نام عذیرے ہے' میں یہاں روز اپنی ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے آتا ہوں' کیا میں جان سکتا ہوں' مٹی کے اس ڈھیر تلے آپ کا کون سا رشتہ دفن ہے؟''

''میرا رشتہ......؟'' اس کے سوال پر ہلکے سے بڑبڑاتے ہوئے وہ بے کلی سے کھڑی ہوئی تھی۔

''کوئی رشتہ نہیں۔''

''کوئی رشتہ نہیں تو روز یہاں کیا لینے آتی ہیں' آندھی' طوفان' بارش کی بھی پروا نہیں کرتیں' اس بات کا

بھی احساس نہیں کہ عورت کا یوں روز قبرستان میں آنا کسی طور مناسب نہیں۔"

عذیر کو حیرانی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

"کون ہو تم؟"

تیوری چڑھاتے ہوئے اب اس نے سوال بدلا تھا۔ مگر لڑکی کے چہرے پر وہی بے نیازی تھی۔

"پتا نہیں۔"

زیر لب بڑبڑا کر ایک نظر سامنے موجود قبر پر ڈالتے ہوئے وہ پلٹ گئی تھی اور عذیر جو آج ہر صورت اسے جان لینا چاہتا تھا' لب بھینچے کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

⦿ ...... ⦿ ...... ⦿

پت جھڑ کی دہلیز پر تنہا
بے چہرہ پتوں کی صورت
ہم کو آج لیے پھرتی ہے
تیرے دھیان کی تیز ہوا

تھکن سے چور بدن کے ساتھ' بنا رات کا کھانا کھائے وہ لان کی طرف بنی سیڑھیوں پر بیٹھی یوں سرد ہوا کے تھپیڑے برداشت کر رہی تھی' جیسے خزاں رت میں درخت سے گرا کوئی پتا' بھاری قدموں کا بوجھ برداشت کرتا ہے۔

دو سال ہو گئے تھے اس نے پلٹ کر زندگی کو نہیں دیکھا تھا' مگر آج' دو سال کے بعد' میکال کے غیر متوقع ایس ایم ایس اور پھر آنسوؤں نے اسے اندر سے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا دیور آیا تھا' دس سال کینیڈا میں مقیم رہنے کے بعد اسے پاکستان اور اپنے گھر والوں کی یاد آئی تھی' تاہم وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

وہ میکال سے مل کر شکستہ دلی کے ساتھ گھر واپس آئی تھی' جب اس کا سامنا اس سے ہوا تھا۔

"لو آ گئی تمہاری بھاوج' مل لو......" گھر میں قدم رکھتے ہی اسے اپنی ساس کی نخریہ آواز سنائی دی تھی اور جواب میں جس ہینڈسم سے لڑکے نے پلٹ کر حیرانی سے اسے دیکھا تھا' وہ اس کا دیور ارتج تھا۔ عائشہ اس کی حیرانی کی وجہ جانتی تھی' تبھی اس کا سر جھکتا چلا گیا تھا۔

اسی روز شام میں جب وہ رات کا کھانا تیار کر رہی تھی' وہ اس کے پاس کچن میں آیا تھا۔

"ایکسکیوزمی! اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو کیا میں کچھ دیر یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" وہ چونکی تھی تاہم اس نے پلٹ کر اسے نہیں دیکھا تھا۔

"جی ہاں۔"

"کیا بنا رہی ہیں......؟" دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے وہ قریب آیا تھا۔

"چکن بریانی۔" عائشہ نے بے حد مختصر جواب پر اکتفا کیا۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر کچن کی صلیب سے ٹیک لگاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"آپ ایک سمجھ دار' خوب صورت خاتون ہیں' یقیناً پڑھی لکھی بھی ہوں گی کیا میں جان سکتا ہوں اس کے باوجود آپ نے میرے بھائی سے شادی کرنے کا احمقانہ فیصلہ کیوں کیا؟"

عائشہ جانتی تھی وہ یہی سوال کرے گا' تبھی اس کے دل پر جیسے کسی نے چٹکی کاٹی تھی۔

"ہوں' یہ میری امی کا فیصلہ تھا اور میں ان کے فیصلے سے بغاوت نہیں کر سکی؟"

"لیکن کیوں' یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک ایب نارمل شخص ہے' بیوی کے حقوق ادا کرنا تو ایک طرف' وہ اس گھر میں آپ کو آپ کا جائز مقام بھی نہیں دلوا سکتا' اور کچھ بعید نہیں کہ رات میں سوتے ہوئے نقصان بھی پہنچا دے پھر بھی آپ کے گھر والوں نے یہ فیصلہ کیا' کیوں؟" عائشہ کو اس کے سوالات سے الجھن ہو رہی تھی مگر پھر بھی وہ اسے جواب دینے پر مجبور تھی۔ کیونکہ اسے اس گھر میں رہنا تھا' اب وہ آٹے کے کنستر سے آٹا نکال رہی تھی۔

"کیونکہ میری بڑی بہن کا رشتہ ان سے طے تھا' اور میرے بھائی کو آپ کے گھر والوں نے باہر کے خواب

دکھا رکھے تھے' میری بہن اس رشتے کے لیے راضی نہیں تھی' اس لیے اس نے اپنی مرضی سے شادی کر لی' اس شادی کے بعد میرے گھر والوں کو جہاں برادری سے بے دخل ہونے کا خدشہ لاحق ہوا' وہیں سارے خواب بھی مٹی میں ملتے ہوئے محسوس ہوئے' اسی لیے انہوں نے میری قربانی دی' تاہم مجھے اس پر کسی سے کوئی گلہ نہیں' کیونکہ یہ میرے نصیب کا لکھا ہے اور انسان نصیب کے لکھے سے کبھی نہیں بھاگ سکتا۔ ایم اے انگلش اور نفسیات کرنے کے باوجود' میں اپنی ماں کے حقوق سے آنکھیں نہیں پھیر سکتی' جس عورت نے مجھے جنم دے کر مجھے پروان چڑھایا' میری پرورش کی' اس کا یہ حق ہے کہ وہ چاہے تو مجھے کسی ایب نارمل شخص سے بیاہ دے یا پھر جان سے مار دے۔" ضبط کی ہزار کوششوں کے باوجود بات کے اختتام پر اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ ارتج کی آنکھوں میں مزید حیرانی عود آئی۔

"گڈ...... داد دیتا ہوں آپ کی فرماں برداری کی' مگر کاش آپ کو جنم دینے والی آپ کی ماں آپ کو جان سے مار دیتی' کیونکہ ہر روز کے مرنے سے ایک بار کا مرنا' کہیں بہتر ہوتا ہے۔" اس بار اس کے لہجے میں ذرا سی تلخی تھی۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔ عائشہ کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں کے دونوں قطرے کسی پکے ہوئے پھل کی طرح ٹوٹ کر اس کے گالوں پر لڑھکتے ہوئے گریبان میں جذب ہو گئے۔

ہوا کی خنکی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا مگر وہ بے حس سی وہیں بیٹھی رہی۔ اندر دوزخ جلتے ہوں تو باہر کی خنکی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس کا بھائی باہر چلا گیا تھا۔ بہن نے خفگی میں دوبارہ کبھی حال بھی پوچھنا گوارہ نہیں کیا' رہ گئی ماں تو وہ مہینے میں ایک آدھ بار چکر لگا کر اس کا حال دریافت کر جایا کرتی تھی۔

روز کھیتوں میں مشقت نے اس کے ہاتھ خاصے کھردرے کر ڈالے تھے۔ پھر بھی نم آنکھوں سے وہ اپنے ہاتھ سامنے پھیلائے جانے ان میں کیا تلاش رہی تھی۔

شاید وہ دن جب اس نے گھر کے بدترین حالات سے مجبور ہو کر پہلی بار قدم گھر سے باہر نکالے تھے اور ریاض حسن صاحب کی کمپنی جوائن کی تھی۔

وہ ایک مشفق اور مہربان انسان تھے۔ پھر ان کی بیٹی مائرہ سے اس کی بہت اچھی فرینڈشپ تھی ان کا چھوٹا بیٹا نہال بھی اسے تھوڑا بہت جانتا تھا' تبھی اسے ان کی کمپنی میں جاب مل گئی تھی اور اس جاب سے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ان دنوں گھر کے بدترین حالات کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی دنیا بھی درہم برہم تھی۔

یونیورسٹی میں جو شخص اس کا "متاع حیات" تھا' اس شخص کے والدین نے صرف اس لیے اسے قبول نہیں کیا کہ وہ اور اس کی فیملی ان کے اسٹینڈرڈ کی نہیں تھی۔ دوسری وجہ اعتراض اس کا جاب کرنا تھا۔ وہ جاب جو اس کی خوشی نہیں مجبوری تھی۔ اس کی ماں نے زندگی میں بہت دکھ دیکھے تھے' وہ اپنی ذات سے ان دکھوں کا ازالہ کرنا چاہتی تھی' اس کا بھائی بیروزگار تھا' بہن کم پڑھی لکھی تھی' ایسے میں اچانک والد کی رحلت اور اس کے بعد پے درپے آنے والے مسائل نے اسے اپنی ذات سے یکسر غافل کر دیا تھا۔

ارمغان کریم' جو اس کی پہلی محبت اور خواہش تھا' سے دستبرداری آسان نہیں تھی' کیونکہ اس کے بہت سے خوب صورت خواب اس شخص کی رفاقت سے جڑے تھے اور خوابوں کا ٹوٹنا یا ان سے دستبردار ہو جانا کتنا تکلیف دہ ہے یہ وہی جان سکتا ہے جس نے یہ اذیت سہی ہو۔ اس نے ارمغان کو چھوڑ دیا تھا مگر اس کے بارہا اصرار پر بھی وہ جاب نہیں چھوڑی تھی۔ جس سے اس کے گھر کی دال روٹی کا سلسلہ چل رہا تھا۔

وہ اپنی ماں کے لیے جان دے سکتی تھی مگر اس کی ماں اسے محض جان بھی نہیں سکی۔ مہینے کے اختتام پر آفس ٹائم کے بعد وہ مارکیٹ نکل جاتی تھی اور بچت کے سارے پیسوں سے اپنے رشتوں کے لیے ان کی ضرورت کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں خود خرید کر لاتی' جنہیں بعض اوقات

خاصے احسان کرنے والے انداز میں قبول کیا جاتا۔
شعور سنبھالنے سے لے کر اب تک اسے اپنی ذات کی تنہائی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ وہ جتنی بھی تھک کر گھر آتی' اس کے گھر والوں نے کبھی اس کا احساس نہیں کیا تھا' دل چاہتا تو کھانا کھا لیتی' نہیں تو کوئی اسے زبردستی کہہ کر کھلانے والا نہیں تھا۔ اس گھر کے دستور نرالے تھے مگر عائشہ برہان کی حساس طبیعت ان نرالے دستوروں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کر سکی تھی۔
سردی کا احساس مزید شدت اختیار کر چکا تھا' تبھی وہ اٹھ کر اندر کمرے میں آ گئی تھی۔ جہاں اس کا ''نام نہاد'' شوہر ساری دنیا سے بے خبر گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ وہ تشنہ لب سی بیڈ کے ایک کنارے پر ٹک گئی۔
اسے یاد آ رہا تھا جب وہ زخمی روح کے ساتھ دلہن بنی اس گاؤں نما شہر میں آئی تھی تو ایک عجیب سی گھٹن کا احساس' اس کی جان پر بنا رہا تھا۔ مختلف سوچیں تھیں جو ذہن کا گھیراؤ کیے ہوئے تھیں۔ پتا نہیں کس شخص کے ساتھ اس کا نصیب پھوڑا گیا ہوگا' پتا نہیں وہ دیکھنے میں کیسا ہوگا؟ شدید تھکن کے ساتھ یہ اذیت ناک خیالات اسے اور بھی نڈھال کر رہے تھے' اپنی ماں کی خوشی کے لیے اس نے قربانی تو دے دی تھی مگر پتا نہیں وہ اس قربانی کی لاج بھی رکھ پائے گی کہ نہیں' یہی خدشہ اسے پریشان کیے ہوئے تھا' جس وقت اسے کمرے میں لے جایا گیا تب تک اس کی الجھن برقرار رہی تھی تاہم جس وقت کوئی کمرے میں داخل ہوا' پھر بنا دروازہ لاک کیے اس کے پاس بیڈ پر بیٹھا اور بنا کسی سلام دعا کے فٹ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر جب اس شخص نے اس سے پوچھا۔
''تم میری دلہن ہو ناں......؟'' تب وہ برف ہو گئی۔
فوراً سے پیشتر نظر اٹھا کر اس نے اپنے سامنے بیٹھے اپنے مجازی خدا کو دیکھا تھا' گہری سانولی رنگت' بڑے باہر کو آتے پیلے دانتوں نے اسے ابکائی پر مجبور کر دیا تھا' بال بہت میلے تھے اور دلہا ہونے کے باوجود اس شخص کی گردن پر جو سیاہی تھی' وہ سیاہی اسے اپنی ساری زندگی پر محیط نظر آ رہی تھی۔
اس کا دل چاہا وہ خوب ہنسے یا پھر اپنے نصیب کی سیاہی پر کسی کے گلے لگ کر خوب روئے۔
''اماں کہتی ہیں تم میری دلہن ہو' اماں ٹھیک کہتی ہیں ناں؟''
''ہاں۔'' بہت دیر کے بعد ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے لبوں نے جنبش کی تھی پھر فوراً اٹھ کر لباس تبدیل کر لیا۔ رات بھر شدت سے روتے ہوئے وہ اپنے پہلو میں لیٹے شخص کے خراٹوں سے بیزار رہی تھی۔
اگلے ایک ہفتے کے بعد اس شخص کو اپنے نصیب کا لکھا سمجھ کر وہ کسی بچے کی مانند اسے ٹریٹ کر رہی تھی۔ سب سے پہلا کام جو اس نے اس شخص سے کروایا تھا وہ ٹوتھ برش کا استعمال تھا۔ باتھ لینے میں بھی وہ اس کی مدد کرتی تھی' تبھی وہ کسی حد تک دیکھنے لائق ہو گیا تھا۔
ابھی یہ امتحان جاری تھا کہ اس روز اس کی ساس نے اسے نیا حکم سنا دیا۔
''بہو' ایک ماہ ہو گیا ہے تمہاری شادی کو' ہم نے گھر کے کام کاج کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا تم سے' اب تم اس گھر کی بیٹی ہو' زمینوں کے کام کاج میں بھی دل چسپی لو' سب کچھ ملازمین پر چھوڑ کر نہیں بیٹھ سکتے۔''
اس کے پاس سوائے ان کے حکم پر سر جھکانے کے اور کوئی جواب نہیں تھا۔ صبح ناشتہ کیے بغیر وہ گھر سے نکلتی تھی اور شام گئے تھکن سے چور بدن کے ساتھ گھر واپس لوٹتی تھی۔ گزرے دو سالوں میں کیا کچھ برداشت نہیں کیا تھا اس نے' مگر 'شکوہ' نام کی کوئی چیز کبھی اس کے لبوں پر نہیں آئی تھی۔ تاہم اب اریج کی اس گھر میں آمد نے اسے بہت ڈسٹرب کر کے رکھ دیا تھا۔

⦿ ...... ⦿ ...... ⦿

وہ سو کر اٹھا تھا' ہانیہ کمرے میں نہیں تھی۔
تکیہ بانہوں میں دبا کر کچھ دیر وہ سستی سے پڑا رہا' پھر اٹھ کر فریش ہونے کے بعد نیچے ہال میں چلا آیا۔ جہاں

قریب ہی کچن میں سارہ اور مائرہ اسی ٹاپک پر بات کررہی تھیں۔

"میکال بھائی اس شادی پر خوش نہیں ہیں' کل رات بھی گھر سے باہر رہے ہیں۔" مائرہ کہہ رہی تھی' تبھی سارہ بول اٹھی۔

"میکال بھائی خوش نہیں ہیں تو ہانیہ بھابی کون سی خوش ہیں' ویسے بھی وہ نہال بھائی میں زیادہ انٹرسٹڈ تھیں' صفدر انکل نے زبردستی انہیں اس شادی کے لیے مجبور کیا ہے' بڑی زیادتی ہوئی ہے نہال بھائی اور ہانیہ بھابی کے ساتھ بھی۔"

"تمہیں کیسے پتا کہ نہال بھائی ہانیہ بھابی میں انٹرسٹڈ تھے؟" مائرہ چونکی تھی اور اس سے زیادہ شاید وہ ٹھٹک گیا تھا۔

"سمیر بھائی سے پتا چلا' کل رات وہ نہال بھائی کے کمرے میں ان سے اسی ٹاپک پر بات کررہے تھے' ہانیہ بھابی کے کلاس فیلو ہیں ناں نہال بھائی۔"

"اگر ایسی بات تھی تو نہال بھائی کو اسٹینڈ لینا چاہیے تھا۔"

"لیا تھا انہوں نے' انکل اور آنٹی سے بات بھی کی تھی' مگر انہوں نے ان کی بات کو اہمیت نہیں دی' ابھی وہ پڑھ رہے ہیں ناں' اس لیے۔" دونوں اپنی باتوں میں مگن تھیں اور شاید دونوں کو ہی اس کی آمد کی خبر نہیں تھی' میکال کو لگا جیسے اس کی آنکھوں میں دھواں بھر گیا ہو۔ کیا یہ سب اسی کی زندگی میں ہونا ضروری تھا؟ شام ڈھلے دن بھر کی آوارہ گردی کے بعد قدرے تھک کر اس نے قدم دوبارہ گھر کی دہلیز پر دھرے تھے۔ گھر میں اب بھی کچھ مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ولیمے کی تقریب تھی' ہانیہ صفدر کو ایک بار پھر دلہن بنا دیا گیا تھا تاہم اس سے کسی نے بھی بات نہیں کی' وہ خود بھی کسی سے بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا' تبھی چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

ہانیہ نے صرف ایک بار سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا پھر چپ چاپ سر جھکا لیا' سارہ اور مائرہ میکال کی کمرے میں آمد کے بعد فوراً وہاں سے کھسک گئی تھیں۔

میکال کچھ دیر لب بھینچے ہوئے اپنے اندر اٹھتے طوفان کو ضبط کرنے کی کوشش کرتا رہا' پھر کچھ سوچتے ہوئے بیڈ پر اس کے پاس آ بیٹھا۔

"السلام علیکم۔" ہانیہ اس کے سلام کا جواب دینا نہیں چاہتی تھی پھر بھی اس نے سر اٹھایا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" اٹھ مار جواب پر وہ کچھ دیر لب بھینچے خاموش بیٹھا رہا پھر بولا۔

"آج ہماری شادی کا دوسرا دن ہے' اس لیے میں کچھ باتیں آپ کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اصل میں مس ہانیہ' میں اس شادی کے لیے ایک فیصد بھی تیار نہیں تھا' یوں سمجھیے میرے والدین نے زبردستی مجبور کرکے یہ پھندا میرے گلے میں فٹ کیا ہے' میں عائشہ برہان میں انٹرسٹڈ تھا' عائشہ برہان میری پہلی محبت' میرا پہلا خواب' میری پہلی خواہش اور میری زندگی میں آنے والی پہلی آئیڈیل لڑکی ہے' بدقسمتی سے ہماری شادی نہیں ہوسکی مگر پھر بھی میں اس کے ہر پل میں موجود ہوں' اور وہ...... وہ میری ہر سانس میں موجود ہے' میں دھوکے باز' منافق انسان نہیں ہوں اس لیے یہ سب کچھ آپ کو صاف صاف بتا رہا ہوں' میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے نہ کوئی پیار' نہ عہد' نہ مقام' اس گھر میں آپ کسی کی بہو یا بیٹی بن کر تو رہ سکتی ہیں' بیوی بن کر نہیں' کیونکہ میں اپنا پیار اپنی پہلی محبت پر نچھاور کرچکا ہوں' اب آپ چاہیں تو یہاں اس گھر میں رہ سکتی ہیں' اور اگر چاہیں تو یہاں سے جاسکتی ہیں' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اچھی طرح دل کا غبار نکالنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ہانیہ صفدر کو لگا شاید اب وہ زندگی میں کبھی اپنا سر اوپر نہیں اٹھا سکے گی' اسے یکلخت اپنی گردن پر بے تحاشا بوجھ محسوس ہوا تھا۔ یہ سب باتیں جو اس نے اس سے کہی تھیں وہ یہ سب باتیں پہلے سے جانتی تھی مگر کاش اس وقت اس شخص نے اس سے یہ سب باتیں نہ کہی ہوتیں۔

گلے میں ایک دم سے آنسوؤں کا پھندا لگا تھا۔

میکال کمرے سے نکل گیا' وہ چپ چاپ بیٹھی حنائی ہاتھوں پر آنسوؤں کے انمول موتی گراتی رہی' جانے کیوں اس لمحے اسے پروین شاکر کی وہ نظم شدت سے یاد آرہی تھی۔

میں وہ بدنصیب دلہن ہوں
جسے شادی کی پہلی رات
کوئی گھونگھٹ اٹھا کے یہ کہہ دے
میرا سب کچھ تمہارا ہے
"سوائے دل کے"

کسی کی شخصیت اور عزت نفس کی بھلا اس سے بڑھ کر توہین اور کیا ہوتی تھی؟ ولیمہ کی تقریب میں بھی وہ اس سے کھچا کھچا سا رہا تھا۔

"ہانی تم ٹھیک ہو ناں؟" اسے پتھر کے مجسمے کی مانند خاموش بیٹھے دیکھ کر بادیہ فوراً اس کے پاس آئی تھی۔

"ہوں' مجھے کیا ہونا ہے؟"

"کیا تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟"

"نہیں۔"

"تو پھر ٹھیک سے بات کیوں نہیں کررہیں' میکال بھائی نے کچھ کہا تو نہیں ناں؟"

"نہیں۔"

"فارگاڈ سیک ہانی پلیز' تم اندازہ نہیں کرسکتیں تمہاری وجہ سے میں کتنی پریشان ہوں؟"

"کیوں؟"

"کیا مطلب کیوں' میری دوست ہو تم' اگر تم خوش نہیں ہو تو میں......"

"اتنی بکواس کافی ہے' مزید سننے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں' تم لوگوں نے مل جل کر میرے ساتھ جو کیا ہے اس کے لیے میں کبھی تم میں سے کسی کو بھی معاف نہیں کروں گی' مگر...... یہ بندی جو زبردستی تم لوگوں نے میرے گلے میں فٹ کی ہے' میں اسے نگل کر دکھاؤں گی' تم لوگوں کو مجھ پر ہنسنے کا مزید موقع نہیں ملے گا۔"

"ہانی...... تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو' ہم کیوں ہنسیں گے تم پر' ہم سب نے تو تمہاری خوشی کے لیے......"

"جسٹ شٹ اپ اوکے۔" لہو رنگ آنکھوں کے ساتھ اس بار وہ غرائی تھی۔ بادیہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا' شدید پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اب خاصی رنجیدہ بھی تھی مگر دلہن بنی ہانیہ کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اس نے سوچ لیا تھا کہ آگے اب اسے کیا کرنا ہے۔

◉ ..... ◉ ..... ◉

ائرپورٹ کی عمارت کے باہر ہاتھ باندھے کھڑا وہ گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے ہوئے تھا جب ثانیہ کی نگاہ اس پر پڑی اور وہ جیسے وہیں ساکت رہ گئی۔

پورے پانچ سال کے بعد وہ یوں بالکل اچانک کبھی سامنے آجائے گا' اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ دل تھا کہ جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔ بڑی مشکل سے رخ پھیر کر' کپکپاتی انگلیوں سے اس نے اپنی دادو کا موبائل نمبر پریس کیا تھا جب جواب میں بھاری مردانہ آواز اس کی سماعتوں میں اتری۔

"جی میڈم' اگر آپ لاہور ائرپورٹ پہنچ چکی ہیں تو براہ کرم باہر تشریف لے آئیے' میں آپ کا منتظر کھڑا ہوں۔"

ثانیہ کو اس آواز پر بھی اس کے لہجے کا گمان ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اسے دیکھے تبھی جلدی جلدی ٹرالی گھسیٹتی وہ ائرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل آئی۔ ایک مرتبہ پھر اس کی انگلیاں وہی نمبر پریس کررہی تھیں۔

"ہیلو...... میں عمارت سے باہر کھڑی ہوں' رائیٹ سائیڈ پر جو......" ابھی وہ اسے بتا ہی رہی تھی کہ وہ سیل فون کان سے لگائے اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"ایکسکیوزمی۔" وہ پلٹی تھی اور اس بار زمین زائر ملک کے پیروں تلے سے کھسک گئی تھی۔

"دو پتر اناراں دے......
ساڈا دکھ سن کے روندے پتھر پہاڑاں دے"

گاؤں کے باباجوگی کی آواز پورے کرب کے ساتھ

اس کی سماعتوں میں ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

"ثانیہ......" جانے کیسے اس کے لب حرکت کر پائے تھے مگر سامنے کھڑی اس لڑکی نے فوراً سے پیشتر آنکھوں پر گلاسز چڑھا کر گاڑی کا بیک ڈور کھول لیا۔

"اگر تم دادی ماں کے بھیجے گئے ڈرائیور ہو تو فوراً سے پیشتر سامان گاڑی میں رکھ کر چلو۔" کوئی شناسائی نہیں تھی اس کے لہجے میں...... وہ بمشکل خود کو سنبھال کر سامان گاڑی کی ڈگی میں منتقل کرتا ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

"بچے کہاں ہیں......؟" اگلے ہی پل گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا مگر وہ اسے بنا کوئی جواب دیئے اپنے سیل فون پر تیزی سے کچھ ٹائپ کرنے لگی کچھ ہی دیر میں اس کا سیل بج اٹھا تھا۔

"ہوں اشعر...... جی میں پہنچ گئی ہوں پاکستان...... جی جی میں اپنا خیال رکھوں گی آپ بھی اپنا اور بچوں کا خیال رکھیے گا...... جی ٹھیک ہے اللہ حافظ۔" کال بک کرتے ہی اس نے تیز لہجے میں کسی کو اطلاع دی اور سیل مٹھی میں دبوچ لیا۔

زائر نہیں جانتا تھا کہ اس نے کس سے بات کی ہے مگر اسے برا ضرور لگا تھا۔ حویلی پہنچنے تک دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی تھی وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے اسے جانتی ہی نہ ہو۔

لانگ شرٹ کے ساتھ کھلے پائنچوں والے ٹراؤزر میں ملبوس اس وقت وہ دوپٹے اور حیا دونوں سے بے نیاز تھی۔ زائر نے ایک آخری نظر اس پر ڈالنے کے بعد خاصے زوردار جھٹکے سے حویلی کے مین گیٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔ جہاں اس وقت گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کا جم غفیر اس "جل پری" کا دیدار کرنے کے لیے جمع تھا۔ بڑی ہیل کے سیاہ جوتوں کے ساتھ جیسے ہی وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی گاؤں کی عورتیں یوں اس پر پل پڑیں جیسے وہ کوئی نکاح کی تقریب میں بٹنے والا چھوارا یا ننھے منے بچوں میں برات کے وقت لٹایا جانے والا کوئی دس کا نوٹ ہو۔

خود زائر کے لیے بھی یہ صورت حال خاصی غیر متوقع تھی تبھی اس نے سرعت سے گاڑی سے نکلنے کے بعد لوگوں کو پیچھے ہٹا کر ثانیہ کے لیے رستہ بنایا اور پھر بنا اس کے ردعمل کی پروا کیے اس کا موی ہاتھ تھام کر تیزی سے حویلی کے کھلے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

چوہدرانی صاحبہ بے تابی سے ان دونوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ ثانیہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر سرعت سے واپس پلٹ آیا۔ برقی قمقموں سے جگمگاتی اس حویلی میں اس وقت شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چوہدرانی کو بتا کر اگلے تیس منٹ کے بعد وہ دوسرے گاؤں میں اپنے چھوٹے سے گھر کے دروازے پر کھڑا دستک دے رہا تھا۔ اس کی زوردار دستک کے جواب میں دروازہ کھولنے والی اس کی ماں تھی۔

"السلام علیکم اماں۔"

"وعلیکم السلام جیتا رہ۔" دروازہ کھلا چھوڑ کر اس کی ماں سائیڈ پر ہوگئی تھی۔

"ماں صدقے جائے اس بار بڑے دن لگا دیئے تو نے سب خیر تو تھی ناں؟"

"ہاں اماں خیر ہی تھی وہ چوہدرانی کی پوتی آئی ہے باہر سے اسی کو لینے ائرپورٹ جانا تھا اسی لیے چوہدرانی صاحبہ نے نہیں آنے دیا تجھے تو پتا ہے وہ کتنا انحصار کرتی ہے مجھ پر۔"

صحن میں بچھی واحد چارپائی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے کے بعد وہ فوراً ہینڈ پمپ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ شدید تھکن اور گرمی نے برا حال کر چھوڑا تھا۔ اماں اب اس کی تائید میں سر ہلا رہی تھیں۔

"ہاں یہ بات تو ہے اللہ کا خاص کرم ہے مجھ پر ماشاء اللہ سے میرا بیٹا بہت لائق ہے۔"

زائر کے ہاتھ تیزی سے ہینڈ پمپ چلاتے ہوئے ٹھنڈا پانی نکال رہے تھے۔ اس کی بات پر خوش ہوتے ہوئے اماں اب باورچی خانے میں چلی گئی تھیں وہ وہیں ہینڈ پمپ کے قریب بیٹھ کر کپڑوں سمیت نہانے میں مشغول ہوگیا۔ اچھی طرح نہانے کے بعد اس نے اندر کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔

اماں اس کی اس عادت سے بہت خائف تھیں مگر اس کا بچپن سے یہی معمول تھا کپڑے بدل کر جس وقت وہ باہر چارپائی پر آ کر بیٹھا اماں اس کے لیے کھانا نکال لائی تھیں چنے کی دال اور کدو کا سالن بنا تھا۔ اسے یہ سالن پسند نہیں تھا مگر بھوک کے شدید احساس کے زیر اثر اس نے سامنے پڑی تندوری روٹی کے نوالے توڑنے شروع کر دیئے تھے تبھی سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ ابھری تھی۔

"بوا میں نے سارے کپڑے اتار لیے ہیں مگر وہ زائر کی شرٹ ساتھ والوں کی چھت پر......" اپنے دھیان میں بولتی وہ آ رہی تھی کہ اچانک سیڑھیوں کے وسط میں ٹھٹک گئی۔ پتھر ہوئے زائر کی نگاہیں اسے ازحد حیرانی سے دیکھ رہی تھیں جبکہ اس کا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔ کیسا دن چڑھا تھا آج کہ شاک پر شاک لگ رہے تھے۔

اماں اس کی کیفیت بھانپ کر اب اسے بتا رہی تھیں۔

"پچھلے جمعے آئی تھی سائرہ تیرے ابا جا کر لائے ہیں اسے موئے سسرال والوں نے بالکل ہی بچی کو لاوارث سمجھ لیا بہت گھمنڈ ہے انہیں اپنی دولت پر میں نے فیصلہ کر لیا ہے اب سائرہ اس گھر میں دوبارہ نہیں جائے گی۔"

اماں کی آواز نے اس کا طلسم توڑا تھا۔ زائر نے سر جھٹک کر نوالہ دوبارہ کٹوری میں رکھ دیا۔ شدید بھوک کا احساس اچانک ہی ختم ہوگیا تھا۔

"روٹی اٹھا لے اماں مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"زائر......" اس کے اٹھ کھڑے ہونے پر اماں نے پکارا تھا مگر...... وہ سنی ان سنی کرتا بیرونی دروازہ کھول کر گھر سے باہر نکل گیا گاؤں کے بابا جوگی کی آواز پورے کرب کے ساتھ اس کی سماعتوں میں ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

"دو پتر اناراں دے......

ساڈا دکھ سن کے روندے پتھر پہاڑاں دے"

⊙ ...... ⊙ ...... ⊙

وہ چار سال کا تھا جب ایک روز اماں اس کی انگلی پکڑ کر اسے سائرہ کے والد ماسٹر افضل صاحب کی کلاس میں شیشم کے اس گھنے پیڑ کے تلے چھوڑ آئی جہاں گاؤں کے دیگر بچے جمع ہو کر ماسٹر افضل صاحب سے درس لیا کرتے تھے۔

ماسٹر افضل رشتے میں اس کی اماں کے سگے ماموں زاد بھائی تھے۔ ان کی بیوی سائرہ کے بچپن میں ہی ہیضہ کی شکار ہو کر چل بسی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اماں نے اس چھوٹی سی بچی کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ سارا دن انہی کے گھر کھیلتی پھر شام میں ماسٹر صاحب اسے لینے آ جاتے تو ان کے ساتھ اپنے گھر سونے کے لیے چلی جاتی۔

زائر کو وہ شروع سے ہی بہت اچھی لگتی تھی یہی وجہ تھی کہ دونوں فرصت کے تمام لمحات ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے۔ سائرہ کے بڑے ہونے پر اس کی گھریلو ذمہ داریوں نے اس کا زائر کے گھر آنا جانا کم کر دیا تو وہ جیسے تڑپ کر رہ گیا۔ اسے سائرہ کے ساتھ کی عادت ہو چکی تھی لہٰذا اس نے خود ماسٹر صاحب کے گھر جا کر ان کے گھر کے کاموں میں (جو پہلے ماسٹر صاحب خود سرانجام دیا کرتے تھے) سائرہ کی مدد کرنی شروع کر دی۔

ایک دوسرے کے احساس کا یہ جذبہ بڑھتے بڑھتے کب محبت کا روپ دھار گیا انہیں خبر ہی نہ ہو سکی پتا تو اس روز چلا جب ایک شام زائر نے ماسٹر صاحب کو اماں سے ان دونوں کی شادی کی بات سنی مارے خوشی کے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے سائرہ اس کے لیے کسی نشے سے کم ہرگز نہیں تھی۔ اس روز اس نے پہلی بار گھر سے پیسے چرا کر سائرہ کے لیے رنگ برنگی خوب صورت چوڑیاں خریدی تھیں کیونکہ سائرہ کو چوڑیاں بہت پسند تھیں۔

زائر نے اسے چوڑیاں دیتے ہوئے اپنے اور اس کے درمیان قائم ہونے والے رشتے کا بھی بتا دیا تھا اور

حسب توقع وہ بھی خوش ہوئی تھی۔ اب اکثر وہ اسے تنگ کرنے لگا تھا۔ کبھی اس کے ساتھ برتن دھلاتے ہوئے چپکے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا' تو کبھی ماسٹر صاحب کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے نظر بچا کر اس کے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ دیتا' ایک دو بار اس نے غیر اخلاقی حرکت کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر سائرہ نے سختی سے اسے ڈپٹ کر رکھ دیا۔ زندگی بے حد خوب صورت اور خوش گوار بسر ہو رہی تھی کہ اچانک اسے میٹرک کے بعد مزید تعلیم کے لیے شہر کے ہوسٹل میں قیام کرنا پڑا اور پیچھے جیسے اس کی دنیا ہی بدل گئی۔

دو سال کے صبر آزما کڑے انتظار کے بعد وہ شاندار نمبروں سے ایف اے کرکے گاؤں واپس لوٹا تو اس کے خطوط کے جواب گول کرنے والی سائرہ افضل نے اس کے ساتھ شادی سے ہی صاف انکار کردیا۔

زائر کے شدید دکھ اور اصرار پر اس نے بتایا تھا کہ اس کے زندگی کے لیے چند خواب ہیں جن پر وہ کبھی سمجھوتہ نہیں کرسکتی۔ اسے بہترین گھر' گاڑی اور بہت ساری دولت چاہیے تھی جو گاؤں کے نمبردار کا آوارہ بیٹا اسے مہیا کرنے کو تیار بیٹھا تھا۔

اس نے زائر سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ صرف محبت پر اکتفا کرنے والی لڑکی نہیں ہے۔ نہ ہی اس میں اتنی ہمت اور صبر ہے کہ وہ ساری زندگی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترس ترس کر گزار دے۔ زائر کا مان ٹوٹا تھا' سائرہ کے اجنبی لہجے اور عجیب وغریب فرمائش نے اس کی حسرتوں کا خون کیا تھا مگر پھر بھی اس نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے یہ سب چیزیں دے گا بس وہ تھوڑا سا انتظار کرلے مگر سائرہ نے اسے چھوٹ نہیں دی۔

اس نے یہ کہہ کر اپنی دہلیز سے رخصت کردیا کہ وہ شہر جائے اور جا کر وہ سب چیزیں جو اس کا خواب ہیں حاصل کرنے کی کوشش کرے تبھی ان دونوں کی شادی ممکن ہوسکے گی بصورت دیگر نمبردار کے بیٹے کی آفر بری نہیں ہے۔ وہ اس کی دہلیز سے پلٹ آیا تھا' بے حد شکستہ اور رنجیدہ۔

ماسٹر افضل اکلوتی بیٹی کی ضد کے سامنے قطعی لاچار ہو کر رہ گئے تھے۔ جبکہ اس کی اپنی ماں سائرہ کو لعن طعن کرتی نہیں تھکتی تھی۔ زائر کا باپ ان دنوں دوسرے گاؤں میں چوہدریوں کے گھر کا منشی تھا اور حویلی میں ان کی قدر ایسے ہی کی جاتی تھی جیسے وہ حویلی کا ہی کوئی فرد ہو۔

صرف اپنی محبت کو پانے کے لیے وہ ماں سے مزید تعلیم کی ضد کرکے دوبارہ شہر چلا آیا اور یہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ راتوں رات امیر بننے کے جنونی خواب نے اسے بگڑے ہوئے لڑکوں کے ٹولے کا حصہ بنادیا۔

ہر طرح کی غلط کاریوں میں ملوث ان لڑکوں نے اسے راتوں رات امیر بننے کے لیے جس شارٹ کٹ راستے کی ترغیب دی' اس راستے کی پہلی سیڑھی پر ہی اس کا ٹکراؤ ثانیہ عباس سے ہوا تھا اور یہیں سے اس کی زندگی میں ایک نئی دل چسپ کہانی نے جنم لیا تھا۔

⦿ ...... ⦿ ...... ⦿

ایک دن نام تیرا......
خواب کی طرح آنکھ میں بسایا تھا
آج تک نیند کو ترستے ہیں......!

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی وہ اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دے رہی تھی جب دروازے پر بیل ہوئی' جلدی جلدی واچ پہنتے ہوئے اس نے موبائل اٹھایا اور کمرے سے نکل آئی۔

ابھی تھوڑی دیر بعد اسے اپنی دوست سعدیہ کے گھر سالگرہ کی تقریب میں جانا تھا۔ سعدیہ کے فون پر فون آرہے تھے' اس نے لاسٹ کال پر ڈرائیور بھجوانے کے لیے کہا تھا اور اب دروازے پر ہونے والی ڈور بیل کی آواز سن کر وہ سرعت سے دروازے کی طرف آئی تھی۔

''کون......'' دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے سرسری سا پوچھا تھا۔ جب آواز آئی۔

''زائر ملک۔''

''آ گئے تم' پچھلے بیس منٹ سے تیار ہو کر بیٹھی ہوں

اور وہ تمہاری مالکن شہزادی فون پر فون کیے جارہی ہے یہ نہیں کہ تمہیں جلدی پہنچنے کی ہدایت کردے۔"

وہ اسے سعدیہ کا ڈرائیور سمجھ رہی تھی تبھی بنا سوچے سمجھے شروع ہوگئی تھی۔ دوسری طرف اسے دو ہفتوں سے ٹیلی کرتے زائر ملک نے قدرے حیران ہوکر اسے پیچھے دھکیلا اور تیزی سے فلیٹ میں داخل ہوکر دروازہ لاک کردیا۔

"نہ میری کوئی مالکن ہے، نہ میں کسی کا ملازم ہوں' میرا مقصد اس وقت اس گھر کا صفایا کرنا ہے' شرافت سے بنا چوں چراں کیے سب کچھ نکال کر ٹیبل پر رکھتی جاؤ' نہیں تو اس پسٹل کی ساری گولیاں تمہارے وجود میں اتار دوں گا۔"

قطعی رف حلیے میں ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ اس پر پسٹل تانے کہتا وہ اسے ساکت ہی تو کر گیا تھا۔ ثانیہ عباس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یوں لوٹی جاسکتی ہے' اس کے خوب صورت چہرے کا رنگ پل میں سفید پڑ گیا تھا۔ زائر ملک کی ہدایت کے عین مطابق اس نے سب سے پہلے اپنا موبائل فون کپکپاتے ہاتھوں سے میز پر رکھا' پھر دونوں کلائیوں سے گولڈ کے خوب صورت نفیس کڑے اتارے' کانوں میں پہنی گولڈ کی ہلکی پھلکی بالیاں اتار کر میز پر رکھیں' اس کا پرس ابھی صوفے پر پڑا تھا' اس نے وہ بھی اٹھا کر اس کے حوالے کردیا۔

"اس وقت میرے پاس یہی کچھ ہے۔" اس کی آواز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت ڈر گئی ہے۔ زائر گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا اس کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تھا' تبھی وہ تڑپ کر پیچھے لپکی تھی۔

"دیکھئے میں سچ کہہ رہی ہوں' میرے پاس جو کچھ بھی تھا میں آپ کے حوالے کرچکی ہوں' مزید اب کچھ بھی نہیں ہے۔"

"شٹ اپ" اس کے منمنانے پر وہ دہاڑا تھا کیونکہ اس کے پاس اس لڑکی سے متعلق مکمل معلومات تھیں۔ وہ باہر سے آئی تھی اور اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ اس شاندار لگژری فلیٹ میں رہتی تھی۔ زائر نے اسے دو ہفتے پہلے ایک ریسٹوران میں دیکھا تھا اور پھر شادی کی ایک تقریب میں' وہ ہر جگہ بہترین لباس کے ساتھ قیمتی جیولری سے لدی پھندی ہوتی تھی' تبھی اپنے دوست کی انویسٹی گیشن پر ففٹی پرسنٹ شیئر کے لیے وہ بلاخوف وخطر اس کے فلیٹ میں گھس آیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت اس کی ملازمہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی' تبھی اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔

اپنی محبت کو پانے کے لیے فی الوقت وہ کچھ بھی کرسکتا تھا یہاں تک کہ اس لڑکی کا خون بھی' مگر...... اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔

لڑکی اب اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

"دیکھیے میرے لیے دولت کی کوئی وقعت نہیں ہے' پپ...... پلیز اب آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

مگر وہ اس کی التجا کو قطعی نظر انداز کیے اب وارڈ روب کھول رہا تھا' کچھ دیر اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر چیک کرنے کے بعد اس کے ہاتھ ایک جیولری کا ڈبا لگا تھا' جسے دیکھنے کے بعد اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکان بکھر گئی۔

"نہیں پلیز' اسے رکھ دیں' یہ میری ماما کی نشانی ہے پلیز۔" وہ تڑپ کر اس کے سامنے آئی تھی' مگر زائر نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"شٹ اپ۔"

"پلیز میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں' یہ میری مما کی واحد نشانی ہے میرے پاس' اسے واپس کردیں' پلیز۔" اب وہ بری طرح رو رہی تھی۔ زائر دروازے کی چوکھٹ پر پہنچ کر رکا تھا' وہ لڑکی اب اس کے پیروں میں گرنے کا سوچ رہی تھی' تبھی اس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر جیسے ایکدم سے اس کا ارادہ بدل گیا۔

"ٹھیک ہے یہ لو۔" پلٹ کر تحمل سے کہتے ہوئے اس نے جیولری بکس اس کی طرف بڑھایا تھا' ثانیہ عباس آنکھوں میں آنسو لیے حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے وہ ڈبا تھاما تھا جب اس نے فوراً سے پیشتر اس کا بازو تھام لیا۔

"تمہیں یہ جیولری چاہیے ناں' ٹھیک ہے رکھ لو مگر بدلے میں مجھے بھی کچھ چاہیے۔" اس بار اس کے الفاظ سے زیادہ اپنے جسم پر پھسلتی اس کی نگاہوں نے اسے سہما دیا تھا۔

"نہیں' تم ایسا کچھ نہیں کرسکتے میرے ساتھ۔"

خوف کے ساتھ ساتھ اس نے غصہ دکھانے کی کوشش بھی کی تھی' مگر زائر ملک نے پروا نہیں کی' ثانیہ عباس کے احتجاج کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اب وہ اسے اپنی طاقت دکھا رہا تھا۔ ثانیہ کی کلائی میں پڑی کانچ کی ساری چوڑیاں ٹوٹ کر قالین پر بکھر چکی تھیں۔ جبکہ اس کا میک اپ سے دمکتا چہرہ اب کھنڈر عمارت کا نقشہ پیش کررہا تھا۔

وہ ساری عمر ابروڈ رہی تھی مگر پھر بھی اسے اللہ کی قائم کردہ حدود کا پاس تھا جبکہ دوسری طرف اسلامی مملکت میں پلنے بڑھنے والے اس شخص کے ماں باپ کی سالوں کی اچھی تربیت پر اس کے برے دوستوں کی چند روزہ بری صحبت اپنا اثر دکھا رہی تھی۔

گناہ کبیرہ کی بھینٹ چڑھتے اس طوفان کو کسی طور ٹلتے نہ دیکھ کر اس نے اس کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔

"مم میری بات سنیں پلیز...... خدا کا واسطہ ہے آپ کو مجھ پر ترس کھائیں' میں بہت دکھی لڑکی ہوں۔"

"جسٹ شٹ اپ اوکے' بہت خطرناک آدمی ہوں میں' میرا دماغ خراب مت کرو۔" اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے وہ غرایا تھا' تبھی وہ سسک اٹھی۔

"میں جانتی ہوں' آپ یہاں صرف سب کچھ لوٹنے آئے ہیں' مگر...... میری عزت کوئی فالتو سامان نہیں ہے' آپ مسلمان ہیں' اللہ کی قائم کردہ حدود کی خلاف ورزی کرکے آپ اس پاک ذات کے غضب سے نہیں بچ سکیں گے۔"

زائر کے دل پر چوٹ پڑی تھی مگر دماغ اتنا ماؤف تھا کہ اس کے لیے اس وقت جیسے خود کو سنبھالنا ممکن ہی نہیں

پیارے بھائی' بھتیجوں کے نام

جن کی یاد سے دل کا اک اک گوشہ مہکتا ہے
جن کے لیے مانگی گئی دعاؤں کے بھیگے پھولوں سے
ہتھیلیاں بھری رہتی ہیں مگر جن کو دیکھنے کے لیے
آنکھیں پل پل ترستی ہیں......

درد کا سلسلہ مسلسل ہے
ضبط کا حوصلہ مسلسل ہے
زندگی بے ثبات لگتی ہے
وقت ٹھہرا ہوا مسلسل ہے
وہ مجھے چھوڑ گیا ہے لیکن
دعا کا رابطہ مسلسل ہے
کتاب زندگی اب تو
دکھوں کا حاشیہ مسلسل ہے
پاس اتنا کہ مثلِ رگ جاں ہے
دور اتنا کہ اک فاصلہ مسلسل ہے
زندگی تھک کے ہار بیٹھی ہے
موت کا قافلہ مسلسل ہے
چراغ محبت بجھانے کو
سازشوں کی ہوا مسلسل ہے
سامنے ہے مگر نگاہ پیاسی
دل میں اک کربلا مسلسل ہے
تم سے بچھڑی تو یہ یقین آیا
عشق کا عارضہ مسلسل ہے
قلم یاد سے صحیفہ دل پر
لفظ اک ہی لکھا مسلسل ہے
لوٹ آؤ گے سرِ شام کبھی
دل کو اک آسرا مسلسل ہے

ام ثمامہ...... جھنڈو' سندھ

رہا تھا۔

ثانیہ اب اس کے سامنے ڈوپٹے سے بے نیاز بیٹھی تھی۔

''آپ میرے لیے کچھ بھی مت کریں' مگر اللہ کے لیے تو کر سکتے ہیں ناں' اسی اللہ کا واسطہ ہے آپ کو' مجھے گنہگار مت کریں' اگر آپ نے میری بربادی کی قسم کھا ہی لی ہے تو پلیز مجھ سے نکاح کرلیں پھر اس کے بعد چاہے فوری طلاق دے دیجیے گا میں گلہ نہیں کروں گی' پلیز۔'' ٹپ ٹپ ٹپ' اس کی آنکھوں سے آنسو یوں گر رہے تھے جیسے ساون کی جھڑی لگی ہو۔ زائر ازحد ڈسٹرب ہوکر چلا اٹھا۔

''بکواس بند کرواپنی' نہ میں ایسی فضولیات میں پڑنا چاہتا ہوں' نہ تم میرے لیے اتنی اہم ہو کہ میں تم سے ایسا کوئی تعلق جوڑتا پھروں۔''

''مم' میں جانتی ہوں' میں نہیں ہوں' مگر اللہ تو ہے ناں' اس کی رضا کے لیے' اس کے عذاب سے بچنے کے لیے کرلیں' پلیز۔''

اس کے آنسوؤں میں' اس کی التجاؤں میں کچھ ایسا تھا کہ جس نے اسے بے چین کرکے رکھ دیا تھا۔ جانے کیا سوچ کر وہ اٹھا تھا اور اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر اس میز تک لے آیا جہاں اس گھر سے برآمد ہونے والا سامان رکھا تھا' وہ سب سامان وہاں سے اٹھا کر اسے اسی طرح بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے وہ نیچے اپنی گاڑی تک لایا اور اگلے ہی پل اسے گاڑی میں دھکیل کر' فرنٹ سیٹ پر بیٹھے اپنے دوست کے ساتھ آ بیٹھا۔

''مجھے اس لڑکی سے نکاح کرنا ہے ابھی اور اسی وقت۔''

''وھاٹ' تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟ تم یہاں چوری کرنے آئے تھے چوری ہونے نہیں۔''

''جو کہا ہے وہ کرو پلیز۔'' اس بار اس کا لہجہ اتنا روڈ تھا کہ اس کے دوست نے حیرانی سے اس کی طرف چند ثانیے دیکھنے کے بعد گاڑی آگے بڑھادی تھی۔ اسی دن کے اختتام پر وہ شاندار ہوٹل کے کمرے میں ثانیہ عباس کے سامنے اس کے شوہر کی حیثیت سے بیٹھا تھا۔

''اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟'' بنا سلام دعا کے اس کے مقابل بیٹھا وہ پوچھ رہا تھا۔ ثانیہ عباس چہرہ جھکاتے ہوئے رو پڑی۔

''میں جانتی ہوں آپ نے جو بھی کیا ہے محض ضد اور غصے کی وجہ سے کیا ہے' پھر بھی میں آپ کی بہت ممنون ہوں' بے شک میرا رب بہترین محافظ ہے۔'' وہ سج دھج کر دلہن نہیں بنی تھی مگر پھر بھی اس کے چہرے پر بے تحاشہ حسن اور نور بکھرا ہوا تھا۔ زائر نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پہلو میں گرایا اور کمرے کی لائٹ آف کردی۔ اگلی صبح وہ اس کے بیدار ہونے تک نہا دھو کر فریش ہوچکا تھا۔

ثانیہ کی آنکھ کھلی تو وہ جوگرز پہن رہا تھا۔

''میں جا رہا ہوں' تمہارا سامان اور تمام نقدی وہ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں محفوظ ہے۔ نکال لینا۔''

''مطلب؟'' وہ ایکدم سے حیران ہوکر اٹھی تھی۔

''مطلب..... میں تمہارے گھر میں ڈکیتی کے لیے آیا تھا' تاکہ بڑا مال ہاتھ لگنے پر کوئی کاروبار کرسکوں اور اپنی محبت اپنی بچپن کی منگیتر کو حاصل کرسکوں' لیکن اب میں وہ سب یہیں چھوڑ کر جارہا ہوں' کیونکہ مجھے تمہاری لوٹی ہوئی دولت پر اپنے خوابوں کا تاج محل کھڑا نہیں کرنا۔'' وہ اس سے رخ پھیرے ہوئے بیٹھا تھا۔ ثانیہ کے لبوں پر اداس سی مسکان بکھر گئی۔

''بہت شکریہ' لیکن اب وہ سب میں آپ کو اپنی رضا سے دے رہی ہوں آپ لے جائیں۔''

''ہرگز نہیں۔'' وہ کھڑا ہوا تھا جب اس نے سرعت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میرا طلاق نامہ.....؟'' اور یہاں اس نے بے ساختہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''بھیج دوں گا جلد۔'' سرعت سے کہہ کر وہ رکا نہیں تھا کمرے سے نکل گیا تھا پیچھے ثانیہ عباس دیر تلک گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی اسے سوچتی رہی۔

کیسا رہزن تھا وہ' اور کیسی انوکھی چوری کی تھی اس نے.....!

وہ اپنے اپارٹمنٹ میں واپس لوٹ آئی تھی۔

شام ڈھل رہی تھی اور درختوں پر بیٹھے پرندے اب اپنے اپنے ٹھکانوں کی تلاش میں' فضا کی وسعتوں میں اڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ عصر کے قریب اس کی ملازمہ بھی گاؤں سے واپس لوٹ آئی تھی' اسی روز شام میں اس نے اپنی کلوز فرینڈ ایمن کو بلا کر زائر ملک سے متعلق ساری کہانی اس کے گوش گزار کردی۔

''گڈ..... یہ تو نیو ٹرینڈ نکل آیا' مطلب اب لوگ گھروں میں گھسیں گے' مگر کوئی مال و دولت لوٹنے کی بجائے سیدھے آپ کی پیشانی سے پسٹل لگائیں گے' اور آپ کو بتا جائیں گے' بنا سمجھے نکاح کرکے اپنی زوجیت میں لے لیں گے' نہ فکر نہ فاقا' عیش کر کاکا' مطلب ساری ٹینشن ہی ختم ہوگئی۔'' تالی بجاتے ہوئے اس نے صاف اس کا مذاق اڑایا تھا۔ تبھی وہ روہانسی ہوکر پلٹی تھی۔

''تمہیں لگتا ہے میں بکواس کررہی ہوں؟''

''ہاں۔''

''جسٹ شٹ اپ' میں بکواس نہیں کررہی' اس شخص کے پاس نکاح نامہ موجود ہے۔''

''یو ڈفر گرل' وہ جو کوئی بھی تھا اس نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے' فلموں کہانیوں میں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص ڈکیتی کی نیت سے آپ کے گھر میں گھسے اور پھر آپ کے کہنے پر شرافت سے نکاح کرکے اپنا کام نکالتا پھرے' مائینڈ اٹ محترمہ' یہاں ایسا انسان کا بچہ کوئی بھی نہیں ہے جو محض آپ کے آنسوؤں یا خدا رسول کے واسطوں سے اپنی بدنیتی کا ارادہ بدل کر نکاح جیسے جھنجٹ میں پڑتا پھرے' وہ مولوی' وہ گواہ' جو تم نے دیکھے سب بکواس اور ڈرامہ ہوں گے' ایسے آوارہ لڑکوں کے لیے' ایسے ڈرامے قطعی مشکل نہیں' اور تم دیکھ لینا' وہ دوبارہ بھی آئے گا' ممکن ہے تین بار طلاق طلاق بھی کہہ دے' مگر یہ سب سوائے دھوکے کے اور کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' ایمن کے لہجے میں خفگی بھی تھی اور سفاکی بھی۔ ثانیہ مضطرب سی رو پڑی۔

''میرا دل نہیں مانتا۔''

''وہ مجھے پتا ہے' اس عمر میں لڑکیوں کے دل کسی بھی فریب کو کب مانتے ہیں بھلا' انہیں تو وہی سولہ آنے سچ دکھائی دے رہا ہوتا ہے جو وہ محض خود دیکھنا چاہ رہی ہوتی ہیں' مگر میں اپنی دوست کو کوئی جھوٹا ڈھکوسلہ نہیں دے سکتی' تمہیں چاہیے کہ تم یہ سب آج ہی آنٹی یا گاؤں میں اپنے دادا دادی سے شیئر کرو' میرا خیال ہے تمہارا اب یہاں اس اپارٹمنٹ میں رہنا خطرے سے خالی نہیں' کیونکہ ہوسکتا ہے اس بار وہ اپنے ساتھ اپنے دوستوں کو بھی لائے۔'' ایمن کا خدشہ غلط نہیں تھا' وہ چپ بیٹھی آنسو بہاتی رہی' کتنا تکلیف دہ تھا یہ تصور کہ کسی نے اسے اپنے نام کا ''لالی پاپ'' دے کر لوٹ لیا ہے۔

ایمن واپس جاچکی تھی مگر وہ اسی پوزیشن میں بیڈ پر دونوں ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی سوچتی رہی۔ ٹپ ٹپ ٹپ آنکھوں سے آنسو یوں گر رہے تھے جیسے کسی خاموش جھیل میں جھرنا گرتا ہو۔ وہ کالج لائف میں تھی جب اچانک اس کے بابا کی رحلت ہوگئی۔ ان کی وفات کے

اے کراچی شہر

اے نگارانِ من اے عروسِ شہر
لگ گئی تجھ کو کن ظالموں کی نظر
پھیلی وہ شامِ غم گہری کالی سیاہ
جس کی آتی کہیں ہے نظر' اب سحر
گھر سے بچوں کے جانے پر لرزے ہے ماں
ہے سہاگن بڑی مضطرب' منتظر
دیکھو! سوچو ذرا عبرتِ خونچکاں
پڑ نہ جائے کہیں اب خدا کا قہر
ایک ہوجاؤ سب' اب خدا کے لیے
ہر لمحہ یہ دعا گو ہے قلبِ مہر

مہر گل.....اورنگی ٹاؤن' کراچی

بعد اس کی بہادر ماں نے نہ صرف ان کے وسیع کاروبار کو سنبھالا' بلکہ اپنے دونوں بچوں کی پرورش میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

اپنی ماں سے اکثر پاکستان میں اپنے ددھیالی رشتہ داروں کے متعلق مختلف کہانیاں سننے کو ملتی رہتی تھیں۔ اس کے دادا' دادی اور ایک تایا پاکستان میں مقیم تھے مگر تایا کی اولاد نہیں تھی جبکہ اس کے پاپا کو پسند کی شادی کے جرم میں خاندان سے عاق کر دیا گیا تھا۔

اس کے بابا رحلت سے قبل آخری بار اپنے گاؤں گئے تھے' مگر انہیں معافی نہیں ملی' پاکستان سے واپسی کے دو ہفتے بعد ان کی رحلت ہوگئی۔ اس موقع پر اس کی دادی اور تایا ان کے پاس آئے تھے اور بہت روئے تھے۔ بابا کی رحلت کے دو ماہ بعد اس کے دادا بھی غم اور بیماری سے ہار گئے۔ وہ چونکہ ان سے زیادہ اٹیچ نہیں تھی لہٰذا اسے اس بات کا زیادہ افسوس نہیں ہوا۔

کالج لائف کے دوران ہی اس کی اپنے پاپا کے عزیز دوست طارق انکل کے اکلوتے بیٹے اشعر سے دوستی ہوگئی تھی۔ وہ بے حد وجاہت کا حامل ایک ضدی اور غصیلا لڑکا تھا مگر اس کے پیار میں بہت شدت بھی تھی۔ وہ چونکہ اپنے بابا سے بہت اٹیچ تھی لہٰذا ان کی رحلت کے بعد اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اس نے اشعر کا سہارا لیا اور پھر جیسے اس سہارے کی عادی ہوتی گئی۔

اشعر کے بغیر جیسے اس کی زندگی ہی نامکمل تھی' اس کی شدت اور پسند کو دیکھتے ہوئے اس کی مما نے ان دونوں کا رشتہ طے کر دیا۔ انہی دنوں اشعر کی توجہ اس سے ہٹ کر اپنی ایک دور پرے کی کزن پر مبذول ہوگئی جو نئی نئی لندن آئی تھی۔ وہ اسے ٹائم اور کمپنی دے رہا تھا جو ثانیہ کے لیے کسی طور قابل برداشت نہیں تھا۔

اسی بات کو لے کر دونوں کے بیچ جھگڑے بھی ہوئے مگر...... کوئی حل نہ نکل سکا۔ نتیجتاً ثانیہ نے جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ رشتہ ختم کر دیا اور اشعر کا اپنے گھر میں داخلہ تک ممنوع کر دیا جس پر مشتعل ہو کر اس نے اسے دھمکی دے ڈالی کہ وہ اسے اس حرکت کی سزا ضرور دے گا' مگر اس سے پہلے کہ وہ ایسا کچھ کرتے ہوئے اسے نقصان پہنچاتا وہ اپنی مما سے ضد کر کے پاکستان چلی آئی۔ تاہم اس نے اپنے ددھیال والوں کو اپنے پاکستان میں قیام سے مطلع نہیں کیا تھا۔

جس نقصان سے ڈر کر وہ لندن سے بھاگی تھی' وہ نقصان پاکستان میں ہوگیا تھا۔ آنسو تھے کہ ٹپ ٹپ بہتے ہی چلے جارہے تھے اور رات تھی کہ اندھیرے کی بکل مارتے ہوئے سرد سے سرد ترین ہوتی جارہی تھی۔

⊙ ...... ⊙ ...... ⊙

''زائر پتر......!'' وہ مضطرب سا چارپائی پر پڑا پہلو بدل رہا تھا جب اچانک اس کے سیل فون پر اماں کی کال آگئی اور اسے ناچاہتے ہوئے بھی اس وقت ان کی کال پک کرنی پڑی۔

''جی اماں۔''

''ماں صدقے جائے کتنے دن سے تُو نے گاؤں کا چکر نہیں لگایا سب ٹھیک تو ہے ناں۔''

''ہاں اماں' سب ٹھیک ہی ہے' جاب ڈھونڈ رہا ہوں' تُو سنا گھر میں سب کیسے ہیں ابا اور سائرہ وغیرہ۔''

''سب ٹھیک ہیں' بس ایک گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''گڑبڑ...... کیسی گڑبڑ......'' وہ چونک کر چارپائی پر اٹھ بیٹھا تھا۔ جب اماں نے قدرے خاموشی کے بعد اسے بتایا۔

''وہ...... اپنی سائرہ ہے ناں۔''

''ہاں...... کیا ہوا اسے؟'' اس کا دل بے ساختہ ہی زور سے دھڑکا تھا۔

''کچھ نہیں...... اس نے نکاح کر لیا ہے' نمبردار کے بیٹے افضل کے ساتھ۔''

''کیا......؟'' اسے لگا جیسے وہ چارپائی سے نیچے گر پڑا ہو۔

''ہاں پتر...... مجھ...... کو نہیں پتا چلا کہ اس کرموں جلی نے کب اور کیسے یہ قدم اٹھایا' تیرے ابا نے تو ایسا دل پر لیا

کہ بستر سے ہی لگ گئے' ابھی کل تاپ اترا ہے ان کا...... اپنی بیٹی ہوتی تو شاید زندہ زمین میں گاڑ دیتے' مگر پرائے خون پر کیا زور چلتا ہے۔'' اماں اب شاید رو رہی تھیں مگر وہ تو سن ہی نہیں رہا تھا۔ سائیں سائیں کرتی سماعتوں میں سوائے سناٹے کے اور کچھ اترتا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

وہ تو ''اس'' سے محبت کرتی تھی' پھر نمبردار کے بیٹے کے ساتھ نکاح کیسے کر سکتی تھی؟ اس کا دماغ گھوما تھا اور وہ فوراً گاؤں واپس آیا تھا۔ سائرہ اس وقت بڑی مسرور سی تندور پر روٹی لگا رہی تھی جبکہ ماسٹر افضل نڈھال سے صحن میں بچھی چارپائی پر پڑے تھے اسے بنا دستک دیئے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر سائرہ کے چہرے کا رنگ فق ہوا تھا۔

''زائر...... تو......؟''

''ہاں میں...... پوچھنے آیا ہوں تجھ سے کہ نمبردار کے بیٹے کے ساتھ تیرے نکاح کی خبر کتنی سچ ہے۔''

''تم کون ہوتے ہو یہ پوچھنے والے؟'' اچانک اس نے بے رخی سے رخ پھیرا تھا۔ زائر کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''میں کون ہوتا ہوں' اپنے باپ سے پوچھ' جس نے میری ماں سے ہم دونوں کی شادی کی بات پکی کی تھی۔'' اس کا بازو پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے وہ چلایا تھا۔ تبھی وہ تپ اٹھی۔

''ہولی بول' یہاں اونچا کوئی نہیں سنتا' رہ گئی بات میرے ابا کی تو اس نے کوئی گناہ نہیں کر دیا تیری اماں سے ہماری شادی کی بات کر کے' جس کا حساب لینے آگیا ہے تُو یہاں؟ تین مہینے ہوگئے تجھے شہر کی گلیوں کی خاک چھانتے ہوئے' کچھ کمایا' کچھ بنایا' نہیں...... بنا بھی نہیں سکتے' تیرے جیسے نکھٹو صرف عاشقی کر سکتے ہیں یا نوکری' تیسرا کوئی کام کرنا ان کے بس کی بات نہیں' اس لیے بھول جا کہ میں تجھ جیسے کنگلے کے ساتھ اپنی زندگی برباد کروں گی' اکلوتی دھی ہوں اپنے ابا کی' میرے جیسی سوہنی دوسری کڑی نہیں اس پنڈ میں' ایسے ہی نمبردار کا بیٹا فدا نہیں ہوگیا مجھ پر' آیا بڑا بچپن کی منگ حاصل کرنے والا؟ جہاں سے آیا ہے کان لپیٹ کر چلا جا' نہیں تو افضل سے کہہ کر وہ درگت بناؤں گی تمہاری کہ کیا یاد رکھیں گے تمہارے ماں باپ بھی۔''

سخت اشتعال میں آئی وہ خالص دیہاتی لہجے میں بولتے ہوئے اسے پل میں اس کی اوقات یاد دلا گئی تھی۔ زائر کا بس نہ چلتا تھا کہ اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ اس وقت اس نے غصے میں اسے ایک زناٹے دار تھپڑ دے مارا تھا مگر پھر سائرہ کے چلا کر شور مچانے پر وہ زیادہ دیر وہاں کھڑا نہیں رہ سکا۔

اس رات اس کا وجود جیسے کسی دوزخ میں گر پڑا تھا' جلتا وجود' جلتی آنکھیں' جلتے آنسو اور پھٹتے اعصاب...... ایک ایک لمحہ عذاب کیسے بن جاتا ہے کوئی اس وقت اس سے پوچھتا۔

زندگی بھر ساتھ چلنے کے وعدے کرنے والے لوگ اچانک کسی ڈگر پر ہاتھ چھڑا کر واپس پلٹ جائیں تو جینا دشوار کیسے ہو جاتا ہے کوئی اس وقت اس سے پوچھتا' کتنے ہی روز تک ان دیکھی آگ کے ساتھ تیز بخار میں جلنے کے بعد بھی جب اسے قرار نہیں آیا تو اس روز وہ بنا کسی کو بتائے شہر چلا آیا۔

تیزی سے ڈھلتی شام کے سرمئی دھندلکوں کے ساتھ اس کے قدم ثانیہ عباس کے لگژری اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہے تھے اور اگلے تیس منٹ کے بعد وہ اس کے دروازے پر تھا۔ اس وقت وہ جس سکون کی پناہ کے لیے بے آب تڑپ رہا تھا وہ سکون ثانیہ عباس کے علاوہ اسے اور کوئی نہیں دے سکتا تھا۔

(جاری ہے)

جھیل کنارے کنکر

نازیہ کنول نازی

مجھے تمہاری جدائی کا کوئی رنج نہیں
میرے خیال کی دنیا میں میرے پاس ہو تم
یہ تم نے ٹھیک کہا ہے' مجھے ملا نہ کرو
مگر مجھے یہ بتا دو کہ کیوں اداس ہو تم

وہ اک بے نام سی الفت' وہ اک معصوم سی چاہت
وہ میری ذات کا حصہ' وہ میری زیست کا قصہ
مجھے محسوس ہوتا ہے وہ میرے پاس ہے اب بھی
وہ جب جب یاد آتا ہے نگاہوں میں سماتا ہے
زباں خاموش ہوتی ہے مگر یہ آنکھ روتی ہے
میں خود سے پوچھ لیتا ہوں
جسے میں پیار کرتا ہوں
اسے کیا پیار تھا مجھ سے؟
جواب "ہاں" سوچ لیتا ہوں
اسے بھی پیار تھا "شاید"
اسی "شاید" سے وابستہ ہے اب تو ہر خوشی میری
یہی اک لفظ شاید بن گیا ہے زندگی میری

دروازے پر دستک کی آواز ابھری تھی۔ ایمن جو کچن میں اس کے لیے چائے بنا رہی تھی' چونک کر پلٹی اور پھر ثانیہ کے اٹھنے سے قبل اس نے ملازمہ کو آواز دے ڈالی۔

"بوا...... ذرا دروازے پر دیکھیں کون ہے؟"

ثانیہ کا دل دستک کی آواز پر زور سے دھڑکا تھا مگر وہ خاموش بیٹھی تھی۔

"بی بی جی! کوئی زائر صاحب آئے ہیں' ثانیہ بی بی کا پوچھ رہے ہیں؟" تین منٹ کے بعد ملازمہ نے واپس آ کر اسے اطلاع دی' وہ تپ اٹھی۔

"دیکھا میں نے کہا تھا ناں وہ آئے گا دوبارہ' لیتی ہوں میں اس کی خبر' آیا بڑا نکاح کرنے والا۔" ہاتھ صافی سے خشک کر کے وہ بیرونی دروازے کی طرف آئی تھی۔

"جی فرمایئے۔" کڑی نگاہوں سے باہر پریشان حال کھڑے زائر ملک پر اک نظر ڈالنے کے بعد اس نے خاصے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تھا' جب وہ بولا

"مجھے ثانیہ عباس سے بات کرنی ہے۔"

"کیوں؟" اب اس نے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے تھے وہ ٹھٹک گیا۔

"کیا مطلب کیوں؟ بیوی ہے وہ میری۔ نکاح ہوا ہے میرا اس کے ساتھ۔"

"اچھا؟ کہاں ہے نکاح نامہ؟" کسی تھانیدار کی طرح وہ اس کے سامنے تن کر کھڑی تفتیش کر رہی تھی۔ زائر اب حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کون ہوتی ہیں مجھ سے نکاح نامہ مانگنے والی؟"

"ثانیہ عباس کی اکلوتی اور عزیز دوست ہوتی ہوں میں' جو بکواس اور فراڈ نکاح کے نام پر آپ نے اس بے

ضرر لڑکی کے ساتھ کیا ہے اس کے لیے میں آپ کو چھوڑوں گی نہیں۔"

"جسٹ شٹ اپ...... نہ تو میں نے کوئی بکواس کی ہے نہ کسی کے ساتھ کوئی فراڈ کیا ہے۔ میرا نکاح ہوا ہے ثانیہ کے ساتھ وہ بھی کورٹ میں۔ آپ جا کر اس سے پوچھ سکتی ہیں جہاں تک نکاح نامے کا تعلق ہے تو وہ بھی محفوظ ہے میرے پاس' کسی سے ڈرتا نہیں ہوں میں اگر ڈر ہے تو صرف اللہ رب العزت کی پاک ذات کا اور بس۔" غصے سے اس کے چہرے کی رنگت سرخ پڑ گئی تھی پھر اس سے پہلے کہ ایمن اس سے کچھ کہتی وہ ایک ہاتھ سے اسے سائیڈ پر ہٹاتے ہوئے دندناتا ہوا اپارٹمنٹ کے اندر چلا آیا' جہاں ثانیہ ہونق کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا تماشا ہے یہ؟ ہوں...... تمہیں پتا ہے نا ہمارا نکاح ہوا ہے کورٹ میں' پھر کیوں نہیں اپنی دوست کو بتایا؟" اسے کندھوں سے تھامے وہ درشتگی سے پوچھ رہا تھا مگر وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔

"کیا بُرا کیا ہے میں نے تمہارے ساتھ بولو؟ یہ پاکستان ہے یہاں آئے روز گھروں میں ڈکیتیاں ہوتی ہیں اور ان ڈکیتوں میں ہر جگہ صرف سامان ہی نہیں لٹتا' عزتیں بھی لوٹی جاتی ہیں مگر میں نے ایسا نہیں کیا' میں نے وہ کیا جو کبھی نہیں ہوتا' کوئی نہیں کرتا' کیا بگاڑ سکتی ہو تم میرا' بولو......؟" اس بار اس نے شانوں کو جھٹکا دیا تھا' تبھی ایمن اس کی طرف لپکی تھی۔

"ثانی کو چھوڑو' نہیں تو میں شور مچادوں گی۔"

"شٹ اپ!" اس کی دھمکی پر وہ دھاڑتے ہوئے پلٹا تھا۔

"خبردار اگر میرے اور اس کے درمیان میں آنے کی کوشش کی تو' بیوی ہے یہ میری جو سلوک چاہوں کر سکتا ہوں مگر کروں گا نہیں صرف اس کی عزت کے لیے اب میں نکاح نامے کے ساتھ ہی آؤں گا پھر دیکھوں گا کیسے روکتی ہو تم مجھے۔" وہ اشتعال کا شکار تھا ایمن اسے کڑے تیوروں سے گھورتی رہ گئی اور وہ چلا گیا۔

"آیا بڑا نیکوکار' کہیں کا' دیکھ لینا ثانی! اب وہ شام کبھی نہیں آئے گی جب یہ فضول شخص حقیقی نکاح نامے کے ساتھ ادھر کا رخ کرے۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اس کا ٹکراؤ تمہاری جگہ یوں کسی اور کے ساتھ ہو جائے گا۔ بہر حال تمہارا اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے' وہ غنڈا موالی شخص کچھ بھی کر سکتا ہے' چلو ابھی میری طرف چلتے ہیں۔" جلدی جلدی کام نپٹاتے ہوئے ایمن کہہ رہی تھی' وہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی یوں جیسے کچھ بھی نہ کہنا چاہتی ہو۔

❁ ☆ ❁

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی جب اچانک ہانیہ کی آنکھ میکال کے موبائل فون کی تیز بپ پر کھل گئی' وہ شاید جاگ رہا تھا' بھی فوراً سے پیشتر کال پک کر کے بیڈ سے اٹھ گیا۔

"ہیلو عائشہ!" اس کی بھاری آواز ہانیہ کی سماعتوں میں اتری تھی اور پھر جیسے اس کی آنکھوں سے نیند کی پریاں خود بخود رخصت ہونا شروع ہو گئیں۔ وہ کمرے سے نکل کر ٹیرس کی طرف چلا گیا تھا مگر اس کی آواز ہنوز کمرے میں آرہی تھی۔

"خوش ہو ناں میری زندگی برباد کر کے' یہی کرنا تھا تو کیوں آئیں میری زندگی میں' کیوں محبت کے خواب دکھائے مجھے' میں تمہیں نہیں بھول پا رہا عائشہ! نہیں جی سکتا میں تمہارے بغیر۔" اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ ہانیہ عجیب سی جلن محسوس کرتے ہوئے بیڈ پر اٹھ بیٹھی۔ اب وہ کہہ رہا تھا۔

"میں کچھ نہیں جانتا' مجھے میری عائشہ چاہیے' وہ عائشہ جو میری محبت ہے' جو بن کہے میرے اندر کے اضطراب کو بھانپ لیتی ہے۔ جس کے پاس میرے سکون اور خوشیوں کی چابی ہے' وہ شخص تمہارے قابل نہیں ہے عائشہ! وہ تمہیں مار دے گا۔" ہانیہ اس کی کہانی سے زیادہ واقف نہیں تھی' بھی چپ چاپ سنتی رہی' تقریباً بیس منٹ گزر گئے اور اب وہ کہہ رہا تھا۔

"میرا دل چاہتا ہے میں خودکشی کر لوں مگر دونوں جہان کی بربادی کا خیال ہر بار ارادے کو کمزور کر دیتا ہے' میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا عائشہ! کبھی بھی نہیں۔"

کسی چھوٹے سے بچے کی طرح ہرٹ اس شخص کے لیے جانے کیوں اس کا دل دکھا تھا۔ مگر وہ چاہنے کے باوجود اس شخص کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

تقریباً تیس منٹ کے بعد وہ دوبارہ کمرے میں آیا تو وہ انہیں گھرائے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ میکال صرف ایک لمحے کے لیے اس کے قریب رکا تھا پھر سر جھٹکتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

اگلے پندرہ منٹ کے بعد وہ فریش ہو کر دوبارہ کمرے میں واپس آیا تو ہانیہ اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ وہ بنا اس پر نگاہ کیے بیڈ کے کونے پر ٹک گیا۔

"ایکسکیوزمی! اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو کیا ہم چند منٹ کے لیے بات کر سکتے ہیں؟" میکال نے اس کی صدا پر خاموشی سے گردن پھیر کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"پلیز......" اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے التجا کی۔

"بولو۔" وہ رخ پھیر کر بھاری لہجے میں بولا تھا۔ ہانیہ نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔

"مجھے نہال نے بتایا تھا کہ آپ عائشہ جی سے بہت پیار کرتے ہیں اور شاید وہ بھی' پھر آپ نے ان سے شادی کیوں نہیں کی؟ آپ مرد تھے' بااختیار تھے' چاہتے تو ان کے لیے اسٹینڈ لے سکتے تھے مگر پھر بھی آپ نے انہیں اکیلا چھوڑ دیا' کیوں......؟"

"میں نے اکیلا نہیں چھوڑا اسے' وہ خود مجھے اکیلا چھوڑ گئی ہے۔" وہ رنجیدہ تھا' ہانیہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"کیوں؟ جو پیار کرتے ہیں وہ اکیلا تو نہیں چھوڑتے۔"

"مجھے نہیں پتا' میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے' پلیز سو جاؤ۔" بے زاری سے کہتے ہوئے وہ بیڈ سے اٹھا تھا' جب ہانیہ نے سرعت سے اس کی کلائی تھام لی۔

"میں آپ کی ہم سفر ہوں میکال! آپ کے دکھ اور سکھ کی ساتھی ہوں' مجھ سے آپ کا یہ درد اور اضطراب برداشت نہیں ہو رہا' مجھے بتائیں میں آپ کے لیے ایسا کیا کروں کہ آپ کو سکون مل جائے۔"

"مجھے نہیں پتا۔" اجنبیت سے بازو چھڑا کر کہتے ہوئے وہ کیبنٹ کی طرف بڑھ گیا تھا تاکہ سگریٹ اور ماچس تلاش کر سکے' تبھی وہ پھر اس کے قریب آئی تھی۔

"میں پوری کوشش کروں گی کہ عائشہ جی کو آپ کی زندگی میں واپس لے آؤں مگر اس کے لیے آپ کو میری ایک بات ماننی ہوگی۔" کتنی رسانیت سے وہ کہہ رہی تھی' میکال چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"مانیں گے ناں پلیز......" میکال رخصتی کے وقت اپنی ذات کے لیے ناپسندیدگی نہ جان گیا ہوتا تو شاید اس کے انداز اور خلوص پر ہرگز حیران نہ ہوتا۔

"کیسی بات؟"

"یہی کہ اپنا خیال رکھیں گے خود کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور مجھے اپنی بیوی نہیں دوست سمجھیں گے ٹھیک ہے۔" وہ اسے بالکل کسی چھوٹے بچے کی طرح ہی ٹریٹ کر رہی تھی' وہ سر جھٹک کر بیڈ پر آ گیا۔

"یہ دھواں بھی کسی درد کو اپنے اندر تحلیل نہیں کرتا میکال! اس لیے اپنا جگر جلانا فضول ہے' آئیں میں آپ کو سلاتی ہوں کیونکہ اس وقت آپ کے لیے نیند بہت ضروری ہے۔" اس کے سر جھٹکنے پر وہ بھی واپس پلٹی تھی اور پھر آگے بڑھ کر اس نے میکال کے لبوں سے سگریٹ نکالتے ہوئے مسل کر پھینک دی۔ وہ اسے کھری کھری سنانا ہی چاہتا تھا کہ ہانیہ نے اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔

"سو جائیے پلیز' سارے دکھ' ساری محرومیاں بھلا کر۔" عجیب جادوئی انداز میں اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے وہ اب سرگوشی کر رہی تھی۔ میکال

کی سانسیں اس کے وجود سے اٹھتی خوشبو کے نشے میں گم ہونے لگیں۔

وہ خود کو اس کے حصار سے نکالنا چاہتا تھا اسے یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ کمزور نہیں ہے جو اس کے حسن کے جادو کے سامنے ہتھیار پھینک دے مگر وہ کمزور پڑ گیا تھا۔

اگلی صبح بانیہ کی آنکھ کھلی تو وہ آفس کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ وہ فوراً سے پیشتر بیڈ سے اتر آئی۔

"میں تیاری میں آپ کی مدد کروں؟"

"نہیں۔" کتنے خلوص سے وہ پوچھ رہی تھی مگر وہ اس کی طرف دیکھنے کا روادار بھی نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے مگر ناشتہ تو کریں گے ناں آپ؟" مگر اس بار وہ پھر اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پرفیوم کا چھڑکاؤ کرنے لگا۔ عین اسی پل اس کے سیل پر عائشہ بربان کی کال آئی تھی۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! تم ٹھیک ہو ناں میکال؟" وہ اس کے لیے متفکر تھی۔ میکال شکستہ سا بیڈ پر ٹک گیا۔

"ہوں، تم کیسی ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں رات میری ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اریج انہیں اسپتال لے کر گیا تھا، میں بھی ساتھ تھی۔ اس لیے تمہارے ایس ایم ایس کا جواب نہ دے سکی تین بجے گھر واپس آئی تو فوری تمہیں کال کی، خدا کا واسطہ ہے میکال! ماضی کو ذہن سے جھٹک دو، اگر تم خوش نہیں رہو گے تو میرے لیے اس قربانی کو نبھانا بہت مشکل ہو جائے گا، مجھے مزید کمزور مت کرو میکال پلیز۔"

"اوکے، ایم سوری! ابھی میں آفس جا رہا ہوں، واپسی پر تم سے بات کرتا ہوں۔" بانیہ کی موجودگی کے باعث اس نے بنا بحث کیے کال ڈراپ کردی تھی، اگلے ہی پل وہ کمرے سے نکل کر سیڑھیوں سے نیچے آیا تو مسز حسن اسے تیار دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"میکال! اتنی صبح تیار ہو کر کہاں جا رہے ہو؟"

"اتنی صبح نہیں ہے مما! دن کے دس بج چکے ہیں اور میں آفس جا رہا ہوں۔"

"آفس..... تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، آج تمہاری شادی کو تیسرا دن ہے، ابھی گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے تمہارے سسرال والے دوپہر میں پہنچ رہے ہیں اور تم آفس جا رہے ہو۔" وہ حیران ہی تو رہ گئی تھیں۔

تبھی وہ ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے انتہائی بدتمیزی سے بولا۔

"مما پلیز میں نے ساری دنیا کے دل رکھنے کا ٹھیکا نہیں اٹھایا ہوا ہے جو کچھ آپ لوگ میری زندگی کے ساتھ کر چکے ہیں، کافی ہے۔ اس سے زیادہ کا حق نہیں رکھتے آپ مجھ پر۔" اس کا لہجہ محض تلخ ہی نہیں حتمی بھی تھا۔

بانیہ تن سی سیڑھیوں پر کھڑی رہی جبکہ مسز حسن ازحد حیرانی کے ساتھ اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"خدا حافظ۔" ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتا اگلے ہی پل وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے نکل گیا تھا۔ مسز حسن پلٹ کر شرمندہ نگاہوں سے بانیہ کو دیکھ رہی تھیں مگر وہ لبوں پر نرم سی مسکراہٹ پھیلا کر انہیں مطمئن کرتی نہال کے کمرے کی طرف چلی آئی۔

❁ ☆ ❁

"نہال۔" تکیہ بانہوں میں دبائے بیڈ پر آڑھا ترچھا لیٹا تھا، جب بانیہ کی پکار پر اس کی آنکھ کھل گئی۔

"ہوں؟" تکیے کو اور بھی شدت سے بانہوں میں دباتے ہوئے اس نے بانیہ کی طرف دیکھا تھا۔

"اٹھ جاؤ، صبح ہو گئی ہے۔"

"پتا ہے مجھے تمہاری شادی کو تیسرا دن ہے، تمہیں تو اپنے کمرے میں ہونا چاہیے تھا میرے سر پر کیوں سوار ہو گئی ہو صبح صبح۔"

"حال پوچھنے آئی تھی تمہارا اسٹوپڈ۔"

"کیوں؟" بانیہ کے کشن مارنے پر وہ کہنیوں کے بل اٹھ بیٹھا تھا۔

"میرے حال کو کیا ہوا؟"

"...نہ سے خراب ہے، مجھے لگا شاید میری شادی کے صدمے نے تمہارے حواس سلب کر دیے ہیں اور تم رات رات بھر روتے رہتے ہو۔"

"اچھا اتنی بڑی خوش فہمی؟" وہ مسکرایا تھا مگر بانیہ اس مسکراہٹ میں چھپی اذیت کو دیکھ سکتی تھی تبھی منہ چڑاتے ہوئے اس کے پہلو میں ٹک گئی۔

"خوش فہمی نہیں ہے، یہ چلو اب فریش ہو جاؤ، نہیں تو تمہیں پتا ہے میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والی ہوں۔"

"ہوں پتا ہے مجھے، پوری جنگلی بلی ہو اور ہمیشہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑی رہتی ہو۔" شرارت سے اس کے بال کھینچتا وہ بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگا گیا تھا۔

"کیوں، کیسے نزول ہوا صبح صبح؟"

"کچھ نہیں، مجھے تم سے عائشہ جی کے بارے میں بات کرنی تھی۔"

"عائشہ جی کے بارے میں؟ خیریت.....؟" وہ حیران ہوا تھا، بانیہ نے رخ پھیر لیا۔

"ہوں، خیریت ہی ہے۔"

"کیا جاننا چاہتی ہو عائشہ جی کے بارے میں؟"

"یہی کہ وہ کون ہیں، میکال کے ساتھ ان کی فرینڈ شپ کیسے ہوئی اور سب سے بڑی بات کہ انہوں نے محبت کے باوجود میکال کے ساتھ شادی کیوں نہیں کی؟"

"کیا میکال بھیا نے اس ٹاپک پر تم سے کوئی بات کی ہے؟" وہ اب پریشان ہو رہا تھا، بانیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں مگر وہ ان کو لے کر بہت پریشان ہیں۔"

"ہوں، عائشہ جی اصل میں میکال بھیا کی یونیورسٹی فیلو ہیں۔ یونیورسٹی پیریڈ سے ہی بھیا انہیں پسند کرتے تھے مگر وہ ان میں انٹرسٹڈ نہیں تھیں کیونکہ وہ کسی ارمغان نامی شخص سے محبت کرتی تھیں اور انہی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں مگر انہی دنوں ان کی بڑی بہن نے گھر سے بھاگ کر پسند کی شادی کر لی شاید اسی لیے عائشہ جی یونیورسٹی چھوڑ گئیں اور ہماری ہی کمپنی میں جاب کرنے لگیں تاکہ اپنی فیملی کو سپورٹ کر سکیں، بھیا کے ساتھ ان کی محبت بھی پروان چڑھی مگر اس سے پہلے کہ بھیا انہیں باقاعدہ پرپوز کرتے ان کی ماں نے ان کا رشتہ طے کر دیا۔ گھر کے ابتر حالات کی وجہ سے ان کی ماں نے اپنی بڑی بیٹی کی نسبت خاندان کے ایک نیم پاگل شخص کے ساتھ طے کر رکھی تھی تاکہ اس شخص کا بھائی عائشہ جی کے بھائی کو باہر سیٹ کروا دے مگر ان کی بہن یہ قربانی دینے پر تیار نہ ہوئیں تو ان کی ماں نے یہ بلی عائشہ جی کے گلے میں فٹ کر دی بس یہی کہانی ہے عائشہ جی کی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ عائشہ جی اپنی ازدواجی زندگی سے خوش نہیں ہیں۔"

"کیسے ہو سکتی ہیں، ایک نیم پاگل شخص کے ساتھ کوئی کیسے خوش رہ سکتا ہے۔" نہال اب اسے دیکھ رہا تھا، بانیہ اثبات میں سر ہلاتی آنے والے دنوں میں اپنے کردار اور قربانی کے بارے میں سوچنے لگی۔

❁ ☆ ❁

وہ کچن میں برتن دھو رہی تھی جب اریج آفس سے گھر واپس آیا۔

لاؤنج میں ٹی وی فل والیم کے ساتھ چل رہا تھا اور اس کی ساس، اپنی بیٹی کے ساتھ ٹی وی کے سامنے براجمان بڑے انہماک سے کوئی ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔ اریج سب کو سلام کرتا وہیں بیٹھ گیا۔

"ایک کپ چائے مل سکتی ہے اس وقت؟" اپنی ماں اور بہن کا انہماک دیکھ کر اس نے کچن کی طرف منہ کرتے ہوئے صدا لگائی تھی۔ جواب میں عائشہ دو تین منٹ کے بعد ہی چائے کا کپ لے کر حاضر ہو گئی۔

"شکریہ۔" وہ اس کا ممنون ہوا تھا مگر جیسے ہی نظر اس کے ہاتھوں پر پڑی ٹھٹک گیا۔

"یہ..... آپ کے ہاتھ پر چوٹ.....؟"

"ہاں آج کھیت میں کام کرتے ہوئے اپنی کم عقلی سے ہاتھ کٹوا بیٹھی ہے اپنا، میں نے تو بہتیرا کہا ہے کہ دھیان سے کام کیا کرو مگر میری کوئی بات یہ

سختی کہاں ہے۔"

"کیا مطلب؟ کھیتوں میں کام کرنے کے لیے اتنے ملازم ہیں پھر یہ کیوں گئیں کھیت پر؟" عائشہ کی بجائے اپنی ماں کے جواب پر وہ شاکڈ ہی تو رہ گیا تھا۔ تبھی وہ چمکتے ہوئے بولی تھیں۔

"تو کیا کریں اسے تاج بنا کر سر پر سجالیں' پورے چار لاکھ روپے لگے ہیں اس کے بھائی کے ویزے پر' مفت میں بیاہ کر نہیں لائے کہ شہزادی بنا کر رکھیں۔"

وہ سر جھکائے مجرم بنی کھڑی تھی۔ ارتج نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر پٹخ دیا۔

"ساڑھے چار لاکھ اس کے بھائی کو دیئے تھے اسے نہیں پھر یہ کیوں یہاں غلاموں جیسی زندگی بسر کریں؟"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو ارتج! میں دیکھ رہی ہوں اس لڑکی کے لیے تمہاری ہمدردیاں کچھ زیادہ ہی بڑھنے لگی ہیں۔"

"یہی سوچ سکتی ہیں آپ' اس کے علاوہ میں آپ سے کوئی امید رکھ بھی نہیں سکتا۔" انتہائی تلخی سے کہتا وہ صوفے سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا' پیچھے عائشہ کتنی ہی دیر تک مجرموں کی طرح سر جھکائے اپنی ساس کی صلواتیں سنتی رہی تھی۔

اسی رات جب وہ اپنے بیڈ پر پہلو کے بل لیٹی سسکیاں بھر رہی تھیں' اسے اپنے کندھے پر مردانہ ہاتھ کی گرماہٹ محسوس ہوئی تھی۔ روتے روتے وہ چونک کر پلٹی تو اس کا نیم پاگل شوہر آنکھیں فل کھولے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"تم رو رہی ہو؟"

"نہیں۔" اسے دیکھ کر اس کے آنسو اور شدت سے بہنے لگے تھے۔

"جھوٹ' مجھے پتا ہے تمہیں امی نے مارا ہے' میں جب صبح اٹھوں گا ناں تو بہت سارا جھگڑا کروں گا ان کے ساتھ پھر تم نہیں روؤ گی ناں؟"

"نہیں۔"

"تم بہت اچھی ہو' میں امی کو کہوں گا تو وہ تمہیں نہیں ماریں گی ٹھیک ہے؟"

کسی چھوٹے سے بچے کی طرح معصوم انداز میں وہ اسے بہلا رہا تھا۔ عائشہ نے اپنے آنسو پونچھ کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

"گڈ گرل۔" وہ اس کی فرماں برداری پر خوش ہوا تھا پھر عائشہ کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس پر جھکا اور اس کی پیشانی کو چوم لیا۔

"اب سو میں' آج میں تمہیں ناں اپنے بازو پہ سلاؤں گا۔"

جانے وہ آج اس پر اتنا نثار کیوں ہو رہا تھا۔ عائشہ قدرے حیرانی سے اس کی طرف دیکھتی وہیں تکیے پر سر رکھے چپ چاپ پلکیں موند گئی تھی۔

❁ ☆ ❁

شام گہری ہو رہی تھی اور وہ سڑک کے کنارے سر جھکائے متفکر بیٹھا تھا۔

اس نے ثانیہ عباس کی دوست ایمن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ شام میں نکاح نامے کے ساتھ آئے گا مگر...... وہ نہیں جا سکا تھا۔

اس کا نکاح نامہ اس کے دوست عاطف کے پاس تھا اور وہ ملک سے باہر تھا۔ دو ہفتوں کے طویل انتظار کے بعد عاطف کے وطن واپس پلٹنے پر وہ اس کی طرف گیا تھا مگر اسے یہ سن کر شدید جھٹکا لگا جب عاطف نے اس سے کہا۔

"ایک شرط پر نکاح نامہ مل سکتا ہے تمہیں۔"

"کیسی شرط؟" بنا چائے کے کپ کو ہاتھ لگائے اس نے الجھن بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ جب وہ مسکرا دیا۔

"بہت معمولی سی ہے۔ دیکھو ہم نے تمہیں ثانیہ عباس کے گھر ڈکیتی کے لیے بھیجا' اتنی محنت کی' اس کی شب و روز سرگرمیوں پر نظر رکھی مگر ہوا کیا' تم نے مال بھی نہیں ہتھیایا اور ہوشیاری دکھاتے ہوئے لڑکی بھی پٹالی'

اب سیدھی سی بات ہے جو لڑکی ہاتھ لگی ہے اس میں ہمارا حصہ بھی ہونا چاہیے ناں؟"

"بکواس بند کرو' وہ لڑکی میری عزت ہے اور میں تم میں سے کسی کو بھی اپنی عزت کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"اجازت مانگ کون رہا ہے تم سے' ہم تو اپنا حصہ مانگ رہے ہیں۔" عاطف کے ساتھ ساتھ اس بار وہاں موجود ثاقب نے ہنس کر اس کا مذاق اڑایا تھا تبھی کاشف بول اٹھا۔

"ویسے آپس کی بات ہے تم یہ کیسے ثابت کرو گے کہ وہ لڑکی تمہاری عزت ہے؟"

"کاشف پلیز' میں یہاں اس وقت تم سے الجھنے کے لیے نہیں آیا لہٰذا بہتر ہوگا کہ تم لوگ مجھے پریشان نہ کرو۔"

وہ ہار رہا تھا' جب عاطف بولا۔

"پریشان تو تم ہمیں کر رہے ہو' دیکھو ناں' تم صرف اپنی بچپن کی منگیتر سے پیار کرتے ہو' اسی کو پانے کے لیے تم نے ثانیہ عباس کے گھر ڈکیتی کا پروگرام بنایا' بعد میں نیت خراب ہونے پر محض گناہ سے بچنے کے لیے تم نے اس سے نکاح کیا' ہم بھی انسان ہیں یار! ہماری بھی نیت خراب ہو سکتی ہے اب ہم تینوں اس سے نکاح تو نہیں کر سکتے مگر حصہ تو ہمارا بھی بنتا ہے ناں۔" آنکھ مار کر لب دباتے ہوئے وہ زائر کو زہر لگا تھا۔ تبھی شدید غصے میں لپک کر اس کا گریبان پکڑتے ہوئے وہ چلّا کر بولا تھا۔

"ایسی کی تیسی تمہارے حصے کی' وہ لڑکی میرے نام کا حصہ ہے۔ میں اسے طلاق دے کر چھوڑ سکتا ہوں مگر عزت بنا کر' اپنا نام دے کر لوٹ نہیں سکتا' سمجھے تم۔"

کاشف اس کے جلال پر فوراً اٹھ کر قریب آیا تھا۔

"چل چھوڑ یار' ٹھیک ہے دے اسے نکاح نامہ' اپنے لیے کوئی اور سہی۔"

وہ زائر کے غصے سے اچھی طرح واقف تھا' تبھی مصالحت کی کوشش کی تھی زائر دو ہفتوں کے بعد نکاح [illegible]

وہاں لگا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

سائرہ افضل کے ساتھ ثانیہ عباس بھی جیسے اس کی دسترس سے دور چلی گئی تھی۔ انہی دنوں اس نے اپنی ماں کی التجا پر حویلی میں ایک ڈرائیور کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی تھی بعد ازاں وہ چوہدرانی صاحب کا لاڈلا بنتا گیا اور انہوں نے زمینوں اور باغات کے سارے معاملات بھی اس کے سپرد کر دیئے۔

سائرہ کے والد ماسٹر افضل کی وفات ہو گئی تھی اور تبھی بہت عرصے کے بعد اس نے اسے دیکھا تھا۔ وہ بُری طرح رو رہی تھی مگر اس کا حسن گم گشتہ ہو گیا تھا' وہ جو فخر سے کہتی تھی کہ گاؤں میں اس جیسا حسین دوسرا کوئی نہیں' اب وہ حسن جیسے کہیں چھپ کر رہ گیا تھا۔ بڑھے ہوئے وزن کے ساتھ چہرے پر پڑی چھائیوں اور سانولے پن نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

زائر اگلے روز اپنے اندر کے اضطراب سے تنگ آ کر پھر شہر چلا آیا تھا' بارش ہو رہی تھی اور وہ مارکیٹ میں تھا جب اچانک اس کی نگاہ شاپنگ کرتی ثانیہ عباس پر پڑی اور پھر جیسے اس کا دماغ گھوم گیا۔

گاڑی کا فرنٹ ڈور زور سے بند کرتے ہوئے وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا تھا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ ٹیکسی یا رکشہ کو ہاتھ دے کر روکتی' زائر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ثانیہ جیسے کرنٹ کھا کر پلٹی تھی' اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ اس کی زندگی میں آئے گا مگر وہ آ گیا تھا۔

ازحد سنجیدہ چہرے پر غصے کی ہلکی سی سرخی لیے وہ اسے بنا کچھ کہے خاموشی سے کھینچتے ہوئے گاڑی کی طرف لے آیا تھا۔

❁ ☆ ❁

اس روز وہ قبرستان نہیں آئی تھی۔

مدیر شہر خاموشاں کی خاموش دنیا میں کافی دیر تک اپنی والدہ کی قبر کے پاس بیٹھا' فاتحہ خوانی کرنے کے بعد [illegible] انتظار کرتا رہا تھا مگر وہ نہیں آئی تھی۔

اگلے روز اس کی بے چینی دیکھنے لائق تھی۔

اس روز بہت بارش ہوئی تھی سڑکوں پر ٹریفک کا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ابھی جاگا تھا کہ اس کی فیانسی سلمیٰ کی کال آ گئی۔

"ہیلو...... عذیر......!"

"بول رہا ہوں' کبھی دعا سلام بھی کر لیا کرو اٹھ کر۔"

"تم پر سلامتی بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ تم ہر وقت ویسے ہی میری دعاؤں کے حصار میں رہتے ہو خیر میں انڈیا جا رہی ہوں' تم نے اپنی دادو سے ہماری شادی کی بات کی؟"

"نہیں یار ابھی دادو سے میری بات نہیں ہو سکی ہے' سمیر اور نمیر وغیرہ کو بتا دیا ہے میرا خیال ہے وہ دادو سے بات کر لیں گے' تم ٹینشن مت لو میرے گھر میں سب میرے فیصلے کا احترام کرتے ہیں۔"

"چلو اچھی بات ہے' ویسے میں اگلے کچھ روز میں پاکستان کا چکر لگا رہی ہوں بہت شوق ہے مجھے پاکستان دیکھنے کا۔"

"گڈ میں بھی یو کے آ رہا ہوں۔"

"خیریت؟"

"ہوں' خیریت ہی ہے بزنس کے سلسلے میں ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔"

"کب تک آؤ گے؟"

"پندرہ بیس دن تو لگ جائیں گے' چلو اب مجھے آفس جانا ہے شام میں بات کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اپنا خیال رکھنا' خدا حافظ۔"

دادو اس کے کمرے میں آ گئی تھیں تبھی اس نے گھبرا کر فوری لائن کاٹ دی' سلمیٰ اس کی یونیورسٹی فیلو تھی اور اسے پسند کرتی تھی چھ ماہ قبل وہ لوگ یو کے شفٹ ہو گئے تھے مگر ان کا رابطہ برقرار رہا تھا۔ عذیر کی لائف میں چونکہ کوئی لڑکی نہیں تھی لہٰذا اس نے اپنے طور پر اسے اہمیت رنگ پہنا دی تھی۔ اس روز بہت دنوں کے بعد وہ آفس سے اٹھ کر شہر خاموشاں کی طرف آیا تھا' شاید اس امید پر کہ وہ آئے گی مگر اس روز پھر وہ نہیں آئی تھی۔

شاید اس نے اس کے کہے کا مان رکھ لیا تھا مگر عذیر کا دل اس فرماں برداری کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ اس سے صرف ایک بار ملنا چاہتا تھا اس کے بارے میں کھل کر جاننا چاہتا تھا مگر شاید ابھی اس کی تقدیر کو منظور نہیں تھا۔

اگلے چند روز میں اس کی مصروفیات مزید بڑھ گئی تھیں۔ اس کے قبرستان جانے کا معمول بھی مستقل نہیں رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ لڑکی اس کے حافظے میں محفوظ تھی' ایک ہفتے بعد اس روز وہ پھر آفس سے اٹھ کر سیدھا قبرستان کی طرف آیا تھا اور...... تبھی وہ اسے دکھائی دے گئی تھی۔

مکمل سیاہ چادر میں خود کو چھپائے' عادت کے عین مطابق وہ مطلوبہ قبر کے پاس بیٹھی اس پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

عجیب یاسیت کا ماحول تھا

عذیر اپنی جگہ پر ٹھٹک کر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

اس نے سنا تھا رشتے صرف سانس کی ڈوری سے بندھے ہوتے ہیں جیسے ہی یہ ڈوری ٹوٹتی ہے' رشتوں کا احساس اور زندگی میں ان کی اہمیت بھی دم توڑنے لگتی ہے۔ خود وہ بھی اس کا تجربہ کر چکا تھا' اس کی زندگی میں اس کی ماں اتنی اہمیت کی حامل تھی کہ اسے لگتا تھا وہ ان کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا مگر ان کی رحلت کے چار سال بعد بھی وہ نہ صرف سانس لے رہا تھا بلکہ زندگی نے اسے اتنا مصروف کر دیا تھا کہ اب اکثر اسے ان کی روح کے ایصال ثواب کے لیے درود پاک پڑھنے کے لیے بھی ٹائم نہیں ملتا تھا حالانکہ ان کی رحلت کے شروع کے دنوں میں ہر روز ان کے لیے بے شمار نوافل اور درود پاک پڑھنا اس نے اپنا معمول بنا لیا تھا مگر......

اس لڑکی کو دیکھ کر یہ نہیں لگتا تھا کہ رشتے سانس سے بندھے ہوتے ہیں' اُدھر چہرہ منوں مٹی کے ڈھیر تلے دفن ہوا اور اِدھر اس شخص کی ذات سے جڑے سارے باب بند۔

مگر وہاں شیشم کے اس پیڑ تلے منوں مٹی کے ڈھیر تلے دفن اس رشتے سے شاید اس کی زندگی کا تعلق ذرا سا بھی کمزور نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ اب بھی آندھی طوفان کی پروا کیے بغیر ہر روز وہاں آ رہی تھی بس اس نے اپنا وقت تبدیل کر لیا تھا۔

عذیر کے پاس اس روز زیادہ ٹائم نہیں تھا مگر اس نے لڑکی کا چہرہ ضرور دیکھ لیا تھا بے شک وہ بے تحاشا خوب صورت لڑکی تھی۔

❁......☆......❁

دروازے پر دستک کی آواز ابھری تھی

عذیر جو ابھی قبرستان سے واپس لوٹا تھا' اپنا سفری بیگ تیار کرتے ہوئے چونک کر پلٹا۔

"السلام علیکم!" اس سے چھوٹا سمیر اس کے پلٹ کر دیکھنے پر دونوں بازو سینے پر باندھے' کچھ ہی فاصلے پر کھڑا دکھائی دیا۔

"وعلیکم السلام' خیریت؟ آج اتنی جلدی گھر کیسے پلٹ آئے آپ؟"

ہنوز اپنے کام میں مصروف وہ اس سے پوچھ رہا تھا' سمیر دو قدم چل کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"نمیر کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی صبح' اسی لیے سو رہا تھا میں نے سوچا اس کے حصے کی صفائی آج میں کر لوں' کھانا باہر سے منگوا لیں گے' اصل میں اس نے بھی پرسوں میرے حصے کے برتن دھوئے تھے جب میں گھر واپسی پر بہت تھکا ہوا تھا۔"

"گڈ! اس کا مطلب ہے آج کل نمیر کے ساتھ اچھے تعلقات چل رہے ہیں تمہارے۔" بیگ میں شیونگ کا سامان اور موزے رکھتے ہوئے عذیر مسکرایا تھا۔ جواب میں سمیر کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ہوں' کہہ سکتے ہیں اصل میں جب تک کوئی خاتون خانہ اس گھر میں نہیں آ جاتی' تب تک سب سے بنا کر رکھنا مجبوری ہے۔ ویسے سلمیٰ بھابی کب تک آ رہی ہیں پاکستان؟"

"پتا نہیں' کافی دنوں سے میرا اس سے رابطہ نہیں ہوا شاید انڈیا چلی گئی ہے وہ ویسے اگلے کچھ روز میں آنے کا امکان ہے اس کا کیونکہ اسے بھی تم لوگوں سے ملنے اور پاکستان دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

"آہم...... رابطہ بھی نہیں ہے اور پل پل کی خبر بھی ہے' ویسے آج قبرستان نہیں گئے آپ؟"

"گیا تھا بلکہ وہیں سے آ رہا ہوں' ایک گھنٹے بعد فلائٹ ہے میری' تم ذرا عمیر کو کال کرو مجھے ائرپورٹ تک چھوڑ آئے۔"

"ٹھیک ہے' واپسی کب تک ہو گی؟"

"اس بار تاخیر ہو سکتی ہے کیونکہ کام کا لوڈ زیادہ ہے پھر بھی جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ تم دادو' زبیر اور عمیر کا خصوصی خیال رکھنا۔"

"جو حکم جناب! فکر ہی نہ کریں آپ۔"

عذیر اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دے رہا تھا اسے بزنس کے سلسلے میں یو کے جانا تھا' سمیر مسکراتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

❁......☆......❁

شام کے سرمئی اندھیروں میں
یوں تیری یاد ساتھ چلتی ہے
جیسے پربت کے سبز پیڑوں پر
برف کے بعد دھوپ پڑتی ہے
جیسے صحرا کی ریت از از کر اجنبی کا طواف کرتی ہے
آہ بھرتا ہوں اشک پیتا ہوں
روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں
کتنی معصوم آرزوؤں کو' کس طرح لوگ توڑ جاتے ہیں
جیسے دم توڑتے مسافر کو قافلے چھوڑ جاتے ہیں
شام کے سرمئی اندھیروں میں یوں تیری یاد ساتھ چلتی ہے

کلاس میں گہرا سناٹا چھایا تھا۔ ڈائس کے اس پار صرف سر جاوید ہمدانی کے بولنے کی آواز وہاں بیٹھے ہر

طالب علم کی سماعتوں میں اتر رہی تھی۔

"دہشت گرد کیا ہوتا ہے اسٹوڈنٹس؟" لیکچر کے دوران اچانک انہوں نے اپنے سامنے بیٹھے طلباء و طالبات پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے پوچھ لیا تھا' ساری کلاس کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

"آپ کے ذہنوں میں کیا ہے' ایک شخص جو باہر سے بم لے کر آتا ہے اور کسی بھی گھر میں گھس جاتا ہے' کیا وہ دہشت گرد ہے یا اس گھر میں موجود افراد جو اس بم پکڑے ہوئے شخص کو روکنے یا قابو کرنے کی کوشش کرتے ہیں' وہ دہشت گرد ہیں؟"

فاطمہ نہیں جانتی تھی کہ سر ہمدانی اس ٹاپک پر گفتگو کیوں کر رہے ہیں مگر وہ انہیں بہت توجہ سے دیکھ رہی تھی' ان کے سرخ و سفید چہرے پر بڑا با رعب سا جوش تھا۔

"جو شخص بم لے کر آئے گا' وہی دہشت گرد ہوگا سر!"

"رائٹ! لیکن اگر وہ شخص آپ کے گھر کے سربراہ کو خرید لے' اس کا منہ پیسوں سے بھر کر آپ کی زندگی کا سودا کرے تو دہشت گرد کون ہوگا؟!" حورعین فاطمہ کے جواب پر انہوں نے پھر سوال داغ دیا تھا' وہ سر جھکا گئی۔

"دونوں سر۔"

"رائٹ! اور اگر اسی گھر کے زندہ بچ جانے والے لوگ صرف اس لیے کہ وہ زندہ بچ گئے اپنے سربراہ کا ساتھ دیں تو دہشت گرد کون ہوگا؟!"

"سب گھر والے سر! کیونکہ ظالم کا ساتھ دینے والا بھی ظالم ہوتا ہے۔"

"جی ہاں اور یہی بات آج میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں' ہم مسلم تو شاید صحیح معنوں میں کبھی بھی نہیں تھے مگر محب الوطن پاکستانی بھی نہ بن سکے۔ ہم نے ہمیشہ ان لوگوں کا ساتھ دیا' جو ظلم کرتے ہیں۔ کس لیے؟ صرف اور صرف اپنے ذاتی مفاد کے لیے ذرا سی زمین' چند پیسے' کشش جائیداد' ذرا سی سہل زندگی کے لیے وہ زندگی جو پانی کے بلبلے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی' ہمیں نہیں فرق پڑتا کوئی ہمیں کیا کہہ رہا ہے' ہماری خودداری اور قربانیوں کے باوجود ہمیں ذلیل کر رہا ہے۔ ہمیں اس بات سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ اسلام دشمن عناصر ان لوگوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں جن کے سینوں میں وہ قرآن پاک' وہ مقدس کتاب محفوظ ہے کہ جس کی حفاظت کا ذمہ خود اس عرش بریں کے مالک نے لیا ہے' ہمیں نہیں فرق پڑتا کہ ہمارے ملک کے ساتھ کیا ہو رہا ہے' وہ کیسی سازشیں' وہ کیسا دیمک ہے' جو اندر ہی اندر اسے چاٹ رہا ہے' رات کے اندھیروں میں کتنے چہرے ہیں جو پیسوں کے عوض اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں' ایک اسلام ہے جو ساری دنیا میں پھیلا ہے اور جس کے خلاف ساری شیطانی قوتیں مل کر بھی اپنے گندے اور گھٹیا مقاصد حاصل نہیں کر پا رہیں' ہمیں نہیں فرق پڑتا اس بات سے کہ یہاں حق کا کلمہ بلند کرنے والے ہر حق پرست کو' ہمارے حکمران جب چاہیں' جس وقت چاہیں' سمندر پار کالے پانیوں کی نذر کر دیتے ہیں مگر ہمیں فرق پڑتا ہے' جب کوئی ہماری پارٹی پر انگلی اٹھائے' اگر کوئی پیپلز پارٹی میں ہیں تو کوئی مسلم لیگ کا بندہ اٹھ کر پیپلز پارٹی کو غلط کہے۔ اپنا مذہب' اپنی وطنیت' اپنی آزادی' ہم سب پر شب خون گوارا کر سکتے ہیں مگر پارٹی پر نہیں کیوں؟ کیونکہ ہم ظلم کا ساتھ دینے والے ظالم ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اگر ہمارے جسم کا کوئی حصہ کٹ رہا ہے تو ہم اس پر احتجاج کرنے کی بجائے' جو حصہ سلامت ہے اس پر مطمئن رہیں گے' پھر کیوں نہ دنیا ہمیں کہے کہ ہم دہشت گرد ہیں' وہ مسلمان جو سیسہ پلائی دیوار کی مثال ہیں' وہ مسلمان جنہیں ایک جسم کی مانند قرار دیا گیا ہے' وہی ظلم پر آواز اٹھانے کی بجائے ذرا سے مفاد کے لیے ظلم کا ساتھ دیں تو کون کہتا ہے کہ وہ ظالم نہیں ہیں' دہشت گرد نہیں ہیں۔" بھرپور جوش میں بولتے ہوئے سر ہمدانی کا لہجہ اک دم بھرا گیا تھا۔

"کیا انجام ہوگا اس مفاد پرستی کا' اس ظلم اور بے حسی

کا؟ کس قیامت پر اپنے اعمال اٹھا کر رکھ دیے ہیں ہم نے؟ قیامتیں تو یہاں ہر روز برپا ہوتی ہیں' روز ایک نیا ظلم ایک نیا بم دھماکہ' ایک نیا ڈرون حملہ' قیامت ہی تو برپا کرتا ہے دلوں پر۔ پھر کیوں شعور نہیں آ رہا ہے' ہمیں' کیسی نیند ہے یہ غفلت کی' جو ہمارے جسموں کو کچلنے مسلنے پر بھی ٹوٹنے نہیں دے رہی' ہمیں کیوں محمود احمدی نژاد نصیب نہیں ہو رہا' کیوں ہم اپنے دفاع کے لیے بھی بندوق اٹھاتے ہیں تو ساری دنیا میں ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیے جاتے ہیں' صرف اسی لیے کہ ہم نے اپنے نفس' جس کے لیے ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ کسی طور جنت سے کم قیمت پر نہ بیچیں' ہم نے مادی دنیا کی ذرا سی آسائشات کے لیے گروی رکھ چھوڑے ہیں' قصور کس کا ہے؟ تباہی کس کی ہے؟ اپنی دنیا و آخرت کی بربادی کا ذمہ دار کون ہے؟ نفس کا گھوڑا تو بے لگام ہے' جس راہ پر ڈالو گے سرپٹ بھاگتا چلا جائے گا مگر راہ کا انتخاب کس نے کرنا ہے؟"

پریڈ کا ٹائم پورا ہو گیا تھا۔ سر ہمدانی بنا کلاس پر الوداعی نظر ڈالے اپنا رجسٹر اٹھا کر بوجھل قدموں سے کلاس چھوڑ گئے تھے۔ حورعین فاطمہ اس روز ایک پل کے لیے بھی ان کے لیکچر کے حصار سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔

وہ سوچتی تھی بھلا حالات کے شکنجے میں پھنسے چند غریب ممالک کے مسلمان اپنے سے تین گنا بڑے مکار دشمن کا کیا بگاڑ سکتے ہیں مگر یہ اسے آج یاد آیا تھا کہ طارق بن زیاد نے جب اندلس کو فتح کیا تھا تو اس کی دسترس میں بھی مٹھی بھر مسلمان سپاہی ہی تھے۔ محمود غزنوی نے فتوحات کی جو ناقابل فراموش تاریخ رقم کی' ان کا سامنا بھی اپنے سے تین گنا بڑے دشمن کے ساتھ ہی ہوا تھا۔

بھلا جنگیں بھی ہتھیاروں سے بھی لڑی جاتی ہیں؟

وہ مذہب جو امن و سلامتی اور سکون کا مذہب ہے۔ عالمگیر مذہب ہے' جس کے پیروکار دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں' اس مذہب کو اگر بدنام کر رہے تھے تو وہ لوگ کون تھے؟ مسلمانوں کے روپ میں' چہروں پر داڑھیاں سجا کر' اسلامی نام اپنا کر' حقیقی اسلام کے متوالوں کی رسوائی کرنے والے وہ بناوٹی چہرے کس کے تھے؟

کس مذہب کے پیروکار تھے وہ؟ کیا تعلیمات تھیں اس مذہب کی' کیا مقاصد تھے؟ وہ سوچتی جاتی تھی اور کڑھتی جاتی تھی۔

پھر ایک روز اس نے سنا کہ پاکستانی حکومت نے سر جاوید ہمدانی کو لاپتا افراد کی لسٹ میں ڈال کر امریکہ کے حوالے کر دیا۔ اس روز وہ دیر تک اپنے اندر اٹھتے دھماکوں کا شور سنتی رہی تھی۔

کون تھے یہ "لاپتا افراد؟"

کیسے اور کہاں کھپا دیے جاتے تھے کہ سال گزرنے کے باوجود بھی ان کا نام و نشان ہی نہیں ملتا تھا۔ کیا کہانی تھی ان لاپتا افراد کے پیچھے؟

بے بس مکینوں کے گھروں میں بجھتے چولہوں اور بااختیار محلوں میں لگتے دولت کے انباروں کے پیچھے تاریخ کی کیسی سسکیاں چھپی ہوئی پڑی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ سر جاوید ہمدانی کی طرح ایک روز اسے بھی کالے پانیوں کا سفر طے کرنا پڑے گا۔ پانچ منٹ کی مختصر سی نیند کے بعد اچانک اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ قبرستان میں اس وقت اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایک نشئی بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔ تبھی وہ گھبرا کر اٹھی تھی اور سرپٹ بھاگتے ہوئے قبرستان سے نکل گئی' شام ڈھل رہی تھی وہ شکستہ قدموں کو گھسیٹتی ایک بار پھر یزداں کی طرف چلی آئی تھی جہاں آج کل زندگی اپنا کٹھن ترین سفر مکمل کر رہی تھی۔

❁ ☆ ❁

سردی کی شدت میں ایک دم سے اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے فٹ پاتھ سے اٹھنے کی کوشش کی مگر ہمت جواب دے گئی' پاس ہی کسی مسجد کے اسپیکر سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔

"حی علی الصلوٰۃ' حی علی الصلوٰۃ ...... (آؤ نماز کی طرف)۔"

"حی علی الفلاح ...... حی علی الفلاح ...... (آؤ کامیابی کی طرف)۔"

"اللہ اکبر' اللہ اکبر ...... (اللہ بہت بڑا ہے' اللہ بہت بڑا ہے)"

"لا الٰہ الا اللہ ...... (نہیں کوئی عبادت کے لائق سوائے اللہ کے)"

اللہ کے گھر سے بلاوا آ گیا تھا' مگر آج وہ اس پاک و بے نیاز ذات کے سامنے حاضر ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ زندگی نے بہت بے رحمی سے اس پر اپنے دروازے بند کر دیے تھے۔ شدید سرد موسم میں بھوک اور نقاہت کے سبب اسے چکر آ رہے تھے۔ اس وقت اس کے لیے اپنی آنکھوں کو کھلے رکھنا بھی بے حد دشوار ہو رہا تھا۔

سونے کے محل میں مخملی بستر پر سونے والی وہ شہزادی' جیسا تک حالات کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

پچھلے ایک ہفتے سے وہ قبرستان بھی نہیں جا سکی تھی اور اس بات کا اسے قلق تھا۔ رات جیسے جیسے آگے سرک رہی تھی اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ تبھی اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر جیسے ہمت پکڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کہاں جانا ہے' اس کی منزل کیا ہے مگر اسے یقین تھا اس کا رحمن اور رحیم رب اسے کبھی بے آسرا نہیں چھوڑے گا۔ وہ اس کے لیے رزق اور محفوظ پناہ گاہ کا انتظام ضرور کرے گا۔

چند قدم چلنے کے بعد کسی سوچ کے تحت وہ اس شاندار عمارت کے بڑے سے آہنی گیٹ کے سامنے رک گئی تھی اور گرد و پیش پر ایک سہمی نظر ڈالنے کے بعد اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے دروازے پر زوردار دستک دے ڈالی تھی' چند لمحوں کی کوشش کے بعد گیٹ وا ہو گیا تھا۔

"جی فرمائیے۔" گیٹ کے اس پار سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا کھڑا اس کا منہ تک رہا تھا' وہ خاموش کھڑی رہی۔

"ارے آپ کچھ بول کیوں نہیں رہیں' میں سمجھ گیا آپ ضرور سلمٰی بھابی ہوں گی۔ یو کے سے آئی ہیں ناں؟"

بنا اس کے حال پر غور کیے' اپنے ہی مفروضے کے تحت اس نے گویا "تکا" لگایا تھا۔ فاطمہ اس کے قیاس پر چونک کر خالی خالی سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ جانے وہ کس غلط فہمی کا شکار تھا۔

"آپ کچھ بول کیوں نہیں رہیں' مانا کہ بھیا نے ہماری بڑی خطرناک مثالیں پیش کی ہوں گی مگر اب ہم ایسے بھی ہٹلر نہیں ہیں کہ اتنی دور سے آئی اپنی پیاری بھابی کو دروازے سے ہی باہر لوٹا دیں' آئیں پلیز۔"

حورعین فاطمہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے اپنی دستک کا کیا جواز پیش کرے' اگر اس نے اسے ایسی ویسی لڑکی سمجھ کر چلتا کر دیا تو وہ کہاں جائے گی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔

وہ جو کوئی بھی تھا اسے تو اس وقت رحمت کا فرشتہ ہی لگا تھا' تبھی دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی وہ بنا وضاحت کیے اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

پرشکوہ عمارت باہر سے جتنی شاندار دکھائی دے رہی تھی اندر سے اس کا حسن اور بھی دیدہ زیب تھا۔ رنگا رنگ پھولوں سے سجا لان' اندر طویل راہداری عبور کر کے کشادہ حال میں اس وقت اس خوب صورت بنگلے کے مکین اکٹھے بیٹھے چائے پی رہے تھے' نظر کے سامنے ہی فل والیم میں ٹی وی چل رہا تھا۔

وہ دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ یونہی سر جھکائے کھڑی رہی' جب وہ لڑکا بولا۔

"بڑی اماں! دیکھیے تو کون آیا ہے؟" اس کی اطلاع پر وہاں بیٹھے تمام افراد نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

"کون ہے یہ ......؟" آنکھوں پر بڑا سا چشمہ سیٹ کیے خاصی ضعیف عورت نے توجہ سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ فاطمہ کو اپنی سانسیں خشک ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"بوجھیں تو جانیں۔" اسے ساتھ لانے والا لڑکا شرارت پر آمادہ ہو رہا تھا۔

حورعین فاطمہ کے لیے اپنی ٹانگوں پر مزید کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔ اسے اس وقت اپنے اعصاب چٹختے محسوس ہو رہے تھے۔

"پہیلیاں مت ڈالو عمیر! صاف صاف بتاؤ کسے پوچھے بنا گھر میں گھسا لائے ہو؟" بڑی ماں کے لہجے میں سختی تھی۔ وہ تو جان سے کانپ گئی جانے اب اس کی تقدیر کا کیا فیصلہ ہونے والا تھا۔

"توبہ کریں بڑی اماں! آپ مجھے ایسا سمجھتی ہیں یہ تو سلمیٰ بھابی ہیں نذیر بھیا کی ہونے والی بیوی یوکے سے آئی ہیں باقی معلومات آپ خود لے لیجیے۔" وہ ایسا ہی تھا از حد کھلنڈرا اور بے پروا' گھر میں سب کو اس سے شکایتیں رہتی تھیں۔ اب بھی بڑی ماں اسے خاصی مشکوک نگاہوں سے دیکھنے کے بعد فاطمہ کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"بیٹھو بیٹا۔" اس کے حلیے کو قدرے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے کے بعد انہوں نے خاصی حلاوت سے کہا تھا۔ فاطمہ دل ہی دل میں انجانے سے خوف کی شکار ہونے کے باوجود ان کی ہدایت پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"کیسا ہے نذیر! اور تمہارا سامان کہاں ہے؟" اس کے بیٹھتے ہی ان کے پہلے سوال نے حورعین فاطمہ کی گھبراہٹ میں اضافہ کر دیا تھا۔ عزت اور جان کا خوف نہ ہوتا تو وہ کبھی جھوٹ بول کر ان کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچاتی۔

"جی ٹھیک ہے سامان ٹیکسی میں ہی رہ گیا' مجھے یاد ہی نہیں رہا؟"

"ارے تم اکیلی آئی ہو پاکستان؟"

ایک اور مشکل سوال؟

وہ اتنے سارے لوگوں کے سامنے خود میں سر اٹھا کر بات کرنے کا حوصلہ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

"جی"

"دیکھا' بہت لاپروا لڑکا ہے یہ نذیر! ڈر رہا ہو گا کہ کہیں ہم اس کی پسند کو ریجیکٹ نہ کر دیں' سچ پوچھو تو میرا ارادہ بھی یہی تھا اسے چیزوں کی پہچان نہیں ہے انسانوں کی کہاں سے ہوگی مگر تمہیں دیکھنے کے بعد تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ وہ اتنی اچھی لڑکی بھی پسند کر سکتا ہے' زندگی میں پہلی بار کوئی ڈھنگ کا کام کیا ہے اس نے۔"

ان لوگوں کی کہانی کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی' مگر اس کے باوجود اس نے لبوں پر خاموشی کا قفل لگا رکھا تھا۔ کتنا چیپ لگ رہا تھا کسی کے احساسات کے ساتھ کھیلنا مگر تقدیر نے اسے کتنا بے بس کر دیا تھا' اس کی آنکھیں کچھ سوچ کر پھر آنسوؤں سے بھر آئیں۔

"میرا خیال ہے بچی تھک گئی ہے' جاؤ عمیر! اسے نذیر کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔"

دادی اماں اب نماز کے لیے اٹھ رہی تھیں یا شاید اس کے لیے کچھ کھانے پکانے وہ شکر کا کلمہ پڑھتی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھابی! ہمارا انٹروڈکشن تو لے لیں۔" عمیر سے بڑا نمیر اچانک چلایا تھا' وہ ٹھٹک گئی۔ تبھی عمیر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بھابی ابھی تھکی ہوئی ہیں ان کے روم میں آ کے کراؤ انٹروڈکشن جس نے کروانا ہے۔" وہ اس کی سائیڈ لے رہا تھا حورعین فاطمہ نے گھبرا کر آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال لیا۔

وہ ابھی نذیر نامی شخص کے شاندار کمرے میں بیٹھی تھی جب نمیر کھانے کی ٹرے ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے ہی کمرے میں چلا آیا۔

"یہ لیں بھابی! پہلے ہمارے پاکستانی کھانے کو ٹیسٹ کریں پھر ہم آپ کو اپنا انٹروڈکشن کرواتے ہیں۔" عمیر کی طرح نمیر کے لہجے میں بھی شگفتگی تھی۔

حورعین کھانے کی ٹرے دیکھ کر اپنا خوف بھول گئی۔

وہ کھانا کھا رہی تھی' جب عمیر نے اسے بتایا۔

"نذیر بھائی نے آپ کو ہم سب کے نام تو بتائے ہوں گے' کام میں بتا دیتا ہوں' یہ جو نمیر ہے ناں بھابی! پورے دو سال بڑا ہے مجھ سے مگر ایک نمبر کا جھوٹا' فلرٹ اور بے ایمان شخص ہے۔ کاہل اور ہڈ حرام تو رج کے ہے اکثر اس کے حصے کے کام بھی میں ہی کرتا ہوں اور جو سمیر بھائی ہیں انہیں تو ہر پندرہ منٹ کے بعد کسی بھی لڑکی سے عشق ہو جاتا ہے' گھر کے کام کاج میں سوائے کوکنگ اور صفائی کے دوسرے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتے' ابھی آئیں گے نا کلب سے تو ان کے نخرے دیکھیے گا آپ' بس وہ ہی کام کے بندے ہیں اس گھر میں' ایک محترم عمیر صاحب یعنی کہ میں اور دوسرا چھٹکو نام تو اس کا زبیر ہے مگر پیار سے سب چھٹکو کہتے ہیں۔ چار سال پہلے جب ممی کی ڈیتھ ہوئی تو وہ صرف تین سال کا تھا' شاید اسی لیے اس کے اندر ایک خلاء ہے' جس نے اتنی چھوٹی سی عمر میں اس کے لبوں پر چپ کا قفل لگا دیا ہے' ابھی وہ ہوم ورک کر رہا ہے' آپ اس سے ضرور ملیے گا۔" عمیر کی زبان کے آگے خندق نہیں تھی' نان اسٹاپ بولتا وہ اسے بے حد اچھا لگا تھا۔ کیا وہ ان لوگوں کو دھوکا دے کر خوش اور مطمئن رہ پائے گی؟

کیا ہو گا اگر نذیر نامی وہ شخص گھر واپس لوٹ آیا تو.....؟

سوالات نہیں اژدھے تھے جو تصورات میں اسے ڈنک دے رہے تھے' بے چین ہو رہے تھے۔ بھوک کے باوجود اس نے کھانے سے ہاتھ روک دیا۔ اگلے تیس منٹ عمیر اور نمیر اسے آرام کرنے کی تلقین کرتے کمرے سے نکل گئے۔

اس نے اٹھ کر اٹیچ باتھ سے وضو کیا اور عشاء کی نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ ابھی تک اس نے کمرے کو سرسری نظر سے دیکھا تھا' نماز سے فارغ ہو کر جس وقت اس نے دعا میں ہاتھ اٹھائے آپ ہی آپ آنسو اس کے گالوں پر بہہ نکلے۔

بے شک اس کے مہربان اور رحیم رب نے اس کے رزق اور محفوظ پناہ گاہ کا انتظام کر دیا تھا۔ جائے نماز سے اٹھ کر جس وقت وہ بیڈ کی طرف آئی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہاں سائیڈ ٹیبل پر اس شخص کی تصویر [illegible] تھا۔

پتا نہیں یہ محض اتفاق تھا یا کوئی آزمائش مگر وہ پریشان ضرور ہو گئی تھی۔

اسے اس شخص کے گھر میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ بے چینی سی بے چینی تھی۔ جانے وہ کب واپس لوٹ آئے' کیا سمجھے گا وہ اسے' چور یا پھر کسی گینگ میں ملوث عورت.....

وہ کیسے اسے اپنی صفائی دے پائے گی اگر اس نے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا تو وہ کہاں جائے گی؟ اس کے لیے تو اللہ رب العزت کی اتنی بڑی کائنات میں کہیں کوئی جائے پناہ ہی نہیں رہی تھی۔

کتنے چبھتے ہوئے سوال تھے اور ڈھیرے ڈھیرے سرکتی رات..... اس نے تھک کر سر بیڈ کی پٹی سے ٹکا دیا تھا۔

❁.....☆.....❁

دو پتر چناراں دے
ساڈا او کھے من کے روندے پتھر پہاڑاں دے

چاندنی رات تھی۔

سردی کی شدت کے باعث اس وقت سارے گاؤں پر جیسے "ہو" کا عالم تھا۔ لوگ سر شام اپنے اپنے گھروں میں دبک کر سو جاتے تھے مگر اس کی قسمت میں نیند نہیں تھی۔

گاؤں کے بابا جوگی کی آواز رات کے گمبھیر سناٹے میں گونجتی' کسی لوری کی طرح ہی محسوس ہو رہی تھی' وہ مضمحل سا فصلوں کو پانی لگاتا رہا۔

بابا جوگی کی زندگی کی کہانی بھی عجب تھی۔ جوانی میں انہیں کسی لڑکی سے عشق ہوا تھا اور پھر وہ لڑکی کسی اور کے ساتھ بیاہ کر چلی گئی۔ اس کی شادی کے بعد بابا جوگی جو نمبرداروں کا بڑا ہونہار لائق فائق بیٹا تھا' جیسے ساری دنیا سے کنارہ کش ہو گیا۔ عشق کے روگ نے ایسا اس کے دل کو جکڑا کہ پھر بربادی ہی بربادی نصیب کا حصہ بنتی گئی مگر اس نے جوگ نہیں چھوڑا' اس کی آواز میں اب بھی اتنا کرب تھا کہ سننے والے کو اپنا دل کٹتا محسوس ہوتا تھا۔

گزرے وقت کے ساتھ ساتھ جہاں نمبرداری گئی وہیں جوانی کے ایام بھی رخصت ہوگئے۔ تھوڑی بہت زمین جو بچ رہی تھی اس پر بابا جوگی نے کاشت کاری شروع کردی تھی اب اس کا بیٹا جوان تھا مگر بیوی جوانی میں ہی داغ مفارقت دے گئی تھی۔ پچھلے دنوں اس نے بیٹے کی شادی کردی تھی گھر میں بہو آ گئی اس کے علاوہ اس کے مرحوم بھائی کے تین بیٹے بھی اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ اسی کے گھر میں رہتے تھے۔ ایک ہفتہ قبل بابا جوگی اپنی فصلوں میں بیجائی کررہا تھا جب اچانک ایک کتے نے پیچھے سے آکر اسے کاٹ لیا۔ بابا نے اسے مار کر بھگا دیا تھا مگر تب تک کتا اپنا کام کرچکا تھا۔ وہ گھر آیا تو گھر والوں نے دیسی گڑ اس کے زخم پر باندھ دیا۔ اس سے افاقہ نہ ہوا تو اگلے دن نمک اور سرخ مرچ کا نسخہ بنا کر زخم کو لپیٹ دیا جس سے زخم کی حالت بگڑنا شروع ہوگئی' پورا ہفتہ وہ لوگ اسپتال جانے کی بجائے گاؤں کے ستر فیصد کم فہم لوگوں کی مثال اتنے سیریس مسئلے پر اپنے دیسی نسخے آزماتے رہے۔

زائر شہر سے گاؤں واپس آیا اور اسے پتا چلا تو وہ فوراً بھاگ کر ان تک پہنچا اور زبردستی لڑ کر اسپتال لے آیا مگر تاخیر ہوچکی تھی۔ زہر کا اثر جوگی بابا کے جسم میں پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنے کے بعد اسے کسی بڑے شہر کے اسپتال لے جانے کی ہدایت کی تھی مگر اس کے گھر والوں نے پھر بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

زائر ابھی تھوڑی دیر پہلے جب بابا جوگی سے ملنے گیا تو گھر والوں نے اسے زنجیروں میں جکڑ کر ایک علیحدہ کمرے میں قید کررکھا تھا۔ کسی کو اس کے پاس جانے اور بات کرنے کی اجازت نہیں تھی گھر والوں کے بقول بابا کو دورے پڑنے لگے تھے اور وہ ہر قریب آنے والے کو کاٹنے کی کوشش کرتے۔

زائر کا دل بابا جوگی کے حال پر کٹ کر رہ گیا تھا۔ ان کے گھر والوں کی بے پروائی اور جہالت نے اس ملنگ صفت انسان کو کس مشکل سے دوچار کردیا تھا۔ وہ بہت دیر تک بابا کے پاس بیٹھا رہنے کے بعد جب اٹھنے لگا تو بابا نے اسے پکارا تھا۔

”اوئے پترا اوئے۔“

”جی چاچا۔“ وہ فوراً پلٹا تھا۔ بابا کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور ان کے گوشوں میں نمی چمک رہی تھی۔

”ان تحمد کے نہ جا پترا۔ تو جا میں گا تے میرے گھر والے مینوں زہر دا ٹیکا لگا کے ہمیش دی نیند سوا دیوں گے۔“ بابا جوگی کی بات پر وہ شاکڈ ہی تو رہ گیا تھا پھر ان کی حالت کے پیش نظر اس نے سر جھٹک دیا۔

”نہ چاچا! ایسا نہ سوچ تیرے گھر والے تو تجھ سے پیار کرتے ہیں پھر اب تو تیرا علاج بھی چل رہا ہے' دیکھنا تو دنوں میں بھلا چنگا ہوجائے گا۔ تو فکر نہ کر میں ادھر باہر ہی بیٹھا ہوں۔“

اس نے اپنی طرف سے پوری تسلی دی تھی اور اب گاؤں کی خاموش سرد رات میں پھر بابا کی درد بھری آواز گونج رہی تھی۔ وہ فصلوں کو پانی دینے کے بعد وہیں ڈیرے پر پڑی چارپائی پر دراز ہوگیا۔

اس کے دھیان کے پنچھی اس وقت ثانیہ عباس کے تصور کے گرد منڈلا رہے تھے جو پانچ سال کے بعد اس کی زندگی میں پھر سے لوٹ آئی تھی۔ اسے ہی سوچتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اگلی صبح وہ اٹھا تو سب سے پہلی خبر اسے کل رات بابا جوگی کی ہونے والی وفات کی ملی تھی۔ کل رات واقعی ان کے گھر والوں نے انہیں زہر کا ٹیکا لگا کر ان سے ہمیشہ کے لیے اپنی جان چھڑالی تھی۔

زائر جیسے ساکت رہ گیا تھا۔

وہ آواز جو درد بن کر گاؤں کی فضا میں گونجتی تھی' جہالت کی بھینٹ چڑھ کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی' کتے کا کاٹا وہ شخص ابدی نیند سو گیا تھا' مگر اس کے لواحقین اب اسے کفن پہنانے' غسل دینے اور اس کی چارپائی کو ہاتھ تک لگانے کو تیار نہیں تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں انہیں جراثیم نہ لگ جائیں۔

تب وہ اٹھا تھا اس نے خود بابا کو غسل دیا' کفن پہنایا اور پھر اپنے دوستوں کو بلا کر جیسے تیسے نماز جنازہ کروا کر اس بدنصیب شخص کو مٹی کے سپرد کردیا۔ وہاں قبرستان میں مٹی کے اس ڈھیر کے نیچے ایک اور انسان کی زندگی کی کہانی اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔

❁ ☆ ❁

کہنے کو محبت ہے لیکن
اب ایسی محبت کیا کرنی
جو نیند چرائے آنکھوں سے
جو خواب دکھا کر پلکوں کو تعبیر میں کانٹے دے جائے
جو غم کی کالی راتوں سے برا آس کا جگنو لے جائے
جو مشکل کردے جینے کو اور مرنے کو آسان کرے
وہ دل جو پیار کا مندر ہو اس دل کو ہی ویران کرے
اب ایسی محبت کیا کرنی؟
جو عمر کی نقدی لے جائے اور پھر بھی جھولی خالی ہو
وہ صورت دل کا روگ بنے جو صورت دیکھنے والی ہو
جو قیس بنادے انساں کو جو رانجھا اور فرہاد کرے
اب ایسی محبت کیا کرنی جو خوشیوں کو برباد کرے

رات جیسے جیسے سرکتی جارہی تھی اس کی وحشت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ نیند کی مہربان پری تھی کہ جیسے اس سے روٹھ ہی گئی تھی۔ زندگی کسی پر کیسے تنگ پڑ جاتی ہے بھلا اس سے بہتر کون جان سکتا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اس نے ایک قطعی اجنبی گھر کے دروازے پر دستک دے کر بہت بڑا رسک لیا تھا مگر فی الوقت اس کے پاس اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ بہت پہلے ایک بار وہ اس بنگلے میں آئی تھی اپنی کالج فیلو کے ہمراہ مگر یہ قیام پانچ دس منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا اپنی کالج فیلو کو وہاں چھوڑنے کے بعد وہ ڈرائیور کے ساتھ اپنے گھر واپس آگئی تھی مگر اس بنگلے کی مالکن کے پیار اور اپنائیت نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ رات بھی وہ اسی پیار اور اپنائیت کو یاد کرکے اس گھر کی طرف بڑھ آئی تھی مگر اب وہ مکین وہ بے لوث پیار لٹانے والی مالکن نہیں رہی تھی' صبح ہوگئی تھی۔

وہ بے قراری بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف آئی تھی جب اس کی سماعتوں میں عمیر کی آواز پڑی۔

”جی عذیر بھیا! میں ابھی خود سے کال کرنے ہی والا تھا آپ کو......“

اور وہ جس کا دل پہلے ہی قرار نہیں پا رہا تھا ان الفاظ پر جیسے ٹھٹک ہی تو گئی تھی۔ دوسری طرف عذیر عمیر کے الفاظ پر مسکرایا تھا۔

”کیوں خیریت......؟“

”اب خیریت کہاں' ہماری عزیز از جان' پیاری بھابی سلمیٰ یہاں پہنچ چکی ہیں۔“ کتنی کھنک اور خوشی تھی عمیر کے لہجے میں مگر عذیر کے سوال نے اس کی خوشی پر جیسے اوس ڈال دی۔

”بھابی...... کون سی بھابی...... سلمیٰ تو یہاں ہے میرے پاس' یہ تو ابھی پاکستان گئی ہی نہیں۔“ اور اس بار شاک لگنے کی باری عمیر کی تھی۔

”کیا مطلب؟ اگر سلمیٰ بھابی آپ کے پاس ہیں پھر وہ کون ہیں؟ جنہیں میں سلمیٰ بھابی سمجھ کر آپ کے کمرے میں چھوڑ آیا ہوں۔“

”کوئی حال نہیں تمہارا' نجانے کب سدھرو گے تم؟ اب پتا نہیں کسے گھسا لیا ہے گھر میں اور جانے میرے کمرے سے کیا کیا کچھ چرالیا ہوگا اس نے' عمیر کے بچے میں واپس آرہا ہوں' تجھے چھوڑوں گا نہیں۔“

اب وہ خفا ہورہا تھا۔ عمیر سوری کرنے کے بعد کال کاٹ کر سیدھا اس کے کمرے کی طرف چلا آیا' جہاں حورعین فاطمہ کھڑکی کے قریب کھڑی رسوائی کے خوف سے کسی خشک پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔

(ان شاء اللہ جاری ہے)

جھنیل، کنارہ، کنکر

نازیہ کنول نازی

رسم الفت کو نبھائیں تو نبھائیں کیسے
ہر طرف آگ ہے' دامن کو بچائیں کیسے
بوجھ ہوتا جو غموں کا تو اٹھا بھی لیتے
زندگی بوجھ بنی ہو تو اٹھائیں کیسے

کب تک دل کی خیر منائیں' کب تک راہ دکھلاؤ گے
کب تک دو گے چین کی مہلت' کب تک یاد نہ آؤ گے
بیتا دید امید کا موسم' خاک اڑائی آنکھوں نے
کب بھیجو گے درد کا بادل' کب برکھا برساؤ گے
عہد وفا یا ترک محبت' جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے ہم سے کیا منواؤ گے
کس نے وصل کا سورج دیکھا' کس پر ہجر کی رات ڈھلی
گیسوؤں والے کون تھے کیا تھے ان کو کیا جتلاؤ گے؟
فیض دلوں کے بھاگ میں ہے گھر بھرنا بھی لٹ جانا بھی
تم اس لطف وکرم پہ پیارے کتنے دن اتراؤ گے؟

"کون ہیں آپ؟" دروازہ رسان سے پش کرتے ہوئے عمیر کمرے میں داخل ہوا تھا' حورعین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرآئیں۔

"اسے کہتے ہیں شکل موساں تے کرتوت کافراں' میں پوچھتا ہوں یہی گھر ملا تھا آپ کو ڈکیتی کرنے کے لیے۔"

"میں ڈکیت نہیں ہوں۔" بے لچک لہجے میں عمیر کے گستاخانہ الزام پر وہ تڑپ اٹھی تھی۔

"میری طرف دیکھو میرے ہاتھ خالی ہیں۔ کیا ڈکیت ایسے ہوتے ہیں؟"

"میں کچھ نہیں جانتا' آپ مجھے بتائیں آپ کون ہیں؟"

اس کے آنسوؤں سے نظر چراتا وہ اب رخ پھیرے کھڑا تھا۔ حورعین کی ہمت جواب دے گئی اسے جو خدشہ لاحق تھا وہ ہو گیا تھا بھی وہ سر جھکاتے ہوئے بولی تھی۔

"حور...... حورعین فاطمہ۔"

"کون حورعین فاطمہ؟" وہ پوچھ رہا تھا اور اب وہ اسے کیا بتاتی کہ حورعین فاطمہ کون تھی۔

"بہت لمبی کہانی ہے حورعین فاطمہ کی' کہاں سنو گے تم؟"

"مگر میں سننا چاہتا ہوں' یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کس مقصد کے تحت جھوٹ بول کر اس گھر میں گھسی ہیں؟" وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ حورعین نے آنسو پونچھ لیے۔

"میں جھوٹ نہیں بولتی' میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ تم خود غلط فہمی کا شکار ہوئے تھے اور میرا یہاں آنے کا کوئی مقصد نہیں' سوائے عزت کی چھت کے۔"

"تو پھر آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ گھر ہم نے ابھی بے آسرا لوگوں کے لیے وقف نہیں کیا' آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ فوراً سے پیش تر آپ یہاں سے چلی جائیں۔" بے لچک لہجے میں کہتے ہوئے اب وہ نیا حکم جاری کر رہا تھا۔ اس کے آنسو پھر روانی سے بہنے لگے۔

"میں آپ کے آنسوؤں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں سارے گھر والوں کے سامنے آپ کی بے عزتی نہ کروں تو پلیز شرافت سے چلی جائیں۔" حورعین کی خاموشی نے اسے مزید تپایا تھا' تبھی وہ بولی تھی۔

"چلی جاؤں گی' میں یہاں ہمیشہ رہنے کے ارادے سے نہیں آئی تھی۔ صرف ہانیہ صفدر کا حوالہ مجھے اس بنگلے کی طرف لے آیا تھا۔"

"ہانیہ صفدر ..... ہانیہ صفدر کو کیسے جانتی ہیں آپ؟" اب کے وہ چونکا تھا۔ حورعین نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔

"میری کالج فیلو تھی' چند سال قبل میں اسی کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی۔"

"آئی سی' کیا مما سے ملی تھیں آپ؟"

"ہوں ملی تھی۔ بہت پیار دیا تھا انہوں نے مجھے' اسی لیے تو بے آسرا ہوکر اس در کی طرف چلی آئی۔" اس بار اس کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی' عمیر کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہوا۔

"کیا میں جان سکتا ہوں' آپ نے اپنا گھر کیوں چھوڑا؟؟"

"میں نے نہیں چھوڑا' حالات اور تقدیر کی طرح میرے گھر کی دیواریں بھی مجھ پر تنگ پڑ گئی تھیں۔"

"کیوں؟" وہ سب جان لینے پر بضد تھا۔ حورعین کا دل درد سے کراہ اٹھا۔ کتنا مشکل تھا گزرے ہوئے دنوں کا سفر کرنا' بیتی ہوئی گھڑیوں کو یاد کرنا مگر ..... اسے یہ سفر کرنا تھا۔

گالوں پر پھسلتے آنسوؤں کے ساتھ اسے بیتی ہوئی گھڑیوں کو یاد کرنا تھا۔

❀ ❀ ❀

ثانیہ عباس' حورعین فاطمہ اور ہانیہ صفدر تینوں کالج فیلو تھیں۔

حورعین چھوٹی سی تھی جب اس کی مما کی ڈیتھ ہوگئی۔ اس کے پاپا ایک نیک اور پرہیزگار آدمی تھے' شہر میں ان کے برابر کا دوسرا رئیس آدمی نہیں تھا۔ اس کی مما کی رحلت کے بعد اس کے پاپا نے کچھ اس طرح سے اس کی پرورش کی تھی کہ اسے کبھی زندگی میں ماں کے وجود سے محرومی کا احساس ہی نہیں ہوا' اسے بھولے سے بھی یاد نہیں آتا تھا کہ بچپن میں اس نے کبھی چل کر پانی بھی پیا ہو' گھر میں نوکروں کی بڑی فوج موجود تھی' اس کی ایک پکار پر ملازم بھاگے آتے تھے۔ بچپن میں ہی اس کا اپنا علیحدہ شاندار کمرا تھا' وہ اسکول لائف میں آئی تو اس کے محبوب باپ نے اسے گاڑی بھی علیحدہ خرید کردے دی۔

صدقہ' خیرات کرنے میں بھی وہ کسی قسم کے بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ کالج لائف میں ہانیہ صفدر اور ثانیہ عباس کا شمار اس کی بہترین دوستوں میں ہوتا تھا۔ ثانیہ اور ہانیہ کے پاپا اس کے پاپا کے قریبی دوستوں میں سے تھے' اس کے پاپا کی خواہش تھی کہ وہ صحافت کا پیشہ اپنائے' خود اسے بھی ساری دنیا کی معلومات رکھنے میں دل چسپی تھی لہٰذا اپنے پاپا کی خواہش پر کالج لائف سے ہی اس نے صحافت کو جوائن کرلیا تھا۔

کالج میں جب بھی وہ ہانیہ اور ثانیہ کے ساتھ فرصت میں بیٹھتی اس کا موضوعِ گفتگو "پاکستان اور اس کی بقاء" ہوتا تھا۔ ان تینوں نے بہت سے ایسے علاقوں کا وزٹ کیا تھا جہاں بسنے والے لوگ غربت کی نچلی ترین زندگی' انتہائی کسمپرسی کے ساتھ بسر کرنے پر مجبور تھے۔

صرف اپنے اکاؤنٹس کا نمبری نوٹوں سے بڑھانے والے لوگ اقتدار میں آکر کیسے لوگوں کو "اجتماعی خودکشی" پر مجبور کردیتے تھے' اس نے دیکھا۔ غربت اور جہالت کی چکی میں پستے بہت سے دیہات کا وزٹ کرنے کے بعد اس نے ایک این جی او بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ جس کا مقصد ہر طرح کے ظلم کا شکار لوگوں کو ریلیف دلانا تھا۔

ہر روز کالج سے واپسی پر شام کی چائے اپنے پاپا کے ساتھ پینے کے دوران وہ ان سے اپنے ارادے اور خواب شیئر کرتی اور جواب میں اس کے پاپا اسے مکمل سپورٹ کی

یقین دہانی کرواتے' انہیں خوشی تھی کہ ان کی بیٹی نے زندگی کے مختصر سفر کے لیے بہت سے دوسرے بے راہ رو نوجوانوں کی طرح غلط راستے کا انتخاب کرنے کی بجائے ایک بامقصد اور قابل ستائش راہ کا انتخاب کیا تھا۔

انہی دنوں امریکہ میں "ورلڈ ٹریڈ سینٹر" کی تباہی کا شور اٹھا اور ساتھ ہی مسلمانوں کی تضحیک و بربادی کا بھی کئی کئی سال اپنا وطن چھوڑ کر اپنا تن من دھن امریکہ پر قربان کرنے والے پاکستانیوں کے ساتھ "سپر پاور" نے جو شرمناک سلوک کیا اس کے بعد اسے اور اس کے پاپا کو قوی امید تھی کہ اب پاکستانی حکومت اور عوام ایران کی طرح امریکہ کے نام پر تھوکنا بھی پسند نہیں کریں گے مگر ..... اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وطن عزیز کے سالار نے "صرف ایک ورلڈ ٹریڈ سینٹر" کی خودساختہ تباہی پر سپر پاور کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے خود کو اور ایک ایٹمی پاور کی حامل اسلامی مملکت کو بطور غلام اسی ملک کے سپرد کردیا۔ جواب میں امریکہ بہادر نے جس درندگی سے عراق اور افغانستان میں لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کو بربریت کے ساتھ موت کی نیند سلایا اس پر خود انسانیت کا سر بھی شرم سے جھک گیا۔

عراق اور افغانستان کی شرمناک تباہی کے بعد وطن عزیز میں دشمن ملک کی دراندازی نے اسے اور اس جیسے دردمند دل رکھنے والے بہت سے دوسرے پاکستانیوں کی راتوں کی نیند اڑادی تھی۔

طاقت کے نشے میں چور ایک مست ہاتھی چیونٹیوں کی طرح اُمت مسلمہ کو کچل رہا تھا اور ساری دنیا چپ تھی یوں جیسے مسلمانوں کے جسموں سے بہنے والا خون خون نہیں پانی ہو۔ انہی دنوں جب کہ ان کا سیکنڈ ایئر بھی مکمل نہ ہوا تھا کہ ثانیہ کے پاپا ابیروڈ شفٹ ہوگئے۔ ثانیہ نے اسے بتایا تھا کہ اس کے ممی پاپا کی لو میرج تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے خاندان سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ تنہائی' اکیلے پن اور اپنوں کی بے رخی نے انہیں دیارِ غیر شفٹ ہونے پر مجبور کیا تھا مگر ..... دیارِ غیر بھی انہیں راس نہیں آسکا تھا اور کچھ ہی عرصہ میں ان کی ڈیتھ ہوگئی۔

اسے یاد تھا ان دنوں اس کے پاپا بہت ملول رہا کرتے تھے مگر وہ پھر بھی ان سے اپنے ناز اٹھوانا نہیں بھولی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہوکر منہ پھلا لینا اس کی

عادت بن چکی تھی مگر اس کے پاپا بنا اکتائے اس کے ناز اٹھاتے۔ وہ غصے میں گاڑی لے کر نکل جاتی تو پیچھے ان کی جان پر بن جاتی۔ کالج سے فراغت کے بعد اس کے پاپا نے اسے مزید تعلیم کے لیے امریکہ بھجوا دیا۔

وہ امریکہ آنے کے حق میں نہیں تھی نا ہی اس کے پاپا یہ چاہتے تھے مگر یہ ثانیہ عباس تھی جس کے اصرار نے اسے امریکہ آنے اور وہاں امریکیوں کا مسلمانوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک دیکھنے پر مجبور کیا' ان دنوں اسے گمان بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی کیا کروٹ لینے والی ہے۔

وہ امریکہ آئی اس نے یہاں انسانی تفریق اور بے حسی دیکھی' کتے کے پلے کو بھی پیار کرنے والے اور ان کا خیال رکھنے والے امریکیوں کا' مسلمان اور پاکستانیوں کے ساتھ بدتر رویہ اور سلوک دیکھ کر جہاں وہ شاکڈ اور دکھی ہوئی وہیں دوسرا دھچکا اسے پاکستان میں اپنے محبوب باپ کی دوسری شادی کی خبر سن کر لگا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پر جان لٹانے والے اس کے پاپا عمر کی اس نہج پر ایسا کوئی قدم اٹھائیں گے' اپنی ماں کے کھونے کے بعد اپنے آئیڈیل باپ پر کسی اور کا قبضہ اسے گوارا ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بیمار پڑ گئی تھی' ذہنی انتشار اور غصے کے سبب اس نے پاکستان اور اپنے گھر سے بھی مکمل لاتعلقی اختیار کرلی۔ اس نے یہ جاننے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ اگر اس کے باپ نے ایسا کیا تو کیوں کیا؟

جن دنوں اسے یہ اطلاع دی گئی اس کے امتحانات چل رہے تھے مگر اس خبر نے اسے ذہنی طور پر یوں اپ سیٹ کیا کہ وہ امتحان بھی نہ دے سکی۔

ثانیہ عباس اور اس کے فیاسی اشعر نے ان دنوں اس کی دوستی کا خوب حق نبھایا تھا' ہر روز وہ اسے کہیں نہ کہیں گھمانے لے جاتے تھے۔ انہی دنوں امریکہ میں اس کی پہلی ملاقات سر جاوید ہمدانی کے ساتھ ہوئی تھی وہ دل کے مریض تھے اور ہمیشہ کہتے تھے۔

"اس دل میں امت مسلمہ پر ہونے والی زیادتیوں اور مظالم کا اتنا درد ہے کہ بے چارہ چھلنی ہوکر رہ گیا ہے۔"

وہ ایک وفد کے سلسلے میں وہاں آئے تھے اور تقریباً تین ہفتے امریکہ میں ان کا قیام رہا تھا' جتنے دن وہ امریکہ میں رہے حورعین روز ان سے ملنے جاتی رہی' بے حد رعب دار چہرے والے سر جاوید ہمدانی کی خوب صورت آنکھوں کے گوشے ہمہ وقت نم رہتے تھے۔ انہوں نے حورعین کو بتایا تھا کہ وہ پاکستان میں ہسٹری کے پروفیسر تھے اور ایک پاکستانی اخبار میں کالم لکھتے ہیں' ان کے دل میں مسلمانوں اور خصوصاً اپنے ہم وطن پاکستانیوں کے لیے بہت درد تھا' وہ حبیب خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور علامہ اقبال کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے تھے۔ حورعین نے ان کے ہاتھ میں اکثر علامہ اقبال کی اردو اور فارسی کتابوں کا کوئی نہ کوئی نسخہ دیکھا تھا' انہی کی وجہ سے اس نے بھی اقبال کو پڑھنا شروع کیا تھا اور پھر جیسے وہ ان کی شیدائی ہوکر رہ گئی تھی۔

کیسی پیشن گوئیاں تھیں جو اس مرد حر نے سالوں پہلے اپنے الفاظ میں اقوام عالم کے سامنے کھول کر رکھ دی تھیں۔ فارسی اور اردو ہندی کلام میں ان کی ہر غزل' ہر نظم' ہر شعر اپنے اندر گہرے سمندر چھپائے ہوئے تھا۔ وہ سوچتی تھی سالوں پہلے اقبال کو کیسے پتا چل گیا تھا کہ مسلمان اپنی کاہلی' بزدلی اور ناعاقبت اندیشی کے سبب ذلت و رسوائی کا شکار ہونے والے ہیں؟ ساری دنیا میں دہشت پھیلانے والے انگریز مکڑی کے جالوں کی طرح مسلم ممالک کی سالاروں کو اپنے جال میں پھنسا کر ان ممالک کے بے قصور معصوم ایشیائی مسلمانوں پر اپنی طاقت کا قہر توڑنے والے ہیں۔

سالوں پہلے اقبال کو کیسے خبر ہوگئی تھی کہ اہل مغرب اقوام مشرق کے ساتھ مکاری اور سازشوں کا خونی کھیل کھیلنے والے ہیں۔

ان دنوں وہ ساری ساری رات جاگ کر اقبال کو پڑھتی تھی اور روتی رہتی تھی۔

بعد ازاں سر جاوید ہمدانی پاکستان چلے گئے کچھ ہی عرصے کے بعد اسے پاکستان میں اپنے پاپا کے شدید علیل

ہونے کی خبر ملی تھی تبھی وہ سارے گلے شکوے بھلا کر فوراً پاکستان چلی آئی اور یہاں آکر جب اس نے اپنے محبوب باپ کی حالت دیکھی تو کلیجہ منہ کو آگیا' اس کے پہلے والے صحت مند ہنستے مسکراتے پاپا تو تھے ہی نہیں' محض چند ہفتوں کے اندر وہ جیسے ختم ہوکر رہ گئے تھے۔ وہ کتنی دیر ان سے لپٹ کر روتی رہی تھی۔

اس کی سوتیلی ماں کے لہجے میں گو اس کے لیے کھوٹ اور منافقت تھی مگر ...... پاپا ہی پاپا... وہ اپنے تمام کام سیدھے کر چکی تھیں' بڑی ہوشیاری سے انہوں نے اس کے پاپا کو بنا بنایا کاروبار اپنے بھائیوں کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

اپنے باپ کی زندگی میں ہی وہ جیسے بے بس ہوکر رہ گئی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی گرتی ہوئی صحت نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا تبھی اس پر حقیقت کا ادراک ہوا کہ اس عورت نے اس کے پاپا کی سادگی اور رحم دلی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کے گھر میں ایک ملازمہ کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے اس کے پاپا کو بلیک میل کیا اور بعد میں ان کی ساکھ خراب کرنے کی دھمکی دے کر محض ان کی دولت اور جائیداد ہتھیانے کے لیے ان پر نکاح کا دباؤ ڈالا۔

پاکستان میں ان دنوں لبرل حکومت کی طرف سے نئے پاس ہونے والے خواتین کے حقوق کے قانون کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے بالآخر وہ عورت اس کے باپ کے ساتھ نکاح کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی اور اس کے پاپا جنہوں نے اس کی مما کی رحلت کے بعد عورت نام کا باب ہی اپنی زندگی میں ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تھا صرف اپنی بیٹی کی نظروں سے نہ گرنے کے لیے اس کی دھمکیوں اور سازش کا شکار ہوکر کسی بے بس پرندے کی طرح محض پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ حورعین کو اپنی کوتاہی اور بدگمانی کا احساس ہوا تو وہ بہت روئی مگر تب تک بساط پلٹی جاچکی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں نے اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے پچھلے تین ماہ سے انہیں خوراک میں سلو پوائزن دینا شروع کر رکھا تھا جس کے نتیجے میں وہ اب اس حالت میں تھے کہ ڈاکٹرز نے بھی جواب دے دیا تھا۔

اپنی وفات سے چند روز قبل انہوں نے اپنے ذاتی وکیل کو بلوا کر اپنی تمام جائیداد اور کاروباری شیئرز کا وارث اپنی بیٹی حورعین فاطمہ کو بنا دیا تھا۔ وصیت کے کاغذات بھی وکیل کے پاس ہی رکھوائے تھے۔

حورعین پر جہاں اپنے محبوب باپ کی اچانک جدائی سے پہاڑ گرا وہیں اس کی جوان سوتیلی ماں بھی وکیل سے وصیت سن کر سنانے میں آ گئی تھی۔ اس کا کھیل فلاپ ہوگیا' اب تک کی محنت اکارت گئی تھی' تبھی اشتعال میں اس نے حورعین پر گھر کے دروازے بند کر دیے۔

بعد ازاں وکیل کی مداخلت اور چچا جانی صفدر کے پاپا کرنل مصطفی کی کوششوں سے اسے گھر واپس مل گیا مگر سکون نہیں ملا۔

سارا سارا دن وہ اپنے کمرے میں بند اپنے پاپا کو یاد کر کے روتی رہتی یا پھر اداس تتلی کی مانند کبھی لان میں کبھی لاؤنج میں گھنٹوں سوچوں میں گم بیٹھی رہتی۔ اسی تنہائی اور اکیلے پن سے اکتا کر اس نے پھر سے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور سر جاوید ہمدانی کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔

جاوید ہمدانی صاحب ہسٹری کے پروفیسر تھے اور اکثر لیکچر کے لیے ان کا موضوع گفتگو "پاکستان واحد اسلامی ایٹمی پاور اور امریکہ کی اجارہ داری" ہوا کرتا تھا۔ لیکچر کے دوران اکثر جذباتی ہوتے ہوئے وہ رو پڑتے تھے۔

اقبال کی طرح ان کے اندر بھی اپنی قوم کے لیے بڑا درد تھا۔ وقت کے فرعون کے لیے ان کے ایک ایک لفظ سے نفرت اور بغاوت کی بو آتی تھی۔ اس روز لیکچر کے دوران انہوں نے اپنی کلاس سے پوچھا تھا۔

"اسٹوڈنٹس...... ! آپ میں سے کتنے لوگ انٹرنیٹ استعمال کرتے ہیں؟" ان کا انداز ہمیشہ سے یونہی انوکھا اور چونکا دینے والا تھا شاید تبھی ان کے طلبہ اور طالبات ان کے لیکچر کو مس کرنے کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ اس وقت بھی ان کے سوال کے جواب

میں کئی ہاتھ بلند ہوئے تھے۔

"کیوں؟" بلند ہوئے ہاتھوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے انہوں نے بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"معلومات کے لیے سر!" کلاس کے ایک کونے سے پھنسی پھنسی سی آواز ابھری تھی۔

"گڈ! تو اب تک کیا معلومات حاصل ہوئی آپ کو؟" ان کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ بکھری تھی مگر ان کے سوال کا کوئی جواب نہ مل سکا۔

"میں جانتا ہوں وہ کون سی معلومات ہیں' جنہیں جاننے کے لیے آپ رات رات بھر اپنے کمروں میں جاگ کر کمپیوٹر کے سامنے گھنٹوں اپنا وقت برباد کر کے حاصل کرنا چاہتے ہیں' یہی تو کارنامہ سرانجام دیا ہے ہمارے لبرل جرنیل نے کہ رہی سہی اسلامی معاشرے کی دیوار بھی گرا دی۔ دشمن جانتا ہے کہ نوجوان کسی بھی ملک کا سرمایہ ہوتے ہیں اسی لیے تو اس نے آپ لوگوں کی رگ رگ میں انٹرنیٹ' کیبل' فیس بک اور موبائل فون کا نشہ اتار دیا ہے۔ سونے پر سہاگہ اس زہر تک رسائی اتنی آسان کر دی کہ کوئی چاہتے ہوئے بھی خود کو تباہ ہونے سے بچا ہی نہیں سکتا۔ آزادی کے نام پر جس بے حیائی کو اس ملک میں فروغ دیا جا رہا ہے میں اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہی کو ابھی سے محسوس کر رہا ہوں۔ بہت دل چسپ حقیقت ہے کہ گناہ میں لذت ہے اور نیکی میں راحت مگر ہمیں راحت نہیں چاہیے ہم لذت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اس لذت کے پیچھے کہ جس کی طلب نے ہمیں راہ حق سے تو بھٹکایا ہی تھا' خونی رشتوں کی تمیز بھی چھین لی اللہ رب العزت کی قائم کردہ حدود کہ جن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پہلے بھی ایک لمحے کے لیے تو ہمارا ضمیر ہمیں ملامت کرتا تھا۔ اس معلومات کے چکر نے وہ احساس بھی ختم کر دیا۔ اب ماں' بہن' بیٹی ہو ہمیں نہیں پتا چلتا کہ وہ نفس کا گھوڑا بے لگام ہونے پر ہمارے ہاتھوں محفوظ رہ سکیں گی کہ نہیں۔ یہی دشمن کی بڑی کامیابی ہے وہ وقت جو نماز اور قرآن کی تلاوت میں صرف ہونا چاہیے تھا۔ فیس بک اور موبائل پر لمبی لمبی کالوں کی نذر ہو کر برباد ہوتا محسوس ہی نہیں ہو رہا ایسا نشہ چڑھتا جا رہا ہے گمراہی کا ہم پر کہ ہمیں ملکوں کی تباہی کا کوئی احساس ہی نہیں۔ حکومت ہماری بربادی کے لیے کیسے کیسے لائحہ عمل ترتیب دے رہی ہے یہ جاننے کی بھی فرصت نہیں رہی۔" حسب معمول وہ جذباتی ہو گئے تھے مگر ان کے طلبہ و طالبات کو دوبارہ ان کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوئی اسی ہفتے وہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت گرفتار ہو کر امریکہ کے حوالے کر دیے گئے تھے۔

ان کے طلبہ اور گھر والے ان کی اچانک گمشدگی پر پریشان تھے مگر چار ماہ تک انہیں ہوا نہیں لگنے دی گئی کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟

بہت دنوں کے بعد میڈیا کے تھرو انہیں اس بات کی خبر ملی تھی کہ جاوید صاحب کو ڈالرز کے عوض کالے پانیوں کی نذر کر دیا گیا ہے۔ اس خبر کے منظر عام پر آنے کے بعد حورعین نے ایک مرتبہ پھر تعلیم کو خیرباد کہہ کر صحافت کی دنیا میں اپنے فرائض سرانجام دینے شروع کر دیے تھے وہ ہر صورت اپنے محبوب استاد کی رہائی چاہتی تھی مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا۔

❁ ❁ ❁

ان دنوں وہ افغانستان کے شہر قندھار میں تھی جب اسے یہ خبر ملی کہ پاکستانی حکومت نے مساجد گرانے کے شرمناک اقدام کے بعد اسلام آباد میں موجود لال مسجد پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ لال مسجد کہ جس سے منسلک جامعہ اور جامعہ فریدیہ کا شمار ملک کے بہترین مدارس میں ہوتا تھا جہاں ہزاروں طلبہ و طالبات زیر تعلیم تھے۔ دس سال کے بچوں' یتیم بچیوں اور غریب طلبہ و طالبات کی بڑی تعداد جہاں زیور تعلیم سے آراستہ ہو رہی تھی' اسی لال مسجد پہ کمانڈو جرنیل نے اپنی ہی افواج کو سرحدوں سے بلا کر دھاوا بول دیا تھا۔

صرف اپنے سامراجی خدا کی خوشنودی اور اطاعت کے لیے اس نے کچھ یوں بساط بچھائی کہ ملک کے عوام بھی ڈگمگا کر رہ گئے صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟ کروڑوں پاکستانیوں کی طرح حورعین کے لیے بھی وہی سچ تھا جو مفاد پرست میڈیا دکھا رہا تھا مگر...... وہ عقل کی اندھی نہیں تھی اس کا لاشعور اسے باور کروا رہا تھا کہ سچ وہ نہیں ہے جو کیمرے کی آنکھ دکھا رہی ہے بلکہ سچ وہ ہے جسے مسجد کی دیواروں کے اندر مسمار کیا جا رہا ہے صرف اس جرم میں کہ انہوں نے فرعونیت کے خلاف آواز کیوں اٹھائی؟

اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کا نعرہ کیوں لگایا؟ وہ مساجد و مدارس کہ جنھوں نے ہمیشہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی حفاظت کی۔ انہیں مسمار کرنے پر شور کیوں مچایا؟ لوگ واہ واہ کر رہے تھے۔

اپنے لبرل جرنیل کی مکاریوں سے بے خبر اپنے ہی ملک کے معصوم بچوں اور بچیوں پر ٹوٹی قیامت کو سراہ رہے تھے۔ شیطانی قوتوں اور اسلام کے مابین بپا ہونے والی اس انوکھی جنگ کو محض عبدالرشید غازی اور مشرف کی جنگ سمجھ رہے تھے انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ وہ کس بدبختی کا شکار ہو رہے ہیں۔

اس وقت سر جاوید ہمدانی کی بیٹی اس درس گاہ میں زیر تعلیم تھی' حورعین نے اسے وہاں سے نکل آنے کا مشورہ دیا تھا۔ میڈیا پر بار بار دکھائی جانے والی فوٹیج سے بدگمان (کہ جس میں بچوں اور بچیوں کی یرغمالی کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے محبوب استاد کی بیٹی اس جنگ سے نکل آئے مگر اس بچی کا پیغام سن کر وہ شاکڈ رہ گئی تھی' اس نے کہلوایا تھا۔

"انسان جب سارے گناہوں سے تھک کر بے آسرا ہو جاتا ہے تو اسے اللہ یاد آتا ہے ساری دنیا سے ٹھوکریں کھا کر وہ اللہ کے گھر کا رخ کرتا ہے تاکہ اسے سرخروئی اور پناہ مل جائے اور تم کہہ رہی ہو میں یہاں سے بھاگ آؤں؟ بھاگ کر آ جاؤں گی تو کہاں جاؤں گی؟ اللہ کے گھر سے بھاگ آنے والوں کو کہاں ٹھکانا ملتا ہے؟ یہاں آگ لگی ہے اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متوالوں اور جاں نثاروں پر انہی کے اسلامی ملک میں قہر ڈھایا جا رہا ہے اور تم کہتی ہو میں یہ میدان چھوڑ کر آ جاؤں' اس بے بودار مٹی سے بنے تن کو لے کر باہر آ بھی گئی تو کتنے دن سنبھال کر رکھوں گی محشر کے روز جب آقا علیہ السلام اپنی امت کی شفاعت کے لیے اللہ رب العزت کا رحم طلب کریں گے تو میں کس منہ سے ان کی شفاعت طلب کروں گی؟ مجھے قیامت صدیوں پر محیط نہیں لگتی حورعین! یزید نے بھی طاقت کے نشے میں یونہی آل رسول پر ظلم ڈھایا تھا مگر کیا ہوا؟ آج تک اس کی نسل اس کے فعل پر پچھتا رہی ہے یہ بھی پچھتائیں گے۔ ہمیں جنت کے بدلے جان کا سودا مہنگا نہیں ہے تم کہو اپنے میڈیا سے کہ وہ یہاں آ کر ان سرنگوں اور بنکرز کی تصویریں بنائیں جس کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے' ہمیں دکھائیں کہ وہ ہتھیار کہاں ہیں جس کا الزام یہ ہم پر لگا رہے ہیں' میں جانتی ہوں' ہمیں کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ہمارے مرنے کے بعد یہاں ہماری اموات کو جائز قرار دینے کے لیے اسلحہ رکھوا دیا جائے گا مگر تب کوئی اس کا پول کھولنے والا نہیں ہوگا' ہم نے اپنا معاملہ اپنے رب کے سپرد کر دیا۔ بے شک وہی انصاف کرنے والا ہے' یہ گولیوں سے چھلنی دیواریں یہ جا بجا بکھرے قرآن پاک کے صفحات' ہمارے جسموں کے اڑتے چیتھڑے یہ گواہی دیں گے کہ یہاں کیسا "کربلا" برپا کیا گیا ہے۔ میں تمہیں آخری خط لکھوں گی حورعین! مگر اس سے پہلے یہاں آؤ اور دیکھو یہ ننھی معصوم پریاں' جن کے ہاتھوں میں ڈنڈے دکھا دکھا کر تمہارے میڈیا نے ہمیں رسوا کیا ہے۔ آ کر دیکھو کیسی سہمی بیٹھی ہیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ پر ہوا' پانی' خوراک' گیس سے محرومی بھی انہیں وقت کے یزید کے سامنے نہیں جھکا سکی جو سر صرف اللہ رب العزت کے سامنے جھکنا جانتے ہوں وہ پھر بھی کسی نمرود' کسی فرعون' کسی یزید کے سامنے نہیں جھکتے۔ تم لوگ میڈیا پر صرف مولانا عبدالعزیز کے مسجد سے فرار کی فوٹیج پر گمراہ ہو سکتے ہو مگر وقت کے فرعون کے سامنے اپنی بقا اور تشخص کے لیے دیوار بن کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ یہ جاننے کی کوشش

نہیں کر سکتے کہ ہم نے خود مجبور کر کے عبدالعزیز صاحب کو کیوں باہر بھیجا؟“

سترہ اٹھارہ سالہ اس بچی کے الفاظ نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی حق اور باطل کی جنگ میں بظاہر باطل نے طاقت کے بل پر حق کا گلا گھونٹ دیا تھا مگر درحقیقت لوح محفوظ میں بدبختی اور پچھتاوے کا ایک اور باب ہمیشہ کے لیے درج ہو چکا تھا۔ وہ کوئی اسکالر نہیں تھی کہ اللہ اور اس کے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی سرخروئی کے لیے کلمہ حق بلند کرتی اور بھٹکے ہوئے بدنصیب لوگوں کو راہ راست کی طرف لاتی نہ ہی وہ کوئی مشہور و معروف رائٹر تھی کہ اپنے قلم سے اپنے مسلمان ہونے کا حق ادا کرتی اور اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کو حق اور سچ کی پہچان کرواتی پھر بھی اس کا دل کٹ رہا تھا۔

نظر کے سامنے اس وقت جامعہ حفصہ سے متعلق ڈاکومنٹری فلم چل رہی تھی یہ ڈی وی ڈی اس کی خواہش پر اس کی ایک دوست نے اسے ارسال کی تھی اسی کے ساتھ اسے ”عینی“ کا آخری خط بھی موصول ہوا تھا جو اس بچی نے جامعہ حفصہ میں اپنی شہادت سے قبل اس کے نام تحریر کیا تھا۔ ڈاکومنٹری فلم میں ایک غیر مسلم جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کو اندر سے دکھا رہا تھا۔ بے حد نفاست کے ساتھ وہاں بہترین تعلیم اور طلبہ وطالبات کی ضروریات کی ہر شے موجود تھی' چھوٹی سی کینٹین جہاں نمکو ٹکٹ' جوس اور اسی طرح کی دوسری استعمال کی چیزیں دستیاب تھیں۔ طالبات کے لیے ایک بے حد نفیس چھوٹے سے کمرے میں رنگ برنگی چوڑیاں' تالپس' جیولری' پونیاں اور ایسی ہی دیگر اشیاء بھی موجود تھیں۔ عبدالرشید غازی اس غیر مسلم وزیٹر کو پوری عمارت دکھا رہے تھے وہاں کوئی سرنگ' کوئی خفیہ تہہ خانہ یا اسلحہ وغیرہ نہیں تھا جس کا ان پر الزام لگایا جا رہا تھا۔ ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں درجنوں طالبات قرآن پاک کھولے اس مقدس کتاب کی تلاوت کر رہی تھیں بالکل چھوٹی چھوٹی معصوم بچیاں......

ایک طرف شفاف حوض میں جامعہ فریدیہ کے معصوم صورت طلب نماز عصر کے لیے مل کر وضو کر رہے تھے۔ حورعین کا دل کٹ کر رہ گیا' ایک غیر مسلم اس پاکیزہ درس گاہ کو کلیئر کر رہا تھا اور اس عمارت کے اندر رہنے والے معصوم لوگوں کی سچائی کو دنیا کے سامنے لا رہا تھا جب کہ ایمان والے خود کو مسلمان کہلانے والے اللہ اور اس کے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے والے محض چند ٹکوں کی خاطر ایک ظالم جرنیل کے حکم پر اپنا ایمان اور آخرت داؤ پر لگا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ بنا سچائی جانے اپنے ہی ملک کے معصوم باشندوں کا خون بہانے کو تل گئے تھے۔ قیامت بھلا اس سے بڑھ کر کیا ہوتی تھی؟ نظر کے سامنے جامعہ حفصہ کی ایک بچی پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔

”اے اللہ! ہماری لاشیں تو گریں گی مگر مساجد قائم رہیں گی ہمارے خون کی ندیاں تو بہیں گی مگر اسلام کی عظمت پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ اے اللہ! تو جانتا ہے ہمیں دھمکیاں دی جا رہی ہیں' رات دن ڈرایا جاتا ہے ہم یہ کر دیں گے ہم وہ کر دیں گے۔ اے مالک! ہم کچھ نہیں جانتے' ہمیں صرف اتنا پتا ہے کہ ہم اپنی جانوں کا مالک تجھے جان کر تیرے رستے میں نکل آئے ہیں۔ اے اللہ! تیرے لیے اگر ہمیں اپنی جان بھی دینی پڑی تو ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے جانیں دے دیں گے۔ یا اللہ! تیرے دین کی سرخروئی چاہیے حاکم الحاکمین تیرے دین کی سرخروئی چاہیے تو ہماری جانوں کو قبول کرلے' ہمارے بھائیوں کو جزائے خیر عطا کر' مساجد کی عظمت کی خاطر' قرآن کے تقدس کی خاطر' اسلامی نظام کی خاطر' جان دینے کے فیصلے ہو چکے ہیں' وصیتیں لکھی جا چکی ہیں' کشتیاں جلائی جا چکی ہیں' واپسی کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں اب شریعت ہوگی یا شہادت ہوگی۔ اے اللہ! کبھی ہمیں کہا جاتا ہے کہ یہ بنیاد پرست ہیں' کبھی کہا جا رہا ہے کہ جاہل ہیں' کبھی کہا جاتا ہے دہشت گرد ہیں۔ اے اللہ! ہم نے یہ سارے القابات تیری محبت میں قبول کر لیے۔“ حورعین کی آنکھیں بے دریغ آنسو لٹا رہی تھیں اور اس کا دل جیسے کٹتا جا رہا تھا۔ وہ اگر مان بھی لیتی کہ وہ لوگ غلط تھے تو پھر کیا طریقہ تھا غلطی کو سدھارنے کا جو سلوک کوئی غیر مسلم بھی نہ کرتا' وہ سلوک اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والے ایک بظاہر مسلم حکمران نے کر دیا تھا۔ صرف ایک ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کا بدلا لینے کے لیے سپر پاور ملک نے تین اسلامی ممالک کو تہس نہس کر کے وہاں کروڑوں لوگوں کو کچل کر مسل کر رکھ دیا تھا جب کہ اس تباہی میں کسی بھی طور سے مسلمان ملوث نہیں تھے پھر بھی ان کی زندگیوں کو تہس نہس کر دیا گیا تھا۔ لاشوں کے ڈھیر لگا دیے گئے تھے' نفرت کے سمندر میں ہر پاکستانی کو ڈبو ڈبو کر تباہ و برباد کر دیا گیا تھا اور یہاں جامعہ حفصہ کی تباہی پر سب یوں خاموش تماشائی بنے تھے جیسے یہاں کا معاملہ ہی نہ ہو' جیسے مرنے والے وہ شہدا ان کے کچھ لگتے ہی نہ ہوں' جیسے قیامت کے روز انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سامنا ہی نہ کرنا ہو' ان کی شفاعت کی ضرورت نہ ہو۔

وہ چلانا چاہتی تھی' چلا چلا کر ہر فرد سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا جامعہ حفصہ میں قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے والی کمسن دہشت گرد طالبات نے ملکوں کے ملک تباہ کیے' دہشت گردی کی تعلیم پانے والے لال مسجد کے طلبا نے دنیا کے امن کو نقصان پہنچایا اگر وہ لوگ کسی اور دوسرے ملک کے شہری ہوتے تو کیا یوں ان کی جانوں سے کھیلا جاتا؟ ان پر یوں دہشت گردی کا لیبل لگا کر اصل حقائق چھپا کر انہیں اپنے ہی ملک میں اپنوں کی آنکھوں کے سامنے محض طاقت کے بل بوتے پر [illegible] شہید کیا جاتا؟ وہ ہاتھ جنہوں نے ان پر گولیاں برسائیں' کیا روز محشر انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی ضرورت نہیں رہی تھی' کیا اس روز کوئی سپر پاور' کوئی جرنیل انہیں اللہ کے قہر سے بچا سکتا تھا؟! اس وقت بس اس کے دماغ میں یہ شعر گونج رہا تھا۔

کہ کیا ہو گا جب جنت کے دروازے پہ روکیں گے
آواز آئے گی جانے دو یہ امت ہے محمد کی

کیوں؟ اسلام کے متوالوں کے سینے ہی گولیوں سے چھلنی کیوں؟

ڈاکومنٹری فلم سائیڈ پر رکھنے کے بعد اس نے سید جاوید ہمدانی کی بیٹی قرۃ العین کا آخری خط اٹھایا تھا جو اس ننھی پری نے جانے کس حال میں لکھا تھا۔

”عزیزی حورعین! اللہ رب العزت کے پاک اور بابرکت نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ جس وقت تمہاری نگاہیں یہ خط پڑھ رہی ہوں گی میں اس دنیا میں نہیں ہوں گی کیونکہ وقت کے ناخداؤں نے اپنے ضمیر کی قیمت ہمارا خون طے کر لی ہے۔ ہم سنا کرتے تھے کہ کشمیر میں بہنیں خون کی مہندی لگاتی ہیں' اپنی خواہشات کو روند دیتی ہیں' تمناؤں کو مار دیتی ہیں مگر ہم نے اس کا عملی مظاہرہ لال مسجد میں دیکھا' لگتا ہی نہیں کہ ہم اس قوم کی بیٹیاں ہیں۔ حورعین! شاید تم آندرے بہرنگ کو جانتی ہو جو کہ ایک کٹر عیسائی ہے پیشہ ور قاتل ہے۔ جس نے خود درجنوں مسلمان طلبہ وطالبات کے قتل کا اعتراف کیا' ساری دنیا کے سامنے تسلیم کیا کہ وہ دنیا بھر سے بالعموم اور یورپ سے بالخصوص مسلمانوں کا خاتمہ چاہتا ہے اس کو کسی بھی مرحلے پر ایسی کارروائی کا موقع ملا تو وہ ہرگز ضائع نہیں کرے گا مگر اس کے باوجود اسے قانونی پاگل قرار دے کر سزا سے مستثنیٰ کر دیا گیا' کیوں؟ ساری دنیا کی بھوک اور دولت کی ہوس ہمارے ہی حکمرانوں کو کیوں؟ ساری دنیا میں امن اور انسانیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے یہودیوں نے اب تک عراق' افغانستان اور پاکستان میں لاکھوں مسلمانوں کو موت کی نیند سلا دیا مگر ان کے خلاف تو کسی نے کوئی جنگ کوئی آپریشن نہیں کیا' کیوں؟ جس جنگ سے ہمارا کوئی واسطہ ہی نہیں اسی جنگ کو ہم پر مسلط کر کے یہاں روز سیکڑوں پاکستانیوں کی زندگی کے چراغ بجھائے جاتے ہیں مگر ان کا حساب لینے والا کوئی نہیں۔ تم بتاؤ حورعین! ایسے حالات میں اللہ کے بندوں کے پاس سوائے جہاد کرنے کے اور کون سا راستہ باقی بچا رہتا ہے۔

کوئی مجھے بتائے کہ کیوں ہماری درس گاہوں کو ہمارا مقتل بنادیا گیا صرف اس لیے کہ ہم نے اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی بات کی تھی؟

یہ ہمیں کیوں کہہ رہے ہیں کہ باہر نکل آؤ ورنہ مار دیئے جاؤ گے؟ ہمیں یہاں سے نہیں جانا کہیں بھی نہیں' چاہے خاک میں ہی کیوں نہ مل جانا پڑے۔ ہمیں مرنے کا افسوس نہیں ہے حورعین! صرف اس بات کا دکھ ہے کہ طاقت کے نشے میں چور ایک بدمست ہاتھی نے ساری قوم کو گمراہ کرکے ہم حفاظ قرآن پر بم برسائے اور ساری قوم دم سادھے چپ چاپ تماشا دیکھتی رہی' نہ صرف تماشا دیکھتی رہی بلکہ اس بدمست ہاتھی کو شاباش بھی دیتی رہی' آخری دم تک ہمیں یہ گمان رہا کہ یہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں اور کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو قتل نہیں کرسکتا مگر ہمیں کیا پتا تھا کہ ملک پاکستان میں اسلام کے نفاذ کا نعرہ لگانا اب ایک جرم بن چکا ہے۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ دنیا میں 196 ممالک میں سے 58 مسلم ممالک ہیں۔ چھ ارب کے قریب انسانوں میں سے ڈیڑھ ارب مسلمان ہیں' دنیا کے معدنی ذخائر میں سے 75 فی صد کے مالک مسلمان ہیں۔ دنیا کی بہترین بندرگاہیں' گزرگاہیں' آبی اور زمینی ذخائر' فضائی راستے مسلمانوں کے پاس ہیں۔ سب سے اچھا محل وقوع مسلم ممالک کا ہے۔ تیل کے لبالب بھرے کنوئیں اور سونے کی کانیں ان کی ہیں' یہ زرخیز زمینوں' دریاؤں اور نہروں کے مالک ہیں' محنتی کسان ہیں' پسینہ بہانے والے مزدور ہیں' جان کی بازی لگانے والے فوجی ہیں' مذہب اور وطن کی خاطر کٹ کر مرنے والے جانباز ہیں' اعلیٰ دماغ ہیں' باصلاحیت ہیں۔ ان کا مذہب مکمل ضابطۂ حیات ہے' سب کچھ ہے ان کے پاس۔ ہاں نہیں ہے تو دوراندیش' نڈر اور بہادر قیادت نہیں ہے' کوئی ایسا کپتان نہیں جو عالم اسلام کی ڈولتی ناؤ کو کنارے لگادے۔ یہ سامراج اور یہودی پالیسی اگر یونہی اس ملک پر قابض رہی تو یہاں

عبرت کے نشانوں کے سوا اور کچھ نہیں رہے گا' یہ لوگ کسی باصلاحیت شخص کو ہمارا رہنما نہیں بننے دیں گے' عالمی طاقتیں ہم پر ایسے ہی ایمان اور ضمیر فروش لوگوں کو قابض رکھیں گی۔ یونہی نایاب ہیروز کو خرید کر اور پاک شہزادوں پر دہشت گردی کا الزام لگا کر انہیں عقوبت خانوں میں ڈالتی رہیں گی۔ میں پوچھتی ہوں حورعین! کیا ہمارے لاشے اجتماعی قبروں میں ڈالنے' بے ساختہ تالوں میں پھینکنے اور مسجد کی دیواروں پر چیتھڑوں کی صورت چپکا دینے سے ہمارا خون چھپ جائے گا؟ نہیں...... قوم کو اس بے حسی کا قرض چکانا پڑے گا' دیکھ لینا۔ فی امان اللہ!"

خط کیا تھا ایک مرثیہ تھا۔ حورعین کو لگا اس کا دماغ سن اور آنکھیں پتھر ہوگئی ہوں' اس روز وہ ثانیہ عباس کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی جب ثانیہ نے اس سے پوچھا۔

"میں نے سنا ہے تم پرویز مشرف پر کوئی فیچر لکھ رہی ہو؟"

"ہوں۔"

"کیوں؟ میرا مطلب ہے ایک فیچر لکھ کر تم کیا کرلو گی لوگ چند لمحوں کے لیے پڑھیں گے اور ایک سائیڈ پر ڈال دیں گے بس۔"

"تو تم کیا چاہتی ہو میں کیا کروں؟"

"میں کیا چاہتی ہوں؟ میں چاہتی ہوں تم کچھ ایسا کرو جو اس ملک کی تقدیر بدلنے' تیسرے درجے کے یہ لوگ بدنام زمانہ جیلوں میں چیخ چیخ کر بے بسی کی موت مرنے کی بجائے اپنے حق کے لیے سر اٹھانا سیکھیں۔"

"نہیں اٹھا سکتے کیونکہ یہاں جو سر اٹھتا ہے وہ یا کاٹ دیا جاتا ہے یا رات کی تاریکی میں ڈالروں کے عوض غیروں کے سپرد کردیا جاتا ہے۔ اس ملک کے دو بڑے مسائل ہیں ثانیہ! ایک جہالت اور ایک بھوک' باقی جتنے بھی مسائل ہیں وہ سب انہی دو مسائل کی کوکھ سے پھوٹ کر پل بڑھ رہے ہیں' تمہیں پتا ہے بش کا کیا کہنا ہے وہ کہتا ہے کہ پرویز مشرف نے اس کی ایماء پر

نصاب تبدیل کیا ہے' پاکستانیوں کے دلوں میں امریکہ کے لیے بڑھتی ہوئی نفرت کا ایک حل ان کے خیال میں نصاب کی من پسند تبدیلی ہے لہٰذا انہوں نے میٹرک تک کے نصاب میں مشرف کو کہہ کر اپنی مرضی کی تبدیلیاں کروائی ہیں۔"

"ویری گڈ! اس شخص پر قوم کے بہت سے قرض ہیں اور بہت نقصان کیا ہے اس نے اس ملک کا' اس شخص نے اسلام دشمن قوتوں کو دوست بنایا' پاکستان کی 62 سالہ پالیسی پر یوٹرن لیا جس کی وجہ سے کشمیری مجاہدین دہشت گرد قرار پائے۔ اس نے صرف ایک کال پر افغان پالیسی بدل ڈالی جس کی وجہ سے لاکھوں افغان بھائیوں کو امریکہ بہادر نے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے سرعام اللہ اور اس کے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی پامالی شروع کی اور اللہ کے گھروں پر فوج کو چڑھا دیا۔ اسی نے محب وطن علماء اور طلبہ کا خون بہایا اور دینی مدارس کو ہراساں کیا' جن کے بارے میں خود علامہ اقبال کا فرمان ہے۔

"ان مکتبوں کو اسی حال میں رہنے دو' غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہی مدارس میں پڑھنے دو' اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں' اگر برصغیر کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج "غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات" اور الحمرا کے نشانات کے سوا وہاں اسلام کے پیروکار اور اسلامی تہذیب کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دہلی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی اسلامی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا اور ہماری بدبختی دیکھو ہم خود ایسے لوگوں کو منتخب کرکے ایوانوں تک لاتے ہیں تاکہ یہ ڈالروں کے عوض ہماری جانوں کا سودا کریں' ہم پر ڈرون حملے کروائیں' بدنام زمانہ جیلوں میں ہم پر ذہنی اور جسمانی تارچر کروائیں یا اندھے بہرے کنوؤں میں پھنکوا کر بھول جائیں۔"

"صحیح کہتی ہو یار! اس شخص کے صرف ایک فرمان سے سیکڑوں بے گناہ اور عام پاکستانی شہری امریکہ کے حوالے کردیئے گئے' اس کے حکم پر جہادی تنظیموں پر پابندیاں لگ گئیں' راتوں رات درجن بھر فلاحی و رفاہی اداروں کے دفاتر سیل کروادیئے' صرف اس شخص کی وجہ سے اسلام پسند لوگ دہشت گرد قرار پائے' اسی نے کراچی کو انسانی خون میں ڈبویا' عورت کو بے جان آزادی دی' قوم کی بیٹیوں کو میراتھن کے نام پر نیم برہنہ سڑکوں پر دوڑایا' ملک بھر میں شراب نوشی' رقص و سرود' کلب اور بار سجائے' فحاشی اور عریانی کو فروغ دینے کے لیے بل منظور کروائے' آئین پاکستان کا حلیہ اسی نے بگاڑا۔ تمہیں پتا ہے اس شخص نے شاہراہ دستور پر کھڑے ہوکر فضا میں مکا لہرا کر کہا تھا۔

"دیکھو! طاقت اسے کہتے ہیں طاقت۔"

صرف اسی شخص کی وجہ سے اس کی لاجسٹک سپورٹ کی وجہ سے امریکی ایجنسیاں ٹڈیوں کی طرح پاکستان پر چھا گئیں' صرف اس شخص کی وجہ سے امریکہ میں جس مسلمان کی طرف اشارہ کرتا اسے زنجیروں میں جکڑ کر ایف بی آئی (امریکی ایجنسی) کے حوالے کردیا جاتا اور اس کی نقد قیمت وصول کی جاتی۔ سیکڑوں انمول ہستیوں کا لین دین لمحوں میں کیا اس شخص نے۔"

"ہوں' اس کا اعتراف تو اس نے خود بھی کیا ہے' نائن الیون کے بعد جس طرح سے اس شخص نے سب کچھ امریکہ کے حوالے کیا' اس کے بعد ملک کے بڑے شہروں سے ہزاروں مذہبی رہنما' علماء' عالم دین' دینی مدارس اور اسلامی فلاحی تنظیموں کو فنڈنگ فراہم کرنے والے گرفتار کرکے محض شک اور شبہ کی بناء پر رات کی تاریکی میں گھروں سے اٹھا کر لاپتا کردیئے گئے' امریکہ کے ہاتھ گروی رکھے گئے پاکستان میں اس شخص نے محب دین اور محب وطن پاکستانیوں کی جیسے منڈی لگادی تھی' پورے چھ سو مجاہدین کی امریکہ حوالگی پر اسے کروڑوں ڈالر دیئے گئے جس کا اعتراف اس شخص نے اپنی کتاب "In the

"Fire" کے 23 ویں باب Manhunt میں خود کیا ہے۔"

"اچھا میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی' کیا لکھا ہے اس باب میں؟"

"اس باب میں لکھا ہے کہ نائن الیون کے فوراً بعد جب القاعدہ کے کئی ارکان افغانستان سے بھاگ کر پاکستان میں آ گئے تھے تو ہم نے ان کے ساتھ چوہے بلی کے کئی کھیل کھیلے مجاہدین کو گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کیا اور اس کے عوض ہم نے کئی ملین ڈالر انعام میں پائے' جنہیں ہم پر یہ الزام لگانے کی عادت ہو چکی ہے کہ ہم دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کافی کردار ادا نہیں کر رہے وہ سی آئی اے سے پوچھ لیں کہ حکومت پاکستان کو وہ انعام میں کتنی رقم ادا کر چکی ہے۔"

"ویری سیڈ' ان لوگوں کے پاس طاقت اور اختیار ہے تو یہ ہر قسم کی دہشت گردی اپنا کر بھی حق پر ہیں اور غریب مجاہدین جو ان کی زیادتیوں اور مظالم کا شکار ہیں وہ بے گناہ ان کے ہتھے چڑھ کر بدنام ہو رہے ہیں صرف اس لیے کیونکہ اللہ کے سوا ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے ناں۔"

"ہوں بہت ظلم ہوا ہے افغانستان اور عراق میں یار! چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں اور عورتوں کو اتنی بے دردی سے مارا ہے امریکہ بہادر نے کہ انسانیت بلبلا اٹھی ہے' تمہیں پتا ہے فرعون نے سیکڑوں نومولود بچے قتل کروا دیئے تھے' صرف اسی خوف کے پیش نظر کہ ان میں سے کوئی بڑا ہو کر اسے اور اس کی خدائی کو ختم نہ کر دے۔ امریکہ بھی یہی کر رہا ہے' چن چن کے مسلمانوں کو مار رہا ہے کیونکہ فرعون کی طرح اسے بھی اپنی خدائی کا خاتمہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہوتا نظر آتا ہے اسی لیے اس نے اپنی طاقت اور پیسے کے بل پر بعض مسلم حکمرانوں کے ایمان اور ضمیر خرید لیے ہیں مگر یہ سودا بہت گھاٹے کا سودا ہے حورعین! کیونکہ یہ دنیا فانی ہے اور سپر پاور صرف اللہ رب العزت کی ذات ہے جو چاہے تو ایک پل میں سب فنا کر کے رکھ دے مگر یہ کھیل ابھی اتنی جلدی ختم ہونے والا نہیں ہے' بہت بڑی ہے دوزخ۔ اب تو بس قیامت کے دن ہی یہ بساط الٹی جائے گی خیر تم نے بتایا نہیں تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"تم بتاؤ یار! میں کیا کروں؟ میرا دل درد سے پھٹ رہا ہے مجھے رات میں نیند نہیں آتی۔ امت مسلمہ کی چیخیں اور آہیں میرا کلیجہ نوچتی ہیں' مجھے بتاؤ تانیہ! میں کیا کروں؟ کہاں سے ایک اور اقبال اور قائد لاؤں؟" تانیہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا حال بہت ابتر تھا۔ بے حد رف کپڑوں میں اس نے کئی روز سے بال سنوارنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی تبھی وہ بولی تھی۔

"تم بھی وہی کرو حورعین! جو اقبال نے کیا' مسلمانوں کی سوئی ہوئی غیرت کو جگاؤ' انہیں بتاؤ کہ تاریخ کیا کہتی ہے' انہیں بتاؤ حورعین کہ دمشق میں جب ایک نصرانی جرنیل نے ایک مسلمان کو مارا پیٹا تھا تو اس وقت کے امیر معاویہ نے اس نصرانی جرنیل کے ساتھ کیا کیا' عموریہ میں رومی عیسائی سلطنت کے زیر اثر ایک عیسائی نے ایک مسلمان عورت کو تھپڑ مارا تو اس وقت کے عباسی خلیفہ نے اس کے ساتھ کیا کیا' پاؤ چلنے کی دعوت دو حورعین! حق اور سچ کی آواز بلند کرو۔"

"مگر کیسے؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ مشرف نے حق اور سچ کے متوالوں کے ساتھ کیا کیا؟ کن مسلمانوں کی بات کرتی ہو تم' وہ جن کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن تھی' جو نڈر اور دین حق پر چلنے والے تھے جو ہمارا سرمایہ تھے وہ سب تو ظلم اور دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ گئے تانیہ! ہم نے خود بندوق اٹھا کر دشمن کے ہاتھ میں تھمائی کہ لو اور ہمیں مارو اب کن مسلمانوں کی بات کرتی ہو تم؟ کون اٹھے گا نعرہ حق پر اور جو اٹھے گا وہ کیا کرے گا' جس سلطنت کا سالار اپنا ضمیر اور ایمان بیچ دے وہاں کوئی اقبال کیا کر سکتا ہے؟"

"اقبال کا دور صرف کسی ایک طاقت کے لیے نہیں تھا' تم حوصلہ رکھو حورعین! توحید اور ایمان کی شمع کبھی بجھائی نہیں جا سکتی۔ اسلام کی فطرت ہے اسے جتنا دباؤ گے یہ اتنا ہی ابھرے گا۔ تم ساری دنیا کے لیے امن کا پیغام لے

کراٹھو اور چھا جاؤ۔" ثانیہ عباس نے اسے حوصلہ دیا اور وہ اپنے رب کا نام لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ حق اور سچ کی صدا بلند کرنے کے لیے اس نے اپنا ایک علیحدہ اخبار بھی نکالا جس کا مقصد صرف مسلمانوں کے خلاف ہونے والی سازشوں کا پردہ چاک کرنا اور ان کا دفاع کرنا تھا اس کے ساتھ مسلمانوں کی سوئی ہوئی غیرت جگانا اور مسلم حکمرانوں کو ان کے فرائض منصبی سے بے پروائی پر شرم دلانا تھا مگر.......

یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکا تھا' ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک روز وہ اپنے ہی ملک میں دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں نے اس سے کہا تھا۔

"کیا چاہتی ہو تم' اس ملک میں امن نہ رہے' اپنے سے دس گنا بڑے ملک کو آنکھیں دکھا کر ہم یہاں اپنے اوپر کوئی صلیبی جنگ مسلط کرلیں' کیوں نہیں عزت اور سکون سے جیتی ہو تم؟ ایک بار کسی کی نگاہ میں آ گئیں تو عبرت بنادیں گے یہ لوگ تمہاری زندگی کو تم کیوں اپنے ساتھ ہمیں بھی لے کر ڈوب مرنا چاہتی ہو۔" مگر اس نے اپنی سوتیلی ماں کی کسی بھی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ چپ چاپ ناشتا کرنے کے بعد وہ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گئی تھی تاہم اس کی ماں کا کہا اکارت نہیں گیا تھا' قوم کو غفلت کی نیند سے جگانے کی بہت کڑی قیمت چکانی پڑی تھی اسے۔

❁ ❁ ❁
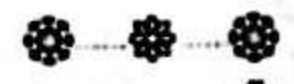
موسم سرد ہو رہا تھا۔

گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی وہ قریبی درختوں سے ہجرت کرتے پرندوں کو بغور دیکھ رہی تھی جب اچانک ایک پولیس موبائل نے اس کا راستہ روک لیا' اس کے ڈرائیور نے قدرے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا تھا' جیسے وہ جاننے کی کوشش کررہا ہو کہ پولیس موبائل نے اسے کیوں روکا ہے۔

"باہر آؤ۔" گاڑی رکتے ہی پولیس کی ایک کرخت چہرے والی خاتون حورعین کی سائیڈ پر آئی تھی اور اس نے اپنے ہاتھ میں موجود موٹے سے ڈنڈے سے اس کی طرف کا دروازہ بجایا تھا' وہ حیران و پریشان سی باہر نکل آئی۔

"کیا مسئلہ ہے؟"

"چٹاخ......!" اس کی آنکھوں کی حیرانی کے جواب میں اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ پڑا تھا' وہ ششدر رہی تو رہ گئی۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ؟"

"جسٹ شٹ اپ یو بچ۔" اس بار جس شخص نے اسے تھپڑ مارا تھا' وہ مسلمان نہیں تھا۔ حورعین اپنے ڈرائیور کے سامنے بنا کسی قصور کے ایسی انہونی پر کٹ کر رہ گئی مگر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی پولیس والوں نے انتہائی بے رحمی سے اسے کھینچتے ہوئے اپنی موبائل کیب میں دھکیل دیا۔ وہ ابھی چلانا ہی چاہتی تھی کہ اس کے ہونٹوں اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اگلے ہی پل اس کے دونوں ہاتھ مروڑ کر اس کی پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ حورعین کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پر اچانک ایسی افتاد ٹوٹ پڑے گی شاید بھی وہ گھبرائی تھی مگر اسے تسلی تھی کہ یقیناً وہ لوگ کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو کر اس کے ساتھ یہ سب کررہے ہیں' جیسے ہی انہیں اپنی غلط فہمی کا احساس ہوگا وہ اس سے معذرت کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیں گے اور تب وہ ان لوگوں کے خلاف خوب احتجاج کرے گی۔

مگر...... اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔

وہ ابھی معاملے کو سمجھنے کی کوشش کررہی تھی جب اچانک کسی نے اس کا دوپٹا نوچ کر دور پھینک دیا' اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے مگر پھر بھی اس نے احتجاج کی کوشش کی تھی جواب میں اس پر لاتوں' گھونسوں اور مکوں کی بارش کردی گئی اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی' جب اس نے ان لوگوں کو انگریزی میں اسلام کے خلاف انتہائی واہیات بکواس کرتے ہوئے سنا۔ وہ لوگ مختصر جملوں میں پاکستان اور اسلام کے خلاف بکواس کررہے تھے۔ حورعین کا دماغ مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبتا گیا۔ جس وقت اسے ہوش آیا اس کا سارا بدن درد کے شکنجے میں تھا۔ اسے اپنے ساتھ لانے والے انسانیت سے ماورا لوگ اب اسے گاڑی سے گھسیٹتے ہوئے نیچے اتار رہے تھے' اسے اب تک معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور اسے کہاں لائے ہیں؟

گاڑی سے اترتے ہوئے وہ ذرا سی لڑکھڑائی تھی' جب انہوں نے زور سے اس کے سر پر بندوق کا بٹ دے مارا' حورعین کو اپنا دماغ ایک مرتبہ پھر تاریکی میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ لوگ اسے گھسیٹتے ہوئے کسی عمارت کی طرف لے جارہے تھے اگلے چند ہی لمحوں میں انہوں نے اسے انتہائی بے دردی سے ایک کمرے میں دھکیل دیا تھا۔

حورعین کے اعصاب پھر سے جواب دے گئے۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ دوبارہ کھلی' وہ جس عمارت میں تھی وہاں ہُو کا عالم تھا۔ مگر وقفے وقفے سے کسی کے چیخنے اور کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ خود حورعین کی آنکھ بھی کسی کے چیخنے پر کھلی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس کی سماعتوں نے ہولناک تشدد کی آوازیں سنی تھیں۔ حورعین کا دل جیسے ساکت رہ گیا جانے کیوں کسی انہونی کا احساس اسے بے چین کررہا تھا۔

درندگی ہی درندگی کے اس جنگل میں امن اور تہذیب کا ڈھنڈورا پیٹنے والے بے رحم لوگ اپنی طاقت کے بل بوتے پر مظلوم ممالک کے بے بس لوگوں پر ایسی ایسی قیامتیں بپا کررہے تھے کہ انسانیت بلبلا اٹھتی تھی۔ بنا کسی آئین و قانون کے وہاں صرف طاقت ہی کا بول بالا تھا۔ جہاں صرف طاقت کے بل بوتے پر سیاہ کو سفید' رات کو دن' جھوٹ کو سچ اور صحیح کو غلط کہلوایا جاتا تھا۔ حورعین نے دیکھا وہ ایک تاریک حجرے میں لا کر پھینکی گئی تھی۔ اس جگہ کے در و دیوار سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ اپنے ملک میں نہیں ہے وہ جگہ بگرام جیل کی تھی جس کے بارے میں کچھ ہی عرصہ قبل اس نے افغانستان میں اپنے قیام کے دوران ریسرچ کی تھی' بدنام زمانہ اس جیل میں کیا کچھ نہیں ہوتا تھا؟

مارے پیاس کے حورعین کے گلے میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے پورے چہرے اور جسم پر تشدد و تکلیف کا احساس اسے کراہنے پر مجبور کررہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے مگر اس کا دل ضرور دھڑک دھڑک کر گواہی دے رہا تھا کہ وہ جہاں بھی ہے اس کے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔

❁ ❁ ❁

چل چھوڑ تمنا جذبوں کی ہر شے کا سودا ہوتا ہے
ہر چیز بکاؤ ہوتی ہے ہر فرد یہاں پر تاجر ہے
ہر وقت تجارت ہوتی ہے
تم آپ ہی اپنے دام کہو
چپ رہ کے نہیں سرعام کہو
کیا لو گے اپنی یاری کا؟
کیا لو گے تم دلداری کا؟
غم خوار بنو گے کتنے میں تم پیار کرو گے کتنے میں؟
سب جذبے میرے نام کرو ہم نام تم اپنے دام کہو
پر دام چکانے کی خاطر......
ہم اپنا دفتر کھولیں تو ہم اپنی جیب ٹٹولیں تو
بس پیار ملے گا تھوڑا سا اظہار ملے گا تھوڑا سا
یہ سکے یہاں کب چلتے ہیں' کیا ادھار ملے گا تھوڑا سا؟
یہ دنیا بے اعتباری کی' ہے غرض یہ ہر بیوپاری کی
چل چھوڑ تمنا جذبوں کی بس ہو رہے ہی دیکھا' آئیں ہم
ہم خالی ہاتھ ہی آئے تھے چل خالی ہاتھ ہی جائیں ہم

بارش گزرتے ہر لمحے کے ساتھ تیز ہورہی تھی۔ میکال جیکٹ سے پانی کی بوندیں جھاڑتا دروازہ آہستہ سے پش کرتے ہوئے جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا' اس کی نظر سیدھی اسٹڈی ٹیبل پر سر رکھے سوئی ہوئی ہانیہ صفدر پر پڑی' وہ شاید کچھ لکھتے لکھتے سو گئی تھی۔ میکال اس سے نظر چراتے ہوئے بیڈ پر آ بیٹھا۔ بھاری بوٹوں کو پیروں سے

علیحدہ کرکے وہ اٹھا اور وارڈ روب سے اپنا سوٹ لے کر واش روم میں گھس گیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ فریش ہوکر دوبارہ کمرے میں آیا تو بانیہ قلم ہاتھ میں پکڑے اسی پوزیشن میں سورہی تھی۔

ڈارک بلو سوٹ میں ملبوس ریشمی بالوں کو کیچر میں مقید کیے بنا کسی میک اپ کے بھی اس وقت وہ بے حد خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا کندھے پر پڑا ریشمی دوپٹا زمین کو چھو رہا تھا۔ میکال نے قریب آکر وہ ڈائری اس کی گرفت سے نکال لیا جس پر کچھ دیر پہلے وہ لکھ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے ''محبت'' ایک خوب صورت تتلی ہے۔ جس کے ہزاروں رنگ کسی بھی دل کو اپنی طرف متوجہ کرلیتے ہیں مگر ہم انسان جب اس تتلی کو مٹھی میں بھرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کے رنگ جذب کرنے والے بھی مٹھی میں ہی رہ جاتے ہیں اور محبت مرجاتی ہے۔''

کتنی خوب صورت بات اس نے کس سلیقے سے لکھی تھی۔ وہ اس کا درد سمجھ سکتا تھا۔ ابھی صفحہ وہیں میز پر احتیاط سے رکھتے ہوئے وہ کمپیوٹر کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ باہر بادل کی گرج سے اچانک بانیہ کی آنکھ کھلی تھی۔ ریشمی بال سمیٹتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھی تو میکال کو کمرے میں موجود پاکر ٹھٹک گئی۔

''السلام علیکم!'' دوپٹا سلیقے سے اوڑھتے ہوئے وہ قریب آئی تھی۔

''وعلیکم السلام!'' اس کے قریب آکر بیٹھنے پر بادل نخواستہ اس نے سلام کا جواب دیا تھا۔

''آج صبح ہونے سے پہلے گھر آگئے خیریت؟'' وہ اس سے فرینک ہونے کے لیے پوچھ رہی تھی مگر میکال نے اس بار اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اس کا چہرہ بے حد سپاٹ تھا۔ بانیہ کو بے ساختہ شدید جھجک کا احساس ہوا مگر پھر بھی وہ مسکرائی تھی۔

''میکال..... کیا ہم اچھے دوست نہیں بن سکتے؟''

''کیوں..... نہال کی دوستی کم پڑگئی ہے؟'' تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اس نے بھرپور طنز سے پوچھا تھا۔ وہ محسوس ہی نہ کرسکی۔

''نہیں بے شک وہ میرا بہت اچھا، بہترین دوست ہے اور ہمیشہ رہے گا مگر آپ کی اور بات ہے میکال! آپ میرے شوہر ہیں میری زندگی کے ساتھی ہیں آپ کے ہر دکھ اور سکھ کی ہم سفر ہوں اور میرے خیال میں ہر بیوی کو اپنے شوہر کی بہترین دوست ہونا چاہیے۔''

''مگر میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنا نہیں چاہتا۔'' پل میں مشتعل ہوتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی کے قریب چلا آیا جہاں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کمرے کی خنکی میں اضافہ کررہے تھے۔

بانیہ کو لگا میکال نے اس کے منہ پر زور کا تھپڑ دے مارا ہو کتنے ہی لمحوں تک وہ چپ رہی تھی پھر میکال کے سگریٹ سلگانے پر وہ اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

''آپ کو کیوں لگتا ہے میکال کہ میں آپ کی ذات پر بوجھ ہوں میرا اللہ گواہ ہے میرے لیے یہ گھر یہ کمرا یہ بیڈ آپ کی ذات سب عائشہ جی کی امانت ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ آپ مجھے ان کی جگہ دیں مگر میرے توسط سے اگر آپ ان کو پالیں تو کیا برا ہے؟ میں وعدہ کرتی ہوں آپ سے میں انہیں آپ کی زندگی میں واپس لاؤں گی لیکن جب تک ایسا نہیں ہوتا تب تک تو آپ کو میرا وجود برداشت کرنا پڑے گا میں وعدہ کرتی ہوں میں آپ سے اپنا کوئی حق طلب نہیں کروں گی ہم اس کمرے میں دو اجنبی لوگوں کی طرح ہی اپنا وقت گزاریں گے مگر اس کمرے کی حدود کے باہر آپ کو میرا بھرم رکھنا ہوگا تاکہ ایک یا دو سال کے بعد جب میں آپ کے گھر والوں کو آپ کی دوسری شادی کے لیے مناؤں تو آپ کے کردار پر کوئی حرف نہ آئے۔''

''تمہیں میرے لیے کسی بھی قسم کی قربانی دے کر مجھ پر احسان کرنے کی ضرورت نہیں ہے سمجھی؟ دوسری شادی میرا حق ہے اور میں جب چاہوں یہ حق استعمال کرسکتا ہوں کسی کی مجال نہیں کہ مجھے روکے۔'' اس کے نرم لہجے پر بھی وہ بھڑکا تھا بانیہ کی آنکھوں میں ایک دم

سے نمی آ گئی۔

"بے شک آپ ایسا کرسکتے ہیں مگر جب تک ایسا نہیں ہوتا' تب تک تو ہم اچھے دوستوں کی طرح رہ ہی سکتے ہیں ناں پلیز۔" سر جھکاتے ہوئے نم لہجے میں کہتی وہ بے حد آزردہ لگ رہی تھی۔ میکال بنا اس پر نگاہ ڈالے بے زاری سے پلٹ گیا۔

اگلے روز بیدار ہونے کے بعد وہ شاور لے کر نکلا تھا' جب اس نے دیکھا کہ نہال اس کے کمرے میں موجود فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر بانیہ پر انڈیل رہا تھا اور وہ بچاؤ کی کوشش کرتی' اس کے ساتھ الجھ رہی تھی۔ ہنستا' کھلکھلاتا نہال اس کے دونوں ہاتھ قابو کیے اسے منہ چڑا رہا تھا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ نظر انداز کرتا آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"میکال...... میں آپ کی مدد کروں؟" نہال سے بازو چھڑاتے ہوئے وہ فوراً میکال کی طرف لپکی تھی جبکہ وہ بے نیازی سے تقریباً غراتے ہوئے بولا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اس کا لہجہ پہچان گئی تھی تبھی نہال کے سامنے مزید بے عزت ہونے سے بچنے کے لیے کمرے سے نکل آئی۔ کچن میں جینا بھابی' مائرہ اور سارہ ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھیں وہ بھی ان کا ہاتھ بٹانا ہی چاہتی تھی کہ نہال اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔

"بانی! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے میرے ساتھ آؤ پلیز۔" میکال سیڑھیوں پر تھا جب اس نے نہال کے یہ الفاظ سنے بانیہ نے جواب نہیں دیا تھا مگر جینا بھابی ضرور بولی تھیں۔

"نہال! بانیہ اب میکال کی بیوی اور تمہاری بھابی ہے' تمیز سے بات کیا کرو۔"

"تمیز مائی فٹ...... بانیہ میری دوست تھی اور دوست رہے گی۔" کتنا واضح جواب تھا اس کا۔ میکال جو ناشتے کے لیے بیٹھ چکا تھا' بریڈ کا ایک بائٹ لیتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے آفس کے لیے دیر ہو رہی ہے' چلتا ہوں خدا حافظ۔" اس کا چہرہ تن گیا تھا مسز حسن بنا کچھ کہے خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ڈائننگ ہال سے نکل گیا اس کے سر میں اس وقت شدید درد ہو رہا تھا۔ ڈرائیونگ میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ ایک بٹا ہوا شخص تھا۔ اپنی ذات کی تکمیل اور سکون کے لیے اسے ایک مکمل عورت درکار تھی مگر تقدیر نے اسے جس عورت کا ہم سفر کیا وہ بھی ایک بٹی ہوئی عورت تھی۔

اس کی طرح دو کشتیوں میں سوار
ایک فرض اور ایک محبت

اس وقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ گاڑی کو کسی درخت میں دے مارتا۔ نہال اس کے جانے کے بعد زبردستی بانیہ کو کھینچتا ہوا اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔

"سچ سچ بتاؤ بانی! میکال بھیا کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے پلیز۔" بانیہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ اس کے معاملے میں بہت حساس ہے' تبھی لبوں پر مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے ہنس کر بولی۔

"بہت اچھا' بے حد کیئرنگ۔"

"جھوٹ۔" اسے جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔

"جھوٹ کیوں؟ میرے چہرے پر جھوٹ لکھا نظر آ رہا ہے تمہیں؟" صرف اپنا بھرم رکھنے کے لیے اس نے چہرے پر مصنوعی غصہ طاری کیا تھا' نہال سر جھٹک کر رہ گیا۔

"وہ اپ سیٹ ہیں نہال! ایک شخص جسے آپ بہت چاہتے ہیں مگر وہ آپ کی دسترس سے دور کسی اور کے حصار میں تکلیف دہ زندگی گزار رہا ہو تو آپ چاہتے ہوئے بھی خود کو نارمل نہیں رکھ سکتے' میرا خیال ہے کہ ہمیں ان کی فیلنگز کو سمجھنا چاہیے انہیں کچھ مزید ٹائم دینا چاہیے۔"

"ہوں۔" ٹراؤزر کی پاکٹس میں دونوں ہاتھ گھساتے ہوئے نہال نے سر جھکاتے ہوئے ہامی بھری تھی۔ وہ اداسی سے مسکراتے ہوئے اس کے بال بکھیر کر رہ گئی۔ رات میں پھر میکال کی واپسی خاصی لیٹ ہوئی تھی۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے کے بعد جس وقت وہ ہال میں آیا'

بانیہ' سارہ اور مائرہ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ وہ سرسری سی ایک نظر ان تینوں پر ڈالتا اوپر اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کرنے کے بعد وہ بیڈ پر لیٹا تھا جب وہ آہستہ سے دروازہ پش کرتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔

"السلام علیکم!" عادت سے مجبور اس نے سلام کیا تھا مگر حسب توقع میکال نے اسے جواب نہیں دیا۔

"کھانا دوں آپ کے لیے؟" بیڈ کے کنارے پر ٹکتے ہوئے اس نے پوچھا مگر وہ ہنوز خاموش رہا۔ یوں جیسے اس کی شکل بھی نہ دیکھنا چاہتا ہو۔

"آپ نے صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا کچھ تو کھا لیں پلیز۔"

"جسٹ شٹ اپ! اوکے۔ تمہیں کیا پتا ہے میں تمہاری خدمتوں پر جیتا ہوں۔" بلاوجہ اس پر غصہ ہوا تھا' بانیہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"میں نے آپ کا کیا نقصان کیا ہے میکال! آپ میرے ساتھ اس طرح سے بات کیوں کرتے ہیں؟" ضبط کے باوجود بھی اس کی آنکھوں اور لہجے میں نمی آ گئی تھی۔

"میں جانتی ہوں آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے مگر اس زیادتی میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ شادی سے پہلے ہی نہال کی زبانی مجھے آپ کی اور عائشہ جی کی محبت کا پتا تھا' اسی لیے آپ کی طرح میں بھی اس شادی کے حق میں نہیں تھی۔ بہت کوشش کی میں نے کہ میں آپ کی زندگی کا حصہ نہ بنوں مگر کاتب تقدیر کے سامنے ہماری ایک نہیں چلتی پلیز میکال مجھ سے دشمنوں والا رویہ مت رکھیں پلیز۔" میکال حسن کے پیروں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے التجا کی تھی' جواب میں میکال نے اس کے ہاتھ اپنے پیروں سے ہٹا دیے۔

"میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے' پلیز سو جاؤ۔"

"نہیں! میں آپ کا سر دباتی ہوں۔" آنسو پونچھ کر میکال کے منع کرنے کے باوجود وہ اپنے نرم ہاتھوں سے اس کا سر دبانے لگی تھی۔ میکال کو اس کے ہاتھوں کی نرماہٹ سے عجیب سے سکون کا احساس ہوا اس کی پلکیں خود بخود بند ہونے لگی تھیں جب وہ بولی۔

"میں عائشہ جی سے مل کر ان سے دوستی کرنا چاہتی ہوں میکال! میں چاہتی ہوں وہ یہاں آئیں آپ سے ملیں' زندگی کو انجوائے کریں۔" مگر میکال سو چکا تھا' بانیہ ساری رات بیڈ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے اس کے سرہانے بیٹھی رہی تھی۔ اگلے ایک ہفتے میں اس کی عائشہ برہان سے دعا سلام ہو گئی پہلی بار جب اس نے اسے بتایا کہ وہ میکال کی بیوی ہے تو وہ ساکت رہ گئی تھی بھلا کوئی بیوی اتنی اعلیٰ ظرف کیسے ہو سکتی تھی کہ اپنے شوہر کی محبوبہ سے دوستی کر کے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے۔

اس روز مسز حسن کو بتا کر وہ مارکیٹ آئی تھی' مقصد صرف عائشہ سے ملنا تھا' مختصر سی شاپنگ کے بعد وہ دونوں ریسٹورانٹ میں بیٹھی تھیں' جب اس نے میکال کو کال کی' وہ کسی میٹنگ میں مصروف تھا مگر پھر بھی اس نے اس کی کال پک کر لی تھی۔

"میکال آپ مصروف نہیں ہیں تو مارکیٹ آ سکتے ہیں؟"

"کیوں؟"

"وہ میں آج مارکیٹ آئی تھی۔"

"سوری! مجھے ابھی ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے میں نہیں آ سکتا۔" اس کی پوری بات سنے بغیر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"لیکن میرے ساتھ عائشہ جی بھی ہیں میں......"

"ٹھیک ہے میں آتا ہوں ابھی' تم جہاں ہو میسج کر دو خدا حافظ۔" ایک مرتبہ پھر روکھے لہجے میں اس کی بات سنے بغیر اس نے کال کاٹ دی تھی۔ بانیہ کو لگا جیسے کسی نے اس کا دل چیر کر رکھ دیا ہو کاش اس کے پاپا نے بھی اس کی مما سے اتنی ہی محبت کی ہوتی جتنی میکال حسن نے عائشہ برہان سے کی تھی۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی کے باوجود وہ مسکرائی تھی۔

"وہ آرہے ہیں پلیز آپ ان سے ٹھیک سے ملیے گا۔ وہ آپ کو لے کر بہت پریشان ہیں۔" کتنی التجا کے ساتھ وہ اس سے کہہ رہی تھی۔ عائشہ کو یقین نہیں آرہا تھا کیا کوئی بیوی اتنا بڑا دل اور ظرف بھی رکھ سکتی تھی؟

"یہ سب ٹھیک نہیں ہے مسز بانیہ! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

"ہوں میں سمجھتی ہوں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے مگر میں کیا کروں میرے شوہر کی خوشی آپ کی ذات میں ہے... ایکسکیوز می۔" اس کے موبائل پر بپ ہوئی تھی۔ کال مسز حسن کی طرف سے تھی تبھی وہ عائشہ سے معذرت کرتی اٹھ کر سائیڈ پر آگئی۔

"جی مما۔"

"بیٹا آپ کے گھر والے آئے ہیں آپ سے ملنے آپ فوری گھر آجاؤ۔"

"سوری مما! میں ابھی گھر نہیں آسکتی۔ شام تک آسکوں گی آپ میری طرف سے انہیں پوچھ لیجیے گا۔" ازحد رف لہجے میں کہہ کر اس نے فوراً کال کاٹ دی تھی۔ وہ جنگ جو زندگی نے اس پر مسلط کردی تھی اس جنگ میں آخری سانس تک اسے فائٹ تو کرنی ہی تھی۔

❀ ❀ ❀

میکال آگیا تھا۔

عائشہ برہان کو دیکھتے ہی اس شخص کی آنکھوں میں اتنے خوب صورت رنگ اترے تھے کہ وہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ شخص جو اس کے سامنے صرف نفرت اور بیزاری کی علامت بنا رہتا تھا۔ اسی میکال حسن کو اس لمحے اس نے محبت کے چشمے میں ڈھلتے دیکھا تھا۔ وہ عائشہ برہان کے سامنے بیٹھی تھی مگر اس شخص نے اس پر ایک نگاہ غلط ڈالنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ ٹیبل پر بیٹھتے ہی اس نے عائشہ برہان کا ہاتھ تھاما تھا۔

"کیسی ہو عائش؟" کیسی بے قراری اور تڑپ تھی اس کے لہجے میں۔ بانیہ اپنے نظر انداز کیے جانے پر گنگ بیٹھی رہ گئی تھی۔

"ٹھیک ہوں تم کیسے ہو؟" عائشہ برہان نے اس کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکال لیا تھا تبھی وہ عائشہ کو جواب دینے کے بجائے اس کی طرف مڑا تھا۔

"تم گھر جاؤ بانیہ پلیز...." اسے گمان نہیں تھا کہ وہ اس سے کچھ ایسا بھی کہہ سکتا ہے تبھی وہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

"تم نے سنا نہیں ہے میں نے کیا کہا ہے جاؤ یہاں سے۔" دو منٹ کے بعد ہی اس کی خاموشی پر وہ تپ اٹھا تھا۔ تبھی وہ عائشہ برہان کے سامنے اپنی بے عزتی پر شدید دکھی ہوتی وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد عائشہ نے میکال سے کہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے میکال؟"

"میری محبت۔" جواب میں اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"نہیں یہ محبت نہیں ہے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم جیسا نرم مزاج' خوش گفتار ایک آئیڈیل شخص اپنی بیوی کے ساتھ ایسا جاہلانہ رویہ بھی رکھ سکتا ہے کیا قصور ہے اس لڑکی کا بولو۔"

"اس کا قصور یہ ہے عائش کہ یہ میری زندگی میں میری مرضی کے خلاف زبردستی آئی اور اس کا دوسرا قصور یہ ہے کہ وہ ایک منافق لڑکی ہے بے شک وہ میری بیوی ہے مگر محبت نہال سے کرتی ہے میرے چھوٹے بھائی سے۔"

"نہیں میں نہیں مانتی۔"

"نہ مانو تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوجائے گا۔" بے نیازی سے کہتے ہوئے اب وہ اس کے ہاتھ سہلا رہا تھا۔ عائشہ نے چپکے سے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے نکال لیے۔

"بہرحال' حقیقت خواہ کچھ بھی ہو مگر یہ ٹھیک نہیں ہے میکال! میں نہیں چاہتی کہ تمہاری مجھ سے محبت میری جیسی کسی دوسری لڑکی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا باعث بنے کوئی میرے جیسا دوسرا مجھ سے نفرت کرے اور میرے

مرنے کی دعا میں مانگے۔"

"کیا بکواس ہے عائش! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔"

"نہیں تم نہیں جانتے میکال! عورت بڑے سے بڑا دکھ بہادری سے برداشت کرسکتی ہے بڑے سے بڑا نقصان سہہ سکتی ہے مگر ایک بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کی تقسیم برداشت نہیں کرسکتی۔ بانیہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے کچھ تو ایسا ہوگا اس میں جو خدا نے میری جگہ اسے تمہارا ہم سفر بنایا۔"

"مگر عائش..."

"اگر مگر کو چھوڑو میکال! بس اتنا یاد رکھو قدرت کو ہمارا ملاپ منظور نہیں تھا اگر ہوتا تو اس وقت بانیہ صفدر کی جگہ عائشہ برہان تمہاری بیوی ہوتی۔ میرا دل ٹوٹا اور اجڑا ہے میکال! اس لیے دل ٹوٹنے اور اجڑنے کی تکلیف کیا ہوتی ہے میں اچھی طرح سے سمجھ سکتی ہوں۔" میکال حسن کی بات کاٹتے ہوئے وہ ازحد آزردہ لہجے میں بولی تھی وہ خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔

"بانیہ صفدر کا حق ہے کہ تم اس کا خیال رکھو اور اس سے محبت کرو اگر وہ شکستہ دل ہے تو تم اپنی محبت سے اس کے زخموں پر پھاہے رکھو اسے زندگی کی طرف لاؤ' جہاں تک میری زندگی کا سوال ہے تو میں اپنی لائف سے مطمئن ہوں میں نے شاید تمہیں بتایا تھا کہ میرا دیور ارتج ایبروڈ سے مستقل پاکستان آگیا ہے وہ میرا بہت خیال رکھتا ہے میں اپنی قربانی پر خاک پڑتے نہیں دیکھ سکتی میکال! اسی لیے آج آخری بار تم سے استدعا کررہی ہوں پلیز مجھ سے فون پر بھی رابطہ مت رکھنا میں نہیں چاہتی کہ میرے سسرال میں کسی کو مجھ پر انگلی اٹھانے کا موقع ملے۔" نظریں جھکائے قدرے بدلے ہوئے لہجے میں وہ اس سے استدعا کررہی تھی۔ میکال آزردہ سا اسے دیکھتا رہ گیا' تبھی کوئی ان کی ٹیبل کے قریب آیا تھا۔

"ایکسکیوزمی!" عائشہ اور میکال نے ایک ساتھ سر اوپر اٹھا کر دیکھا تھا اور پھر جیسے عائشہ کے چہرے کا رنگ ایک دم سے اڑ گیا۔

"ارتج آپ؟" فوراً سے پیشتر وہ اپنی سیٹ سے کھڑی ہوئی تھی۔

"جی ایک دوست کے ساتھ ڈنر کا پروگرام تھا وہ ابھی پہنچا نہیں تبھی آپ پر نظر پڑ گئی تو اس طرف آ گیا۔" بنا اس سے کوئی وضاحت طلب کیے وہ عام لہجے میں روانی سے اسے بتا رہا تھا۔ عائشہ سے نظریں اٹھانا موت ہوگیا۔

"یہ... یہ میکال صاحب ہیں... شادی سے پہلے میں انہی کی کمپنی میں جاب کرتی تھی اتنے دنوں بعد اچانک مارکیٹ میں ملے تو کھانے کے لیے اصرار کرنے لگے ہم... میں بس ابھی اٹھنے ہی والی تھی۔" وہ ایک دم سے اتنی گھبرا گئی تھی کہ میکال بھی اسے دیکھتا رہ گیا۔

جانے کیوں اس لمحے اسے عائشہ برہان کی گھبراہٹ اور تعارف پسند نہیں آیا تھا۔ ارتج سے مصافحے کے بعد وہ گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا وہاں سے اٹھ آیا تھا جب کہ ارتج ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد عائشہ برہان کے گھبرائے گھبرائے سے چہرے پر نگاہ ڈالتا اسے اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر ہوٹل سے نکل گیا۔

❀ ❀ ❀

بانیہ جس وقت گھر واپس آئی کرنل صاحب اور ان کی فیملی اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت کسی سے بھی ملنے کی خواہش مند نہیں تھی تبھی خود کو کمپوز کرتی تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھی رہی پھر خرابی طبیعت کا بہانہ کرتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

بادیہ اور جاذب کو اس سے ایسے رویے کی امید نہیں تھی' خود مسز حسن بھی اس کی بے مروتی پر حیران رہ گئی تھیں مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی' جانے کیوں اس لمحے اسے اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔

کرنل صاحب اور دیگر لوگوں کے جانے کے بعد وہ کمرے سے نکل کر لان میں آ بیٹھی تھی جب نہال چپکے سے لاؤنج سے اٹھ کر لان کی سیڑھیوں پر اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔

"بانیہ! پریشان ہو؟"

"ہاں!" بنا اس کی طرف دیکھے اس نے خلاف توقع جواب دیا تھا وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"کیوں...... اب کیا ہوا ہے؟"

"پتا نہیں۔" وہ بے آواز رو رہی تھی نہال کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

"مگر مجھے پتا ہے تم ضرور میکال بھائی کی وجہ سے پریشان ہو۔"

"میں اس شخص کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں نہال!" فوراً سے پیشتر بہتے آنسوؤں کی پروا کیے بغیر اس نے وضاحت دی تھی۔ "وہ شخص تو میرا آئیڈیل ہے صرف ایک لڑکی کی محبت کو روگ بنا کر اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنانے والا میرا یقین کرو مجھے بہت خوشی ہے کہ وہ شخص محبت کے معاملے میں اتنا ایمان دار ہے بقول بادیہ کے آج سے پچاس سال پہلے والا ہیرو ہے مگر...... پتا نہیں کیوں میں اس کی نفرت سے ہارتی جارہی ہوں...... پتا نہیں کیوں۔" اب وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ میکال جو گاڑی پارک کرنے کے بعد وہاں سے گزر رہا تھا اسے روتے دیکھ کر وہیں رک گیا۔

"میں اس کی نفرت نہیں سہہ پارہی نہال! پتا نہیں کیوں۔" کانپتے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی وہ ایک پل ٹھہرنے کے بعد اپنے کمرے میں آ گیا تھا جب کہ نہال اب اپنی انگلیوں کی پوروں پر اس کے آنسو چن رہا تھا۔

"پاگل ہو تم اور کچھ نہیں۔" وہ کچھ اور کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس رات بہت دیر تک وہ روتی رہی تھی اور نہال بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھا اس کی برین واشنگ کرتا رہا تھا۔ میکال اگلے روز خرابی طبیعت کے باعث دوپہر میں لنچ کے لیے گھر آیا تو وہ سیڑھیوں پر نہال کے تنگ کرنے کے سبب اندھا دھند بھاگتی اس سے بری طرح ٹکرا گئی۔ اس وقت اگر وہ فوری اسے نہ تھام لیتا تو دونوں کا گر جانا یقینی تھا۔

"کیا مصیبت ہے یہ کبھی بچپنے سے نکل بھی آیا کرو۔" نہال کو دیکھ کر ایک دم سے اس کا پارہ چڑھا تھا جب کہ وہ اس کی چوڑی پشت کے پیچھے چھپتے ہوئے منمنائی تھی۔

"سوری میکال...... وہ...... نہال مجھے ڈرا رہا ہے اس کے ہاتھ میں زندہ چھپکلی ہے۔" اس کی اطلاع پر میکال نے نہال کی طرف دیکھا تو واقعی اس کے ہاتھ میں زندہ چھپکلی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں ایسی بچوں جیسی حرکتیں کرتے ہوئے۔" وہ بگڑا تھا جب کہ وہ بے شرمی سے بولا۔

"اس میں شرم کی کیا بات ہے صبح بانیہ نے میرے موزے چھپا دیئے تھے۔ میں پورا ایک گھنٹہ اکیڈمی سے لیٹ ہو گیا اب میرا حق ہے کہ میں اپنا بدلہ لوں۔" شکایتی لہجے میں کہتے ہی اس نے چھپکلی بانیہ کی طرف اچھال دی تھی جواب میں وہ فلک شگاف چیخ مارتے ہوئے خوب زور سے میکال حسن کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس کی ٹانگیں اس لمحے بری طرح کپکپا رہی تھیں۔ میکال جھنجلا کر رہ گیا جب کہ بانیہ کی چیخوں پر مسز حسن اور ہمنہ بھابی اپنے کمروں سے بھاگتے ہوئے نکلی تھیں۔

"کیا ہوا ہے؟" نہال جس کا ہنس ہنس کر برا حال ہو رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی زبردستی ہنسی روک گیا۔

"کچھ نہیں مما! حساب کتاب کلیئر ہو رہا تھا وہ دیکھیے بانیہ کے پیروں میں چھپکلی۔" بانیہ کا یہ سننا تھا کہ وہ اور بھی زور و شور سے چیخیں مارنے لگی جب کہ میکال کی پشت کے گرد اس کی گرفت اور بھی سخت ہو گئی تھی۔ اتنی سخت کہ اسے اس کے ناخن اپنے وجود میں گڑتے محسوس ہو رہے تھے۔

"شرم کرو نہال! کیوں فضول میں تنگ کر رہے ہو اسے دیکھو کتنی بری حالت ہو گئی ہے اس کی۔" ہمنہ بھابی نے نہال کو ڈپٹتے ہوئے فوراً بانیہ کی سائیڈ لی تھی وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"دیکھ رہا ہوں یہ آپ عورتیں جتنا چھپکلی سے ڈرتی ہیں اتنا آخرت اور قبر سے ڈریں تو قسم سے ساری کی ساری بنا قسمت سیدھی جنت میں جائیں۔"

"بہت بدتمیز ہوگئے ہو تم' بھلا اتنا بھونڈا مذاق بھی کرتا ہے کوئی؟" ہانیہ اب رو رہی تھی جب کہ میکائل نرمی سے اپنا آپ چھڑا کر اوپر کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ تبھی مسز حسن نہال پر برہم ہوئی تھیں مگر وہ ان سنی کرتا ہانیہ کے قریب چلا آیا۔

"ارے... کیا ہوا؟" اسے شدت سے روتے دیکھ کر فوراً اس کے دل کو کچھ ہوا تھا' تبھی نرمی سے اس کے ہاتھ تھامے تو ہانیہ نے آنسوؤں سے بھیگے سرخ چہرے کے ساتھ سر اٹھا کر درشتی سے اس کے ہاتھ پرے جھٹک دیے۔

"شٹ اپ! خبردار اگر دوبارہ تم نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تو......" اس کی آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں نکل رہی تھیں نہال کی جان پر بن گئی۔

"سوری ہانیہ! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ دوبارہ ایسے تنگ نہیں کروں گا وعدہ! پلیز معاف کردو پلیز۔"

"جسٹ شٹ اپ۔" تنک کر کہتی وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی جب اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"جان لے لوں گا تمہاری اگر مجھ پر ایسی کوئی پابندی لگائی یا سیریسلی ناراض ہوئی تو۔" اس کی آنکھوں میں نمی جھلک رہی تھی۔ ہانیہ خفگی سے اس کی طرف دیکھتی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

"ایک شرط پہ معاف کروں گی اور وہ یہ کہ تم شام میں مجھے میری پسند کا ڈنر کراؤ گے وہ بھی میری پسند کے ریستوران میں۔"

"ٹھیک ہے منظور...... سو بار منظور......" پہلی بار وہ فوری مان گیا تھا' ہانیہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"پاگل!" مسز حسین اور عینہ بھابی مطمئن انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتیں اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

❁ ❁ ❁

اب تیری یاد سے وحشت نہیں ہوتی مجھ کو
زخم کھلتے ہیں اذیت نہیں ہوتی مجھ کو
اب کوئی آئے چلا جائے میں خوش رہتا ہوں
اب کسی شخص کی عادت نہیں ہوتی مجھ کو
ایسا بدلا ہوں تیرے شہر کا پانی پی کر
جھوٹ بولوں تو ندامت نہیں ہوتی مجھ کو
ہے امانت میں خیانت سو کسی کی خاطر
کوئی مرتا ہے تو حیرت نہیں ہوتی مجھ کو
اتنا مصروف ہوں جینے کی ہوس میں اے دوست!
سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ہوتی مجھ کو

موسم میں اچانک تبدیلی آئی تھی۔ آناً فاناً آسمان پر بادل چھائے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ ثانیہ پچھلے کئی دنوں سے ایمن کی طرف رہ رہی تھی۔ وہیں اس نے فون کرکے اپنی مما کو زائر ملک والے واقعے قصے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ثانیہ کی دوست ایمن کی طرح اس کی مما نے بھی اس سانحے پر غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔ وہ بھی زائر سے اس کے نکاح کو کسی طور بھی ماننے کو تیار نہیں تھیں۔

ایمن کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ زائر نے نکاح کے نام پر اسے بے وقوف بنایا ہے' اسی لیے انہوں نے اسے سختی سے تنقین کی تھی کہ جب تک وہ پاکستان نہیں آجاتیں' وہ اکیلی اپنے اپارٹمنٹ نہیں جائے گی۔

ایمن کو بھی انہوں نے اس کا خیال رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ ان کی ہدایت کے پیش نظر ہی وہ ایمن کے ساتھ رہ رہی تھی مگر اس روز ایمن کو ایک ضروری سیمینار اٹینڈ کرنا تھا لہٰذا اپنی چند ضروری چیزوں کے لیے مجبوراً اسے اکیلے ہی مارکیٹ آنا پڑا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شاپنگ سے واپسی پر وہ زائر ملک کی نظروں کے حصار میں آجائے گی اور وہ شخص بے خوف و خطر اسے یوں ڈنکے کی چوٹ پر ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔

اس وقت وہ ثانیہ کو مارکیٹ سے سیدھا اس کے اپارٹمنٹ لے آیا تھا۔ زرد چہرے اور سرد ہاتھوں کے ساتھ ثانیہ عباس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ عجیب صورت حال بن گئی تھی وہ فون کرکے ایمن کو زائر کے بارے میں مطلع بھی نہ کرسکی جانے اب وہ اس کے

ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا۔ اپارٹمنٹ پر ملازمہ بھی نہ تھی کہ اسی کا حوصلہ ہوتا۔ وہ بہت کنفیوژ حالت میں اس کے ساتھ اندر آئی تھی جب وہ بولا۔

"دیکھو میرا یقین کرو میری وجہ سے جو کچھ بھی تمہارے ساتھ ہوا میں اس کے لیے تم سے بہت شرمندہ ہوں مگر میں تمہیں نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ رہا نکاح نامہ بے شک دوبارہ اپنی دوست کو اور بھی کسی کو دکھانا چاہتی ہو تو دکھا دو۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے' ہاں اس روز میں شام کو نہیں آسکا اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ نکاح نامہ میرے دوست کے پاس تھا اور وہ ملک سے باہر تھا۔ تم میری عزت ہو ثانیہ! میں تمہارے ساتھ کوئی فراڈ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

اس کا ہاتھ پکڑ کر اپارٹمنٹ کے اندر لاتے ہوئے وہ اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔ ثانیہ کا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا محال ہوگیا۔

"تم بھروسا کرتی ہو ناں مجھ پر؟ ہاں؟" اب وہ اس کے ہاتھ کو دبا رہا تھا۔ ثانیہ نفی میں سر ہلانا چاہتی تھی مگر جانے کیسے اس کا سر اثبات میں ہل گیا۔

"شکریہ...... بہت بہت شکریہ۔" وہ مسرور ہوا پھر اگلے ہی پل اس نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیے۔

"میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا ثانیہ! حقیقت یہی ہے کہ مجھے تمہاری ذات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی صرف ایک شرط کے لیے نفس بہکا اور پھر تمہاری بات دل پر لگ گئی۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ میں نکاح کے بعد تمہیں فوری طلاق دے کر یہ کہانی ختم کردوں گا مگر میں ایسا نہیں کرسکا۔ پچھلے دو ہفتوں سے میں روز یہاں کا چکر لگا رہا ہوں مگر تم مجھے نہیں ملیں میں کوئی پروفیشنل ڈکیت یا لٹیرا نہیں ہوں ثانیہ! میری کہانی صرف اتنی سی ہے کہ میں نے بچپن سے ہی ایک لڑکی کو چاہا اور اس کے خواب دیکھے صرف اس کی خواہشات کی تکمیل کے لیے غلط راستہ اپنایا مگر پھر بھی وہ مجھے نہیں ملی اس نے صرف اس لیے مجھے ٹھکرا دیا کہ میرے پاس دولت نہیں تھی۔ میں بہت اداس تھا' مجھے لگا شاید مجھے تمہاری بددعا لگ گئی ہے' اسی لیے میں ہر صورت تم سے مل کر تم سے معافی مانگنا چاہتا تھا مجھے معاف کردو ثانیہ! پلیز۔" شدت سے اس کے ہاتھ دباتے ہوئے وہ معافی مانگ رہا تھا۔ ثانیہ بوکھلا کر رو دی۔

"تم کہو گی تو میں تمہیں ابھی طلاق دے کر چلا جاؤں گا اگر ایسا نہیں چاہو گی تو میں وعدہ کرتا ہوں میری وجہ سے کبھی تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں آئیں گے مجھے معاف کردو ثانیہ! پلیز۔" کہتا بے بس لگ رہا تھا وہ اس کے سامنے۔ ثانیہ نے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے نکال لیے۔

"آپ ایسا مت کہیں پلیز' میرے ساتھ جو ہوا شاید وہی تقدیر کا لکھا تھا بہرحال میں نے اپنی مما کو سب بتا دیا ہے وہ کل پاکستان آرہی ہیں وہی فیصلہ کریں گی کہ مجھے آپ کے ساتھ زندگی گزارنی چاہیے یا نہیں۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی' زائر گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

باہر شام رات میں تبدیل ہو رہی تھی' ہلکی ہلکی بوندا باندی نے ایک دم سے تیز بارش کا روپ دھار لیا تھا' زائر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے تو پھر میں کل ہی آؤں گا پھر اس بار کہیں مت جانا' مجھے زندگی میں دھوکا پسند نہیں ہے۔" ثانیہ کا سر ہنوز جھکا ہوا تھا' عین اسی لمحے لائٹ چلی گئی۔

"دروازہ بند کرلو بلکہ ہوسکے تو اپنی فرینڈ کو فون کرکے بلالو موسم کے تیور ٹھیک نہیں ہیں۔" وہ اسے تنبیہہ کررہا تھا' ثانیہ نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ابھی آپ رک جائیں پلیز' مجھے اندھیرے میں اس موسم سے بہت ڈر لگتا ہے۔" زائر نے اس کی التجا پر ایک نظر اس کے چہرے کی طرف دیکھا پھر ایک نظر باہر طوفان کی صورت اختیار کرتی بارش کو' اس وقت واقعی اس کا وہاں رکنا ضروری تھا۔

❁ ❁ ❁

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے پر اس میں بڑا نقصان ہوا

کچھ بخت میں ڈھیروں کا لک تھی' کچھ آب کے غضب کا کال پڑا
ہم راکھ لیے ہیں جھولی میں اور سر پہ ساہوکار کھڑا
جب دھرتی صحرا صحرا تھی ہم دریا دریا روئے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں اور سر سنگیت میں کھوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں کچھ خواب انوکھے بوئے تھے
کچھ خواب سجل مسکانوں کے' کچھ خواب کبت دیوانوں کے
کچھ لفظ جنہیں معانی نہ ملی' کچھ گیت شکستہ مانوں کے
کچھ نیر وفا کی شمعوں کے' کچھ پر پاگل پروانوں کے
پھر اپنی گھائل آنکھوں سے خوش ہو کے لہو چھڑکایا تھا
ماٹی میں ماس کی کھاد بھری اور نس نس کو زخمایا تھا
ہم بھول گئے پچھلی رت میں' کیا کھویا تھا' کیا پایا تھا
ہر بار گگن نے وہم دیا
اب کے برکھا جب آئے گی
ہر بیج سے کونپل پھوٹے گی ہر کونپل پھول کھلائے گی
سر پہ چھایا چھتری ہوگی اور دھوپ گھٹا بن جائے گی
جب فصل کٹی تو کیا دیکھا
کچھ درد کے ٹوٹے گجرے تھے
کچھ زخمی خواب تھے کانٹوں پر' کچھ خاکستر سے گجرے تھے
اور دور افق کے ساغر میں
کچھ ڈوبتے ڈولتے بجرے تھے
اب کھاٹ نہ گھر دہلیز نہ در
اب پاس ہمارے کیا بابا
بس تن کی گٹھڑی باقی تھی جا یہ بھی تو لے جا بابا
ہم بستی چھوڑے جاتے ہیں تو اپنا قرض نبھا بابا

موسم میں ایک دم سے تبدیلی آئی تھی۔ باہر کہیں بادل زور سے گرجا تھا۔ زائر کے ہاتھ پر ثانیہ عباس کے ہاتھ کی گرفت مزید مضبوط ہوگئی تھی۔

زائر اس کے خوف کو محسوس کرتا اگلے ہی پل اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔

"کیا تمہیں بھی دوسری بہت سی لڑکیوں کی طرح چمکتی بجلی اور گرجتے بادلوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"ہوں۔" وہ صرف سر ہلا سکتی تھی۔ زائر کی آنکھوں میں ایک دم سے سائرہ افضل کا سراپا لہرا گیا۔ وہ بہت نڈر تھی کسی چیز سے نہیں ڈرتی تھی' چھپکلی' کاکروچ' سانپ جو بھی چیز کے پیچھے بھاگ کر جب تک اسے مار نہیں دیتی تھی اسے چین نہیں آتا تھا۔ اکثر شدید خطرناک موسم میں بنا آندھی طوفان کی پروا کیے وہ بڑی بے فکری سے اوپر چھت پر جاکر کپڑے وغیرہ اتار لاتی تھی۔ رات میں لائٹ نہ ہوتی تو سکون سے دیا جلا کر اپنی کڑھائی وغیرہ کا کام مکمل کرتی رہتی "ڈر" جیسا لفظ اس کے لیے قطعی نا آشنا تھا۔ شاید اسی لیے اسے اس سے محبت ہوئی تھی کہ اس میں عام لڑکیوں جیسی کوئی بات ہی نہیں تھی اور شاید اسی لیے اس نے بڑی جی داری سے اسے ٹھکرا کر نمبردار کے بیٹے کے ساتھ نکاح کرلیا تھا۔ کوئی پھانس تھی جو اس کے دل میں چبھی تھی' تبھی وہ آہستہ سے اپنا ہاتھ ثانیہ عباس کی گرفت سے نکالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تم بیٹھو میں لائٹ کا انتظام کرتا ہوں۔" ثانیہ کی اندھیرے میں جان جاتی تھی مگر پھر بھی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی رہی جب وہ کچن سے کینڈل جلا کر لے آیا۔

"کیا اندھیرے سے بھی ڈر لگتا ہے؟" کینڈل ٹیبل پر سیٹ کرتے ہوئے بہت سرسری سے لہجے میں اس نے پوچھا تھا جب وہ بولی۔

"ہوں۔"

"اور مجھ سے؟" اچانک پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اسے کنفیوژ کردیا تھا۔ ثانیہ کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

"پتا نہیں۔"

"یہ تو کوئی جواب نہ ہوا پلیز بتاؤ ناں' مجھ سے بھی ڈر لگتا ہے کہ نہیں؟" اب وہ پھر سے اس کے مقابل آ بیٹھا تھا۔ ثانیہ سے نظریں اٹھانا دشوار ہوگیا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟" اس کی "نہیں" پر بے ساختہ وہ مسکرایا تھا۔

"پتا نہیں۔"

"یہ تو غلط بات ہے یار! اصولاً تو اس وقت سب سے زیادہ ڈر آپ کو مجھ سے ہی لگنا چاہیے کیونکہ اتنے خراب موسم میں جب کہ تنہائی بھی میسر ہو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" اس کے خوب صورت لبوں کے گوشوں میں مسکراہٹ دبی تھی' ثانیہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"میں جانتی ہوں آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے؟"

"کیوں؟" اب اس کی خوب صورت نگاہوں میں اشتیاق تھا۔ ثانیہ نے رخ پھیر لیا۔

"کیونکہ میں آپ کی منزل نہیں ہوں۔" زائر نے اس کے جواب پر بے ساختہ گہری سانس بھری تھی پھر اٹھ کر باہر روڈ کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔

"یہاں منزلوں کی خبر کسے ہے ثانیہ جی! سالوں ساتھ چلنے والے ایک لمحے میں ہاتھ چھڑا کر ایک دم سے راستہ بدل لیتے ہیں یوں کہ پھر پیچھے پلٹ کر انہیں آپ کی طرف دیکھنا بھی یاد نہیں رہتا بہرحال مجھے کردار کے معاملے میں باکمال مت سمجھیے گا کیونکہ عورت کا وجود میری کمزوری نہیں ہے۔ مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آرہا کہ اس روز مجھے کیا ہوگیا تھا۔ سوائے سائرہ کے آج تک میں نے کسی لڑکی کو غور سے نہیں دیکھا نہ مجھے اس میں کوئی دلچسپی ہے' میں زندگی کی آخری سانس تک صرف سائرہ کا ہو کر رہنا چاہتا تھا مگر اس نے میرے پیار کو اس قابل نہیں سمجھا۔ محبت' عزت اور دولت میں سے اس نے دولت کو چن لیا اور تمہیں پتا ہے ناں دو محبت کرنے والے دلوں کے درمیان جب دولت آجاتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ تقدیر سالوں تک اس دل کی سرزمین پر صرف آنسو ہی آنسو کاشت کرتی ہے اور صدیوں تک آنسو ہی آنسو کاٹتی رہتی ہے۔" پل میں اس کی خوب صورت غلافی آنکھوں کے گوشے سرخ ہوگئے تھے۔ ثانیہ دل میں عجیب سی کسک محسوس کرتی خاموش بیٹھی رہی۔

"لیکن اسی دل کی سرزمین سے محبت کی بہار جب دستک دے کر بے مروا لوٹ جاتی ہے تو پھر کوئی لاکھ سر پٹختا رہے محبت اس کے لیے کبھی اپنا در وا نہیں کرتی۔ میرے دل میں بھی اب سائرہ کے لیے کوئی خواہش نہیں ہے' وہ محبت جو اس کی ذات سے وابستہ تھی اب میرے دل میں اس کا مقبرہ ہے اور مقبروں پر صرف یادوں کے دیئے جلائے جاتے ہیں' ان کے ساتھ خوابوں کو پیوستہ نہیں کیا جاتا۔" جانے وہ اسے کیا باور کرانا چاہتا تھا ثانیہ یک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ عین اسی لمحے موسم نے کروٹ بدلی ہلکی پھلکی بارش نے شدید طوفان کی صورت اختیار کرلی تھی' کھلی کھڑکی سے تیز ہوا کے جھکڑ اسے اچھا خاصا سہا گئے تھے اس کی صورت دیکھتے ہوئے زائر نے تیزی سے تمام کھلی ہوئی کھڑکیوں کے پٹ بند کردیئے۔

"اتنے خراب موسم میں جب کہ ملازمہ بھی ساتھ نہ ہو آپ کو یہاں اکیلے نہیں رہنا چاہیے۔" وہ رخ پھیرے کھڑا تھا' ثانیہ اس کے "تم" اور "آپ" میں الجھتی سر جھکا گئی۔

"میں تنہا نہیں رہتی ملازمہ گاؤں گئی ہوئی ہے اور میں ایمن کی طرف رہتی ہوں۔ ابھی مارکیٹ سے سیدھے وہیں جانا تھا مگر آپ زبردستی یہاں لے آئے۔"

"ایمن کی طرف کیوں رہتی ہیں آپ؟" اس کی وضاحت پر وہ حیرانی سے پلٹا تھا جب وہ بولی۔

"لاسٹ ٹائم جب آپ یہاں آئے تھے تو وہ بہت ڈر گئی تھی اس کا کہنا ہے کہ آپ نے مجھ سے نکاح کا محض ڈرامہ کیا تھا ورنہ فلموں ڈراموں میں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی چوری کی نیت سے آپ کے گھر میں گھسے اور پھر نیت خراب ہونے پر آپ کی عزت کی لاج رکھتے ہوئے آپ سے نکاح کرلے اسی لیے وہ نہیں چاہتی کہ آپ دوبارہ میری تذلیل کرنے کے لیے یہاں آئیں اور میں آپ کو یہاں ملوں۔" ثانیہ کے الفاظ نے اسے بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کیا تھا۔ تبھی روشن نگاہیں اس کے خوب صورت سراپا پر جمائے وہ اس کے قریب آیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر دھر دیئے۔

"کس چیز پر اعتراض ہے اسے میرے شرافت سے نکاح کرنے پر یا بقول اس کے دوبارہ تذلیل پر؟"

"دونوں پر۔" بنا سر اٹھائے اس نے جواب دیا تھا' زائر پھر ہنس دیا۔

"پگلی ہو تم دونوں اور کچھ نہیں۔" ایک ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگاتے ہوئے اس نے سر جھٹکا تھا' تبھی ثانیہ کا صوفے پر دھرا سیل وائبریٹ کرنے لگا' اس نے جلدی سے اٹھ کر کال پک کر لی۔

"ہیلو۔"

"کہاں مرگئی ہو' تمہیں پتا ہے میں پچھلے دو گھنٹوں سے پاگلوں کی طرح تمہارے سیل پر کالز کر رہی ہوں' کیوں نہیں اٹھا رہیں تم۔" اس کی آواز سے اس کی پریشانی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"سوری ایمن! میرا سیل سائلنٹ پر تھا' تمہاری کالز کا پتا ہی نہیں چلا۔"

"کیوں؟ تم کیا انڈے سینکنے بیٹھ گئی تھیں جو سیل کو سائلنٹ پر لگا چھوڑا۔"

"نہیں یار! موسم اچانک بہت خراب ہوگیا تھا' میں مارکیٹ سے سیدھی ادھر اپارٹمنٹ میں ہی آگئی' ابھی تھوڑی دیر میں' میں بس تمہیں کال کرنے ہی والی تھی۔"

"جسٹ شٹ اپ! میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ تم۔" وہ اس سے شدید خفا تھی' جبھی چنگھاڑتے ہوئے کال ڈراپ کر گئی تو ثانیہ نے بھی سیل آف کر دیا۔ وہ اپنی اس دوست کے مزاج اور غصے سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔ اس وقت اگر زائر وہاں نہ ہوتا تو یقیناً وہ اسے فوری کال بیک کر کے مناتی' پوری وضاحت دیتی مگر اس وقت وہ خود اس سے بچنا چاہتی تھی' جبھی سیل آف کر کے رکھ دیا۔ اس بات سے قطعی بے نیاز کہ ایمن اس کے لیے پوری رات کتنی پریشان رہے گی۔

"کیا کہہ رہی تھی ایمن؟" اس کے گہری سانس بھرنے پر زائر پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ثانیہ نے ایک نظر اسے دیکھ کر رخ پھیر لیا۔

"کچھ نہیں' پریشان ہو رہی تھی' میں نے اسے مطلع نہیں کیا تھا ناں کہ میں ادھر آگئی ہوں اس لیے۔"

"ہوں.... پھر؟"

"پھر کچھ نہیں' وہ اس وقت غصے میں ہے' میں نے اب سیل آف کر دیا۔"

"لیکن میرے خیال میں آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ اسے بتانا چاہیے تھا کہ اس وقت میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"نہیں اگر میں یہ بتا دیتی تو اس نے اپنی اور میری جان ایک کر دینی تھی۔ میرے معاملے میں وہ بہت پوزیسو ہے' صبح مما کے آنے کے بعد میں اس سے بات کروں گی۔"

"چلیں ٹھیک ہے' جو آپ بہتر سمجھیں۔" گہری سانس بھر کر کہتے ہوئے وہ اس کے پہلو میں ہی صوفے پر ٹک گیا تھا۔

"ایک بات پوچھوں ثانیہ؟" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

"جی۔"

"صبح اگر آپ کی مما نے مجھ سے ملنے کے بعد ہمارے نکاح نامے کو ریجیکٹ کر دیا اور مجھے پسند نہ کیا تو کیا آپ مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لیں گی؟"

"ہاں۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے فوری فیصلہ سنا دیا تھا۔ زائر کے دل کو دھچکا سا لگا۔

"اور اگر میں ایسا نہ چاہوں تو؟"

"آپ ایسا نہ چاہیں تب بھی میں وہی کروں گی جو میری مما کہیں گی۔"

"کیوں؟ کیا میں اتنا برا ہوں؟"

"میں نے کب کہا؟" اب وہ سر اٹھائے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ زائر نے پلکیں موند کر سر صوفے کی پشت گاہ سے ٹکا دیا۔

"ہم کو حسرت ہی رہی ٹوٹ کے چاہے جاتے
دل میں بس جاتے تو ہرگز نہ بھلائے جاتے
میری دنیا میں کوئی ایک تو ایسا ہوتا
روح تک گھاؤ جسے رو کے دکھائے جاتے

آپ آئے ہیں تو دھڑکن کی بندگی ہے ورنہ
ہم سے یہ ہجر کے صدمے نہ اٹھائے جاتے"

آنکھیں بند کیے بہت جذب کے عالم میں وہ یہ غزل اسے سنا رہا تھا۔ ثانیہ یک ٹک اس کے چہرے کے خوب صورت نقوش کو دیکھتی بے چین سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرا خیال ہے آپ نے شام سے کچھ نہیں کھایا ہوگا' میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" جانے کیوں اس لمحے زائر عباس کی قربت اسے کمزور کر رہی تھی جبھی فرار چاہا تو زائر نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

"کیوں اب ڈر نہیں لگے گا؟"

"نہیں۔" اس کی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں' وہ مسکرا دیا۔

"ٹھیک ہے جائیے' میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔" ٹیبل سے کینڈل اٹھا کر اسے تھماتے ہوئے وہ شرارتی ہوا تھا۔ ثانیہ بنا اس کی آنکھوں میں دیکھے خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ کیبنٹ میں کھانے پینے کی مختلف چیزوں کے ساتھ خشک دودھ کے ڈبے بھی رکھے تھے' اس نے چولہا جلا کر پانی بوائل کیا پھر کیبنٹ سے مگ نکال کر ٹرے میں کپ ترتیب دینے لگی۔

اگلے دس منٹ میں جس وقت اس نے زائر کے سامنے ٹیبل پر ٹرے رکھی جانے اس کے من میں کیا آیا کہ اٹھ کر اسے چھیڑ بیٹھا۔

"ثانیہ.... تمہارے پاؤں میں چھپکلی۔" اس کا یہ کہنا تھا اور ثانیہ چیخ مار کر اس کی طرف لپکنا تھا۔ زائر ہنس رہا تھا جب کہ وہ زرد پتے کی طرح کانپتی اس کے بازو سے لگی تھی۔ اس لمحے ثانیہ عباس کے دل کی تیز دھڑکنوں کو وہ اپنے وجود میں اترتا محسوس کر رہا تھا۔

"پاگل لڑکی ہو تم ثانیہ عباس اور کچھ نہیں۔" ثانیہ سمجھ گئی تھی کہ اس نے مذاق کیا ہے' شاید جبھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ زائر اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر شرمندگی محسوس کر رہا تھا مگر اس نے ثانیہ عباس سے کچھ نہیں کہا' چائے پینے کے دوران وہ بہت خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا تاہم تیز ہوا کے جھکڑ اب بھی بند کھڑکیوں کے کواڑوں پر دستک دے رہے تھے۔ ثانیہ چائے پینے کے بعد برتن کچن میں رکھ کر آئی تو وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے نیند آرہی ہے پلیز سلادیں۔"

"مم.... میں؟" وہ اس کی عجیب وغریب فرمائش پر حیران ہی تو رہ گئی تھی۔

"جی ہاں آپ۔"

"لل.... لیکن میں آپ کو کیسے سلا سکتی ہوں؟"

"ادھر آئیں میں بتا دیتا ہوں۔" اس کا ہاتھ تھام کر بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے کہا تھا' وہ ہکا بکا سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"آپ کو نہیں پتا' پچھلے تین ہفتوں سے میں بہت بے سکون ہوں۔" بیڈ پر لیٹ کر اسے اپنے پہلو میں بٹھاتے ہوئے وہ بہت سنجیدگی سے اسے کہہ رہا تھا۔ ثانیہ کی جان مشکل میں پھنس گئی۔

"میں جانتا ہوں آپ کو میری ذات میں دلچسپی نہیں ہے' ہونی بھی نہیں چاہیے۔ ایک قطعی اجنبی شخص جس کے بارے میں آپ کچھ بھی نہ جانتے ہوں بھلا اس کی ذات سے آپ کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے مگر ہمارے بیچ ایک تعلق تو ہے ناں ثانیہ؟" اس کے لہجے میں عجیب سی آنچ تھی۔ ثانیہ کا دل اس کی سماعتوں میں دھڑکنے لگا۔ وہ ہرگز نہیں جانتی تھی کہ اس کا کیا ارادہ ہے؟ اگر جانتی ہوتی تو شاید کبھی اس کے قریب نہ بیٹھتی۔ اس کا ایک ہاتھ زائر کی گرفت میں تھا جب کہ دوسرے ہاتھ سے وہ اب اس کے بال سہلا رہی تھی۔ زائر نے دھیرے سے پلکیں موند لیں۔ بہت دنوں کے بعد اسے سکون محسوس ہو رہا تھا اور اب وہ کبھی اس سکون کو کھونے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

چند لمحے پہلے ثانیہ نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا' صبح سورج کی پھوٹتی کرنوں کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ ثانیہ عباس کی ماں اسے ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی سے دور کرکے

پھر سے بے سکون کرسکتی تھی تبھی اپنے اوراس کے رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے اپنے دونوں ہاتھ ثانیہ عباس کے کندھوں پر جماتے ہوئے اسے اپنے اوپر گرالیا' وہ اس کی گرفت میں ذرا سی کسمسائی تھی مگر زائر نے پروا کیے بغیر حصار مزید مضبوط کردیا۔

"مجھے غلط مت سمجھنا ثانیہ! مگر اپنے رشتے کو بچانے کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"نہیں...... آپ نے وعدہ کیا تھا' آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔" وہ گھبرائی تھی تبھی اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"وہ وعدہ اس وقت کیا تھا' جب مقصد صرف اپنی خواہش کا حصول تھا مگر اب میرا ارادہ بدل گیا ہے اب میں ہمیشہ تمہیں اپنی زندگی میں شامل دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ تبھی ممکن ہے جب تمہارے پیروں میں میری محبت کی زنجیر ہو' ایسی زنجیر جس کی وجہ سے تم چاہتے ہوئے بھی مجھ سے الگ نہ رہ سکو۔" وہ شخص ذہین بھی تھا اور شاطر بھی۔ ثانیہ اس کا ارادہ جان کر دنگ رہ گئی تھی۔

"میں ایسا نہیں کرسکتی' میں نے اپنی مما سے وعدہ کیا ہے میں ان کے اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتی۔"

"مگر میں تمہارا شوہر ہوں' قانونی اور شرعی شوہر۔ تم میرے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتیں۔"

"کرسکتی ہوں کیونکہ یہ رشتہ صرف نفس کی خواہش پر قائم ہوا تھا' دل کی خواہش پر نہیں۔" اس کی بانہوں میں مچلتے ہوئے اس نے اپنا آپ اسے چھڑا لیا تھا۔

"مگر اب اس میں دل کی خواہش بھی شامل ہے۔" پھر سے اس کے آنچل کو تھامتے ہوئے وہ بے خود ہوا تھا۔ ثانیہ سٹپٹا کر رہ گئی' وہ اٹھ کر بھاگنا چاہتی تھی مگر زائر ملک نے اسے اتنا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ ٹھان چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے تبھی ثانیہ کی التجاؤں اور آنسوؤں کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ صبح میں ابھی چند ہی ساعتیں باقی تھیں جب وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

اگلے پچیس منٹ کے بعد فریش ہوکر وہ دوبارہ کمرے میں آیا تو ثانیہ کے آنسو سسکیوں میں ڈھل چکے تھے۔

"تم ایک بے ہودہ' جنگلی انسان ہو' میں لعنت بھیجتی ہوں تمہاری رفاقت پر' یاد رکھنا' تم میں وہ بھی [illegible] ہونے دوں گی جو تم چاہتے ہو' سنا تم نے۔" اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی وہ چلائی تھی' زائر شرمندہ سا اس کے مقابل جا بیٹھا۔

"ایم سوری ثانیہ...... میں......"

"جسٹ شٹ اپ! میں اس وقت تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" وہ رو رہی تھی' زائر اس کے ابتر حال پر ایک نظر ڈالتا' خاموشی سے کمرے سے نکل آیا۔

اگلے دو گھنٹوں کے بعد وہ ثانیہ کے اپارٹمنٹ میں اس کی ماں اور دوست ایمن کے مقابل بیٹھا انہیں اپنے بارے میں بتا رہا تھا۔

"میں مانتا ہوں میں نے ثانیہ کو پانے کے لیے جو طریقہ اپنایا وہ ٹھیک نہیں تھا مگر حقیقت یہی ہے میں دل سے ان کی عزت کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔"

"ہمیں تمہاری عزت سے کوئی لینا دینا نہیں' ثانیہ امیر باپ کی بیٹی ہے۔ پیدا ہونے سے لے کر اب تک محلوں میں رہی ہے سونے کے چمچ سے کھایا ہے شاندار گاڑیوں میں گھومی ہے۔ تمہارے پاس کیا ہے اسے دینے کے لیے' ایک ٹوٹی پھوٹی چار دیواری' گھڑے کا ٹھنڈا پانی اور رات کی باسی روٹی؟" وہ تلوار جو ساجد افضل نے اس کے دل پر چلائی تھی۔ وہی تلوار ثانیہ کی مما کے ہاتھ میں تھی' زائر کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں میرے پاس واقعی دولت نہیں ہے جس کا آپ ذکر کررہی ہیں مگر زندگی گزارنے کے لیے صرف یہی دولت کافی نہیں ہوتی

ایک دولت اور بھی ہوتی ہے' محبت کی دولت جو بہت کم ماؤں کی بیٹیوں کو نصیب ہوتی ہے مگر جس کے لیے ہر ماں دعائیں ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا گو رہتی ہے۔"

"تم اپنی محبت اپنے پاس سنبھال کر رکھو کیونکہ جس محبت پر تم اتنا اترا رہے ہو وہ محبت میری بیٹی چند ٹکوں میں خرید سکتی ہے۔"

"میری محبت نہیں خرید سکتی آپ کی بیٹی! اپنا آپ بیچ دے تب بھی نہیں۔" ایک لمحے میں وہ مشتعل ہوا تھا۔ ثانیہ کی مما ناگواری سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"زیادہ جنگلی پن دکھانے کی ضرورت نہیں ہے بہتر ہوگا تم میری بیٹی کو طلاق دو اور یہاں سے دفع ہوجاؤ۔" ایمن ثانیہ کے ساتھ بیٹھی تھی' زائر کی آنکھیں لمحوں میں سرخ ہوگئیں۔

"سوری! میں ایسا نہیں کرسکتا۔"

"تو ٹھیک ہے ہم کورٹ سے رجوع کرلیں گے خلع کے لیے۔" اب وہ اسے دھمکی دے رہی تھیں' وہ مضطرب سا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کرلیں رجوع' میں دیکھتا ہوں دنیا کی کون سی عدالت مجھے آپ کی بیٹی سے الگ کرتی ہے۔" اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تھا پھر کچھ یاد آنے پر پلٹا اور ثانیہ عباس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"ایک بات یاد رکھنا ثانیہ! جب میں نفس کا غلام ہوا تھا تو تم نے مجھے خدا یاد دلایا تھا' آج میں بھی وہی کررہا ہوں اگر میری وجہ سے تم نے کسی معصوم کی جان لی تو یاد رکھنا میں تمہیں تمہارے اس گناہ کے لیے کبھی معاف نہیں کروں گا اور شاید میرا خدا بھی تمہیں معاف نہ کرے۔" لہجے اور آنکھوں میں ڈھیروں اضطراب لیے اسے خبردار کرنے کے بعد وہ پھر وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔

اگلے چند دنوں میں مسز عباس نے عدالت میں خلع کے لیے کیس دائر کروادیا مگر زائر ملک تو ایسا غائب ہوا کہ پھر پلٹ کر خبر ہی نہیں لی تبھی وہ کیس ختم کرکے ثانیہ کو اپنے ساتھ انگلینڈ لے آئیں' انہی دنوں ثانیہ کی طبیعت خراب رہنا شروع ہوگئی تھی۔

ثانیہ چیک اپ کروانے کے حق میں نہیں تھی' اسے خوف تھا کہ کہیں زائر ملک کی مراد پوری نہ ہوجائے مگر...... کب تک؟ اس روز طبیعت زیادہ خراب ہونے پر بالآخر اسے مسز عباس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا تھا اور پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا' وہ تین ہفتوں کی حاملہ تھی۔ مسز عباس نے اسے ابارشن کا مشورہ دیا تھا' وہ خود بھی یہی چاہتی تھی مگر پھر زائر کے الفاظ نے اسے روک دیا اگر زائر جیسا آزاد منش' چینڈو شخص اللہ کی قائم کردہ حدود کا خیال رکھ سکتا تھا تو پھر وہ تو اس سے زیادہ پرہیزگار' پڑھی لکھی تھی۔

اشعر علی کو بھی اس کے نکاح اور پھر حاملہ ہونے کا پتا چل چکا تھا تبھی وہ جیسے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا' اس کا بس نہ چلتا تھا کہ ثانیہ کو شوٹ کر ڈالے۔ کتنی بڑی بے ایمانی کی تھی اس لڑکی نے اس کے ساتھ۔ وہ ہرگز اسے معاف کرنے والا نہیں تھا۔ مسز عباس کو اس کے ارادوں کی خبر ہوگئی تھی' تبھی وہ بیٹی کو لے کر ایک رات چپکے سے پاکستان چلی آئیں یوں کہ ان کے سسرال کو کانوں کان خبر نہ ہوسکی۔ ثانیہ ابارشن کے حق میں نہیں تھی جب کہ وہ ہر صورت یہ ابارشن کروانا چاہتی تھیں مگر ایسا نہیں ہوسکا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

جھیل، کنارہ، کنکر

نازیہ کنول نازی

ہزار سجدے تو کرچکا ہوں' قضا تمہاری محبتوں میں
میں اب دکھاوے کا کوئی سجدہ ادا کروں گا تو کیا کروں گا
بغیر پانی کے کوئی مچھلی بھلا! کبھی زندہ رہ سکی ہے
میں تجھ کو کھو کر کسی کا ہوکر' بتا کروں گا تو کیا کروں گا

عزیز قارئین!
آداب وتسلیمات

دل کی گہرائیوں سے آپ سب کی خیر وعافیت کے لیے دعا گو ہوں۔

"پتھروں کی پلکوں پر" کے بعد "جھیل' کنارہ' کنکر" کے لیے آپ کی بے پناہ پسندیدگی میرا قیمتی سرمایہ ہے' آپ کی اسی پسندیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اس کے صفحات ڈبل کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ جلد از جلد اس ناول کو اختتام تک پہنچاسکوں مگر اس وقت شدید ذہنی انتشار کے سبب میں چاہتے ہوئے بھی زائد صفحات نہیں لکھ سکی معذرت۔

پچھلے سال میری مما کی صحت اور درازی عمر کے لیے ملک کے گوشے گوشے سے آپ بہنوں نے جیسے دعائیں کیں اپنے خوب صورت خطوط' میسجز اور فون کالز کے ذریعے اپنی محبت اور جذبات مجھ تک پہنچائے ان انمول دعاؤں اور احساسات کے لیے' میری ہر سانس آپ کی مقروض ہے تاہم ایک مرتبہ پھر مجھے آپ کی انہی انمول دعاؤں کی ضرورت ہے۔ اس شخص کے لیے جسے مشرف حکومت نے قطعی بے گناہ ہونے کے باوجود وطن عزیز کے اندھے بہرے قانون کی بھینٹ چڑھادیا۔ دنیا بھر کے مسائل پر چیخ چیخ کر فنڈز بٹورنے والی انسانی حقوق کی تنظیموں میں آج تک کسی تنظیم نے جیل کی اونچی چار دیواری کے اس پار بربریت وانسانی درندگی کا شکار ہوکر بے بسی کی موت مرتے ان قیدیوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی' کتنی دل سوز کہانیاں ہیں جو ان اونچی دیواروں کے اندر جنم لیتی ہیں اور دم توڑ دیتی ہیں۔ خدا کا واسطہ ہے کوئی تو اٹھے' کوئی تو ان لوگوں کے لیے نفرت کا گراف گراکر انہیں انسان نہ سہی جانور سمجھ کر ہی ان پر رحم کرے۔

پتا نہیں کب قانون کا اندھا پن دور ہوگا' کب آنکھیں نصیب ہوں گی اسے' کب سیدھے سادے بے گناہ شہری جعلی پولیس مقابلوں اور جیلوں میں قانون کے رکھوالوں کی دہشت گردی سے محفوظ رہ سکیں گے' کب لوگوں کے دلوں سے عقوبت خانوں میں بے بس قیدیوں کے لیے نفرت کا گراف نیچے گرے گا' جانے کب اعلیٰ عدالتوں اور برسر

اقتدار حکمرانوں کو اس بدنصیب مخلوق کے لیے سنجیدگی سے سوچنے کی فرصت نصیب ہوگی' جانے کب اونچی چار دیواریوں کے اندر ہر لمحہ اک نئی مصیبت کی بھینٹ چڑھ جانے والے اس تیسری دنیا کے باسیوں کو انسان ہونے کا درجہ دیا جائے گا اور یہ سسک سسک کر بے بسی کے ساتھ پاگل پن کی موت مرنے سے چھٹکارا پا سکیں گے۔

میں ان قانون سازوں کی دل کی گہرائیوں سے ممنون و مشکور ہوں جو سزائے موت کا قانون پاکستان میں ختم کرنے کا بل پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میں کسی پارٹی' کسی این جی او سے وابستہ نہیں ہوں پھر بھی وقت کے ہر ظلم اور بربریت کے خلاف میری کھلی جنگ ہے۔ خدا کے واسطے اس ماں کے لعل کی رہائی کے لیے دعا کیجیے جو بے گناہ ہوتے ہوئے بھی ظلم کی بھینٹ چڑھ گیا۔ معصوم بہنوں کے اس بھائی کے لیے دعا کیجیے جس کے حوصلے بے پناہ ظلم و تشدد برداشت کرنے کے باوجود بھی نوٹے نہیں ہیں' جواب بھی رب کائنات کی رحمت سے بہ امید انصاف کا منتظر ہے۔ کیا پتا آپ میں سے کسی کی دعا اسے موت کی وادی سے زندگی کے گلشن کی طرف واپس لے آئے۔ ایک ماں کی مامتا اور بوڑھے باپ کی ہر وقت بھیگی نگاہیں آپ کی ممنون رہیں گی' ساتھ ہی اللہ رب العزت کے بعد صدر آصف علی زرداری سے رحم کی امید بھی رکھتی ہوں۔ آخر میں میری دعا ہے کہ اللہ اگلے پانچ سال کے لیے پاکستان پر ایسے کوئی حکومت مسلط نہ کرے جو اقتدار میں آتے ہی سب سے پہلے ان ستر فیصد بے گناہ قیدیوں کو سولی پر لٹکانے کا لائحہ عمل تیار کریں آمین۔

"بے حد دکھی دل کے ساتھ" (یار زندہ صحبت باقی)

کبھی وہ مجھ سے کہتا تھا کہ میری زندگی تم ہو
تمہی ہو آرزو میری' میری تو ہر خوشی تم ہو
نہ دیکھوں میں اگر تم کو تو آنکھیں نور ہی کھو دیں
میری آنکھوں میں جان جاں چمکتی روشنی تم ہو
مجھے ہر خوف سے ہٹ کر یہ دنیا کو بتانا ہے
کہ اپنے پیار کا بندھن تو صدیوں سے پرانا ہے
ہمیں اک دوسرے کی ذات کی تکمیل کرنی ہے
سمندر کے کنارے پھر ہمیں اک گھر بنانا ہے
وہ گھر جس میں بہاروں' خوشبوؤں' رنگوں کا میلہ ہو
یہاں سے دور سبزے میں وہ گھر اپنا اکیلا ہو
میں ہر صبح تمہاری آنکھ سے دیکھوں حسین منظر
تمہارے حسن کا جادو میری آنکھوں میں پھیلا ہو
مگر پھر یوں ہوا حالات نے اس کو بدل ڈالا
بھلا کر اس کی سب باتیں ہمارا دل کچل ڈالا
بنائے ساحلوں پر گھر سمندر سے حسین اس کے
مگر وائے مقدر کہ بدل ڈالے یقین اس کے
کسی کا ہاتھ ہاتھوں میں وہ لے کر اب بھی چلتا ہے
مگر جب تنہا ملتا ہے تو بس اتنا ہی کہتا ہے

سنو......
بچھڑ کے تم سے جو دل پر لگا ہے گھاؤ گہرا ہے
ہمارے دل کی وادی میں جہاں تھا راج خوشیوں کا
وہاں اب "درد" ٹھہرا ہے

مینا کمال اپنے شوہر کمال حسن کے پاس انگلینڈ واپس جا چکی تھیں۔ میکال کا ارادہ بھی وہیں شفٹ ہونے کا تھا کیونکہ عائشہ از ہان کی کنارہ کشی کے بعد اس کا پاکستان میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ مگر اچانک حسن صاحب کی طبیعت ناساز ہوگئی تھی لہٰذا مجبوراً اسے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا تھا تاہم وہ بہت اپ سیٹ ہو کر رہ گیا تھا۔

اس روز موسم بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔ ہانیہ اور نہال اس وقت ایوننگ واک پر نکلے تھے۔ ہانیہ آج کل نہال سے گاڑی ڈرائیو کرنا سیکھ رہی تھی۔ جاتی گرمیوں اور آتی سردیوں کے ان اداس دنوں میں سرسبز درختوں نے شفاف سڑک پر ڈھیروں زرد پتے بکھیر دیے تھے۔ انہی پتوں پر قدم قدم نہال حسن کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے ہانیہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"پتا ہے نہال! دنیا میں محبت سے زیادہ دلچسپ اور

عجیب چیز اور کوئی نہیں' جسے یہ مل جاتی ہے اسے خوب صورت بنا دیتی ہے اور جس سے یہ چھن جاتی ہے اسے پتھر بنا کر رکھ دیتی ہے' میں نے دیکھے ہیں محبت کی بستی میں پتھر ہوئے لوگ۔" لانگ شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس' دونوں بازو سینے پر باندھے وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی' نہال نے سڑک کے وسط میں پڑا پتھر پاؤں کی ٹھوکر سے دور اچھال دیا۔

"مجھے لگتا ہے تم میکال بھیا کے ساتھ شادی پر خوش نہیں ہو' ہے ناں ہانی؟"

"ہوں۔" پہلی بار اس کے قیاس پر اس نے یوں اعتراف کیا تھا' وہ چونک اٹھا۔

"ہانی......"

"ہاں نہال! میں میکال حسن کے ساتھ زبردستی اس بندھن پر خوش نہیں ہوں۔ ہر روز رات میں ایک ہی بیڈ پر اس کے پہلو میں لیٹی میں اپنی بے بسی پر تڑپ تڑپ کر روتی ہوں' میرا بس نہیں چلتا کہ میں اپنا چہرہ نوچ لوں' مجھے آئینے میں اپنے چہرے سے زیادہ بھیانک اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ میں عذاب بن کر ایک ناپسندیدگی کے تاثر کے ساتھ اس کے سر پر سوار نہیں رہنا چاہتی۔ کوئی مجھے ایک بار نظر انداز کرے تو میں اسے دس بار نظر انداز کرتی ہوں مگر میں کیا کروں' پاپا نے تو جیسے کسی ناکردہ گناہ کی طرح میرے وجود کو اپنی زندگی سے نکال پھینکا ہے' میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی' اس زیادتی کے لیے میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" پہلی بار وہ جذباتی دکھائی دے رہی تھی' نہال ششدر رہ گیا۔

"ہانی...... یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"پتا نہیں۔" سنگی بنچ پر بیٹھ کر وہ اب رونے لگی تھی۔ وہ پریشان ہو گیا۔

"ہانی پلیز مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے' کیا میکال بھیا نے تم سے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم نے یہ سب کیوں کہا' میں مانتا ہوں تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے مگر میکال بھیا بھی اس شادی کے لیے خوش نہیں تھے پھر بھی پتا نہیں کیوں مما پاپا نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا' مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔ ماں باپ کے فیصلوں کی اہمیت اپنی جگہ مگر انہیں اپنے بچوں کی زندگیوں کو یوں ضد اور انا کا مسئلہ نہیں بنالینا چاہیے۔" سر جھٹکتے ہوئے وہ بھی جذباتی ہوا تھا۔ ہانیہ نے آنسو پونچھ لیے۔

"شاید اسے ہی تقدیر کا لکھا کہتے ہیں' خدا ایسے ہی اپنے بندوں کو دکھاتا ہے کہ وہ ہے مگر میں بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں دکھاؤں گی میکال حسن کو کہ ہانیہ صفدر بھی کسی سے کم نہیں ہے۔"

"ہوں' یہ ہوئی ناں بات۔ میں اپنی ہانی کو کسی بھی محاذ پر کبھی شکست نہیں دیکھ سکتا۔" وہ خوش ہوا تھا۔ ہانیہ گہری سانس بھر کر رہ گئی' تبھی وہ بولا تھا۔

"ہادیہ کی کال آئی تھی کل میرے نمبر پر' تمہیں لے کر وہ بہت ڈسٹرب ہے شاید رو بھی رہی تھی' تم اس سے بات کیوں نہیں کرنا چاہتی۔ وہ تمہاری بہترین دوست ہے ہانی! تم میکال بھیا کی زیادتی کا بدلہ اس سے کیوں لے رہی ہو؟"

"پتا نہیں۔" اس بار نہال کے سوال پر بے زاری جتاتے ہوئے وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی' نہال بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے ہانیہ! مانا اس نے تمہارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے مگر دوستوں کو یوں چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر زندگی سے نکال پھینکنا درست نہیں ہے' وہ بتا رہی تھی کہ انکل اور آنٹی بھی تمہارے سلوک کو لے کر بہت پریشان ہیں اور شاید جاذب بھی' انکل کا ارادہ ہے کہ تمہارے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اب ہادیہ اور جاذب کی نیا بھی پار لگا دیں مگر صرف تمہاری وجہ سے یہ نیک کام التوا کا شکار ہو رہا ہے۔"

"کیوں' کیا میں نے ان کی خوشیوں پر پابندی لگا

رکھی ہے؟"

"نہیں' لیکن جس طرح سے شادی کے بعد تم ایک بار بھی وہاں نہیں گئی انہیں لگتا ہے تم شادی پر بھی نہیں جاؤ گی' بھی وہ تمہارا غصہ ٹھنڈا ہونے کا انتظار کررہے ہیں۔"

"مگر مجھے کوئی غصہ نہیں ہے' یہ میری زندگی ہے اور میرے خیال سے اسے اپنی مرضی اور اختیار سے گزارنے کا حق بھی میرے پاس ہونا چاہیے۔"

"رائٹ...... لیکن......"

"پلیز اسٹاپ اٹ نہال! بہتر ہوگا کہ ہم اس ٹاپک پر کوئی بات نہ کریں' میں منافق نہیں ہوں' میرا دل اگر ان لوگوں سے ملنے کو نہیں چاہتا تو میں زبردستی وہاں جا کر ان کے ساتھ گھل مل کر نہیں رہ سکتی۔ پتا نہیں یہ لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔" وہ بہت زیادہ قنوطیت اور بے زاری کا شکار ہورہی تھی۔ نہال گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"ہوں' میں سمجھ سکتا ہوں' دلوں میں فرق آجائے تو پھر تعلق نبھائے نہیں جاتے' گھسیٹے جاتے ہیں۔" بہت دھیمے لہجے میں وہ بہت گہری بات کہہ گیا تھا۔ ہانیہ کی آنکھیں پھر بھرانے لگیں۔ اسے اس وقت اپنی ذات اور سڑک پر بکھرے زرد پتوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہورہا تھا۔ بہت سے دن اداسیوں کی نذر کرنے کے بعد اس روز پھر اس کی میکال سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا' ہانیہ چپکے سے اس کے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔

"کیا ہورہا ہے؟" بہت لگاوٹ سے اس نے پوچھا تھا مگر میکال نے حسب توقع نہ اس کی طرف دیکھا نہ اس کے سوال کا جواب دیا۔

"میرا اکاؤنٹ بھی بنادیں فیس بک پر پلیز۔" اگلے ہی پل شرارت سے کہتے ہوئے اس نے اپنا سر اس کے کندھے پر دھر دیا تھا جب کہ اس کے بازو میکال کے بازو کے گرد لپٹے تھے مگر وہ اب بھی خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔

"اف...... ! ایک ہزار فرینڈ ہیں آپ کے اکاؤنٹ میں' میں عائشہ جی کو بتاؤں گی۔"

"جسٹ شٹ اپ' اوکے۔" اس بار وہ بھنایا تھا۔ ہانیہ تذلیل کے باوجود ڈھٹائی سے مسکرادی۔

"اتنا ڈرتے ہیں عائشہ جی سے' ویسے محبت واقعی انسان کو بہت کمزور کردیتی ہے' ہے ناں؟"

"میرا دماغ مت کھاؤ' جا کر سو جاؤ چپ چاپ۔" کتنی بے زاری اور نفرت تھی اس شخص کے لہجے میں' ہانیہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ مگر پھر بھی وہ بہت ضبط سے بولی تھی۔

"کیسے سو جاؤں' نیند ہی نہیں آرہی۔ آپ آکر سلادیں پلیز......"

"اتنا فضول ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔"

"تو ٹھیک ہے پھر میں بھی یہیں بیٹھی رہوں گی آپ کے پاس' چاہے پوری رات بیت جائے۔"

"تم اپنی حد سے بڑھ رہی ہو ہانیہ صفدر!" اس بار سلگ کر کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کرتے ہوئے وہ اس کے پہلو سے اٹھ گیا تھا۔ ہانیہ کے لبوں پر پھیکی سی مسکان بکھر گئی۔

"اچھا' کیا ہیں میری حدود؟" اس نے پوچھا تھا مگر میکال حسن جواب دینے کی بجائے بیڈ پر چت لیٹ گیا تھا۔ جانے کیوں اس لمحے اسے روشنی سے وحشت ہورہی تھی۔ آنکھوں پر بازو رکھ کر اس نے خود کو ہانیہ صفدر سے لاتعلق ظاہر کیا تھا مگر وہ اس بے زاری پر بھی اٹھ کر اپنی جگہ پر جانے کی بجائے اس کے پہلو میں آبیٹھی تھی۔

"میں نہیں جانتی میکال کہ آپ زندگی میں کبھی مجھ سے محبت کریں گے یا نہیں مگر مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ آپ نے عائشہ جی سے محبت کا حق ادا کردیا۔" اس بار یاسیت سے کہتے ہوئے اس نے اپنا سر میکال حسن کے کشادہ سینے پر ٹکا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والے گرم گرم آنسو اسے اپنے اندر جذب ہوتے محسوس ہوئے تھے شاید تبھی وہ بپھر کر اٹھا تھا۔

"عائشہ عائشہ عائشہ...... آج کے بعد میرے سامنے اگر بھولے سے بھی تمہاری زبان پر اس کا نام آیا تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔ وہ میری محبت' میری زندگی ہے اور میں نے یہ حق کسی کو نہیں دیا کہ وہ مجھ سے میری محبت کو ڈسکس کرے' تمہاری جو اوقات ہے بہتر ہوگا تم اسی میں رہو ورنہ مجھ سے کسی بھی قسم کی رعایت کی امید مت رکھنا۔" حقارت سے اسے پرے دھکیلتے ہوئے اس نے جیسے اسے کوڑا مارا تھا۔ اس سے بڑھ کر بھلا اس کی ذات کی توہین اور کیا ہوتی تھی شاید تبھی وہ بلبلا اٹھی۔

"مجھے اپنی اوقات میں رہنا بہت اچھی طرح آگیا ہے میکال حسن! مگر کاش کہ آپ بھی اپنی اوقات میں رہنا سیکھ لیں' کس بات کا اتنا گھمنڈ ہے آپ کو' بولیں...... میرے سامنے آپ کی کیا اوقات ہے؟"

"جسٹ شٹ اپ؟" اس بار چنگھارتے ہوئے وہ خود پر سے اپنا اختیار کھو بیٹھا تھا۔ ہانیہ اپنے رخسار پر پڑنے والے اس جاندار تھپڑ سے لڑکھڑا کر رہ گئی تھی۔

"اپنے باپ سے پوچھنا جا کر اپنی اوقات' جنہوں نے راتوں رات زبردستی تمہیں میرے گلے کا ڈھول بنادیا' پتا نہیں کیا کیا گل کھلائے ہوں گے کہ انہیں یوں میرے پاپا کے پاؤں پکڑنے پڑے' تمہیں تو کوئی نہ کوئی لڑکا چاہیے دل بہلانے کے لیے خواہ وہ شوہر کے روپ میں ہو یا اس کے بھائی کے۔" ہانیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ انتہائی گھٹیا الفاظ میں اپنے اندر کا زہر نکال رہا تھا۔ ہانیہ کو لگا جیسے اس کے جسم کا تعلق روح سے ٹوٹ گیا ہو بھلا کوئی یوں اتنی بے رحمی سے بھی کسی کی ذات کے بخیے ادھیڑ سکتا تھا؟

وہ چلا کر اس کا منہ توڑنا چاہتی تھی مگر اس کے اعضاء جیسے جواب دے گئے تھے۔ رنج' حیرانی' اذیت' غصہ کیا نہیں تھا اس کی آنکھوں میں۔ ایک لمحے میں وہ خوب صورت آنکھیں جیسے لہو ٹپکانے لگی تھیں۔ جسم دہکتا انگارہ بن گیا تھا' تبھی شدید اشتعال میں وہ آگے بڑھی تھی اور اس نے اس کا گریبان تھام لیا تھا۔

"کیا جانتے ہو تم میرے کردار کے بارے میں' ہاں...... ! کیا سوچ کر اتنا گھٹیا بہتان لگایا ہے تم نے مجھ پر؟ کیا سمجھتے ہو تم کہ میری قسمت اگر تمہارے ساتھ پھوٹ گئی تو تم کوئی بہت اعلیٰ وارفع چیز ہو' میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تمہاری رفاقت پر' وہ بھی ہزار بار۔" زخمی ناگن کی طرح پھنکار کر کہتی وہ اس پر اس کی اہمیت واضح کر گئی تھی۔

"ہانیہ صفدر اتنی گری پڑی نہیں ہے کہ تم جیسا شخص اٹھ کر اس کے کردار پر انگلی اٹھا سکے' اب تک اگر میں تم پر فدا رہی تو یہ میرے کردار کی کمزوری نہیں بلکہ نرم دلی تھی' مجھے لگا شاید تمہیں کسی بہت اپنے کی ضرورت ہے مگر نہیں تم جیسے لوگ اسی قابل ہوتے ہیں کہ انہیں دھتکار دیا جائے۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا میکال حسن! کسی انسان کی اوقات نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان سے محبت کرسکے' یہ تو صرف اور صرف اللہ رب العزت کا کمال ہے کہ وہ کسی انسان کے دل اور اس کی آنکھوں میں' کسی دوسرے انسان کے لیے محبت ڈال دے' تم بھی ڈرو میکال حسن! اس گھڑی اس لمحے سے جب تم میرے لیے روؤ اور مجھ پر تمہارے آنسو اثر ہی نہ کریں۔" لہو ٹپکاتی آنکھوں کے ساتھ اس نے نفرت سے اسے پرے دھکیلا تھا۔ میکال حسن اس کے اس عجیب و غریب روپ پر حیران ہی تو رہ گیا تھا۔

وہ کمرے سے نکل گئی تھی' میکال نڈھال سا بیڈ پر بیٹھا گیا۔ اس نے واقعی اس لڑکی کے کردار کے لیے بہت غلط لفظ استعمال کیے تھے شاید اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ رات دھیرے دھیرے آگے سرکتی جارہی تھی مگر وہ سو نہیں پارہا تھا۔ سر میں ایک دم سے شدید درد کا احساس ہوا تھا' وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھا رہا۔

❁ ❁ ❁

میکال حسن کو ہانیہ صفدر کی بددعا لگ گئی تھی۔ گھر میں' آفس میں' پارٹیز میں' وہ ہر جگہ اس کے اعصاب پر سوار ہوکر رہ گئی تھی۔ اپنے کردار کی چوٹ پر جو مشتعل انداز اس نے اپنایا تھا' وہ اس کے ذہن سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔ اسے حیرت ہورہی تھی کہ پچھلے ایک ماہ میں اس نے جتنا

بانیہ صفدر کے بارے میں سوچا تھا اتنا عائشہ اذہان کے بارے میں بھی نہیں سوچ سکا تھا۔

ایک دم سے وہ بہت بے نیاز ہوکر رہ گئی تھی۔ پچھلے ایک ماہ سے وہ انگلینڈ میں تھا مگر اسے جیسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کی واپسی پر بھی اس کی بے نیازی برقرار رہی تھی۔

سارہ اور مائرہ ہاسٹل شفٹ ہوگئی تھیں۔ نہال کا ایم بی اے بھی مکمل ہوگیا تھا اور آج کل وہ اور بانیہ دونوں آفس جارہے تھے۔ میکال کا دل جیسے بزنس سے بھی اچاٹ ہوگیا۔

اس وقت شام ڈھل رہی تھی۔ ریاض حسن صاحب اور مسز حسن شام کی چائے سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ بانیہ وہاں نہیں تھی مگر نہال وہیں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ تبھی ریاض حسن صاحب نے سرسری سی ایک نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"جانے کیوں مگر مجھے لگتا ہے آسیہ! جیسے ہم نے اپنے بچوں کے ساتھ زیادتی کی ہے شاید ہمیں میکال کی مرضی کے خلاف بانیہ بیٹی سے اس کی شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"جی! میرے بھی یہی احساسات ہیں۔ میکال اس شادی سے خوش نہیں ہے اور شاید بانیہ بھی۔"

"کیا بانیہ بیٹی نے آپ سے اس بارے میں کوئی بات کی ہے؟"

"نہیں لیکن میں جانتی ہوں وہ بہت حساس بچی ہے ماں کی وفات کے بعد اس کی شخصیت جیسے ایک دم سے بدل کر رہ گئی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے میکال کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اتنے دنوں میں ایک بار بھی اسے دل سے ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا' اپنے گھر والوں سے بھی قطع تعلق کرلیا ہے اس نے شاید میکال کی طرح وہ بھی اس شادی سے خوش نہیں ہے۔"

"ہوں شاید ایسا ہی ہے' مگر میری سمجھ میں میکال کا یہ نہیں آرہا' وہ ایسا کیوں کررہا ہے؟"

"میں جانتی ہوں وہ ایسا کیوں کررہا ہے۔" کپ کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے مسز حسن نے کہا تھا۔ جواب میں ریاض حسن صاحب چونک اٹھے۔

"کیا مطلب؟"

"میکال کسی اور لڑکی میں انٹرسٹڈ تھا' شاید وہ لڑکی آپ کے آفس میں ہی کام کرتی تھی' عائشہ اذہان نام تھا اس کا' مجھے اگر یہ بات پہلے معلوم ہوجاتی تو میں کبھی عائشہ کی جگہ بانیہ کے لیے ضد نہ کرتی۔"

"مگر عائشہ کی شادی تو ڈھائی سال پہلے ہی ہوچکی ہے اس نے آفس سے ریزائن کردیا تھا۔" اس بار چونکنے کی باری مسز حسن کی تھی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں....؟"

"پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں مما۔" کب سے خاموش بیٹھے نہال نے ٹی وی آف کرتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

"عائشہ جی کی شادی میکال بھیا کی شادی سے دو سال پہلے ہی ہوگئی تھی۔ وہ بھیا کی یونیورسٹی فیلو تھیں' گھریلو حالات کی وجہ سے جاب کرتی تھیں۔ بھیا ان سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر ان کی ماں نے پہلے ہی ان کا رشتہ کہیں اور طے کردیا' اسی لیے وہ جاب بھی چھوڑ گئیں۔"

"وہاٹ.... تم نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"بتایا تھا مما! مگر شاید آپ کو یاد نہیں رہا' بہرحال آپ سب کچھ جان بھی لیتیں تو کیا کرسکتی تھیں۔ میکال بھائی نے عائشہ کو نہیں چھوڑا' عائشہ نے خود میکال بھیا کو چھوڑا ہے۔" "وہ خود بھی اپ سیٹ تھا' مسز حسن الجھ کر رہ گئیں۔

"بانیہ میری دوست ہے مما! وہ کیسی لڑکی ہے میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں' اسی لیے میں بھی اس شادی کے حق میں نہیں تھا اور اب.... جس طرح سے میکال بھیا بار بار اسے ٹیز کررہے ہیں' میں یہ سب برداشت نہیں کرسکتا۔ بانیہ صفدر کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا میرے لیے دنیا کا مشکل ترین کام ہے لہٰذا پلیز آپ میکال بھیا

کو سمجھا دیں نہیں تو میں ان سے لڑ پڑوں گا۔" ریموٹ صوفے پر اچھالتے ہوئے اس نے خاصی سنجیدگی کے ساتھ کہا اور اگلے ہی پل بنا کوئی بات سنے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف آگیا۔ پیچھے ریاض حسن صاحب اور مسز آسیہ حسن دیر تک وہیں بیٹھے اس موضوع کو ڈسکس کرتے رہے تھے۔

❁ ❁ ❁

اسے کہنا....
بچھڑنے سے محبت تو نہیں مرتی
بچھڑ جانا محبت کی صداقت کی علامت ہے
محبت ایک فطرت ہے....
اور فطرت کب بدلتی ہے....
سو جب ہم دور ہوجائیں نئے رشتوں میں کھو جائیں
تو یہ مت سوچ لینا تم محبت مرگئی ہوگی
نہیں ایسا نہیں ہوگا....
میرے بارے میں سن کر جب تمہاری آنکھ بھر آئے
چھلک کر ایک بھی آنسو پلک پر جو ٹھہر جائے
تو بس اتنا سمجھ لینا....
جو میرے نام سے اب بھی تیرے دل کو عقیدت ہے
تیرے دل میں بچھڑ کر بھی ابھی میری محبت ہے
محبت تو بچھڑ کر بھی سدا آباد رہتی ہے
محبت ہو کسی سے تو ہمیشہ یاد رہتی ہے

چاندنی رات تھی۔ سرد ہواؤں سے بے نیاز کھڑکی میں کھڑی وہ میکال حسن کے بارے میں سوچ رہی تھی' جس سے ترک تعلق کیے آج اسے پورا ڈیڑھ ماہ ہونے کو آیا تھا۔ اس نے اپنا موبائل نمبر بدل لیا تھا گھر سے نکلنا بھی ترک کرچکی تھی۔ اس روز جب ارتج اسے ہوٹل سے لایا تھا تو پورے راستے اس کا موڈ بنا رہا تھا۔ گاڑی میں اس نے اس کی طرف دیکھنا تو درکنار بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا مگر وہ بے نیازی خاموش بیٹھی رہی تھی۔

گھر آکر تھوڑی دیر کے بعد وہ نارمل ہوگیا تھا تاہم اس روز کے بعد عائشہ اذہان کا اس سے سامنا بہت کم ہوا تھا۔ انہی دنوں اس کا بھائی دبئی میں سیٹ ہوگیا تھا۔ اس کی ساس اپنی بیٹی کی بڑھتی عمر اور زبان سے سخت عاجز تھی' دولت جائیداد کے باوجود کوئی رشتہ نہیں آرہا تھا۔ تبھی انہوں نے عائشہ سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کے لیے اپنی ماں سے رشتے کی بات کرے' عائشہ اپنی نند کو پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ اس کی عادتیں اور کردار کھلی کتاب کی مانند اس کے سامنے تھے تاہم ساس کی بات رکھنے کے لیے اس نے اپنی ماں سے بات کرلی تھی اور اس کی حیرت کی

انتہا نہ رہی جب اس کی ماں نے ذرا سی سوچ بچار کے بعد یہ رشتہ منظور کرلیا۔

چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق فوری شادی کے دن رکھ دیئے گئے تھے۔ عائشہ اس افراتفری پر بوکھلا کر ہی تو رہ گئی تھی۔ دونوں طرف سے شادی کی تیاری اس کے کندھوں پر آ پڑی جب کہ اس کی جان پہلے ہی سکون میں نہیں تھی۔

اس وقت بھی جب وہ تھکن سے چُور ساری دنیا سے کٹ کر کھڑی تھی اس کا شوہر کمرے میں آ گیا تھا۔

"آشا۔" وہ اسے عائشہ کی بجائے آشا ہی پکارتا تھا۔ اس کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا' چونک کر پلٹتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنے شوہر پر ڈالی تھی۔

"ہوں۔"

"میں نے باہر جانا ہے' اماں سے کہو گیٹ کھولے۔" بچوں کی طرح مچل کر ضد کرتے ہوئے اس نے منہ بسورا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"نہیں' اس ٹائم باہر نہیں جاتے' میں وعدہ کرتی ہوں صبح لے جاؤں گی آپ کو۔"

"نہیں' میں نے ابھی جانا ہے' اریج بھی گیا ہے' میں بھی جاؤں گا۔" وہ اپنی ضد پر اڑا رہا تھا' عائشہ پریشان ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی شام کے بعد اسے اور اس کے شوہر کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ شادی سے پہلے ایک بار اس کا شوہر آنکھ بچا کر شام کے بعد گھر سے نکل گیا تھا اور قریب ہی روڈ پر حادثے کا شکار ہو گیا' تاہم ٹریفک کم ہونے کی وجہ سے اسے زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ اس روز کے بعد سے اس پر پابندی عائد ہو گئی تھی تبھی وہ اسے ٹال رہی تھی مگر وہ تو جیسے کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

"جمال میں......" ابھی وہ اسے سمجھانے کے لیے لفظ ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ اس کے شوہر نے غصے سے بگڑتے ہوئے قریبی ٹیبل پر پڑا گلدان اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔

عائشہ کے لیے یہ حملہ قطعی غیر متوقع تھا' تبھی وہ اپنا دفاع نہیں کرسکی تھی' گلدان اس کی پیشانی پر لگا تھا اور اگلے ہی لمحے خون کا ایک فوارا ابل پڑا تھا۔ عائشہ تیورا کر گری تھی اور اس کے بعد اسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔ اریج جو اپنا موبائل فون چارج پر بھول گیا تھا' اٹھانے کے لیے واپس آیا تو جمال چیخ رہا تھا وہ گھبرا کر اس کے کمرے کی طرف بھاگا' اس کی ماں بھی سیڑھیوں سے بھاگی آ ئیں' تبھی سامنے کا منظر دیکھ کر ان دونوں کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ سامنے فرش پر پڑی عائشہ اذہان کی پیشانی سے بہنے والے خون نے اس کا چہرہ چھپا دیا تھا' بجلی کی سی سرعت سے لپک کر وہ اس کی طرف بڑھا اور بنا کچھ بھی سوچے سمجھے اگلے ہی پل اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی کے قریب لے آیا۔ اس کی ماں باہر تک آئی تھی مگر وہ اس سے قبل ہی گاڑی لے کر نکل چکا تھا۔

❁......❁......❁

عائشہ اذہان کی جس لمحے آنکھ کھلی' وہ اسپتال کے سرد کمرے میں تھی۔ اس کے بائیں بازو میں ڈرپ لگی تھی' آنکھ کھلتے ہی شدید تکلیف کے احساس نے اسے کراہنے پر مجبور کیا تھا۔ اریج جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا' اس کی آواز پر فوراً لپک کر قریب آیا۔

"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟" ڈیڑھ ماہ کے بعد پہلی بار اس نے اسے براہ راست مخاطب کیا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ پیشانی تک لے جاتے لے جاتے رک گئی۔

"ٹھیک ہوں۔"

"مگر ٹھیک لگ نہیں رہی ہیں' اچھا لڑکا تھا وہ اس روز ہوٹل والا سوٹ کررہا تھا آپ کے ساتھ پھر بھی پتا نہیں کیوں آپ میرے پاگل بھائی کے پلے بندھ گئیں۔" وہ اب طنز نہیں کررہا تھا مگر پھر بھی عائشہ کے دل میں درد کی لہر اٹھی تھی۔

"پتا نہیں لوگ کیسے رشتوں کی مروت میں اپنی پوری زندگی' اپنے خوابوں کا سودا کر لیتے ہیں' کم از کم میں ایسا کبھی نہیں کرسکتا۔" اب کے رخ پھیرتے ہوئے وہ دل

گرفتگی سے بولا تھا۔ عائشہ نے جواب میں چپ چاپ پلکیں موند لیں۔ ڈرپ لگنے کے باعث اسے وہاں شدید ٹھنڈ کا احساس ہورہا تھا مگر اس نے اریج سے نہیں کہا۔ عجیب سے چپ سی سوار ہو گئی تھی اس پر' تبھی وہ بولا تھا۔

"یہ ڈرپ مکمل ہو جاتی ہے تو گھر چلتے ہیں' کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا' لا دوں گا۔" سرسری سی ایک نظر اس کی ڈرپ کی رفتار پر ڈالتے ہوئے وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اگلے پچیس منٹ کے بعد نڈھال سی عائشہ گاڑی میں اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔

"یہ جو اسپتال ہوتے ہیں ناں' زندان ہوتے ہیں لوگوں کے لیے' لوگ شفا لینے آتے ہیں یہاں جانے کہاں کہاں سے دھکے کھا کر' پیسے لٹا کر ان شفا خانوں تک پہنچتے ہیں مگر یہاں انسانیت کی خدمت سے اکتائے تعلیم یافتہ لوگ' مسیحائی کے عوض جو سلوک ان کے ساتھ کرتے ہیں' وہ دیکھنے لائق نہیں ہوتا' ڈاکٹرز تو چلو بے حس ہی سہی' نرسز کا گھمنڈ' سنگ دلی اور مریضوں کے ساتھ بے حد برا رویہ دیکھ کر میں ہمیشہ ان شفا خانوں کی طرف آنے سے گھبراتا ہوں۔ خدا کے واسطے اگلی دفعہ خیال کیجیے گا۔ بہت سے لوگوں کو بے موت ان زندانوں میں بے بسی کی موت مرتے دیکھا ہے میں نے۔" سر جھکائے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے اسے تنبیہ کی تھی' عائشہ اب بھی لبوں پر چپ کا قفل لگائے بیٹھی رہی۔

اگلے چند دنوں میں اس نے اریج کو بہت ڈسٹرب دیکھا تھا۔ پوری پوری رات جاگ کر سگریٹ پھونکتا رہتا' گھر کا راستہ تو جیسے اسے بھول ہی گیا تھا۔ کئی کئی دن کے بعد گھر آتا بھی تھا تو کسی کے پاس نہیں بیٹھتا تھا۔ عائشہ اذہان کے ساتھ اس گھر میں ہونے والے ظلم بھی اب جیسے اس کی توجہ سمیٹنے میں ناکام رہے تھے۔

اس روز اس کے سامنے اس کی نند نے اس کے چہرے پر بھرپور تھانچہ دے مارا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا' اپنا والٹ اٹھا کر بے نیازی سے باہر نکل گیا تھا۔ صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح وہ گھریلو

کاموں میں جتی رہتی تھی۔ مگر وہاں اس کا احساس کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ جانے اس سے ایسی کیا خطاء سرزد ہوئی تھی کہ اس کے واحد ہمدرد نے بھی اس کے حق سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

اس روز بہت بارش ہوئی تھی۔ عائشہ کو پچھلے تین چار روز سے شدید بخار نے بے حال کر رکھا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے فرائض مکمل تندہی سے سرانجام دے رہی تھی' تیز بخار کے سبب آنکھیں جیسے جل رہی تھیں جب کہ سر یوں چکرا رہا تھا جیسے ابھی گر پڑے گی۔ رات گئے کچن سے فراغت پا کر وہ اپنے کمرے میں آئی اور بنا کچھ کھائے پیئے ہی بستر پر ڈھیر ہو گئی' اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب اس کا شوہر کمرے سے نکلا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ خبر تو اس وقت ہوئی جب اس کی ساس نے انتہائی بے رحمی سے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑتے ہوئے اسے گہری نیند سے اٹھایا۔

"بدحرام' منحوس' میرا بیٹا وہاں زخمی پڑا ہے اور تو یہاں میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہی ہے۔" تیز چنگھاڑ نے اسے اچھا خاصا بدحواس کردیا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ہوا کیا ہے؟ سرد فرش پر گری تو کہنیوں اور دانتوں میں اٹھنے والے شدید درد نے ہوش بحال کیے' وہ ابھی ٹھیک سے سنبھلی بھی نہیں تھی کہ ساس نے پھر اسے دو تھپڑ جڑ دیئے۔

"چل نکل یہاں سے منحوس ماری' آئی بڑی شہزادی کہیں کی۔" اعصاب شکن گالیاں بکتی ہوئی اس کی ساس اسے سیڑھیوں سے نیچے گھسیٹ لائی تھی۔ وہ بلبلا کر ان سے رحم کی درخواست کرتی رہ گئی' باہر موسم اپنے تیور بدل چکا تھا' گرجتے بادلوں کے ساتھ رفتہ رفتہ تیز ہوتی بارش نے جیسے اس کے حواس معطل کردیئے۔ اس کا شوہر زخمی حالت میں لاؤنج میں دھرے صوفے پر پڑا تھا' وہ لپک کر اس کی طرف بڑھنا چاہتی تھی مگر اس کی ساس اور ان کی مدد کے لیے آئی نند نے اسے بنا کوئی موقع دیئے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ وہ اوندھے منہ گیٹ کے اس

بار سیڑھیوں پر جا پڑی تھی باہر جنوں خیز ہواؤں اور زور پکڑتی بارش نے اسے مزید سہما دیا۔ تبھی اریج کی گاڑی کے ٹائر اس سے کچھ ہی فاصلے پر چرچرائے تھے۔

❀ ❀ ❀

دانش وراں تُو دی نیں جیہڑے حل ہوندے
ایسے نقطے وی عشق سمجھا دیندا
لوکی پیراں دے ہتھ نئی چومن دیندے
عشق کنجیاں دے پیر اچھا دیندا

"میکال...... "وہ آفس کے لیے نکل رہا تھا جب مسز حسن کی پکار پر ان کے قریب چلا آیا۔ تھکے تھکے سے اعصاب اور آنکھوں میں دوڑتی رت جگوں کی سرخی اس کے اندر کے حال کا بخوبی پتا دے رہی تھی۔ مسز حسن نے ہاتھوں میں پکڑا ڈائجسٹ سائیڈ پر رکھ دیا۔

"بیٹھو! مجھے کچھ بات کرنی ہے تم سے۔"

"سوری مما! میں اس وقت آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔"

"آفس امپورٹنٹ نہیں ہے۔" چہرے پر حد درجہ سنجیدگی طاری کیے وہ خفگی سے بولی تھیں۔ میکال لب بھینچتا ان کے مقابل ٹک گیا۔

"جی فرمایئے۔"

"مجھے ہانیہ کے بارے میں بات کرنی ہے وہ بہت پیاری اور سلجھی ہوئی بچی ہے میرا خیال تھا تم اسے خوش رکھو گے مگر ایسا نہیں ہے۔" میکال کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے بات کی تمہید باندھی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی میکال! مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اگر شادی نہیں کرنا چاہتے تو اس کے پیچھے کیا وجہ ہے پتا لگ بھی جاتا تب بھی شاید میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی کیونکہ تم نے جس لڑکی کو پسند کیا وہ تم سے پہلے پیاہ کر کہیں اور جا چکی تھی ایسے میں اگر ہانیہ نہ ہوتی تب بھی کسی نہ کسی لڑکی نے تو تمہاری زندگی میں آنا تھا ناں پھر ہانیہ کے ساتھ ایسا تضحیک آمیز سلوک کیوں؟" وہ پوچھ رہی تھیں مگر میکال اب بھی سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا تھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں اس بچی سے میرے نزدیک اس میں اور مائرہ میں کوئی فرق نہیں ہے بھابی صاحب کی وفات کے بعد اس کی زندگی بہت بدل گئی ہے۔ ترستی ہے وہ خوشیوں کے لیے وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کے ساتھ یوں تضحیک آمیز سلوک کیا جائے میں نہیں چاہتی کہ بھائی صاحب کو کسی بات کا پتا چلے اس لیے درخواست کر رہی ہوں تم سے اس بچی کو ستانا چھوڑ دو پلیز......" وہ التجا کر رہی تھیں تبھی ان کی نگاہ میکال کی بھرائی آنکھوں پر پڑی اور وہ جیسے تڑپ اٹھیں۔

"میکال...... میری جان! مجھے بتاؤ کیا مسئلہ ہے کیوں کر رہے ہو تم یہ سب؟ میں تمہاری ماں ہوں بیٹے۔" فوراً اٹھ کر اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیا تھا تبھی وہ اٹھ کر نیچے قالین پر بیٹھا اور اپنا سر ان کی گود میں رکھتے ہوئے رو پڑا۔

"ایم سوری مما...... مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے بہت بے چینی ہے میرے اندر ایک عجیب سا طوفان مجھے اندر سے تہس نہس کرنے کو مچل رہا ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی کسی ننھے سے معصوم بچے کی مانند وہ ان کی گود میں منہ چھپائے دیر تک روتا رہا اور آسیہ بیگم بے چین و متفکر سی اس کے بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرتی جانے کیا کیا پڑھ کر اس پر پھونکتی رہیں۔

❀ ❀ ❀

کہیں دور دشتِ خیال میں
کوئی قافلہ ہے رکا ہوا
کہیں خالی آنکھ کی گود میں
کئی رت جگے ہیں پڑے ہوئے
کہیں عہدِ ماضی کی راہ پر
کوئی یاد ہی کہیں کھو گئی

کہیں خواب زاروں کے درمیاں
مجھے زندگی نے بسر کیا
میرے...... دوسال کی گود میں نہ وصال کا کوئی چاند ہے
کوئی آس ہے نہ امید ہے
نہ کسی ستارے کا ساتھ ہے

ٹپ ٹپ ٹپ...... گزرے ہر لمحے کے ساتھ حورعین فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر بکھر رہے تھے اور عمیر ہمدانی اس کے سامنے دم سادھے بت بنا بیٹھا اس کی روداد سن رہا تھا۔ وہ روداد جو روح چھید کر رکھ دیتی تھی۔ گزرے ہوئے وہ لمحے آج بھی نشتر بن کر اس کی روح میں چبھتے تھے۔ آج بہت دنوں کے بعد اس نے اپنی ذات کو ان تکلیف دہ لمحوں کے سپرد کیا تھا۔

بگرام جیل کی یادیں وہاں بیتا ہر لمحہ آج بھی اس کی رگوں سے لہو نچوڑتا تھا۔ ساری دنیا کے لیے امن اور تہذیب کا نعرہ لگانے والے یہودی مل کر ان عقوبت خانوں میں کیسے انسانیت کی دھجیاں بکھیر رہے تھے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

"سپر پاور" کہلانے والے سپر پاور کو جس ملک کے عوام میں بڑھتی ہوئی نفرت پر تشویش تھی اسی عوام کے انمول ہیروں کو وہ بدترین بربریت کی بھینٹ چڑھا کر صفحۂ ہستی سے مٹا رہا تھا اور اسے اس پر کوئی تشویش نہیں تھی۔ وہ سانس لینے کو رکی تھی جب عمیر نے بے تابی سے پوچھا۔

"پھر...... پھر کیا ہوا؟ کیا آپ کو بھی سر جاوید ہمدانی کی طرح امریکہ کے حوالے کر دیا گیا؟"

"نہیں۔" اس کے سوال پر نرمی سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی عین اسی لمحے نمیر نے اس کمرے میں انٹری دی۔

"تو جناب عمیر صاحب یہاں تشریف فرما ہیں اور وہاں کچن میں ڈھیر سارے برتن پڑے میرا منہ چڑا رہے ہیں۔" صد شکر کہ حورعین نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے پھر بھی اپنے دھیان میں بولتا وہ اس کی طرف دیکھ کر چونکا تھا۔

"ارے آپ رو رہی ہیں؟" رات وہ اس سے نہیں ملا تھا مگر نمیر نے اس کی گھر واپسی پر اسے اس کے بارے میں بتا دیا تھا تبھی کمرے سے نکلتے ہی اس نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ حورعین اس کے غیر متوقع سوال پر چونک اٹھی تھی جب کہ عمیر اس اچانک مداخلت پر گہری سانس بھرتے ہوئے اس کے پہلو سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"چلیے بھابی! باقی کی کہانی پھر سہی میں نے کہیں پڑھا تھا لفظ جھوٹے ہو سکتے ہیں مگر لہجے کبھی فریبی نہیں ہوتے۔ جانے کیوں آپ کے آنسوؤں اور لہجے سے مجھے بھی سچ کی خوشبو آرہی ہے اس لیے جب تک عذیر بھائی نہیں آجاتے آپ یہاں قیام کر سکتی ہیں۔" اپنی بات کہہ کر وہ کمرے میں رکا نہیں تھا جب کہ نمیر حیران رہ گیا۔

"یہ کیا کہہ گیا ہے؟" عمیر کی بات چونکہ اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی تبھی اس نے حورعین سے استفسار کیا تھا مگر وہ بھی نفی میں سر ہلا گئی۔

"کچھ نہیں آپ چلیے میں بھی باہر آتی ہوں۔"

"جی شیور۔" نمیر اس کے گریز کا برا منائے بغیر شرافت سے باہر نکل گیا تھا۔ اسی روز شام میں عذیر ہمدانی کی واپسی ہو گئی تھی وہ کچن میں نمیر کی ہیلپ کروا رہی تھی عمیر حسب معمول کلب گیا تھا جب کہ عمیرا ابھی زبیر کو ٹیوشن سے لانے کے لیے گھر سے نکلا تھا بڑی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی پھر بھی وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی حورعین کو دعائیں دے رہی تھیں کہ جس نے مہمان ہونے کے باوجود ان کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ عذیر حسب عادت شور مچاتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔

"عمیر...... عمیر......" حورعین کا دل اس کی پکار پر زور سے دھڑک اٹھا۔ ایک مشکل ٹلی نہیں تھی کہ دوسری آپڑی تھی۔ نمیر جو اسے پیاز کاٹ کر دے رہا تھا اس کے ہاتھوں کی لرزش پر غور کیے مسکرا اٹھا۔

"لیں بھابی! آگئے آپ کے صاحب بہادر ابھی آپ یہاں نہ ہوتی ناں تو انہوں نے ایک ماہ سے پہلے

نہیں آ تا تھا۔" حورعین کے لب اس کی شرارت پر بمشکل پھیلے تھے' وہ اسے وکٹری کا نشان بنا کر دکھاتا کچن سے نکل گیا۔

"السلام علیکم عذیر بھائی۔"

"وعلیکم السلام! عمیر کہاں ہے؟" دھپ سے بڑی ماں کے پہلو میں صوفے پر گرتے ہوئے انہیں سلام کرنے کے بعد اس نے نظر اٹھا کر نمیر کو دیکھا تھا' حورعین کو لگا جیسے اس کا دل رک جائے گا۔

"وہ تو زبیر کو ٹیوشن سے لینے گیا ہے' خیریت؟"

"اس کے ہوتے خیریت ہوسکتی ہے' ایک نمبر کا بے وقوف' الو کا پٹھا ہے یہ لڑکا۔"

"کیا ہوگیا ہے عذیر! کیوں آتے ہی شروع ہوگئے؟" بڑی ماں کی تسبیح مکمل ہوگئی تھی تبھی وہ بولیں تو وہ غصے سے سر جھٹک کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا ہوا ہے؟ آپ کو پتا ہے بڑی ماں! اس نے کیا کیا ہے؟" انگاروں پر لوٹتا وہ شخص اس کا بھانڈا بس پھوڑنے ہی والا تھا تبھی متوقع رسوائی کے خوف سے آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ وہ کچن کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔

"کیا کیا ہے عمیر نے؟" بڑی ماں کے ساتھ ساتھ نمیر کے کان بھی کھڑے ہوگئے تھے تبھی عذیر کی نگاہ اس پر پڑی تھی۔

"تت...... تم......؟" حورعین کو گمان نہیں تھا کہ وہ اسے یوں فوری پہچان لے گا مگر اس نے اسے پہچان لیا تھا' وہ بنا کوئی جواب دیے چپ چاپ کھڑی رہی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو' تمہیں کیا لگا ہم اسے نہیں رکھیں گے' ارے پہلی بار زندگی میں کوئی ڈھنگ کا فیصلہ کیا ہے تم نے' ورنہ مجھے تو یہی خدشہ تھا کہ نجانے کیسی لڑکی کو اپنے متھے مار لیا ہے تم نے۔" اس کی نگاہوں کی تقلید میں حورعین کو دیکھتے ہوئے بڑی ماں شفقت سے مسکرائی تھیں' عذیر حیران حیران سا بالوں میں ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

"مگر......"

"ارے چھوڑو اگر مگر' کو بہت پیاری بچی ہے' ابھی کل آئی ہے اور آج سارا گھر بھی سنبھال لیا' میرا دل تو بہت خوش ہے اتنی بھلی صورت کی بچی تو شاید میں بھی تمہارے لیے نہیں ڈھونڈ سکتی تھی۔"

"ہاں بھیا' بھابی واقعی بہت گریٹ ہیں' میں نے اور بڑی ماں نے فیصلہ کرلیا ہے' ہم کل ہی سارے خاندان میں آپ دونوں کی شادی کی خبر عام کردیں گے۔" اس کی سنے بغیر بڑی ماں اور نمیر نے فوری اپنی قیمتی رائے پیش کردی تھی' وہ ہکا بکا سا انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

"بڑی ماں! ایسا کچھ نہیں ہے' آپ لوگ واقعی پاگل ہوچکے ہیں۔"

"ہاں' اب تو تم پاگل ہی کہو گے' چپ چاپ تمہاری پسند کو قبول جو کرلیا ہے' میں پوچھتی ہوں تم نے ہم سب کی رائے لیے بغیر اس بچی سے نکاح کیا تھا' تب تم پاگل نہیں تھے۔" بڑی ماں جانے کیا سمجھ بیٹھی تھیں' وہ بوکھلا گیا۔

"نکاح؟"

"اور نہیں تو کیا' تم نے کیا سمجھا تھا' مجھے پتا نہیں چلے گا۔ ارے دادی ہوں تمہاری یہ بال یونہی دھوپ میں سفید نہیں کیے میں نے۔"

"اف......!" دادی کی قیاس آرائی پر اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے تھے' نمیر اس کی الجھن پر مسرور ہوتا وہاں سے کھسک گیا۔ عین اسی لمحے عمیر نے قدم لاؤنج میں دھرے تھے۔

"ارے عذیر بھائی! اتنی جلدی آ گئے آپ' ابھی تو ہفتہ بھی پورا نہیں ہوا۔" نمیر کی طرح اس کے لبوں پر بھی محظوظ کن مسکراہٹ تھی۔ وہ سلگ کر ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے حورعین کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

"ذرا میرے کمرے میں تشریف لایئے' بہت ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔" حورعین جانتی تھی وہ اس سے ایسا ہی کہے گا' تبھی جھکی پلکوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی وہ سر جھکا گئی۔ اگلے پانچ منٹ کے بعد بڑی ماں کے اشارے پر وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھ آئی۔

عمیر کی نگاہوں میں بھی اس کے لیے حوصلہ افزائی تھی۔

"کون ہو تم؟" کمرے میں اس کے قدم دھرتے ہی وہ جو بے قرار سا کھڑکی میں کھڑا تھا' فوراً پلٹ کر اس کی طرف بڑھا۔ حورعین بس ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"میں نے عمیر کو بتایا ہے کہ میں کون ہوں؟"

"مجھے بتانے میں کیا حرج ہے؟" پینٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ پھنسائے وہ بہت کڑی نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا' وہ رخ پھیر گئی۔

"نہیں...... میرا نام حورعین فاطمہ ہے' آپ کی کزن پانیہ صفدر کی کلاس فیلو رہی ہوں' اسی کے ساتھ چند سال قبل اس گھر میں آئی تھی' میں مگر میں نے آپ کے گھر والوں کو کوئی دھوکا نہیں دیا' یہ لوگ خود غلط فہمی کا شکار ہیں۔"

"اچھا اور وہ جو دادو شادی کی بات کررہی ہیں وہ؟"

"میں نے انہیں ایسا کچھ نہیں کہا' نہ شادی کے لیے نہ نکاح کے لیے۔"

"ٹھیک ہے' مگر میں جاننا چاہوں گا آپ یہاں کیوں آئیں؟" اس کی پوزیشن اور انداز میں تبدیلی نہیں آئی تھی' وہ بے چینی سی ہتھیلیاں مسلنے لگی۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ آپ کا گھر ہے' میں تو صرف پناہ چاہتی تھی' کہیں بھی کیونکہ میرے اپنے محل میں میری عزت اور جان کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔"

"کہاں ہے آپ کا محل؟"

"یہیں اسی شہر میں۔ کچھ ہی فرلانگ کے فاصلے پر۔"

"ہوں اور وہ روز قبرستان میں جو باقاعدگی سے حاضری دیتی ہیں وہ؟"

"وہ میرا ایرئیل ہے۔"

"ٹھیک ہے' مگر میں بالکل نہیں چاہوں گا کہ میرے گھر والے آپ کی وجہ سے کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ فوری اپنے منہ سے انہیں سب سچ سچ بتادیں۔" حورعین کے گریز نے اس کا موڈ خراب کردیا تھا' اپنے بھائی کی طرح وہ بھی اسے کسی قسم کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا' تبھی اس کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔

"بتادوں گی مگر ابھی چند روز مجھے یہاں رہنے دیں پلیز' ایک ملازمہ کی حیثیت سے ہی سہی۔"

"ٹھیک ہے مگر ایک بات آپ اچھی طرح سے جان لیں' میری دادو ایک سادہ لوح مگر سخت خاتون ہیں اگر ان پر یہ جھوٹ کھل گیا تو وہ آپ کو ایک پل کے لیے بھی یہاں نہیں رہنے دیں گی' میں اچھی طرح سے جانتا ہوں انہیں اور شاید عمیر بھی تبھی اس نے ان سے یہ نکاح والا جھوٹ گھڑا ہوگا۔ لڑکوں والا گھر ہونے کی وجہ سے وہ محلے کی کسی لڑکی کو بھی گھر میں گھسنے نہیں دیتیں' آج تک انہوں نے کسی لڑکی کو ملازمہ نہیں رکھا' میری کسی گرل فرینڈ کو بھی یہاں آنے اور رکنے کی اجازت نہیں ہے جہاں تک سلمیٰ کا تعلق ہے تو وہ انڈین نژاد ہے میں نے اپنے طور پر اسے رنگ پہنائی تھی تاہم میرے گھر والوں نے اسے نہیں دیکھا اگر میرے حوالے سے بنا کسی تعلق کے وہ بھی یہاں آتی تو شاید چند گھنٹوں سے زیادہ نہ رک سکتی' بہرحال یہ ساری تفصیل سنانے کا مقصد یہی ہے کہ دادو کے سامنے بہت احتیاط سے رہنا' باقی میں کوشش کروں گا کہ آپ کو یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو جب تک آپ یہاں رہیں۔" وہ لگی لپٹی رکھنے والا شخص نہیں تھا۔ حورعین کی نگاہوں میں ممنونیت در آئی۔

"بہت شکریہ' میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

"ویلکم۔" اس بار اس کے چہرے پر سرسری سی نظر ڈالنے کے بعد وہ فوری کمرے سے نکل گیا تھا۔ حورعین نے بے ساختہ سر اٹھا کر اوپر کمرے کی چھت کو تکتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا۔

❁......❁......❁

میں نفرتوں کے جہاں میں رہ کر جفا کروں گا تو کیا کروں گا
یہ ٹھیک کہتے ہو بے وفا ہوں' وفا کروں گا تو کیا کروں گا
بس ایک تو ہی تو رہ گیا ہے جہان سارا تو کھو چکا ہوں
تجھے بھی اپنی انا میں آ کر خفا کروں گا تو کیا کروں گا

ہزار سجدے تو کر چکا ہوں' قضا تمہاری محبتوں میں
میں اب دکھاوے کا کوئی سجدہ ادا کروں گا تو کیا کروں گا
بغیر پانی کے کوئی مچھلی بھلا کبھی زندہ رہ سکی ہے
میں تجھ کو کھو کر کسی کا ہو کر بتا کروں گا تو کیا کروں گا

ائر پورٹ سے گاؤں تک اپنے شان دار استقبال پر ثانیہ عباس نے جیسے خود کو سنبھالے رکھا تھا وہی جانتی تھی مگر کب تک...... ؟ رات کی تاریکی میں تنہائی میسر آتے ہی ضبط کے سارے بندھ جیسے ٹوٹ گئے تھے۔ کیا ضروری تھا کہ پانچ سال کے طویل عرصے کے بعد وطن واپسی پر وہ شخص یوں غیر متوقع طور پر بالکل اچانک اس کے سامنے آتا؟

کیا ضروری تھا کہ دل میں دبی ہوئی راکھ کو پھر سے ہوا ملتی؟ وہ سونا چاہتی تھی مگر نیندوں کے قافلے تو عرصہ ہوا اس سے روٹھ چکے تھے۔ گزرے پچھلے پانچ سالوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں تھا جب وہ شخص اسے یاد نہ آیا ہو۔

گو پچھلے پانچ سالوں میں اس نے زندگی کو بہت سیٹ کرلیا تھا۔ اسے جینے کے ڈھنگ آگئے تھے' مگر پھر بھی اندر کہیں ایک خلا تھا جو پُر ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس کے دونوں بچے اب بڑے ہوگئے تھے' انگلینڈ جیسے ایڈوانس ملک میں پرورش پانے کے باوجود وہ اپنے باپ کو یاد کرتے تھے۔ کیا کیا نہیں ہوگیا تھا گزرے پانچ سالوں میں؟ اس کے کزن اشعر حسین نے بارہا اسے شادی کی پیش کش کی تھی' مگر...... وہ بھلا اب ایسی کسی پوزیشن میں رہی ہی کہاں تھی۔

دل تھا کہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جانے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ سرسراتی ہوا کے سرد جھونکے جیسے سانسیں لوٹ لینے کو مچل رہے تھے۔ وہ بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ آنسو تھے کہ بے دریغ بہتے ہی چلے جارہے تھے۔ وہ اسے سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر وہ اس کی سوچوں میں آنے کے لیے بھلا اس کی مرضی کا پابند ہی کہاں تھا۔ دن رات' سوتے جاگتے' اس کا جب دل چاہتا وہ بے دھڑک اس کی سوچ کے دروا کرتے اس کے تصورات کی دنیا میں چلا آتا تھا۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

زائر ملک کی یاد بہت بے رحمی سے اس کی سوچوں کے تمام در وا کرتی ہوئی اس کے تصورات میں چلی آئی تھی۔

❁ ❁ ❁

زائر ملک ان دنوں شہر میں تھا۔ ثانیہ عباس اپنی ماں کے ہاتھوں بے حد مجبور ہو کر اس روز چیک اپ کے لیے اسپتال آئی تھی۔ اس کی ماں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کا ابارشن نہیں کروائیں گی مگر چیک اپ ضروری ہے تاہم حقیقت میں وہ اس کے ابارشن کے لیے ہی اسے وہاں لائی تھیں۔

زائر کا دوست اتفاق سے اسی اسپتال میں تھا' ان دنوں وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ جو روڈ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوا تھا' وہیں رہ رہا تھا۔ اس کا جو دوست وہاں پر اٹینڈینٹ تھا اس کا خوب خیال رکھ رہا تھا' اس وقت بھی اسے چائے فراہم کرتے ہوئے اسے اپنے چھیڑا تھا۔

"لے یار! دیکھ کتنا خیال رکھتا ہوں تیرا' پھر بھی تُو مہینوں ادھر کا رخ نہیں کرتا۔" زائر نے مسکرا کر چائے کا کپ پکڑا تھا۔

"مہربانی' مگر کیا کروں میں اللہ کی مخلوق کو ان اسپتالوں میں بے بسی کی موت مرتے نہیں دیکھ سکتا اسی لیے نہیں آتا۔"

"چھوڑ یار! تُو اس فیلڈ میں آتا تو تجھے پتا چلتا' کیسے لوگ سر میں درد کردیتے ہیں صبح سے لے کر شام تک۔"

"اس درد کے پیسے بھی دیتے ہیں۔"

"ہوں' پیسہ تو زندگی کے نظام کو چلانے کا سبب ہے' تُو دیکھ ابھی ڈاکٹر ناہید کے پاس ایک عورت آئی ہے اپنی بیٹی کو لے کر' اور تجھے پتا ہے وہ کیا چاہتی ہے؟"

"کیا؟"

"ابارشن...... وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ اس کی بیٹی کی جان کو خطرہ ہے۔"

"وہاٹ؟"

"ہاں یار! یہاں صبح سے شام تک پتا نہیں کیسے کیسے تماشے ہوتے ہیں' اللہ نے ماں کے قدموں تلے جنت رکھی ہے کیونکہ وہ صرف بچے پیدا ہی نہیں کرتی بلکہ اپنے بچوں کی بہترین تربیت بھی کرتی ہے انہیں صحیح اور غلط کا فرق سمجھاتی ہے مگر آج کل کچھ مائیں یوں اپنے مقام اور فرض سے غفلت برتے ہوئے ہیں کہ خدا کی پناہ' اسلامی معاشرے کا چہرہ ہی خراب کرکے رکھ دیا ہے انہوں نے ذرا سی عیش پسند زندگی کے لیے آخرت کی رسوائی مول لے لی ہے اور انہیں اس پر کوئی پچھتاوا بھی نہیں۔" اس کا دوست اپنے خیالات اور دکھ کا اظہار کررہا تھا' زائر کو فوراً ثانیہ عباس کی فکر لاحق ہوگئی' پتا نہیں وہ کہاں تھی اور کیسی تھی؟ ابھی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اچانک اس کی نگاہ وارڈ کے دروازے کے قریب سے گزرتی ثانیہ عباس کی ماں پر جا پڑی۔ صرف ایک ملاقات کے باوجود اس نے فوراً انہیں پہچان لیا تھا۔

"مسز عباس اور یہاں؟" وہ چونکا ہی نہیں بلکہ حیران رہ گیا تھا۔

"ہوں' یہی تو ہیں وہ خاتون جو اپنی بچی کا ابارشن کروانے آئی ہیں۔" اس کے دوست کی نگاہ بھی اس کی نظروں کی تقلید میں مسز عباس پر جا پڑی تھی' تبھی اس نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ زائر کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ کسی اسپرنگ کی طرح وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور فوراً مردانہ وارڈ سے باہر نکل آیا' ثانیہ سر جھکائے ڈاکٹر ناہید کے کمرے میں بیٹھی تھی تاہم ڈاکٹر ناہید اور مسز عباس دونوں ہی وہاں موجود نہیں تھیں' تبھی بے حد مشتعل انداز میں اس نے ثانیہ کا بازو پکڑا اور پھر بنا کسی نتیجے کی پروا کیے اسے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے اسپتال سے باہر لے آیا۔

ثانیہ تو جیسے کسی ٹرانس کی کیفیت میں تھی اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ زائر ملک یوں اس طرح سے اسے ڈھونڈ نکالے گا اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتی وہ ٹیکسی روک چکا تھا۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ' چھوڑو مجھے۔" جب وہ اسے ٹیکسی میں دھکیل رہا تھا وہ چلائی تھی مگر اس نے پروا نہیں کی۔ اس کا چہرہ اس لمحے غیظ وغضب سے خوب سرخ ہورہا تھا۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد اس نے ٹیکسی ایک بچی سڑک پر رکوائی تھی۔ مقررہ کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ اسے اسی طرح کھینچتے ہوئے اپنے گھر لایا تھا۔ قرب وجوار کے گھروں میں مکین خواتین کے لیے یہ ایک بالکل نیا اور دلچسپ ڈرامہ تھا مگر اسے تو جیسے کسی کی پروا نہیں رہی تھی۔ اس کی زوردار دستک کے جواب میں دروازہ اس کی ماں نے کھولا تھا' زائر انہیں نرمی سے سلام کرکے ثانیہ کو گھر کے اندر گھسیٹ لایا۔ پیچھے اس کی ماں جیسے ہکا بکا سی دہلیز پر کھڑی رہ گئی تھی۔

"چٹاخ۔" اپنے کمرے میں لاتے ہی اس نے ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا تھا۔ ثانیہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔

"منع کیا تھا ناں تمہیں کہ اللہ رب العزت کی قائم کردہ حدود کی خلاف ورزی مت کرنا' پھر بھی یہ کبیرہ گناہ کرنا چاہتی تھیں تم' کیوں؟" وہ آگ بگولا ہورہا تھا' ثانیہ سہم کر رہ گئی۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہورہا تھا۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔" بنا اس کی وضاحت سنے وہ دہاڑا تھا۔ تبھی اس کی ماں کمرے میں چلی آئی۔

"زائر بچے! کون ہے یہ لڑکی اور تو کیوں غصے ہورہا ہے اس پر؟"

"یہ اسی لائق ہے اماں! اسی سے پوچھ لیں یہ کون ہے؟" وہ اس وقت شدید غصے میں تھا تبھی کچھ بھی بتائے بغیر گھر سے نکل گیا۔ پیچھے ثانیہ کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر آئیں۔

"کون ہے تو؟" زائر کی ماں حیران حیران سی اس کے قریب آئی تھیں تبھی ثانیہ نے سر جھکا کر آنسو پونچھتے ہوئے اپنی اور زائر کی تمام کہانی ان کے گوش گزار کردی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟" تمام حقیقت جاننے کے بعد وہ حیران ہی تو رہ گئی تھیں۔ ثانیہ نے آہستہ سے رخ پھیر لیا۔

"سچ کہہ رہی ہوں' یقین نہ آئے تو اپنے بیٹے سے پوچھ لیجیے گا۔" وہ بے حد آزردہ ہورہی تھی' اماں شاکڈ سی اس کا منہ تکتی رہ گئیں۔ رات میں زائر کی واپسی خاصی لیٹ ہوئی تھی' ثانیہ تب تک بھوکی پیاسی اسی کمرے میں پڑی رہی۔ تاہم وہ اپنی ماں اور باپ کی عدالت میں پیش ہوگیا تھا۔ بہت دیر کے بعد اس کی کمرے میں آمد ہوئی تھی' ثانیہ اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔

"میری ماں پریشان ہورہی ہوگی' تمہیں خدا کا واسطہ ہے مجھے ان کے پاس چھوڑ آؤ' پلیز۔"

"سوچنا بھی مت۔" اس کی التجا پر سکون سے کہتے ہوئے وہ اس کے پہلو میں ٹک گیا تھا۔

"فون کردیا تھا تمہاری ماں کو میں نے' بتادیا تھا اسے کہ میں اپنی امانت اپنے پاس لے آیا ہوں لہٰذا وہ شرافت اور خاموشی سے انگلینڈ واپس چلی جائیں مگر...... شاید میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی ہے اسی لیے دھمکیاں دے رہی تھیں' کہہ رہی تھیں وہ مجھے پاتال کی سات گہرائیوں سے بھی ڈھونڈ نکالیں گی' میں بھی دیکھتا ہوں کیسے وہ مجھ تک پہنچتی ہیں۔" خوب صورت ذہین آنکھوں میں عجیب سی ضد کی چمک لیے وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ تڑپ کر رہ گئی تھی۔

"تم ایسا نہیں کرسکتے' یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"چپ کرو تم' بہت اچھی طرح سے جان گیا ہوں میں کہ تمہارے نزدیک صحیح اور غلط کیا ہے' دوسروں کو ہدایت کی تلقین کرتی ہو' اللہ کی قائم کردہ حدود کا پابند کرتی ہو تم اور خود کیا کرتی ہو۔ بولو خود تمہیں یہ باتیں' یہ ہدایات کیوں بھول جاتی ہیں' بہرحال میں اس وقت تم سے بحث کے موڈ میں نہیں ہوں' میں تمہیں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میری ماں نے بہت مشکل سے تمہیں اپنی بہو تسلیم کیا ہے' بہت خوف زدہ رہتی ہیں وہ شہری لڑکیوں سے اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے' کم از کم جو کچھ تم اور تمہاری ماں مل کر آج کررہے تھے اس کے بعد تو بالکل بھی نہیں' اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں انسان کی بچی بن کر رہو تو زیادہ بہتر ہے۔ ورنہ ہم دیہاتی مردوں

راشدہ منیر

السلام علیکم! میری معزز بہنوں اور دوستوں جی جناب! کیا حال چال ہے؟ ارے آپ لوگ حیران مت ہوں کہ یہ کون ہے جو ہمارا حال پوچھ رہی ہے۔ میں اپنا تعارف کراتی ہوں۔ میرا نام راشدہ منیر ہے۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں میرا نمبر پہلا ہے۔ باقی پیارے بہن بھائی مجھ سے چھوٹے ہیں۔ میرا تعلق ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ہے۔ خوبیاں تو (بقول میرے) اتنی ہیں کہ شمار مشکل ہے' مگر خامیاں پوچھنے کے لیے آپ کو میری بہنوں اور کزنز سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ میری اپنی بہنوں اور کزنز سے بہت دوستی ہے۔ رشتا دوستی کا اچھا لگتا ہے۔ سردیوں میں آئس کریم کھانا اچھا لگتا ہے۔ وقت شام کا پسند ہے۔ سبزیاں ساری شوق سے کھاتی ہوں۔ کھانا کھانا اور پکانا اچھا لگتا ہے۔ کانچ کی چوڑیاں پسند ہیں۔ جو میں ہر وقت پہنے رکھتی ہوں۔ کمر سے نیچے تک آتے بال پسند ہیں۔ (جو میرے ہیں) لباس میں شلوار قمیص اور لمبا سا دوپٹا پسند ہے۔ رنگوں میں گلابی رنگ پسند ہے۔ پھلوں میں آم پسند ہے۔ پھولوں میں سرخ گلاب پسند ہے۔ فارغ وقت میں کتابیں پڑھنا پسند ہے۔ شاعری پسند ہے۔ علامہ اقبال پسندیدہ شاعر ہیں میں M.A اردو کی طالبہ ہوں۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ اللہ ہمیں دنیا اور آخرت میں کامیابی اور کامرانی نصیب فرمائے۔ آمین

بہت اچھی طرح عورتیں سدھار کر رکھنی آتی ہیں۔" قطعی بدلے ہوئے لہجے میں وہ اسے وارن کر رہا تھا۔ ثانیہ پھٹی پھٹی سی نگاہوں میں بے یقینی سموئے اسے دیکھتی رہی۔

"اب سو جاؤ' بہت رات ہوگئی ہے' صبح تمہیں بتاؤں گا کہ اس گھر میں کیسے رہنا ہے تم نے۔" بنا اس کے چہرے کے تاثرات کی پروا کیے وہ فوراً اس کے پہلو سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ثانیہ کی آنکھوں سے آنسو یوں ٹپک پڑے تھے گویا صدیوں سے خشک ندی میں اچانک پانی بہہ نکلا ہو۔

رات کے اس پہر درد' اذیت اور پریشانی کے ساتھ ساتھ بھوک کی تکلیف بھی اس پر حاوی تھی' اپنی حالت کے پیش نظر آج کل وہ بہت کم کچھ کھا پا رہی تھی۔ مسز عباس دن میں ہزار ہزار منت کرکے اسے کچھ نہ کچھ کھانے پر راضی کرتیں اور یہاں جب کہ پہلی بار اسے بھوک کا مفہوم سمجھ میں آیا تھا' کوئی اس کا خیال کرنے والا ہی نہیں تھا۔ آنسوؤں کا سلسلہ جو شروع ہوا تو پھر رکنے کا نام ہی نہیں لیا۔ گھٹنوں میں سر چھپا کر وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ جب وہ ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لیے دوبارہ چلا آیا۔

"یہ لو تھوڑی دیر کے لیے رونے دھونے کا پروگرام ملتوی کرکے کھانا کھالو' اماں بتا رہی تھیں تم نے دن بھر سے کچھ نہیں کھایا۔"

"مجھے نہیں کھانا' لے جاؤ اپنی اور اپنی اماں کی نوازشات واپس۔" گھٹنوں سے سر اٹھاتے ہوئے وہ سلگی تھی۔ زائر اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"اللہ کا رزق ہے میری یا میری اماں کی نوازشات نہیں ہے اور تمہیں پتا ہے ناں اللہ کے رزق سے انکار نہیں کرتے۔"

"مجھے کچھ نہیں پتا' تم اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ دو پلیز۔" وہ روہانسی ہوئی تھی جواب میں زائر نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیے۔

"نہیں چھوڑ سکتا' اس وقت تو کیا کسی وقت بھی نہیں اور بس یہی خامی ہے میری جو چیز میرے نام لگ جاتی ہے میں اسے چھوڑ ہی تو نہیں سکتا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ کی بائیں آنکھ سے چھلکنے والا آنسو اس کی پلکوں پر ہی اٹک گیا۔ تبھی اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو انگلیوں کی پوروں پر سمیٹے تھے۔

"اب کھالو پلیز' اپنے لیے نہیں تو اس معصوم بچے کے لیے ہی سہی' جو صرف میری نہیں تمہاری بھی اولاد ہے۔" بہت رسان سے اسے سمجھاتے ہوئے اس نے خود ہی نوالہ توڑ کر اس کے منہ میں ڈال دیا تھا' اگلی صبح ثانیہ کی آنکھ کھلی تو وہ کمرے میں نہیں تھا۔ وہ سست سی یونہی بستر پر پڑی' اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگی' تبھی وہ کمرے میں چلا آیا۔

"السلام علیکم صبح بخیر!" رات کی نسبت اس کا موڈ خاصا فریش تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی اٹھ بیٹھی۔ "سلام کا جواب تو دے دو یار! مانا کہ تم شہری لوگ گڈ مارننگ وغیرہ جیسے فضول لفظوں سے اپنے دن کا آغاز کرتے ہو مگر ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے سلامتی بھیجنا تو تم پر بھی فرض ہے اور مجھ پر بھی۔" بہت فری انداز میں کہتے ہوئے وہ بستر پر اس کی گود میں سر ٹکائے ہوئے نیم دراز ہوگیا تھا جب کہ ثانیہ کے دونوں ہاتھ بھی اس نے اپنی گرفت میں لے کر سینے پر رکھ دیے تھے۔

"وعلیکم السلام!" بس ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا' وہ مسکرا دیا۔

"شکریہ۔"

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔" کچھ پل خاموشی کی نذر کرنے کے بعد ثانیہ نے لب وا کیے تھے' غصے کا دھواں چھٹتے ہی اسے تہذیب بھی یاد آگئی تھی۔ زائر نے مسکراتے ہوئے اپنی گرفت میں موجود اس کے دونوں ہاتھ زور سے دبا دیے۔

"کہو...... ویسے مجھے تمہارا تم کہنا بھی برا نہیں لگتا۔" ثانیہ جز بز ہوئی تھی تاہم وہ کہنا نہیں بھولی تھی۔

"مجھے گاؤں میں رہنے کی عادت نہیں ہے آج تک میں نے صرف قصے کہانیوں میں دیہاتوں کے بارے میں پڑھا ہے' ذاتی طور پر میں نے ابھی تک گاؤں کی زندگی کا مشاہدہ نہیں کیا۔ اس لیے میں چاہتی ہوں آپ مجھے میرے شہر والے فلیٹ میں شفٹ کروا دیں میں وعدہ کرتی ہوں میں آپ کے اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔"

"ممکن ہی نہیں ڈیئر! زائر ملک بس صرف ایک بار ٹھوکر کھاتا ہے اس کے بعد راستے کے پتھر خود اس کی راہ سے ہٹ کر دور ہو جاتے ہیں۔ تم تو پھر بھی میری ہم سفر ہو اور ہم سفر بھی وہ جس کی کوکھ میں...... خیر تمہیں گاؤں میں رہنے کی عادت نہیں ہے' کوئی مسئلہ نہیں رفتہ رفتہ عادت ہو جائے گی۔ میں کوشش کروں گا یہاں تمہیں کوئی مسئلہ نہ ہو' لیکن تمہیں بھی آج کے بعد پوری کوشش کرنی ہے خود کو میرا بہترین انتخاب ثابت کرنے کی' میرے والدین بہت سادہ لوح ہیں اور میں...... میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں' بہت سے خواب وابستہ ہیں ان کے مجھ سے اگر تم نے کسی بھی زعم میں ان کا دل دکھانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔" بنا اس کی بات کو اہمیت دیے وہ اس پر اپنے قانون اور اصول لاگو کر رہا تھا۔ ثانیہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ تبھی وہ پھر بولا تھا۔

"یہاں گاؤں کی عورتیں تمہیں دیکھنے اور تم سے ملنے کے لیے بہت بے تاب ہو رہی ہیں' انہیں لگتا ہے شاید میں تمہیں اغواء کرکے لایا ہوں' اماں اب تک بڑی مشکل سے انہیں سنبھالے ہوئے ہیں یہ کہہ کر کہ تم آرام کر رہی ہو مگر ابھی یہاں اس کمرے سے نکلنے کے بعد تم انہیں مطمئن کرو گی اور ہاں یہاں گاؤں میں صبح کا آغاز بہت جلدی ہو جاتا ہے' میں بالکل پسند نہیں کروں گا کہ تم یہاں کمرے میں پڑی سوئی رہو اور میری ماں تمہارے ہوتے ہوئے خود صبح سویرے اٹھ کر سارے کام نمٹاتی پھریں' ویسے بھی اس حالت میں ہمارے یہاں کی خواتین فارغ بیٹھے رہنے کو بالکل پسند نہیں کرتیں' میرا خیال ہے میری باتیں تمہاری سمجھ میں آگئی ہوں گی۔" وہ اس کی سماعتوں پر ایک کے بعد ایک بم گرا رہا تھا اور ادھر ثانیہ کو لگ رہا تھا جیسے اس کا وجود سکڑتا جا رہا ہو وہ اس طرز زندگی کی عادی نہیں تھی' تبھی بولی تھی۔

"میں معذرت چاہتی ہوں مگر حقیقت یہی ہے کہ میں یہاں آپ کے ساتھ اس طرح زندگی نہیں گزار سکتی۔"

"سیکھ جاؤ گی وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔"

"مگر کیوں؟ مجھے تم سے کسی قسم کی محبت یا عشق کا دعویٰ نہیں ہے' اس لیے تم میرے ساتھ کسی قسم کی زبردستی نہیں کر سکتے۔"

"کرنا چاہتا بھی نہیں تم شاید بھول رہی ہو ثانیہ عباس! کہ مجھ سے نکاح کا فیصلہ اور ضد تم نے کی تھی' میں نے نہیں' تم چاہتی تو بھری عدالت میں چلا کر کہہ سکتی تھیں کہ میں تمہارے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں' زبردستی تعلق جوڑنا چاہ رہا ہوں مگر تم نے ایسا نہیں کیا الٹا ایک رات میرے ساتھ گزارنے کے بعد تم نے اپنا تمام سامان' بھی اپنی مکمل رضا مندی سے میرے حوالے کر دینا چاہا' کیا تھا وہ سب؟ بولو......؟ مان لیتا ہوں کہ میں تمہارے لیے ناپسندیدہ شخص ہوں مگر اس ناپسندیدہ شخص کو تمہاری عادت ہوگئی ہے' عشق و محبت کا دعویٰ نہیں کرتا مگر زبردستی کسی تعلق کو گھسیٹے رکھنے کا حامی بھی نہیں ہوں' اس لیے جس روز تم میری امانت میرے حوالے کر دو گی میں اسی روز تمہیں آزاد کر دوں گا' یہ میرا وعدہ ہے چاہو تو اعتبار کر لینا نہیں تو تمہاری مرضی۔" بے حد سچے کھرے لہجے میں اپنی بات مکمل کرتا وہ پھر کمرے میں نہیں ٹھہرا تھا۔ ثانیہ جیسے چکرا کر رہ گئی۔ اس کے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی کہاوت بالکل سچ ہوگئی تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

شب کے جاگے ہوئے

راحت وفا

کون کسی کو دل میں جگہ دیتا ہے
درخت بھی سوکھے ہوئے پتے گرا دیتا ہے
واقف ہیں ہم دنیا کے رواجوں سے
دل بھر جائے تو ہر کوئی بھلا دیتا ہے

"اکبر! یہ ناشتا تو ٹھنڈا ہوگیا' کیا کرتے رہے؟" زاہدہ نے اسے موبائل فون پر محو دیکھ کر بے زاری سے کہا اور کمرے میں پھیلی بے ترتیب چیزیں سمیٹنے لگی۔

"تمہاری ہی نوکری کررہا تھا۔" وہ فون بند کرکے ٹرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میری کون سی نوکری؟" اسے تعجب سا ہوا۔

"یہی نوکری رہ گئی میری زاہدہ بیگم کو سالگرہ کی محفل میں بلانا ہے' محفل موسیقی میں بلانا ہے' مہندی میں بلانا ہے' وقت نوٹ کرلیں۔" وہ کسی مقرر کی طرح بولا۔

"ایڈوانس لے لو' پوری رقم لے لو' یہ جملے بھول گئے کیا؟" زاہدہ نے پوچھا۔

"جتا رہی ہو؟ تم گانا چھوڑ دو۔" وہ بولا۔

"اکبر! ان معمول کی باتوں سے میں تنگ آگئی ہوں۔"

"مجھ سے بھی تنگ آگئی ہو؟"

"ناشتا کرو میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے' میں کچھ دیر سونا چاہتی ہوں۔" وہ سر ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولی۔

"اوہ! نہیں مجھے تو کھٹے ڈکار آرہے ہیں تم نے رات جانے سے پہلے جو کھانا دیا تھا وہ شاید ٹھیک نہیں تھا۔" وہ ذرا سا منہ بنا کر لیٹ گیا۔

"کھانا تو بہت اچھا تھا۔"

"لیکن بازاری تھا۔"

"سب کچھ ہی بازاری ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"بہرحال میں رات بھر سو نہیں سکا۔"

"کم کھانا تھا۔" وہ جل کر بولی۔

"ایک لیگ پیس' ایک نان اور ایک کباب ہی تو کھایا تھا۔" وہ وضاحت کے لیے اٹھ بیٹھا۔

"پھر کھٹے ڈکار کیوں آرہے ہیں؟"

"شاید نیند پوری نہیں ہوئی۔" اس نے منہ کھول کے جمائی لی۔

"اب ناشتا لے جاؤں؟"

"ہنہہ! دوپہر کا کھانا کھاؤں گا' تم دو بجے تک آجاؤ گی نا۔" اس نے پوچھا۔

"میں دوپہر کے لیے فتح شیر سے انکار کرچکی ہوں' مجھ میں ہمت نہیں رہی' سونا چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"مگر یہ تو بہت بڑے گھر کی تقریب ہے' فتح شیر اور استاد ہدایت اکیلے پچاس ہزار کمالیں گے۔"

"ان کے ساتھ پانچ سازندے بھی ہوتے ہیں' سب میں برابر پیسے تقسیم ہوتے ہیں۔"

"تو پھر بھی ہمارا نقصان ہے۔"

"میں نے رات محفل موسیقی میں جانا ہے' اب دن میں آرام کروں گی۔" وہ یہ کہہ کر اٹھی تو اکبر نے خاموشی اختیار کرلی۔ ناشتے کی ٹرے لیے وہ نوشین کے کمرے میں آگئی۔ وہ گھوڑے بیچ کر سوئی تھی یا مردوں سے شرط باندھ کر' اس کا اندازہ مسلسل پانچ چھ آوازیں لگا کے بعد اسے ہوگیا۔

"اوں ہنہہ کیا ہے آپا؟" نوشین نے کسلمندی سے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے کہ تم زندہ ہو۔" وہ جل کر بولی۔

"تمہیں سدا سے میری نیند بری لگتی ہے یہ بات اماں اور ابا کو بھی معلوم تھی' اس لیے وہ بھی تمہارا نام لے لے کر جگاتے رہتے تھے۔" پوری طرح آنکھیں کھول کر وہ ماضی قریب میں پہنچ گئی۔

"مگر وہ دونوں سوگئے اور تم پھر بھی نہ جاگیں۔" زاہدہ نے کہا اور ٹرے وہیں رکھ کے مڑنے لگی تو وہ بولی۔

"مجھے ناشتا نہیں کرنا۔"

"مرضی ہے تمہاری۔" وہ بھی مختصراً کہہ کر باہر نکل گئی۔

❁.....◉.....❁

اسے جہیز میں ملنے والی بہن یا بری میں ملنے والے شوہر کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے بھی دونوں کے معیار زندگی کا پتا نہیں چلا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں ہی سریلی آواز کی وجہ سے ابا نے اسے یہ پکا کرادیا تھا کہ موسیقی روح کی غذا ہے اور موسیقی میں نام پیدا کرنا ہے۔ ریڈیو سے ریٹائر استاد چمن خان سے ابا کی دعا سلام تھی یوں اسکول کی پانچ جماعتوں کے بعد وہ صرف موسیقی کی طالبہ بن گئی۔ استاد نے ایسا سبق پڑھایا کہ اس کی آواز کا جادو دور دور تک پھیل گیا۔ چھوٹے بڑے فنکشن میں' تقریبات میں استاد اسے ننھی آواز کے طور پر متعارف کراتے تو وہ تتلی کی مانند ہواؤں میں اڑنے لگتی۔ اس کی اڑان نے گھر کے چھوٹے سے آنگن اور باورچی خانے میں اشتہا انگیز کھانوں کی مہک بھردی۔ کبھی مرغ پلاؤ' کبھی تکہ بوٹی اور کبھی چرغہ...... اماں کے ہانڈی کی تیاری غریب کی خوشیوں کی مانند محدود کردی تھی۔ تھوڑے بہت ملنے والے پیسوں سے مہینے میں ایک دو جوڑے سلتے جنہیں پہن کر وہ محفلوں میں جاتی۔ امراء کی محفلوں میں اعلیٰ ترین لباس دیکھ کر وہ بھی ا

سادہ سے سوتی کپڑوں میں مطمئن رہتی اور آواز کے رچاؤ سے سُر بکھیرتی تو سماں بندھ جاتا۔ دھیرے دھیرے یہ سُر سنگیت کا سفر پھیل کر اس کی رات دن کی مصروفیت میں بدلتا چلا گیا۔

❁ • ❁

اس کی کامیابی اور شہرت کے حصے دار ایک مخصوص طبقے کے لوگ تھے کیونکہ نیم کلاسیکی اور کلاسیکی گائیکی کے علاوہ وہ فرمائشی مشہور فلمی گیت بھی گایا کرتی لیکن نئی نسل کی پسند کے مطابق پاپ اور راک میوزک سے اس کی شناسائی نہیں تھی۔ لوگوں نے مشورے بھی دیئے لیکن اس کا مزاج ایسا نہیں تھا۔

ابا نے نوشین کو بھی اس فن کی طرف راغب کرانے کی کوشش کی لیکن بات نہیں بنی۔ اس کے پاس اچھی شکل صورت تو تھی مگر آواز میں سُر اور گداز نہیں تھا۔ مزاجاً بھی وہ موسیقی پر جھوم جھوم کے نہ سر دھن سکتی تھی اور نہ گردن ہلاسکتی تھی۔ پڑھنے لکھنے سے اسے رغبت نہ تھی بس وہ خود میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ اماں ابا کی محبت دونوں کے لیے یکساں تھی مگر اس کے کام سے ابا کا بوجھ کم ہوگیا تھا۔ انہیں چائے کے کھوکھے سے جو بھی آمدنی ہوتی وہ جمع کرکے اس کی شادی اماں نے اپنے بھانجے اکبر سے کردی۔ وہ شادی کرنے آیا تو گھر داماد ہی بن گیا۔

ابا نے اسے اپنے ساتھ کھوکھے پر ہی رکھ لیا۔ ان دونوں کے مرنے کے بعد اس نے کھوکھا کرائے پر دے دیا اور اس کا سیکریٹری بن گیا۔

وہ گانے گا کر گھر چلا رہی تھی' چار سال سے وہ ساتھ تھا مگر شوہر کم سیکریٹری زیادہ...... یہ الگ بات تھی کہ بدتمیز اور بدتہذیب نہیں تھا۔ زاہدہ کو اسی لیے اس سے محبت تھی۔

وہ کمرے میں آئی تو پھر اکبر نے فتح شیر کے فون کا ذکر کیا مگر وہ بیڈ پر گرگئی۔

"پلیز مجھے سونے دو فون بند کردو۔"

"جیسی تمہاری مرضی میں باہر جارہا ہوں' کچھ لانا ہے تو بتاؤ۔" اس نے سیاہ سینڈل پیروں میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"نوشین سے پوچھ لو مجھے تو کچھ نہیں چاہیے۔" اس نے بوجھل پلکیں گراتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ اکبر موبائل فون اور بٹوہ جیب میں ڈال کر باہر نکل گیا۔ اس نے انداز سے جان لیا کہ وہ جاچکا ہے تو پُرسکون ہوگئی۔

یہ نیند بھی عجیب شے ہے کہ چاہو بھی تو اس کے بنا گزارہ نہیں' نہ چاہو تب بھی یہ قربت کا احساس دلاتی ہے۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ وہ کتنا سوئی؟ آنکھ نوشین کے پیر کا انگوٹھا ہلانے سے کھلی۔

"آپا! شام کے چھ بج رہے ہیں اور کتنا سونا ہے؟"

"اوہ!" اس نے آنکھیں کھول کے انگڑائی لی۔

"آج تو تم بہت سوئی ہو تقریباً سارا دن۔"

"دن میں آدمی سوتا نہیں' آنکھوں کو نیند کا احساس دلاتا ہے۔" وہ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

"اگر تمہیں فلموں کے گانے مل جائیں تو چھوٹی موٹی تقریبات میں جانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ میں نے سنا ہے ملکۂ ترنم نور جہاں کی بڑی نور تھی۔" اس نے ایسے بتایا جیسے عظیم گلوکارہ کی پرسنل سیکریٹری رہ چکی ہو۔

"ہر انسان اپنے مقدر کا مالک ہوتا ہے مجھے تو کوئی احساس کمتری نہیں۔ چھوٹی محفل میں جائیں یا بڑی میں' ہمیں لوگ میراثی ہی کہیں گے۔"

"اسی لیے تو میں نے ماسٹر دین محمد کی بھتیجی کا منہ نوچا تھا۔" نوشین نے جذباتی ہوکر کہا۔

"حقیقت تو یہی ہے منہ نوچنے سے زبان بند ہوتی ہے نہ بدلتی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"ہنہہ! ایسے ہی لوگ ہمیں میراثی کہیں۔" نوشین کسی طور پر یہ بات ماننے کو تیار نہ تھی۔

"آپا کی جان! سب کی سنو اور خاموش رہو اسی میں کامیابی ہے۔"

"بس بس گلوکارہ ہی رہو استانی نہ بنو۔" اس نے شرارت سے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"چلو جلدی سے چائے پلادو دیر ہورہی ہے۔"

"ابھی لائی' کپڑے میں نے استری کردیئے ہیں۔" وہ تنک کر باہر گئی تو کپڑے تولیہ سمیت لیے الگوتے پھوڑ... سے واش روم میں گھس گئی۔

❁ • ❁

مغرب کی نماز پڑھ کر اکبر آیا تو وہ تیار ہورہی تھی۔ نوشین نماز پڑھ رہی تھی اس نے رکشہ لانے کے لیے کہا تو وہ بڑے پیار سے اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے بولا۔

"ایسی سج دھج کے ساتھ رکشے والے کے ساتھ تو نہیں بھیجوں گا جانِ من!"

"کافی دور جانا ہے نوشین اکیلی رہے یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"نہیں' میں خود چھوڑ کے آؤں گا' کچھ نہیں ہوتا نوشین کو وہ نماز پڑھنے کے بعد دو گھنٹے تو وظیفے پڑھے گی' باہر سے تالا لگادیتے ہیں' ڈر کیسا؟" اکبر نے مشورہ دیا اور خود بھی بالوں میں کنگھا کرنے لگا۔ وہ شوہر کے احساس پر فدا ہوئی۔ جلدی سے سفید چادر میں خود کو چھپایا' اپنی سیاہ ڈائری اٹھائی اور صحن میں آگئی۔ اکبر نے میلے کپڑے سے موٹر سائیکل کی سیٹ ایسے جھاڑ پونچھ کے صاف کی جیسے زاہدہ بیگم نے مالیدہ یا کمخواب کا سوٹ پہنا ہو۔ اکبر کی اس ادا پر وہ مسکرادی اور اچک کر اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

اکبر کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ زیادہ تر وہ رکشہ ٹیکسی پر جاتی تھی اور واپس بھی اسی طرح آتی۔ اس کی مزدوری بارش' سردی' گرمی جیسے موسموں سے بے نیاز تھی۔ ایک مرتبہ تیز بارش میں رکشہ راستے میں بند ہوگیا اور اسے پیدل گھر تک آنا پڑا۔ ایسے میں حکیم طفیل محمد کی ماں نے اپنے دروازے سے جھانکتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

> **بھیگا دسمبر**
>
> اے دوست!
> کیا سناؤں میں تجھ کو احوال اپنا
> وہی دسمبر کی سرد راتیں' بے کیف بوجھل سے دن
> وہی اداس تنہائی اور اکیلے سے ہم
> نہ کوئی ہمدم نہ غم شناس ہے
> کوئی جگنو نہ تارا نہ کوئی خوشی دل کے پاس ہے
> وہی بھیگا سا دسمبر ہے
> اور وہی تنہا سے ہم
> وہی وصل جاناں سے غم ہجراں کے قصے پرانے
> وہی درد محبت اور وہی ہم ہیں دیوانے
> وہی بھیگا سا دسمبر ہے
> اور وہی تنہا سے ہم
>
> بشریٰ باجوہ...... اوکاڑہ
>
> **غزل**
>
> چپ کیوں ہو کچھ تو بولو ناں
> تالے یہ لبوں کے کھولو ناں
> غم دل میں چھپائے بیٹھے ہو
> ایک بار ہی کھل کر رو لو ناں
> مدت سے جاگ رہے ہو یوں
> آغوش میں سکھ کی سو لو ناں
> مت دیکھو بے اعتباری سے
> سب کو ایک تول میں تولو ناں
> پھر ہوا روانہ کاروانِ الفت
> تم بھی مہر اس سنگ ہو لو ناں
>
> مہر گل...... اورنگی ٹاؤن' کراچی

"زاہدہ! تمہاری زندگی سے تمہیں تو محبت ہونی چاہیے' کیسا مرد ہے وہ تمہیں لا نہیں سکتا۔ گھر کے صحن میں بھی عورت بھیگے تو برا لگتا ہے اور تم باہر سے تربتر پیدل آرہی ہو۔" انہوں نے اس انداز میں ہمدردی کا اظہار کیا کہ اس کے دل میں برچھی کی طرح اتر گیا مگر جواب دینا

مناسب نہیں تھا سو چپ ہو کر دروازے تک آ گئی۔

❀ ● ❀

آج رات بھی حسب معمول دیر ہو گئی رکشے کی آواز پر اکبر نے دروازہ کھولا اور اس کے اندر آنے پر بند کیا۔ وہ چادر اتارتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔

"سو گئے تھے؟" غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"نہیں...... تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" وہ بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔

"آج کھانا وہیں کھلا دیا۔"

"میں تمہارے لیے جاگ رہا تھا' کھانے کے لیے نہیں۔"

"ہائے میری جان! کتنے اچھے ہو تم۔" وہ اس پر جھک کر پیار سے بولی۔

"تم بھی تو اچھی ہو۔"

"ویسے تم لوگوں نے کچھ کھایا کہ نہیں۔" وہ فکر مند ہوئی۔

"ہاں! میں عشاء پڑھ کر آتے ہوئے برگر لے آیا تھا' نوشین سے کچھ پکوا تو سکتا نہیں تھا۔"

"ویسے بھی وہ نیند کی کچی[illegible] تو عشاء کے بعد ہی سو جاتی ہے۔"

"چلو یار! چھوٹی بہن ہے اس کا ہمارے علاوہ ہے ہی کون؟" وہ بولا تو کپڑے تبدیل کرنے کے لیے چلی گئی۔

اگلے دو تین دن اس کی کسی تقریب کی کمٹمنٹ نہیں تھی اس نے سکھ کا سانس لیا' بڑے عرصے سے کچھ خریداری التوا میں پڑی تھی' اس لیے اس نے فہرست بنا کر اکبر کو بازار لے جانے کے لیے کہا تو وہ ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس کی بات پر متوجہ نہ ہوا تو نوشین کو مداخلت کرنی پڑی۔

"اکبر بھائی! آپا تم سے کچھ کہہ رہی ہیں۔"

"ہنہہ...... ہاں کیا......؟" وہ محویت سے باہر نکلا۔

"بازار لے چلو۔"

"چلو لیکن کتنی دیر لگے گی؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔"

"اگر دیر ہوئی تو پھر رکشے پر واپس آ جانا مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ بولتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس بات پر راضی ہو گئی۔ چلتے ہوئے نوشین نے بھی اپنی ضروری چیزوں کی لسٹ اس کی مٹھی میں تھما دی۔

وہ جب واپس گھر پہنچی تھی تو ظہر کی نماز کے بعد کا وقت تھا۔ نوشین باورچی خانے میں چاول پکا رہی تھی اکبر ابھی گھر نہیں آیا تھا۔ چادر اتار کر ٹھیک سے بیٹھی بھی نہیں تھی کہ ریڈیو اسٹیشن سے پروگرام منیجر کا فون آ گیا' اسے رات کے سالانہ فنکشن میں گانے کی دعوت دی تھی' جو اس نے قبول کر لی۔

"آپا! کتنے پیسے ملیں گے؟" اس کی فون پر بات سن کر نوشین نے پوچھا۔

"پتا نہیں' شاید نہیں ملیں گے۔"

"یہی تو تمہارا مسئلہ ہے محلے میں خواری بھی اور پیسہ بھی نہیں۔ میراثی سے کمتر کیوں نہیں بنتیں؟" نوشین نے جل کر کہا۔

"میرے پاس نہ سفارش تھی اور نہ اچھی قسمت' فلمیں' پیسہ' شہرت ان کے لیے ہے جن کا کوئی بڑا تعارف ہو۔"

"ہنہہ!" وہ ہنکارا بھر کے واپس باورچی خانے میں چلی۔ اسے احساس تھا کہ نوشین کی سوچ غلط نہیں ہے مگر وہ بڑی اسکرین اور بڑی میوزک کی دنیا کی فنکارہ نہیں تھی۔

"یہ لو کھانا کھاؤ اور سو جاؤ' رات پھر بنا پیسے کے جاگنا ہے۔" نوشین نے چاول کی پلیٹ اور اچار اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"تو دل نہ جلایا کر' ہر حال میں خوش رہتے ہیں' تیری شادی کے لیے میں نے بہت سے پیسے جمع کر رکھے ہیں۔" وہ پیار سے بولی۔

"میری شادی...... مجھ سے کون شادی کرے

گا؟ اب اور کوئی اکبر تو ہے نہیں۔" نوشین نے پوچھا تو وہ لرز سی گئی۔

"کیوں؟ کیوں نہیں کرے گا؟ کبھی آئینہ دیکھا ہے تُو نے؟"

"صرف صورت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔"

"ہاں سیرت بھی ضروری ہوتی ہے اور تُو صورت سیرت دونوں سے مالا مال ہے میں تو اللہ کی گناہ گار بندی ہوں۔ تُو تو اللہ کو یاد رکھتی ہے تیری دعاؤں کا اثر ہے کہ میں کچھ سامان زندگی کر لیتی ہوں۔" زاہدہ نے اسے محبت سے سینے سے لگا کر کہا۔

"اچھا اب چھوڑو یہ باتیں' کھانا کھا کر آرام کرو۔" نوشین بہن کی محبت اور دل گرفتگی دیکھ کر ٹال گئی۔

❀ ● ❀

شام کو وہ تیار ہو رہی تھی کہ حکیم طفیل محمد کی ماں پوتا پیدا ہونے کی خوشی میں چار لڈو پرانی سی کنارے جھڑی پرچ میں رکھے آ گئی۔ دو کمروں میں سے یہ انتخاب کرنا انتہائی آسان تھا کہ زاہدہ کا کمرہ کون سا ہے لہٰذا وہ وہیں آ گئی۔ نوشین نے بتایا کہ آپا تیار ہو رہی ہیں لیکن وہ بلند آواز میں بولیں۔

"ارے بھئی محلے داروں کا بھی کوئی حق ہوتا ہے' ہم کوئی گانا سننے تو نہیں آئے۔" یہ سن کر وہ حیرت سے ان کا منہ تکنے لگی' البتہ نوشین نے تڑخ کر کہا۔

"گانا سن لو مگر اس کے لیے پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں اور تمہارے پاس پیسے ہوتے تو نئی چار پلیٹیں خرید لیتیں۔"

"نوشین...... تم جاؤ۔" زاہدہ نے جلدی سے کہا۔

"میں بھی جا رہی ہوں' سچ کہتے ہیں محلے والے۔" وہ اپنی خالی پلیٹ مضبوطی سے ہاتھ میں دبا کر بولیں۔

"کیا سچ کہتے ہیں چاچی......؟"

"کچھ نہیں' چاند چڑھے گا تو کل عالم دیکھے گا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

تب زاہدہ کا دل مٹھی میں پھڑپھڑانے لگا۔ تیاری

نمرہ افتخار

السلام علیکم! تمام قارئین کیسے ہیں آپ امید کرتی ہوں کہ ٹھیک ہوں گے آپ سب۔ مجھے آپ کا آنچل کافی پسند ہے۔ بس کبھی لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اب میں چلتی ہوں اپنے تعارف کی طرف۔ میرا نام نمرہ افتخار ہے۔ فرسٹ ایئر کلاس کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ سب مجھے پیارے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ میری فرینڈ اقراء تبسم مجھے نمی کے نام سے بلاتی ہے۔ میری ڈیٹ آف برتھ 5 اپریل ہے۔ Arise میرا اسٹار ہے۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ میں سب سے چھوٹی ہوں۔ بھائی بڑے ہیں۔ میں اپنی آپی عدیلہ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ کچھ روز پہلے۔ میری فرینڈز اقراء تبسم' ارم' زعیمہ' اقراء رشید' ام کلثوم' حرا' آمنہ اور سمیعہ ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ایک فرینڈ ہے سب کے لیے میری دعا ہے کہ وہ ہمیشہ خوش رہیں۔ میں فارغ اوقات میں میوزک سننا اور پینٹنگ کرنا پسند کرتی ہوں۔ مجھے بلیک اور زنک کلر پسند ہے۔ مجھے غصہ بہت آتا ہے لیکن اب اپنی اس عادت کو تبدیل کر رہی ہوں۔ خامی یہ ہے کہ لوگوں پر جلد بھروسا کر لیتی ہوں لیکن اب سمجھ آ رہا ہے کہ ہر شخص بھروسے کے قابل نہیں ہوتا۔ مجھے زیادہ شور اور ہر کسی کے ساتھ جلد فری ہو جانا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ لباس میں مجھے فراک اور شلوار قمیص پسند ہے۔ لائٹ جیولری اور لائٹ میک اپ پسند ہے۔ مجھے وہ شاعری پسند ہے جو دل کے جذبات کا اظہار کرے۔ اگر کوئی مجھ سے ایک بار جھوٹ بولے تو وہ پھر اگر سچ بھی کہے تو مجھے جھوٹ ہی لگتا ہے۔ مجھے لمبے قد والے افراد پسند ہیں۔ میں اپنے کام میں کسی کی دخل اندازی بالکل پسند نہیں کرتی۔ مجھے جو کام کرنا ہو یا ارادہ کر لوں تو کر لیتی ہوں اور اس بات سے لوگ کیا سوچیں گے مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خیر بہت ہو گیا اپنا تعارف باقی پسند نہ پسند پھر کبھی بتاؤں گی اگر موقع ملا۔ ڈیئر قارئین اگر آپ میری وجہ سے بور ہوئے ہوں تو پلیز آئی ایم سوری۔ دعاؤں میں یاد رکھنا۔ اب اجازت چاہتی ہوں خدا حافظ۔

بھول بھال کر بڑی دیر وہ سوچ میں گھری رہی۔

چاچی کی بات نے اس کے دل میں ڈیرے ڈال لیے تھے۔ وہ جانے کیوں بہت گرم دودھ پیے بنا بھی پھاچھ پھونک پھونک کے پینے لگی تھی' کسی طرف دھیان نہیں رہا تھا۔ مجبوراً چاچی اور بے دلی سے لوٹ آتی۔ اسے یہ بات بے چین کرتی تھی کہ محلے والے کیا سچ کہتے ہیں؟ میراثی کہتے ہیں؟ گانے والی کہتے ہیں؟ یہ تو اسے پتا تھا اس کے علاوہ کون سا سچ ہے یہ وہ نہیں جان پا رہی تھی۔ اکبر نے الجھا الجھا دیکھ کر کئی بار پوچھا مگر وہ ٹال گئی۔ سامنے سالن کی پلیٹ میں ہاتھ رکھ کے بھول جاتی تو نوشین کو پریشانی ہوتی مگر اس کے لیے بھی کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس' گھر سے باہر نکلتے ہوئے چور نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر رکشہ یا ٹیکسی میں بیٹھتی' کوئی دیکھتا یا نہیں دیکھتا مگر اسے ایسا ہی لگتا کہ سب اسی کو دیکھ رہے ہیں۔ سب کے خوف سے اس کی چادر کا سائز اور بڑھ گیا تھا۔ موسموں کے احساس سے عاری چادر دبیز سے دبیز ہوتی چلی جا رہی تھی۔

"آپا! ایسا لگتا ہے کہ تم گانے نہیں بلکہ وعظ کرنے جاتی ہو۔" نوشین نے ایک روز چڑ کر کہہ ہی دیا۔

"ہاں یار! تم تو باوا آدم کے زمانے میں جا رہی ہو لوگ بور ہو جاتے ہوں گے۔" اکبر نے بھی چائے کی چسکی لیتے ہوئے نوشین کی تائید کی تو وہ پہلی بار جھنجھلا میں اتر گئی۔

"لوگوں کا خیال رکھوں یا اپنا' کون سے لوگ خوش ہوں گے اور کون سے ناخوش؟"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" اکبر کو تعجب ہوا۔

"تم نہیں سمجھو گے' میں لوگوں کے کس طبقے سے تعلق رکھتی ہوں' یہ تم نہیں بتا سکتے۔" وہ الجھی الجھی سی بات کر کے تکیے میں منہ دے کر لیٹ گئی۔

"تم سو جاؤ' آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔" اکبر نے ہمدردانہ مشورہ دیا۔

"ہاں! رات کو تو بہت دیر سے آئی ہیں۔" نوشین نے ناشتے کے برتن سمیٹے۔

"اس دن کے بعد سے چاچی ہمارے گھر نہیں آئیں ہیں نا۔" اس نے ایک دم نوشین سے پوچھا۔

"تو ...... دفع کرو' ہماری کیا لگتی ہیں۔" نوشین نے جواب دیا' وہ چپ ہو گئی۔

اسی طرح چھ مہینے گزر گئے' نہ اس کے ذہن سے وہ جملہ نکلا اور نہ اسے سکون حاصل ہوا' بس کوئی کسک سی تھی' وہ اس شام ایک پرائیوٹ ٹی وی چینل پر گانا ریکارڈ کرا کے اسٹوڈیو سے باہر نکلی تو پروڈیوسر نے چائے آفر کی۔ مناسب قد و قامت کے درمیانی عمر کے باری صاحب سے وہ پہلی بار ملی تھی' وہ اس کی آواز اور گائیکی پر جھوم جھوم جا رہے تھے۔ اس نے بہت بار معذرت کی مگر وہ مصر تھے' بڑی ادا سے بولے۔

"ارے میڈم زاہدہ! آپ کیا جانو لوگ کیا کہتے ہیں؟" وہ کانپ سی گئی' چاچی جھٹ باری صاحب کے برابر آ کر کھڑی ہو گئیں۔

"جی ...... نہ ...... نہیں تو ......" وہ ہکلائی۔

"ارے چھوڑیئے آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ بات کیا ہے؟" باری صاحب کے گھنٹی بجانے پر پانچ منٹ میں چائے حاضر ہو گئی۔

"لیجیے۔"

"جی شکریہ۔" اس نے کپ میں برائے نام چینی ملاتے ہوئے کہا۔

اسی اثناء میں انہوں نے اپنے کمرے میں موجود ایل سی ڈی ٹی وی کو ریموٹ سے آن کیا۔ نیوز ٹائم میں ہیڈ لائنز کے بعد تفصیلی خبریں نشر ہو رہی تھیں۔

"خبروں کے بعد آپ کا گانا آن ائیر ہو گا۔ بس جتنی دیر میں ہم چائے پئیں گے۔" باری صاحب نے والیم کم کرتے ہوئے بتایا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا کر کپ ہونٹوں سے لگا کر نظریں اسکرین پر مرکوز کر دیں مگر آن واحد میں اس کے ہاتھ سے کپ بنا لرزش کے چھوٹنے سے چکنا چور ہو گیا۔ نیوز رپورٹ میں اس کا گھر کیمرے کی آنکھ میں تھا' لوگوں کا ہجوم گھر کے آنگن میں تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر چلانے لگی۔

"آواز کھولیں ...... آواز اونچی کریں' یہ تو میرا گھر ہے' سب کیا ہے؟" باری صاحب نے گھبرا کر فل والیم کر دیا۔ نیوز رپورٹر مائیک پر لوگوں کے تاثرات جان رہا تھا۔ سب کی ملی جلی آوازیں تھیں۔

"ان دونوں کو نہیں جی ان تینوں کو سنگسار کرنا چاہیے۔ یہ گھر میں رنگ رلیاں مناتے ہیں اور وہ باہر گندگی سے پیسہ کما کر لاتی اور یہ سالی بہنوئی عیش کرتے ہیں۔"

صحن کے فرش پر گھٹنوں میں منہ دیے اکبر اور نوشین کو محلے والے ٹھوکریں اور ٹھڈے مار رہے تھے۔

"یہ جھوٹ ہے' یہ غلط ہے سرا!" وہ جذباتی ہو کر باری صاحب کی طرف پلٹی جو بڑے انہماک سے نیوز رپورٹ دیکھ رہے تھے۔ اس نے بے بسی سے دوبارہ اسکرین پر دیکھا تو اب کی بار کیمرے کے سامنے چاچی تھی جو اور کچھ نہیں بولی سوائے اس کے۔

"یہ سب لوگ سچ کہہ رہے ہیں' یہ کھیل سب کھلی آنکھوں سے دیکھتے آئے ہیں۔" چاچی اس رپورٹ کی آخری چشم دید گواہ تھیں۔ جنہوں نے اسے سچ بتانے میں چھ مہینے لگا دیے تھے۔

"دن میں سونا اور راتوں کو جاگنا ......!" کتنا کڑوا سچ بن گیا تھا ...... ہمیشہ کے لیے۔

جھیل، کنارہ، کنکر

نازیہ کنول نازی

کیسے کر پاتے تیرے پیار کا اظہار صنم
ہم تیری چاہت کو اس دل میں چھپائے رکھتے
دل کی دھڑکن میں تیرا پیار بسا رکھا ہے
ہم کہاں اس کو یوں ہاتھوں میں اٹھائے رکھتے

کچھ بھی تو نہیں ویسا جیسا تجھے سوچا تھا
جتنا تجھے چاہا تھا......
سوچا تھا تیرے لب پر کچھ حرف دعاؤں کے
مہکیں گے میری خاطر......
کچھ بھی تو نہیں ویسا جیسا تجھے سوچا تھا
محسوس یہ ہوتا ہے دکھ جھیلے تجھے جواب تک
بے نام مسافت میں لکھنے کی محبت میں
پڑھنے کی ضرورت میں بے سود ریاضت تھی
بے فیض عبادت تھی
جو خواب بھی دیکھے تھے ان جاگتی آنکھوں نے
سب خام خیالی تھی
پھر بھی تجھے پانے کی خواہش تو بجا لی تھی
لیکن تجھے پا کر بھی اور خود کو گنوا کر بھی
اس حبس کے موسم میں کھڑکی سے ہوا آئی
اب نیند نہ آنکھوں میں نہ دل میں وہ پہلی سی
تازہ سخن آرائی......
ناں لفظ میرے نکلے نہ حرف و معنی کی
دانش میرے کام آئی
نادیدہ رفاقت میں جتنی بھی اذیت تھی
سب میرے ہی نام آئی
کچھ بھی تو نہیں ویسا جیسا تجھے سوچا تھا
جتنا تجھے چاہا تھا

باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ حورعین سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں کھڑی عجیب خاموش نگاہوں سے سڑک کے اس پار کی بوندوں کا شور سنتی رہی۔ آج کل اس کے اندر بھی تو ایسا ہی شور سرا ٹھا رہا تھا۔ پچھلے تین دنوں سے وہ قبرستان بھی نہیں جا سکی تھی۔ دل کو ایک عجیب سی بے چینی نے گھیر رکھا تھا۔ نمیرز بیر، سمیرا اور عمیر کے ساتھ دادی ماں بھی اس سے بہت خوش تھیں۔ سارے گھر کا کام اپنے ذمے لے کر اس نے جیسے سب کا دل جیت لیا تھا۔ دادی ماں کی خواہش تھی کہ وہ اسے اپنے خاندان میں باقاعدہ اپنی بہو کی حیثیت سے متعارف کروائیں مگر عذیر نے عذر تراش کر فی الحال انہیں اس ارادے سے منع کر دیا تھا۔

عمیر کچن میں چائے بنا رہا تھا۔ وہ ابھی اپنے کمرے سے کمپیوٹر آف کر کے باہر نکلا تھا۔ حورعین عشاء کی نماز پڑھ کر کچن صاف کرنے کے بعد ابھی کمرے میں گئی تھی۔ دادی ماں کو اس نے شام میں ہی کھانا کھلا کر سلا دیا تھا۔ خراب موسم کے باوجود عذیر کی ابھی گھر واپسی نہیں ہوئی تھی۔ حورعین عمیر کی مدد کے خیال سے دوبارہ کچن میں آ گئی۔

"ارے آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟" دونوں ہاتھوں میں مگ تھام کر وہ پلٹ رہا تھا جب حورعین سامنے آ گئی۔

"ہوں! بہت دن ہوئے نیند سے تعلق ہی نہیں رہا۔"

"چائے پئیں گی؟"

"نہیں میں چائے بہت کم پیتی ہوں۔"

"چلیں پھر کچھ دیر بات تو کرسکتی ہیں؟"

"ہوں' کیوں نہیں۔" اثبات میں سر ہلاتی وہ عمیر کے ساتھ لاؤنج میں آ بیٹھی تھی تبھی وہ بولا تھا۔

"آپ نے گوانتاناموبے جیل براہ راست دیکھی ہے؟"

"ہوں' تین ماہ وہاں رکھا گیا تھا مجھے۔"

"کس حالت میں؟"

"بہت تکلیف دہ حالتیں ہوتی ہیں وہاں' کن کن کا ذکر کروں؟" ایک زخمی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے اس کی آنکھیں جھلملائی تھیں۔ عمیرا سے دیکھ کر رہ گیا۔

"پاکستانی جیلوں سے واسطہ پڑا ہے کبھی؟"

"نہیں' کیوں......؟"

"میرا پڑا ہے' تین سال پاکستان کی مختلف جیلوں میں رہ کر آیا ہوں۔ وہ بھی بغیر کسی جرم کے اور ان تین سالوں میں جو حقائق سامنے آئے ان کے مطابق پاکستانی جیلیں گوانتاناموبے' بگرام ائیربیل' جرخی' شبرغان اور قلعہ جنگی سے بھی زیادہ بری ہیں۔ جو کچھ ان جیلوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر ہوتا ہے اگر یہود اور نصاریٰ دیکھ لیں تو اپنے سارے قیدی پاکستانی جیلوں کے سپرد کردیں۔"

"تم جیل کیوں گئے تھے؟"

"خود سے تو نہیں گیا تھا' تقدیر لے گئی تھی اور یہاں پاکستان میں ساٹھ فیصد لوگوں کو جرم نہیں غربت اور تقدیر ان عقوبت خانوں میں لے جاتی ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"کیوں یہ آپ پوچھ رہی ہیں؟" اب کے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ مبہم سا مسکرایا تھا۔

"جس ملک میں قانون محض دکھاوا ہو' جس ملک میں کوئی نظام نہ ہو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ بات شاید آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہیں۔"

"ہوں' مگر کس جرم میں جیل گئے تھے تم؟"

"جرم تو کوئی تھا ہی نہیں' الزام تھا مجھ پر وہ بھی قتل کا الزام۔"

"وہاٹ؟" وہ چونکی تھی عمیر نے مگ مضبوطی سے تھامتے ہوئے رخ پھیر لیا۔

"ہوں' قتل کا الزام تھا مجھ پر وہ بھی ایسے شخص کے قتل کا جسے میں جانتا تک نہیں تھا۔"

"پھر......؟"

"پھر کیا۔" کوئی ثبوت نہیں تھا میرے خلاف' پولیس بھی جانتی تھی کہ میں بے گناہ ہوں' مگر پھر بھی ایس ایچ او کی جیب میں آئے پچاس ہزار روپوں نے ہمیں گناہ گار ثابت کردیا۔ ایف آئی آر ہوئی' کیس بنا اور انصاف کے ایوانوں میں بیٹھے منصفوں نے اپنے فیصلوں میں بنا کسی بحث و جرح کے سزائے موت نافذ کردی۔"

"او میرے خدا! پھر......" حورعین کے چہرے پر بکھری پریشانی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ عمیر نے مگ خالی کرکے واپس میز پر رکھ دیا۔

"پھر کیا تین سال زندگی اور موت کے درمیان پھنسا انسانی درندگی اور بربریت کا نظارہ کرتا رہا۔ انسانوں کے ہاتھوں انسانیت کی دھجیاں بکھرتے دیکھتا رہا' کیا کیا نہیں دیکھا ان گزرے ہوئے تین سالوں میں میں نے۔ سوائے قیدیوں کے ان پر ٹوٹنے والی آفات کی کہانی اور کوئی بیان نہیں کرسکتا۔" وہ آزردہ ہوا تھا۔ حورعین اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ اصل کہانی کیا تھی کس کے قتل کے الزام میں سزا سنائی گئی تھی تمہیں اور پھر رہائی کیسے ہوئی؟" وہ ایک ساتھ سب جان لینا چاہتی تھی' عمیر بے کل سا اٹھ کر ٹیلی وژن کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"یہاں پاکستان میں پچاس فیصد سے زائد انسانوں کی تقدیر کے فیصلے تھانے کی حدود میں ہوتے ہیں۔ ایس آئی اور ایس ایچ او اگر چاہیں تو خطرناک سے خطرناک مجرم کو بھی مکھن میں بال کی طرح نکال کر صاف بچا لیتے ہیں اور اگر کسی کا ان کے ساتھ کمپرومائز نہ ہو سکے تو پھر وہ دودھ کا دھلا بھی سنگین سے سنگین مقدمے کی بھینٹ چڑھ کر بدترین موت کا نوالہ بن جاتا ہے۔ یہی تھانہ کلچر ہے' ہمارا یہی سسٹم ہے اس ملک کا' میں نے خود اپنی آنکھوں سے سیکڑوں بے گناہوں کو اسی نظام کی بھینٹ چڑھ کر سولی پر لٹکتے دیکھا ہے اور آپ کو پتا ہے ان کی آخری خواہش کیا تھی؟ اس ملک کے نظام کو تبدیل کیا جائے' یہاں صحیح معنوں میں اسلامی قانون نافذ کیا جائے' مگر...... جس ملک کا کوئی نظام نہ ہو وہاں آخری خواہشیں بھی کہاں پوری ہوتی ہیں' تبدیلیاں اتنی آسانی سے تو نہیں آتیں ناں۔" ایک لمحے کے لیے وہ سانس لینے کو رکا پھر حورعین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہمارا جو تھانہ کلچر ہے ناں وہاں آپ کسی بھی بے گناہ سے بے گناہ انسان کو ذرا سے تعلق یا پیسوں کا استعمال کرکے کسی بھی وقت پھنسا سکتی ہیں۔ کوئی مشکل نہیں ہے کسی کے خلاف جھوٹی ایف آئی آر کٹوانا' قیمتی زندگیوں کے فیصلے چند روپوں میں ہوجاتے ہیں۔ میرا اور شہزاد کا فیصلہ بھی یونہی ہوگیا تھا۔"

"شہزاد کون؟"

"دوست تھا میرا' ہمیں قریبی گاؤں میں رہتا تھا۔ بے حد ذہین' خوددار اور ہوشیار لڑکا تھا۔ بہت محبت تھی اسے اپنی زمین سے' گاؤں کا نمبردار اس سے اس کی زمین ہتھیانا چاہتا تھا مگر وہ پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہیں تھا۔ نمبردار جانتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا لڑکا ہے آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا' تبھی اس نے وہی مکارانہ چال چلی جو اس ملک کے ستر فیصد دیہات میں آئے دن یہ نمبردار اور چوہدری کرتے رہتے ہیں۔"

"کیسی چال؟" حورعین کے پوچھنے پر اس نے گہری سانس بھری تھی۔

"اندھے قانون کی چال۔"

"کیا مطلب' میں سمجھی نہیں؟"

"سمجھ جائیں گی' شہزاد کو پھنسانے کے لیے نمبردار نے اپنے ایک ملازم کو بے قصور موت کے گھاٹ اتار کر الزام شہزاد پر ڈال دیا۔ میں چونکہ اس کا قریبی دوست تھا لہٰذا میرا نام بھی ایف آئی آر میں لکھوا دیا' پاکستان میں یہ عام روشن ہے اگر کوئی ایک بندہ بھی قصوروار ہو تو مدعی پارٹی اس گھر کے تمام مردوں کے نام لکھوا دیتے ہیں اور یوں قطعی بے قصور بھی سزا کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں' خدیر بھائی نے بہت کوشش کی مجھے بچانے کی مگر بے سود' میری اور شہزاد کی تعلیم' ٹیلنٹ' کیریئر سب تباہ ہوگیا۔ ایف آئی آر کٹی' کیس بنا' قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کرائے کے گواہوں نے میرے اور شہزاد کے خلاف شہادت دی اور انصاف کی کرسی پر بیٹھے جج نے بنا کسی بحث و جرح کے ہمارے حق میں سزائے موت کا فیصلہ صادر کردیا۔ اس سے پہلے ایس ایچ او کہتا رہا کہ پچاس ہزار دے دو تمہیں بچاؤں گا مگر مجھے غرور تھا کہ جب میرا کوئی قصور ہی نہیں تو مجھے سزا کیسے ہوگی مگر وقت نے مجھے بتادیا کہ اس ملک کے نظام میں سزا کا طوق زیادہ تر بے قصور اور بے گناہ لوگوں کے گلے میں ہی ڈالا جاتا ہے' اصل قصوروار اور خطرناک لوگ تو قانون کی پناہ میں رہتے ہیں۔ تاریک راہوں میں جعلی پولیس مقابلوں کی بھینٹ چڑھ کر ابدی نیند سونے والے اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اپنے جرم کا بھی پتا نہیں ہوتا۔ ہم کہتے ہیں اس ملک پر اتنی آفتیں کیوں ٹوٹتی ہیں' یہاں روز کسی نہ کسی صورت عذاب کیوں نازل ہوتے رہتے ہیں مگر ہم یہ نہیں دیکھتے کہ روزانہ انصاف کے ایوانوں میں لوگ اپنے ضمیر اور ایمان کا سودا کرکے کتنی بے شرمی سے اس مقدس کتاب پر جھوٹا حلف اٹھاتے ہیں' جو کتاب ساری دنیا کے لیے ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ ہے کیا نہیں ہوگا روز محشر ان لوگوں کے ساتھ' یہ جھوٹے مدعی' یہ جھوٹے گواہ' یہ پیسے لے کر اپنے فرض سے کوتاہی برتنے والے ایس ایچ او' اے ایس آئی' محرر' وکیل' جج' کہاں جائیں گے یہ لوگ اس روز جب بادشاہوں کے بادشاہ کی عدالت لگی ہوگی اور وہاں کوئی کسی کا سفارشی نہیں ہوگا' کیسے سر اٹھائیں گے یہ لوگ اس قہار و جبار کے سامنے؟ کیا بے گناہ سولی چڑھنے والے معصوم قیدیوں کا خون ان کے سر نہیں ہوگا؟ اسلام تو دوسرے مذاہب کے لیے بہترین مثالی دین ہے تاریخ بھری پڑی ہے ایسے بے شمار سنہری واقعات سے جس میں غیر مسلم قبائل اور لوگوں نے اسلام کے بہترین اصولوں اور انصاف سے متاثر ہوکر اسے اپنایا۔ مگر آج ہم دنیا کو کیا

دکھا رہے ہیں؟ بجائے اس کے کہ ہم وہ وجوہات ختم کریں جو جرائم کو جنم دے رہی ہیں' ہم الٹا بے گناہوں کو رگڑ رہے ہیں' وہ مذہب جو اسلام کے بدترین دشمنوں کے لیے بھی امن و سلامتی کا باعث بنا اسی مذہب کے پیروکاروں کے ساتھ کیا کررہے ہیں ہم؟ آپ کو پتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں غلے کا قحط پڑا تو انہوں نے چوری کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا کو اس وقت تک کے لیے معاف کردیا تھا جب تک قحط دور نہ ہوجاتا۔ وہ عمرؓ کہ جن کا کیا فیصلہ او پر آسمان پر سراہا جاتا تھا مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج ہم نے ایسی اصول اور گراں قدر ہستیوں کا اتباع کرنے کی بجائے اپنی زندگیوں کو انہی شرمناک اصولوں کے سپرد کردیا ہے جو منحوس انگریز ہمارے لیے چھوڑ کر گئے کتنے دکھ کی بات ہے کہ ایک اسلامی ملک میں اسی کے باشندوں کے ساتھ قطعی غیر اسلامی سلوک روا رکھا جارہا ہے' تاریخ کھول کر دیکھ لیجیے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یا ان کے کسی صحابی نے کبھی کسی گناہ گار قاتل کو بھی دس دس پندرہ پندرہ سال بدترین قید میں رکھ کر پھانسی کی سزا نہیں دی' ان ان پاک ہستیوں نے تو گناہ گار کے لیے بھی قصاص کے ساتھ ساتھ دیت اور معافی کو پسند کیا۔ خود پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی بہترین مثالیں ہمارے سامنے ہیں' جن میں انہوں نے اپنے پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور محبوب بیٹی کے قاتلوں کو سزا دینے کا حق اور اختیار رکھنے کے باوجود عام معافی کا اعلان کردیا مگر یہاں ہماری جیلوں میں موت کی سزا پانے والے بدنصیب حق داروں کے ساتھ ساتھ کئی بے گناہ معصوم قیدیوں کے ساتھ انہیں ذہنی اور جسمانی اذیت سے دوچار رکھنے کے لیے وہ وہ طریقے آزمائے جاتے ہیں کہ شاید انہیں دیکھ کر شیطان بھی انسان سے پناہ مانگتا ہوگا آئے روز ان عقوبت خانوں سے کتنی ہی لاشیں نکلتی ہیں' جو اپنے پیچھے سیکڑوں افسوس ناک سوالات چھوڑ جاتی ہیں۔" بولتے بولتے عمیر کا تنفس تیز ہوگیا تھا۔ حورعین چپ چاپ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی اندر کہیں کسی درد نے جھٹکے سے انگڑائی لی تھی مگر وہ ساکت بیٹھی رہی۔

"کتنی دلچسپ بات ہے ناں آپی! کہ محض ایک جرم کرنے والا قتل کے بدلے میں قتل تو ہوتا ہی ہے مگر اٹھارہ اٹھارہ بیس بیس سال عقوبت خانوں میں قید ایک ایک پل کا عذاب اپنے جسم اور روح پر ٹوٹتے علیحدہ برداشت کرتا ہے' کیا کیا نہیں ہوتا ان سالوں میں اس کے ساتھ۔" عمیر کے لہجے میں ٹھہراؤ اور آنکھوں میں گزرے دنوں کی دھول صاف نظر آتی دکھائی دے رہی تھی حورعین گہری سانس بھر کررہ گئی۔

"ہوں' سچ کہتے ہو یہاں کسی بھی شعبے کا نظام درست نہیں ہے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجائیں تب بھی ہم نہ اس سسٹم کو ٹھیک کرسکتے ہیں نہ اس جال کو توڑ سکتے ہیں جو ہم پر یہود و نصاریٰ نے ڈال رکھا ہے یہی تقدیر ہے اس ملک کے باشندوں کی کہ وہ بے قصور مارے جائیں اور کوئی ان کے لیے آواز اٹھانے والا نہ ہو بہرحال شہزاد کا کیا بنا؟"

"کیا بنتا تھا؟" حورعین کے سوال کے جواب میں عمیر کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ بکھری تھی۔

"جس ملک کا آئین اور قانون نہ ہو وہاں بے بس غریب لوگوں کے ساتھ کیا بنتا ہے آپ کے ساتھ کیا بنا؟ سر ہمدانی اور ان جیسے سیکڑوں قوم کا درد دل میں رکھنے والے معصوم پاکستانیوں کے ساتھ اب تک کیا بنتا آیا ہے' چھوڑیں آپی! اس خطہ ارض میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا قانون چلتا ہے۔" آنکھوں کے گوشوں میں ایک دم سے چھلک آنے والی نمی کو چھپانے کے لیے اس نے فوراً رخ پھیر لیا تھا۔

"آپ کو نیند آرہی ہوگی سو جائیں جاکر۔"

"نہیں مجھے نیند نہیں آرہی پھر...... ابھی مدیر بھی گھر واپس نہیں آئے۔"

"وہ لیٹ ہی آتے ہیں آپ کو ان کی فکر میں جاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں ان کی فکر میں نہیں جاگ رہی۔" فوراً سے پیشتر اس نے وضاحت دی تھی۔

"جیل سے آنے کے بعد میں چائے کا بہت عادی

ہوگیا ہوں خیر آپ نے پاکستانی قانون میں دفعہ سیلون اے ٹی اے کا نام سنا ہے؟"

"نہیں' کیوں؟"

"جاننا چاہیے تھا یہ قانون نواز حکومت میں پاس ہوا تھا' انسداد دہشت گردی کے ضمن میں بظاہر یہ قانون دہشت گردوں کے لیے بنا ہے' مگر پولیس والوں کے پیٹ کی مہربانی کی وجہ سے اکثر دوسرے لوگ بھی اس بدترین قانون کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں' اس قانون کی رو سے اگر مقتول کے ورثاء قاتل کو معاف کردیں تو بھی اسے سزا سے رہائی نہیں ملتی۔"

"وہاٹ؟"

"جی ہاں' ہمارا المیہ ہے کہ ہم یہاں کسی بھی قانون کو غلط استعمال کرنے اور اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے' بس اس پر اختیار ہونا چاہیے۔

تین سالہ جیل کے دوران میں نے بہت سے لوگوں کو اس اندھے قانون کی بھینٹ چڑھتے دیکھا ہے' ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی اور کہیں میلوں دور ہمارے نام کی ایف آئی آر بھی کٹ چکی ہوتی ہے' شہزاد کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا تھا۔ نمبردار نے پولیس کو تگڑی رقم دے کر اس پر سیلون اے ٹی اے کی دفعہ نافذ کروادی تھی۔ بہت کوشش کی شہزاد کے گھر والوں نے انصاف کے لیے نمبر دار کو راضی کرنے کے لیے اپنی زمین بھی اس کے حوالے کردی۔ زمین ہتھیانے کے بعد نمبردار نے راضی نامہ لکھ کردے دیا' جس پر سپریم کورٹ نے مجھے اور شہزاد کو قتل کے کیس سے بری کردیا مگر شہزاد پر چونکہ سیلون اے ٹی اے کی دفعہ نافذ تھی تو قتل کے کیس سے باعزت بری ہونے کے باوجود فاضل جج نے اس کی سزا برقرار رکھی' بہت احتجاج ہوا اپیلیں کی گئیں' اس وقت کے جیل کے نیک دل سپرنٹنڈنٹ نے بھی بہت تعاون کیا شہزاد کے گھر والوں کے ساتھ نہ صرف یہ بلکہ اس نیک دل انسان نے جیل سے مختلف جگہوں پر انصاف کے حصول کے لیے درخواستیں بھجوادیں مگر کسی بھی جگہ پر کوئی سنوائی نہیں ہوئی' سب نے یہی کہا کہ قانون بنا ہے تو اس کا احترام بھی ہونا چاہیے' خواہ وہ شخص اپنے جرم سے باعزت بری ہی کیوں نہ ہوگیا ہو۔ تین بار ڈیتھ فکس ہوئی شہزاد اور اس کے گھر والے

پاگل ہونے کو تھے کہ اگر ہمارے بچے کی جان ہی نہیں بچنی تھی تو ہمیں اپنی زندگی بھر کی پونجی لٹا کر نمبردار سے راضی نامہ کرنے کا کیا فائدہ؟ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ چاہے اسے معطل کردیا جائے مگر وہ ایک ناجائز قتل کا گناہ اپنے سر نہیں لے گا۔ تب اوپر سے دھمکیاں بھیجی گئیں مگر سپرنٹنڈنٹ کے کردار پر آفرین ہے کہ اس نے شدید دباؤ کے باوجود سزا پر عمل درآمد نہیں ہونے دیا اور افسران کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ وہ بہت غلط کررہے ہیں، بے شک ایسے ہی لوگوں کے لیے جو اپنے فرض سے غداری نہیں کرتے" آخرت کی راحت ہے مگر شہزاد کو انصاف نہیں ملا، ہر جگہ انصاف کے حصول کے لیے سر پھوڑنے کے بعد بالآخر وہ پاگل ہوگیا اور آج تک پاگل پن میں جیل کاٹ رہا ہے، یہ ہے اس ملک کا نظام اور یہاں کا اندھا قانون، وہ بدترین اور اندھا قانون، جس کی بھینٹ صرف بے گناہ، غریب اور کمزور لوگ چڑھتے ہیں، بااثر اور امیر لوگوں کے لیے تو یہ کسی کھیل تماشے سے کم نہیں۔" رخ پھیرے وہ بہت دل گرفتگی سے کہہ رہا تھا۔ حورعین رنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"آپ کو دکھ ہے کہ آپ کے ساتھ بے گناہی کے باوجود ایک غیر ملک کے ظالم آفیسرز نے غیر انسانی سلوک کیا صرف اس لیے کہ آپ مسلمان اور پاکستانی تھیں مگر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہاں اپنے ملک میں بااختیار لوگ بے بس لوگوں کے ساتھ کس حد تک جاکر غیر انسانی سلوک کرتے ہیں، پل پل بدترین موت کا انتظار کرنے والے قیدیوں کے ساتھ خوف ناک اندھی کوٹھڑیوں میں کیسے انسانیت کی دھجیاں بکھیرتے ہیں، ہر لمحہ کیسے ان کو ذہنی اور جسمانی طور پر ٹارچر کرکے پاگل پن کی بے رحم موت کے سپرد کرتے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں عمیر! بہت حد تک اندازہ ہے مجھے۔"

"نہیں، آپ نہیں جان سکتیں، سوائے ان قیدیوں اور ان کے خدا کے اور کوئی نہیں جان سکتا کہ وہاں کیا ہوتا ہے، دوسرے لوگوں کے سامنے اگر ایسی کوئی بات آتی ہے تو وہ یقین ہی نہیں کرتے" کر بھی لیں تو یہی سمجھتے ہیں کہ ضرور کسی قصور کی سزا ہی ملتی ہوگی مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔"

"میں جانتی ہوں عمیر! میرا خود ایسے حالات سے براہ راست واسطہ پڑا ہے۔"

"میں جانتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جو باتیں میں کررہا ہوں وہ بہت سے لوگوں کے نزدیک محض فضول باتیں ہیں، بہت سے لوگ تو ان پر کان دھرنا اور انہیں سننا بھی گوارا نہیں کرتے اور یہی بے حسی ہمارا المیہ ہے، جس کا جواب وہ ہمیں ہونا ہے اپنے ہی جیسے انسانوں کے ساتھ انسانیت سے گر کر ہونے والے سلوک پر۔ بہرحال ابھی جو بات میں آپ کو بتانے جارہا ہوں، مجھے اس کا بہت دکھ ہے کیونکہ یہ بدترین ظلم ہے۔ بہرحال بہت پرانی بات نہیں ہے یہ میرا کیس ان دنوں فائنل مراحل میں تھا جیل کے حکام نے ہمیں اس روز جو چاول کھانے کے لیے دیے تھے وہ کسی طور کھانے کے قابل نہیں تھے یہاں میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ حکومت جیل حکام کو یومیہ فی قیدی دو سے تین سو روپے دیتی ہے مگر قیدی کو بمشکل تمیں سے چالیس روپے کا کھانا بھی نہیں ملتا، جیل کا باورچی ساٹھ ستر ہزار روپے خرچ کرکے یہ ڈیوٹی سنبھالتا ہے اور پھر جو راشن آتا ہے اس کی تقسیم ہوتی ہے قیدی کے لیے کچھ بھی نہیں بچتا دوسری دنیا کے ان نیم پاگل لوگوں کو جو کھانا تیار کرکے دیا جاتا ہے اس کی تیاری کچھ اس طرح سے ہوتی ہے کہ ایک دیگ میں پانی ابال کر اس میں دال، سبزی یا گوشت ڈال دیا جاتا ہے جو پکانا مقصود ہوتا ہے پھر برائے نام نمک مرچ چھڑک کر گھی کی جگہ ایک جگ بھر کر گندہ اور بدبودار تیل ڈال دیا جاتا ہے جو ڈرموں کی صورت وہاں پڑا ہوتا ہے، جس روز کسی مجسٹریٹ یا اعلیٰ افسر نے چکر لگانا ہو اس روز ذرا بہتر کھانا دے دیتے ہیں ورنہ روز ایسا ہی کھانا دیا جاتا ہے کہ انسان دیکھ کر ہی پیچھے ہٹ جائے۔ اس روز بھی ہمیں ایسے ہی چاول دیے گئے تھے۔ جس پر سب قیدیوں نے احتجاج کردیا، جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے قیدیوں سے کہا کہ

ٹھیک ہے آپ لوگ اپنے اپنے سیل میں واپس چلے جائیں میں آٹا منگوا کر آپ لوگوں کے لیے روٹی کا انتظام کردیتا ہوں، ہمیں پتا تھا کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ ہمیشہ دھوکا کرتے ہیں اس لیے ہم نے کہا کہ ہمیں ان کے وعدے کا کوئی اعتبار نہیں، وہ قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر حلف دے دیں کہ ہمیں کھانا دیں گے اور ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا جائے گا تب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر حلف دیا کہ وہ دھوکا نہیں کرے گا۔ اس حلف کے بعد سب قیدی جیسے ہی منتشر ہوکر سیلز میں بند ہوئے ان لوگوں نے وہی گندے چاول نالی میں پھینک کر ایک ایک قیدی کو باہر نکالا اور پھر مار مار کر ان کے بازو اور ٹانگیں توڑتے ہوئے انہیں نالی میں پڑے ہوئے چاول اٹھا کر کھانے پر مجبور کیا اور کھلائے بھی۔ اگلے دن احتجاج پر ہمارے چار ساتھیوں کو گولی مار کر ان پر یہ الزام عائد کردیا کہ ان لوگوں نے جیل سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اس لیے انہیں گولیاں ماری گئیں۔" گہری سانس ہموار کرتے ہوئے اس نے سر جھکا لیا تھا جب حورعین نے پوچھا۔

"لوگ بیمار نہیں ہوئے وہ گندے چاول کھا کر؟"

"آپ کو کیا لگتا ہے نہیں ہوتے، ہوں گے مگر جیل کی چار دیواری کے اندر بیماری بھی کسی عذاب سے کم نہیں، حکومت جو بہترین ادویات قیدیوں کے لیے بھجواتی ہے وہ فروخت کرکے پیسے بٹور لیے جاتے ہیں اور قیدیوں کو ایڑیاں رگڑنے پر ہر مرض کے لیے ایک ہی قسم کی سستی سی کالی پیلی گولیاں لاکر پکڑا دی جاتی ہیں۔ سزائے موت کے قیدیوں کو تو حالت مرگ میں بھی بیڈ نصیب نہیں ہوتا نہ ہی نزع سے پہلے باہر کے اسپتال کا منہ دکھاتے ہیں، اسی لیے سنتریوں میں وہ قیدی بیماری سے پناہ مانگتے ہیں۔"

"ہوں آپ نے شاید سن رکھا ہوگا پاکستان اور ہندوستان میں بہت سی جیلیں ایسی ہیں جہاں قیدی اپنے گھر والوں کو پیغام میں یہ لکھتے ہیں کہ ان کے لیے موت مانگا کریں، وہ جیلیں جہاں ڈھلتی ہر شام نہایت وحشت ناک ہوتی ہے سورج کے غروب ہوتے ہی جہاں دلوں کو نوچ لینے والی خاموشی اپنے پنجے گاڑھ کر بیٹھ جاتی ہے، وہ جیلیں جو قبروں سے بھی زیادہ ویران اور قبرستان سے بھی زیادہ خوف ناک ہوتی ہیں۔"

"جی، میں جانتا ہوں میں نے سن رکھا تھا کہ بھارتی جیلوں میں مسلمان قیدیوں کو پیٹرول پلایا جاتا ہے تاکہ ان کے اعضاء کو مفلوج کیا جاسکے، وہ قیدی جو وہاں سے رہا ہوکر آتے ہیں وہ یا تو مکمل طور پر پاگل ہوجاتے ہیں یا پھر ان کے لبوں پر ایک جامد خاموشی ہمیشہ کے لیے ڈیرا ڈال لیتی ہے، زندگی بھر وہ محض خلاؤں میں تکتے رہتے ہیں اور اپنے زندہ ہونے پر روتے رہتے ہیں۔"

"ہوں، موت تو اٹل حقیقت ہے جس سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا مگر پھر بھی دنیا کے ہر دکھ سے بڑا موت کا دکھ ہوتا ہے۔"

"برزخ میں جلتے لوگوں کے لیے نہیں ہوتا۔" عمیر نے کہا اور اسی پل عذیر ہمدانی نے لاؤنج میں قدم دھرے تھے۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام!" عذیر کے سلام کے جواب میں حورعین اور عمیر نے مشترکہ سلامتی بھیجی تھی۔ وہ سر کو ہلکی سی جنبش دیتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"اوکے آپی! میرے خیال سے ٹائم کافی ہوگیا ہے نیند آرہی ہے آپ بھی سوجائیے۔" عذیر کے کمرے کی طرف بڑھتے ہی عمیر بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ حورعین اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا گرم کرکے وہ عذیر کے کمرے میں لے آئی، وہ ابھی لباس تبدیل کرکے بیٹھا تھا۔

"السلام علیکم! یہ کھانا......"

"کیا پکایا ہے؟" اچٹتی سی ایک نظر اس کے سراپے پر ڈالنے کے بعد اس نے کھانے کی ٹرے کو دیکھا، حورعین کنفیوز سی کھڑی رہی۔

"کریلے گوشت۔"

"میں کریلے نہیں کھاتا۔"

"کیوں؟"

"بس...... مجھے کریلے اچھے نہیں لگتے۔"

"مگر آج میں نے کھانا نہیں بنایا، میں نے بنایا ہے آپ

ذراسا کھا کر دیکھ لیں اگر اچھا نہ لگے تو کچھ اور بنادوں گی۔"

"شکریہ مگر میں نہیں سمجھتا کہ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔"

"میں جانتی ہوں مگر میں اتنی دیر تک جاگ کر آپ کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔"

"اسے ضرورت بھی نہیں ہے میرا انتظار کرنے کی، لیٹ گھر واپسی پر سب اپنا اپنا کھانا خود ہی نکال کر کھاتے ہیں۔" اس کے ہاتھ سے کھانے کی ٹرے لے کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے وہ مبہم سا مسکرایا تھا۔ حورمین سر جھکائے کھڑی رہی۔

"بیٹھ جائیں پلیز۔"

"نہیں آپ کھانا کھالیں تب تک میں چائے لے آتی ہوں۔"

"ابھی چائے کی ضرورت نہیں پلیز آپ بیٹھ جائیں میں کچھ جاننا چاہتا ہوں آپ کے بارے میں؟" اگلے ہی پل کھانے کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے اس نے سرسری سی نظر حورمین پر ڈالی۔ وہ ہلکی سی گھبراہٹ کا شکار قریبی صوفے پر ٹک کر بیٹھ گئی۔

"جی۔"

"عمیر نے دادی اماں کو بتایا ہے کہ ہمارا نکاح ہو چکا ہے اسی لیے دادو نے بنا سوچے سمجھے سارا گھر آپ کے سپرد کردیا وہ جتنی سخت ہیں اتنی ہی پیار کرنے والی خاتون بھی ہیں۔ میرے حوالے سے آپ کو اس گھر میں کوئی مسئلہ نہیں ہوسکتا مگر یہ حوالہ ہمیں بہت سی مشکلات سے دوچار کرسکتا ہے۔" نوالہ توڑتے ہوئے وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ مزید گھبراہٹ کا شکار ہوگئی۔

"کیسی مشکلات؟"

"ہیں کچھ مشکلات آج صبح جب میں دادو کے کمرے میں گیا تو پتا ہے وہ مجھ سے کیا پوچھ رہی تھیں کہ آپ انہیں خوش خبری کب سنا رہی ہیں کہہ رہی تھیں کہ آپ کو ساتھ لے کر ڈاکٹر سے چیک اپ کرواؤں بہت ایکسائیٹڈ ہیں وہ گھر میں کوئی نہ کوئی تقریب کرنے کے لیے۔" عذیر کے الفاظ نے اس کا چہرہ لمحوں میں سرخ کردیا تھا۔ مارے حیاء کے وہ اس کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔

"بڑی مشکل سے ٹالنے میں کامیاب ہوا ہوں انہیں مگر میں جانتا ہوں ہم شاید زیادہ دن تک اس فرضی رشتے کا بھرم نہیں رکھ پائیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ مجھے اپنے گھر والوں کے بارے میں بتائیں تاکہ میں آپ کا مسئلہ حل کرسکوں آخر کار آپ ساری عمر کے لیے تو فرضی تعلق کا سہارا لے کر اس گھر میں نہیں رہ سکتیں ناں؟" اس کی حیاء اور خاموشی کو یکسر نظر انداز کیے وہ اپنی بات مکمل کررہا تھا۔ حورمین کی آنکھیں چند لمحوں میں پھر سے آنسوؤں سے بھر آئیں۔

"میں جب گھر سے نکلی تھی تو اذان ہورہی تھی، اس وقت صرف اللہ ہی میرا واحد رشتہ تھا اسی سے عزت کی حفاظت اور پناہ کی دعا مانگی تھی میں نے اور اس نے میری دعا کو رد نہیں کیا۔"

"گھر سے کیوں نکلی تھیں؟" وہ اب باقاعدہ انویسٹی گیشن کررہا تھا حورمین کا سر جھکا ہوا ہی تھا۔

"پاپا کی ڈیتھ کے بعد اس گھر میں میرے لیے سوائے گھٹن کے اور کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ ایسے میں پاپا کی تمام پراپرٹی کے مالکانہ حقوق میرے نام ہونے پر میری سوتیلی ماں کے لیے میرے وجود کو برداشت کرنا اور بھی مشکل ہوگیا۔ اس روز اگر میں گھر سے نہ بھاگتی تو یقیناً وہ اپنے بھائی اور بھانجے کے ہاتھوں میری عزت پامال کروادیتیں۔"

"واٹ؟"

"ہاں پاپا کے آفس پر ان کے بھائی قابض ہیں اور گھر پر وہ اور ان کی فیملی وہ ہر صورت مجھے اس گھر سے بے دخل کرنا چاہتی تھیں اور انہوں نے کردیا۔"

"یہ تو بہت غلط ہے کیا آپ کی فیملی میں کوئی اور سپورٹر نہیں ہے آپ کا؟"

"نہیں کوئی بھی نہیں، صرف وکیل انکل تھے جب تک وہ زندہ تھے میں عافیت میں تھی ان کی رحلت کے بعد ہی یہ سب ہوا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں میں اس معاملے کی مکمل تحقیق کروا کر یہ مسئلہ حل کرواؤں گا ان شاءاللہ۔"

"شکریہ۔" آنسو پونچھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اگلے روز عصر کے بعد دل کے ازحد بے قرار ہونے پر بہت دنوں کے بعد وہ قبرستان چلی آئی تھی۔ دادی اماں سے اس نے بازار سے سودا سلف لانے کا کہا تھا۔ شہر خاموشاں کی خاموش دنیا کا وہی معمول تھا وہ لوگ جن کے ہونے سے زندگی کا گمان ہوتا ہے چپ کی بکل مار کر ابدی نیند سو جائیں تو دل قبرستان بن جاتے ہیں اور پھر انہی قبرستانوں میں گزرے ہوئے وقت کی تمام تر یادیں بدروحوں کی طرح بھٹکتی پھرتی ہیں۔ اس کے اندر بھی سناٹوں کا راج تھا قبرستان کے بڑے سے پھاٹک کے اس پار قدم رکھتے ہی وہ جیسے کانچ کے برتن کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی تھی۔

❀ ❀ ❀

رات سبک روی سے برفیلی ہواؤں کے ساتھ اپنا پچھلا سفر مکمل کررہی تھی جب وہ بے کل سی کمرے سے نکل کر باہر لان سے ملحقہ سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔

آدھی آستینوں کے باریک سوٹ میں ایک لمحے کے لیے وہ کپکپا کر رہ گئی تھی مگر اگلے ہی پل بے حسی کا مظاہرہ کرتی، ٹھنڈی یخ سیڑھیوں پر ٹک گئی۔ کل رات سے وہ مسلسل رو رہی تھی کتنی بے دردی سے اس کے ہم سفر نے اس کی روح کے کانچ ادھیڑے تھے اسے لگا جیسے اس کا سر درد سے پھٹ جائے گا۔

"اپنے باپ سے پوچھنا جاکر اپنی اوقات جنہوں نے راتوں رات زبردستی تمہیں میرے گلے کا ڈھول بنا دیا تھا نجانے کیا کیا گل کھلائے ہوں گے کہ انہیں یوں میرے پاپا کے پاؤں پکڑنے پڑے تمہیں تو کوئی نہ کوئی لڑکا چاہیے تھا دل بہلانے کے لیے خواہ وہ شوہر کے روپ میں ہو یا اس کے بھائی کے۔" کتنا کٹیلا لہجہ تھا میکال کا ایک ایک لفظ کوڑے کی طرح لگا تھا جسم پر۔ لوگ کہتے ہیں تیر تلوار ہی گھاؤ چھوڑتے ہیں مگر جو چوٹ لفظوں سے پہنچتی ہے اس کا تدارک کوئی مرہم نہیں کرسکتا۔ گرم گرم آنسوؤں کے بہنے کا سلسلہ جاری ہی تھا اس وقت اسے کسی اپنے کی کمی شدت سے محسوس ہورہی تھی کوئی ایسا اپنا جس سے وہ اپنا ہر درد شیئر کرکے پرسکون ہوسکتی۔ اگلے پچیس منٹ مزید برفیلی ہواؤں کا سامنا کرنے کے بعد وہ بے دلی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی بیڈ کے قریب سائیڈ ٹیبل سے اپنا سیل اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھیں پھر بھر آئی تھیں آج کتنے دنوں کے بعد اس کی انگلیاں ہادیہ ظفر کا موبائل نمبر پریس کررہی تھیں۔

"ہیلو۔" اسے گمان نہیں تھا مگر حیرت انگیز طور پر رات کے اس پہر بھی اس کی کال فوری پک کرلی گئی تھی یوں جیسے اس کے ساتھ وہ بھی جاگ رہی ہو۔ ہانیہ خاموش رہی یوں جیسے وہ سمجھ ہی نہ پارہی ہو کہ اسے بولنا چاہیے یا نہیں۔

"ہانیہ! میری جان بات کرو پلیز، میں مانتی ہوں کہ میں نے تمہارے اعتبار کو ٹھیس پہنچا کر تمہارا دل توڑا ہے مگر خدا شاہد ہے ہانی! میرا مقصد صرف تمہاری بہترین زندگی تھا۔ میکال بھائی بہترین انسان لگے تھے مجھے تمہارے لیے۔" اس کی خاموشی پر تڑپتے ہوئے وہ بول رہی تھی ہانیہ کے آنسو تیزی سے بہنے لگے اس کے دل پر جما گلیشیئر پگھلنے لگا تھا ابھی اپنی سسکیوں کو دباتی وہ کمرے سے نکل کر کمرے سے ملحقہ ٹیرس کی طرف چلی آئی تھی۔ سرد ہواؤں کی سنگت نے ایک مرتبہ پھر اس کے چہرے پر نم سا تاثر چھوڑا تھا۔ دوسری طرف موجود ہادیہ اس کی سسکی کی آواز پر جیسے تڑپ اٹھی تھی۔

"ہانی...... ہانی! تم ٹھیک تو ہو کیا ہوا ہے پلیز مجھے بتاؤ۔" اس کی بے قراری اس کے لہجے سے صاف محسوس کی جاسکتی تھی مگر ہانیہ خاموشی سے روتی رہی، آنسوؤں کی زبان کے علاوہ اس وقت اسے اور کوئی زبان اپنے درد کے اظہار کے لیے مناسب نہیں لگی تھی۔

"کچھ تو کہو ہانی! پلیز کچھ تو بتاؤ کیا ہوا ہے، دیکھو صبح ہونے والی ہے میں فجر کی نماز پڑھتے ہی تمہارے پاس آجاؤں گی پلیز تم چپ ہو جاؤ نہیں تو مجھے کچھ ہو جائے گا۔" وہ خود بھی رونے لگی تھی اور وہ ایسی ہی تھی ہمیشہ ہانیہ کی

تکلیف پر تڑپ اٹھنے والی صرف بانیہ کے لیے اس کی محبت میں اس نے انگلینڈ جیسا شاندار ملک چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے پاکستان میں پڑاؤ ڈال لیا تھا جب کہ اس بات پر کتنے ہی دن جاذب جو اس کا منگیتر ہی نہیں محبوب بھی تھا اس سے ناراض رہا تھا۔

بانیہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اسے کیا کہے تبھی اس نے خاموشی سے کال ڈس کنیکٹ کردی تھی اور روتے ہوئے وہ پلٹ رہی تھی جب قطعی غیر متوقع طور پر میکال حسن کے ساتھ اس کی ٹکر ہوگئی اس کے وہم و خیال میں بھی نہیں تھا کہ رات کے اس پہر اپنے بیڈروم سے نکل کر وہ یوں اس کے کمرے کی طرف بھی آسکتا ہے' تبھی اس نے بھیگی پلکوں کے ساتھ حیرانی سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند ساعتیں دیکھنے کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو اپنی انگلی کے پوروں پر چن لیے تھے۔

"ایم سوری بانیہ! شاید مجھے وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا جو میں نے کہا۔" وہ شخص اس سے معذرت کا اظہار کر رہا تھا جس کی بے بنیاد نفرت بانیہ کی سمجھ سے باہر تھی مگر اس شخص کے لفظوں نے جو کیچڑ اس کی ذات پر اچھالا تھا' وہ چاہتے ہوئے بھی اسے کبھی بھول نہیں سکتی تھی تبھی ایک سرد نگاہ اس کے چہرے پر ڈالنے کے بعد وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی اور کمرا لاک کر کے بیٹھ گئی اگلے چند گھنٹوں میں ہادیہ اس کے پاس تھی' بانیہ اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ کر پھر رو پڑی۔

"آنٹی اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ روز کے لیے بانیہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں' اصل میں انکل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ یاد کر رہے ہیں۔" اسے چپ کروانے کے بعد وہ ڈائننگ ٹیبل پر موجود مسز حسن کو مخاطب کرتے ہوئے بولی تھی۔ میکال اور حسن صاحب آفس کے لیے نکل چکے تھے جب کہ نہال پچھلے چند روز سے شہر سے باہر تھا تبھی اس کی استدعا پر انہوں نے فوراً سر جھکائے بیٹھی بانیہ کی طرف دیکھا تھا۔

"بانیہ بیٹے! کیا آپ بہن کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟"

"جی۔" اس کے جی نے ہادیہ کے ساتھ ساتھ مسز حسن کو بھی حیران کیا تھا شاید تبھی انہوں نے فوراً اجازت دے دی تھی۔

"ٹھیک ہے' یہ تو بہت اچھی بات ہے آپ جب تک چاہو وہاں رہ سکتی ہو۔" وہ اس کی ماں نہیں تھیں مگر بانیہ کے لیے ان کا پیار اور ان کا کردار کسی طور ایک ماں سے کم نہیں تھا تبھی وہ فرماں برداری سے سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

ہادیہ کے ساتھ اگلے تین گھنٹے کے بعد جس وقت اس نے اپنے گھر میں قدم رکھا لان میں بیٹھے کرنل صاحب اور جاذب کی نگاہیں گویا پلک جھپکنا بھول گئیں' کتنے عرصے کے بعد وہ اس گھر میں واپس آئی تھی' جاذب اٹھا تھا اور لپک کر اس کے قریب آیا تھا۔

"بنی! یہ تم ہی ہونا' میری آنکھیں کہیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں۔"

"کھا بھی سکتی ہیں کیونکہ چشمے کے بغیر تمہیں کچھ ٹھیک سے نظر کہاں آتا ہے۔" بانیہ کی بجائے جواب ہادیہ نے دیا تھا جس پر وہ چڑ گیا۔

"تم اپنا بوتھا بند رکھو تو کے۔"

"او کے اب ہٹو راستے سے' بنی کو انکل سے ملنے دو۔"

"میری بہن ہے پہلے مجھ سے ملے گی' تم خرید کے نہیں لائیں اسے۔" وہ پھر چڑا تھا۔ بانیہ کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ بکھر گئی تبھی جاذب نے اسے کھینچ کر خود سے لگا لیا۔

"میں تم سے سخت خفا ہوں بنی! مگر پھر بھی معاف کرتا ہوں' کیا کروں اکلوتی بہن جو ہے میری۔" وہ آج بھی ویسا ہی تھا زندہ دل' تین سال پہلے والا۔ بانیہ کی آنکھوں میں نمی بھر آئی۔ جاذب اسے خود سے لگانے کے بعد اب اس کی آنکھیں اور سر چوم رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ کتنے انمول رشتے تھے یہ' جنہیں چھوڑ کر وہ ایک ایسے شخص کی زندگی میں چلی گئی تھی' جسے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جاذب اسے اپنی مضبوط بانہوں کے حصار میں لیے

کرنل صاحب کی طرف لایا' جواب میں وہ بھی اسے خود سے لپٹا کر رو پڑے تھے۔ اس کے آجانے سے پورے گھر میں جیسے خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کوئی بھی اسے ایک منٹ کے لیے بھی تنہا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ شام میں بمشکل اسے ہادیہ کے ساتھ تنہا ہونے کا موقع ملا تو اس کے استفسار پر اس نے شادی کے پہلے دن سے لے کر اب تک کے تمام حالات اس کے گوش گزار کر دیے۔

"بنی! اتنا کچھ ہوگیا اور تم نے ہمیں بتایا تک نہیں؟" ہادیہ کا چہرہ اس لمحے دیکھنے لائق تھا۔ بانیہ نے سر جھکا لیا۔

"کیا بتاتی' اس شخص کو زبردستی تم لوگوں نے میری زندگی کا حصہ بنایا تھا پھر تم ہی سے کیا درد شیئر کرتی اپنا۔"

"جسٹ شٹ اپ یار! وہ شخص تم سے اور تمہاری خوشیوں سے زیادہ عزیز نہیں ہے ہمیں۔" ہادیہ سخت ٹینس لگ رہی تھی۔

"کرتی ہوں میں انکل سے بات' اس شخص کا دماغ ٹھکانے نہ لگایا تو میرا نام بھی ہادیہ نہیں۔"

"نہیں' تمہیں ایسا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"چپ کرو تم زیادہ دیوی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" ناگن جھاڑتے ہوئے اس نے فوراً سے ڈپٹ کر چپ کروا دیا تھا۔

"مجھے صرف اتنا بتاؤ تم مزید اس گھر میں اس شخص کے حوالے رہنا چاہتی ہو کہ نہیں؟"

"پتا نہیں۔" وہ بے حد اضطراب کا شکار تھی' ہادیہ گہری سانس بھرتی بہت محبت سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے بیسٹ آف لک۔" سردی بڑھ رہی تھی' وہ اس پر شال درست کرتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

اگلے روز شام میں اتفاق سے وہ صفدر باجوہ صاحب کے ساتھ جس تقریب میں شریک تھی میکال حسن بھی اپنی فیملی کے ساتھ اسی تقریب میں موجود تھا۔ کھانے کے بعد جس وقت وہ لوگ گپ شپ میں مصروف تھے۔ اس نے ایک نظر میکال حسن کے اداس اور الجھے ہوئے سراپا پر ڈالتے ہوئے صفدر صاحب کو مخاطب کیا تھا۔

"ایکسکیوزمی انکل! مجھے میکال بھائی کی موجودگی میں بانیہ کے بارے میں کچھ بات کرنی تھی آپ سے۔" اس کا انداز ایسا تھا کہ میکال حسن اور صفدر صاحب کے ساتھ ساتھ حسن صاحب اور مسز حسن بھی چونک اٹھی تھیں۔

"جی کہو بیٹے۔" صفدر صاحب نے بھی میکال پر نگاہ ڈالنے کے بعد اس کی طرف دیکھا۔ تبھی وہ دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے بولی تھی۔

"میکال بھائی کا کہنا ہے کہ آپ نے بانیہ کے ان سے رشتے کے لیے حسن انکل کے پاؤں پکڑے تھے' کیوں؟" میکال کو گمان نہیں تھا کہ وہ بھری محفل میں اسے یوں منہ کے بل گرانے کا ارادہ رکھتی ہے' تبھی وہ بوکھلا کر رہ گیا تھا جب کہ حسن اور صفدر صاحب کے منہ حیرت کی زیادتی سے کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔

"میں نے پاؤں پکڑے تھے حسن کے......؟"

"ایکسکیوزمی مس ہادیہ! آپ شاید جانتی نہیں ہیں کہ اس وقت ہم لوگ اپنے گھر میں نہیں ہیں۔"

"جانتی ہوں بہت اچھی طرح سے احساس ہے مجھے کہ ہم لوگ اس وقت کہاں ہیں' مگر میں یہ بھی بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ بانیہ کی شادی آپ جیسے شخص سے کروانے کے لیے سب سے زیادہ محنت میں نے کی تھی' میں نے ہی انکل کو مجبور کیا تھا کہ وہ بانیہ کے لیے آپ کا پرپوزل قبول کریں کیونکہ مجھے لگتا تھا وہ آپ کے گھر بہت خوش رہے گی' مگر اب تک جو کچھ وہاں اس کے ساتھ ہوا ہے میرا دل غم کی شدت سے پھٹ رہا ہے۔" وہ جذباتی ہوئی تھی' جب حسن صاحب نے اس سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہم گھر چل کر بات کرتے ہیں اس موضوع پر' یہ جگہ ایسے کسی جھگڑے کے لیے مناسب نہیں ہے۔" حسن صاحب کی ایماء پر اگلے پینتیس منٹ میں وہ لوگ ان کے گھر پر موجود تھے۔ نہال بھی اتفاق سے لاؤنج میں ہی بیٹھا تھا۔ مسز حسن چائے کا آرڈر دینے چلی گئیں تبھی حسن صاحب نے پھر ہادیہ کی طرف دیکھا۔

"جی بیٹے اب آپ بتائیں' کیا کہنا چاہ رہی تھیں؟"

"پاپا میں اپنے روم میں جارہا ہوں میرے سر میں آل ریڈی بہت درد ہے میں کسی بھی جھگڑے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔"

"ہم لوگ بھی جھگڑالو نہیں ہیں نہ ہی ہمارا خاندانی مشغلہ ہے۔" ایک دم سے میکال کے اٹھنے پر وہ بھی سلگتے ہوئے بولی تھی تبھی صفدر صاحب بول اٹھے۔

"کیا بات ہے ہادی بیٹا! کیوں اس طرح کا برتاؤ کررہی ہیں آپ؟"

"کیونکہ میں بہت ہرٹ ہوں انکل! پچھلے دو روز سے ہانیہ کا بخار نہیں ٹوٹ رہا ہے بے حد ڈسٹرب ہے وہ اور اس کی وجہ میکال بھائی ہیں۔"

"کیا کیا ہے میکال نے؟"

"کیا نہیں کیا انہوں نے؟ جب سے ہانیہ اس گھر میں بیاہ کر آئی ہے انہوں نے ایک دن بھی اس کے وجود کو تسلیم نہیں کیا' ہر روز ہر لمحہ اس سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے رہے مگر وہ پھر بھی خاموش رہی' کسی کمزوری کی وجہ سے نہیں صرف اور صرف آپ کی عزت کے لیے جو آپ کے قائم کیے بندھن کو نبھانے کے لیے مگر یہ اس پر بھی خوش نہیں رہے انہوں نے اس سے کہا کہ وہ ایک بدکردار لڑکی ہے اسی لیے آپ نے حسن انکل کے پاؤں پکڑ کر زبردستی اس کا تعلق ان سے جوڑ دیا' میں جاننا چاہتی ہوں انہوں نے اتنی بڑی بات کس بنیاد پر کی اس سے؟" غصے کی شدت کے باعث اس کی چھوٹی سی ناک کی پھننگ پھول گئی تھی۔ صفدر صاحب اس کے الفاظ پر جہاں کے تہاں بیٹھے رہ گئے تھے۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں حسن؟"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا انکل! یہ جھوٹ بول رہی ہیں۔" گہری سانس بھر کر پینٹ کی پاکٹس میں ہاتھ پھنساتے ہوئے وہ خاصی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا تبھی وہ چیخی تھی۔

"میں جھوٹ بول سکتی ہوں مگر ہانیہ جھوٹ نہیں بولتی۔"

"تو ہانیہ سے کہیے ناں وہ خود یہاں آ کر سب کے سامنے یہ بات کہے۔" ہادیہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ شخص اتنا جھوٹا اور چالاک ثابت ہوگا' تبھی اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔

"ہانیہ کو یہاں آ کر آپ کی شکایت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' جو حال فقط چند ماہ میں آپ نے اس کا کردیا ہے کافی ہے' میرا خیال ہے آگے وہ ایک قدم بھی آپ کے ساتھ چلنا پسند نہیں کرے گی۔"

"آپ اپنا خیال اپنے پاس رکھیے' میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں چلنا' یہ خالصتاً ہانیہ کا مسئلہ ہے اور اس کا فیصلہ بھی وہی کرے گی۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ میرے دل میں انکل کے لیے بہت عزت ہے میں ہانیہ کے معاملے میں ان کے لیے کسی بھی غیر ضروری بات کے سخت خلاف ہوں۔ اب سوری کہ میں آپ کو مزید کمپنی نہیں دے سکتا کیونکہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' خدا حافظ۔" انتہائی محتاط الفاظ میں بات ختم کرتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ تبھی وہ بولی تھی۔

"میں نے جو بھی کہا ہے وہ حرف بہ حرف سچ کہا ہے اگر آپ لوگوں کو یقین نہ آئے تو آپ ہانیہ سے اس کی تصدیق کرسکتے ہیں میں اس کی خوشیوں کی دشمن نہیں ہوں مگر میں اسے پل پل مرتے بھی نہیں دیکھ سکتی۔" سر جھکاتے ہوئے اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں بھی نمی چھلکی تھی۔ تبھی مسز حسن چائے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی تھیں۔

"میکال کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں بیٹا! اگر اس نے ہانیہ بیٹی سے ایسی کوئی فضول بات کی ہے تو نہایت چھوٹے پن کا ثبوت دیا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ ہانیہ کو میں نے اپنی بیٹی کی طرح ہی سمجھا ہے' وہ میرے گھر کی عزت اور رونق ہے۔"

"بس ہوگئی آنٹی! مجھے یا ہانیہ کو آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔" چائے کا کپ تھام کر گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے گویا بات ختم کردی تھی۔ گھر واپسی کے بعد صفدر صاحب نے ہانیہ کو اپنے کمرے میں طلب کرلیا۔

"جی پاپا! آپ نے بلایا۔"

"ہوں' یہاں بیٹھو۔" پُرسوچ نگاہ اس کے بخار سے نڈھال سراپا پر ڈالتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے قریب صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے اب' ہادیہ بتارہی تھی بخار ہے۔"

"جی' کچھ بہتر ہے اب۔"

"الحمدللہ' اپنا خیال رکھا کرو بیٹے! بے پروائی اچھی بات نہیں ہے۔"

"جی پاپا۔"

"ہانیہ بیٹے! مجھے میکال کے بارے میں آپ سے کچھ بات کرنی تھی' کیا آپ اس کے ساتھ خوش ہیں؟"

ان کے سوال پر اس نے بے ساختہ چونک کر سر اٹھایا تھا۔

"آپ یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں پاپا؟"

"بس یوں ہی دل کی تسلی کے لیے۔"

"اگر میں کہوں کہ میں اس کے ساتھ خوش نہیں ہوں تو آپ کیا کریں گے' علیحدگی کروادیں گے میری اس سے؟" کتنے مضبوط لہجے میں کتنا مشکل سوال کرگئی تھی وہ' صفدر صاحب اس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

"ہوں' ممکن ہے کروا بھی دوں کیونکہ تمہاری خوشی کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"بس کریں پاپا پلیز۔" ایک دم سے اس کا لہجہ تلخ ہوا تھا۔

"مائنڈ مت کیجیے گا مگر مجھے لگتا ہے روز محشر اگر کوئی سب سے زیادہ پریشان ہوگا تو وہ آپ لوگ ہوں گے' ہمارے مشرقی والدین جو ہمیں پیدا تو کرتے ہیں مگر پھر پل پل اذیت کی بھٹی میں جلا کر اپنے اس پیدا کرنے والے احسان کا حق بھی وصولتے ہیں' والدین کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم بیٹیاں جنہیں اللہ رب العزت نے اپنی رحمت قرار دیا ہے۔ ہماری بھی کوئی زندگی ہے' کوئی خواہش ہے' بے زبان جانوروں کی طرح زندگی بھر ہم صرف سر جھکاتے ہیں اور اپنی ذات کے لیے آپ لوگوں کے احکامات سنتے ہیں' خواہ ہمارا دل اس پر کتنا ہی احتجاج کیوں نہ کرتا ہو' اون کے گالوں کی طرح آپ اپنی مرضی سے کوئی بھی من پسند ڈیزائن بُنتے ہیں اور پھر فالٹ نظر آنے پر ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ احساس کیے بغیر کہ اس ڈیزائن کے ساتھ ہی ہماری زندگیاں بھی ادھڑ کر رہ جاتی ہیں' معاف کیجیے گا پاپا! مگر یہ سچ ہے کہ آپ ساری زندگی اپنے بچوں کو اسلام کا درس تو دیتے ہیں انہیں ماں باپ کی اطاعت' ثواب' گناہ' پردہ سب بتاتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام نے ہر انسان کو خواہ وہ بالغ بیٹا ہو یا بیٹی اس کی رضا اور پسند کا حکم دیا ہے۔ بہرحال مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ بس میں اتنا چاہتی ہوں کہ میری زندگی میں مزید کوئی ہنگامہ نہ کیا جائے فی الحال میں صرف سکون چاہتی ہوں بس۔" جتنے مضبوط لہجے میں اس نے اپنی بات مکمل کی تھی صفدر صاحب کو اس سے ایسے کھرے پن کا گمان بھی نہیں تھا۔

"اور ہاں پاپا! پلیز آپ جاذب اور ہادیہ کی شادی کی تیاری شروع کردیں' میرا خیال ہے کہ اس نیک کام کو مزید موخر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"ہوں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

"اچھی بات ہے میں اب چلتی ہوں آپ آرام کرلیں۔" زندگی میں پہلی بار اس نے اتنی خود اعتمادی سے ان سے بات کی تھی کہ وہ جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ سکے تھے۔

ادھر میکال کی کلاس لگ رہی تھی۔

حسن صاحب اور مسز حسن دونوں ہی سخت شرمندگی محسوس کررہے تھے' صفدر صاحب اور ہادیہ کے جانے کے بعد وہ دونوں میکال کے کمرے میں چلے آئے تھے وہ جو بیڈ کی سائیڈ پر بیٹھا تھا انہیں دیکھتے ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"تمہارے پاپا تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں میکال!" مسز حسن ایک سنجیدہ نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے بولی تھیں' وہ سر جھکا گیا۔

"جی کہیے۔"

"کیا کہوں یہ...... کہ مجھے تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے شرم آرہی ہے یا پھر یہ کہ تم نے ساری عمر کے لیے مجھے حسن کے سامنے نظر اٹھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا پاپا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"جسٹ شٹ اپ! اگر میں صفدر کے سامنے نہیں بولا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے تمہارے جھوٹ پر یقین کرلیا ہے بہت اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہوں میں کہ تم نے کتنا دل دکھایا ہوگا اس بچی کا جو وہ وہاں جا کر بیٹھ گئی ہے۔ بہرحال مجھے اب اس ٹاپک پر تم سے کوئی بات نہیں کرنی' میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم ہانیہ بیٹی کے بارے میں کل تک کوئی فیصلہ کرلو مجھ میں مزید شرمندگی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔" غصے کی شدت سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا میکال خاموش بیٹھا رہا۔

اگلے روز صبح ابھی ہانیہ کی آنکھ کھلی تھی' جب اس کے سیل پر میکال کی کال آگئی' کئی بار نظر انداز کرنے کے بعد بالآخر اسے اس کی کال پک کرنی پڑی تھی۔

"السلام علیکم۔" اس کی خاموشی پر اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا تھا وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"وعلیکم السلام فرمایئے۔"

"ملنا چاہتا ہوں تم سے' کہاں ملوگی؟"

"کہیں بھی نہیں کیونکہ میں اب آپ سے ملنا نہیں چاہتی۔"

"مگر میں پھر بھی تم سے ملنا چاہتا ہوں' بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"معذرت اب ایسا کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔" میکال کی طرح اس کے لہجے میں بھی ٹھہراؤ تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اس نے کال کاٹ دی۔ اگلے بہت سے دن اس کے شدید مصروفیات کی نذر ہوگئے تھے۔ جاذب سے ریکوئسٹ کرکے اس نے آفس جانا بھی شروع کردیا تھا جب کہ ہادیہ اور جاذب کی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔

اس روز ایک فارنرز ڈیلی گیشن کے ساتھ میٹنگ کے دوران اس نے میکال کو دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ کمزور اور الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میٹنگ کے دوران بھی اس کی نظریں مسلسل ہانیہ کے چہرے کا طواف کرتی رہی تھیں۔ میٹنگ سے فراغت کے بعد وہ سیڑھیاں کراس کررہی تھی جب وہ ایک دم سے مقابل آ گیا تھا۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے ہانیہ! پلیز میری بات سنو۔"

"وقت نہیں ہے میرے پاس' سوری۔" چہرے پر چٹانوں سی سختی لیے اس نے سائیڈ سے نکلنا چاہا تھا' جب میکال نے برہم ہوتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میکال یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ اسے اپنے ساتھ زبردستی کھینچتے ہوئے گاڑی کی طرف لے آیا تھا جب وہ چلائی تھی۔ مگر اس نے پروا نہیں کی۔ سختی سے ہونٹ بھینچے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔ ہانیہ تلملا کر رہ گئی۔

اگلے پچیس منٹ کے بعد گاڑی ایک جھٹکے سے کسی ریستوران کے سامنے رکی تھی۔

"اترو۔" بنا اس کی طرف دیکھے اس نے انجن بند کرتے ہوئے حکم جاری کیا مگر ہانیہ اس کے حکم پر گاڑی سے نکل کر ریستوران کی جانب بڑھنے کی بجائے مخالف سمت کو چل پڑی تھی۔

"ہانیہ۔" وہ چلایا تھا مگر وہ بے نیازی سے آگے بڑھتی رہی۔ تبھی وہ لپک کر اس کے مقابل آیا تھا۔

"ہانیہ صفدر! اگر تم سمجھتی ہو کہ جس طرح زبردستی تم میری زندگی میں گھس آئی تھیں۔ اسی طرح زبردستی نکل بھی جاؤ گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔"

"اور تمہاری بھی بھول ہے میکال حسن کہ میں اب بھی تمہارے جیسے شخص کے ساتھ رہوں گی۔" سینے پر مضبوطی سے بازو باندھے وہ ایک پل کو رکی تھی۔ تبھی بارش کی پہلی بوند نے اس کے رخسار کو چھولیا۔ شام کے ڈھلتے لمحوں کے ساتھ زمین کی طرف لپکتی غیر متوقع بارش نے اسے حیران کیا تھا۔ عین اسی پل میکال کی نظریں بھی اوپر آسمان کی طرف اٹھی تھیں۔

"میں کسی بھول میں نہیں جیتا' مگر یہ طے ہے کہ تم میرے ساتھ رہوگی۔"

"ہرگز نہیں۔" اس کی بھوری روشن آنکھوں میں سردی سا دیکھتے ہوئے وہ رخ پھیر گئی تھی۔ تبھی وہ بولا تھا۔

"تو ٹھیک ہے آج نہ تم گھر جاؤ گی نہ میں جاؤں گا جب تک تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہ آ جائے۔"

"مگر کیوں میرا کیا تعلق ہے آپ سے' میں تو ایک بد

کروانا پسند یہ وہ رشتا ہوں آپ کے لیے آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ میں خود ہی آپ کی لائف سے نکل آئی اب آپ اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں۔"

"جیسی بھی ہو مگر میری ذمہ داری ہو فی الوقت میں ذہن میں کسی بات کو نہیں رکھنا چاہتا نہ ہی تمہیں یہ اختیار دوں گا کہ تم میری زندگی کے فیصلے کرو۔"

"کوئی شوق نہیں ہے مجھے آپ کی زندگی کے فیصلے کرنے کا بس میں اس شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی جس کی نظروں میں میری کوئی عزت نہ ہو۔" سر جھٹک کر کہتے ہوئے وہ پھر چل پڑی تھی۔ تبھی بارش میں ایک دم سے شدت آ گئی۔ ہانیہ کو ہمیشہ یہ موسم بے حد پسند ہونے کے باوجود اس موسم سے ڈر لگتا تھا۔ تبھی وہ پریشان ہوئی مگر میکال کے چہرے پر اطمینان تھا شاید ہانیہ کی پریشانی نے اسے ریلیکس کیا تھا۔

"اب بتاؤ چلنا ہے گھر کہ نہیں؟"

"نہیں۔" اس کی نظروں کے اطمینان سے خائف ہوتی وہ ادھر ادھر پناہ کے لیے نگاہیں دوڑانے لگی تھی۔ تبھی میکال نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"جب میں نے اپنے کہے ہر لفظ پر تم سے ایکسکیوز کرلیا ہے تو پھر یہ ناراضی کیوں؟"

"ہاتھ چھوڑو میرا۔"

"نہیں پہلے میرے سوال کا جواب دو۔"

"میں تمہارے کسی سوال کے جواب کی پابند نہیں ہوں۔"

"کرسکتا ہوں پابند' مگر فی الحال کروں گا نہیں۔" بے نیازی سے کہتے ہوئے اس نے ہانیہ کا ہاتھ زور سے دبایا تھا۔ جس پر وہ کراہ کر رہ گئی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی بارش نے دونوں کو بری طرح بھگو ڈالا تھا۔

"میکال.....!" وہ ابھی کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اپنے نام کی پکار پر چونک اٹھا۔ پلٹ کر سائیڈ پر دیکھا تو مسٹر اینڈ مسز رحیم دونوں گاڑی روکے مسکراتی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ مسز رحیم کا تعلق اس کے ننھیال سے تھا مگر وہ اس کے پاپا کے بہترین دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ میکال کا بچپن زیادہ انہی کے گھر انہی کی محبت میں گزرا تھا۔ بعدازاں مسٹر رحیم اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ ابیروڈ شفٹ ہوگئے تو اس کا رابطہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ تاہم وہ دیار غیر سے بھی میکال کے لیے قیمتی تحائف اور چیزیں بھجواتے رہتے تھے۔

انیس سال بعد دوبارہ وطن واپسی پر ان کا تعلق میکال سے پھر بحال ہوگیا تھا۔ مسز رحیم کی خواہش وفرمائش پر وہ انہیں "آپا" کہہ کر بلاتا تھا۔ ویسے بھی وہ رحیم صاحب سے کئی سال چھوٹی تھیں۔ میکال جب بھی بہت خوش یا ٹینس ہوتا تو رحیم صاحب کا گھر ہی اس کی جائے پناہ ہوتا تھا۔ کیونکہ ان کے بچے اب ان کے ساتھ نہیں تھے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ دونوں میکال کو سڑک کے وسط میں بارش میں بھیگتا دیکھ کر رک گئے تھے۔ میکال ان کی پکار پر سر سے پانی جھاڑتا ہانیہ کو ساتھ کھینچتے ہوئے فوراً ان کی طرف لپکا تھا۔

"السلام علیکم! ایسے برساتی موسم میں آپ گھر سے باہر کیا کررہے ہیں۔"

"وعلیکم السلام وہی جو تم کررہے ہو۔" مسز رحیم ادھار رکھنے کے قائل نہیں تھے وہ مسکرادیا۔

"یہ میری وائف ہیں ہانیہ۔"

"ماشاءاللہ بہت پیاری بچی ہے' گن پوائنٹ پر تو نکاح نہیں کروایا نا؟" اب مسز رحیم اسے شرارتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چھیڑ رہی تھیں۔ وہ پھر مسکرادیا۔

"یہی سمجھ لیں۔"

"تم سے یہی امید تھی' یہاں روڈ پر اتنی تیز بارش میں کیا کررہے ہو؟"

"موسم کو انجوائے کررہے ہیں ہانیہ کو بارش بہت پسند ہے۔"

"پسند کے بچے بیمار کرڈالو گے اسے چلو ہماری گاڑی میں گھر چل کر کافی پیتے ہیں۔"

"گڈ آئیڈیا! آپ لوگ چلیں میں پیچھے آتا ہوں گاڑی ہے میرے پاس۔"

"چلو ٹھیک ہے بیسٹ آف لک۔" مسز رحیم اسے

انگوٹھا دکھاتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ تبھی وہ پیچھے پلٹا تھا۔

"کیا خیال ہے چلوگی مسز رحیم کے گھر؟"

"ہرگز نہیں۔"

"چلنا تو پڑے گا کیونکہ وہ اتنے پیار اور مان سے آفر کر کے گئے ہیں تم آن۔"

"مسٹر میکال میں تمہاری ملازمہ نہیں ہوں۔" اس کی ہٹ دھرمی پر ہانیہ نے پاؤں پٹخے تھے جب وہ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"جانتا ہوں باور کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ملازمین کو اپنے ساتھ گھسیٹے نہیں پھرتا میں۔" بے نیازی ہی بے نیازی تھی۔

وہ ہاتھ چھڑواتی رہ گئی مگر میکال نے اسے فرنٹ سیٹ پر دھکیل کر ہی دم لیا۔ اگلے بیس منٹ میں وہ لوگ رحیم صاحب کے گھر تھے۔ میکال رحیم صاحب کے ساتھ بغل گیر ہونے کے بعد ان کے ساتھ باتوں میں لگ گیا تھا۔ جب وہ مسز رحیم کے ساتھ اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔

"کیا بات ہے ہانیہ کیا میکال کے ساتھ تمہارا کوئی جھگڑا چل رہا ہے؟" تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مسز رحیم اصل موضوع کی طرف آ گئی تھیں۔ ہانیہ چونک اٹھی۔

"نہیں تو آپ سے کس نے کہا؟"

"میکال کی آنکھوں نے۔ اصل میں ہم دونوں میاں بیوی کو وہ بہت عزیز رہا ہے۔ بدقسمتی سے اس کی شادی پر ہم یہاں نہیں تھے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہم سے دور ہو گیا ہو اس کی زندگی کا کوئی بھی دکھ یا خوشی ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔"

"گڈ پھر تو آپ کو عائشہ اذہان کے بارے میں بھی سب پتا ہوگا۔"

"ہوں سب پتا ہے مجھے مگر یہ حقیقت ہے ہانیہ مرد کسی عورت پر خواہ جان ہی کیوں نہ لٹاتا ہو مگر اس کی زندگی میں جو اہمیت اس کی بیوی کی ہوتی ہے وہ کبھی کسی عورت کی نہیں ہو سکتی۔ جو عورت مقدس بندھن میں بندھ کر مرد کے ساتھ بستر شیئر کرتی ہے اس کے بچوں کو جنم دیتی ہے وہ اسی کے ساتھ جڑ کر رہ جاتا ہے۔ پھر باقی ساری عورتیں محض ادھوری کہانیاں بن کر رہ جاتی ہیں۔"

"مگر آپ یہ سب کیسے کہہ سکتی ہیں؟" بہت کڑا سوال کیا تھا اس نے مسز رحیم بے ساختہ نظریں چرا کر رہ گئیں۔

"مجھے عملی زندگی میں اس کا تجربہ ہے ہانیہ کیونکہ وہ شخص جس کی سانسیں صرف میری امانت تھیں۔ مجبوراً شادی کے بندھن میں بندھ کر محض دو سال کے بعد ہی میری زندگی سے نکل گیا۔ اس نے مجھ سے جو کہا ہانیہ وہ غلط تھا۔ وہ عورت جو اس کی بیوی بن گئی تھی اسے وہی عورت چاہیے تھی۔ میرے بغیر ایک پل نہ جینے کا دعویٰ کرنے والا مجھ سے ہی کہہ رہا تھا کہ وہ اللہ کے فیصلے پر سرخرو ہے۔ اس نے سوچا ہی نہیں کہ میں جو اس کا جوگ لے کر بیٹھی ہوں میرے دل پر اس کے الفاظ کسی اور کے لیے اس کی خوشی کیسی قیامت ڈھا رہی ہوگی۔" بولتے بولتے ان کا لہجہ بھر آیا تھا ہانیہ کو بے حد افسوس ہوا۔

"مرد کے لیے جسم کی راحت دل کی راحت سے بڑھ کر اہم ہے ہانیہ بھلے سب مرد ایسے نہ ہوں مگر اکثریت ایسی ہی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ مسٹر رحیم کے ساتھ خوش نہیں ہیں۔"

"نہیں ایسی بات نہیں رحیم صاحب بہت اچھے انسان ہیں میں ان کی محبت اور رفاقت پر جتنا ناز کروں کم ہے مگر...... بس دل کا ایک کونا ہے جو کسی صورت آباد نہیں ہوتا۔" چالیس کے لپیٹے میں آ کر بھی وہ عورت محبت کے زخم نہیں بھول پائی تھی۔ ہانیہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہ گئی تبھی وہ مسکرائی تھیں۔

"میں بھی کیا دکھڑے لے کر بیٹھ گئی۔ میکال سوچ رہا ہوگا پتا نہیں میں اس کی بیوی کو کیا پٹیاں پڑھا رہی ہوں۔"

"بالکل میں یہی سوچ رہا تھا اسی لیے اٹھ کر چلا آیا تھا پرفیکٹ سوچ ہے آپ کی میرے بارے میں۔" فوراً سے پیشتر ہی وہ کچن کے دروازے پر نمودار ہو گیا تھا۔ تبھی وہ

کھلکھلا اٹھی تھیں۔

"شیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر۔"

"جی ہاں اپنے گھر بلا کر تو اب آپ کچھ بھی کہہ سکتی ہیں۔" ہانیہ کے کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر کھڑے ہوتے اس نے منہ بنایا تھا۔ وہ ہنس پڑی تھی۔

"اگر آپ فیور دیں تو میں گھر کال کرنا چاہوں گی مسز رحیم میں پاپا کو بتا کر نہیں آئی۔"

"میں نے بتا دیا ہے پاپا کو تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ شخص اسے زچ کرنے کی قسم کھائے ہوئے تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی باہر بارش قدرے تھم چکی تھی۔ مسز رحیم نے فوری کھانا لگا دیا۔

"آپ کھانا بہت اچھا بناتی ہیں مسز رحیم۔" چکن بریانی کا ایک چمچ ہی منہ میں ڈالتے ہوئے اسے ذائقے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ میکال کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"شکریہ ہانیہ میں چاہوں گی کہ تم اور میکال ہر ویک اینڈ پر ہمیں ڈنر کرو ہمارے ساتھ۔"

"کیوں نہیں آپا آپ اتنے پیار سے آفر کر رہی ہیں میں بالکل انکار نہیں کروں گا۔"

"اور ہانیہ؟"

"ہانیہ بھی آئے گی آپ فکر نہ کریں۔" بے حد ریلیکس موڈ میں کہتے ہوئے اس نے اپنی پلیٹ سے چکن پیس اٹھا کر ہانیہ کی پلیٹ میں ڈال دیا تھا وہ بے بس سی دیکھتی رہ گئی۔

اگلے بیس منٹ کے بعد وہ لوگ وہاں سے اٹھ آئے تھے۔ بارش مکمل طور پر تھم چکی تھی۔ مگر سرد ہواؤں کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ وہ کپکپا اٹھی۔

"مسٹر اینڈ مسز رحیم سے مل کر کیسا لگا؟" فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ وہ سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتی اندر بیٹھ گئی۔

"اچھے لوگ ہیں۔"

"صرف اچھے نہیں بہت اچھے لوگ ہیں۔ کم از کم تمہارے قریبی لوگوں سے تو بہت اچھے جنہیں کسی کی عزت نفس کا پاس رکھنا بھی نہیں آتا۔"

"آپ کو آتا ہے کسی کی عزت نفس کا پاس رکھنا؟" وہ ابھی سیٹ پر آ بیٹھا تھا جب وہ کٹیلے لہجے میں بولی۔ میکال سر جھٹک کر رہ گیا۔

"میں معذرت کر چکا ہوں۔"

"معذرت کرنے سے کسی کی عزت واپس آ جاتی ہے؟" اس کے لہجے کی کاٹ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا میکال لب بھینچ کر رہ گیا۔

"میں اس وقت تم سے جھگڑا کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں ہانیہ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس رشتے کو قبول کر لو بالکل ویسے ہی جیسے میں قبول کر چکا ہوں۔"

"کوئی زبردستی ہے؟"

"نہیں ریکویسٹ ہے کل شام کی فلائیٹ سے انگلینڈ جا رہا ہوں پتا نہیں کب واپسی ہو میں نے بہت ساری اسٹوریز میں پڑھا ہے اکثر ہیروز باہر جاتے ہیں تو پھر واپس ہی نہیں آتے۔ اسی لیے میں نے سوچا تم سے معافی مانگ لوں۔ پتا نہیں واپس آنا نصیب ہو کہ نہیں۔"

"مسٹر میکال میں اس طرح کی جذباتی بلیک میلنگ میں آنے والی نہیں ہوں۔"

"چلو مت آؤ یہ بتاؤ واپسی پر کیا گفٹ لے کر آؤں تمہارے لیے؟"

"کیوں لے کر آئیں گے گفٹ آپ میرے لیے؟ میں کوئی مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی ہوں جس کو گفٹ کا لالچ ہوگا اور یہ دو ہی روز میں آپ کی کایا پلٹ کیسے ہو گئی آپ تو میری شکل تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے کل تک آج یہ عنایت کیوں؟"

"پتا نہیں۔" بے نیازی سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے پھر سر جھٹکا تھا۔ ہانیہ جی جان سے جل کر رہ گئی۔ دیر تک بارش میں کھڑے رہنے کے باعث دونوں کے کپڑے بے حال بھیگے ہوئے تھے مگر دونوں نے ہی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس لیے قدرے بچت ہو گئی تھی ہانیہ رخ پھیرے بیٹھی تھی جب میکال نے شرارت سے گاڑی اپنے گھر والے روڈ پر ڈال دی۔ ہانیہ کو جانے پہچانے راستوں

کا احساس ہوا تو اس نے فوراً میکال کے اسٹیئرنگ پر دھرے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے آپ مجھے زبردستی اپنے گھر نہیں لے جاسکتے۔"

"کیوں؟ جو زبردستی شادی کرواسکتا ہے وہ گھر بھی لے جاسکتا ہے ویسے بھی اس وقت میں تمہاری فیملی کے کسی فرد کے منہ لگنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں صبح نہال کے ساتھ چلی جانا ادھر۔"

"ہرگز نہیں آپ مجھے میرے گھر ڈراپ کریں پلیز۔"

"یہ تو ممکن نہیں ہے ابھی سوری۔" وہ اسے زچ کرنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ہانیہ کٹ کر رہ گئی۔ مارے بے بسی کے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ شخص آخر اس کے ساتھ یہ سب کر کیوں رہا تھا۔ وہ تو اس سے نفرت کرتا تھا اس کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ پھر اب کیا ہوا تھا۔

یہ احساس ندامت تھا یا کچھ اور؟ جتنا وہ اس بارے میں سوچتی جارہی تھی الجھتی جارہی تھی۔ اگلے چند لمحوں میں گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تھی۔ ہانیہ بجھے دل کے ساتھ اندر آئی تو سامنے خالی پڑا لاؤنج اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ تب قدرے حیرانی کے ساتھ شکر ادا کرتی وہ فوراً اوپر اپنے بیڈ روم میں چلی آئی تھی۔ شاید شدید سردی نے اس گھر کے مکینوں کو بھی جلدی اپنے کمروں میں دبک جانے پر مجبور کردیا تھا۔

اپنے بیڈ روم میں آنے کے بعد اس نے کپڑے تبدیل کیے اور پھر فوراً گرم کمبل میں گھس کر سوگئی تھی۔ میکال نے اگر اس کے گھر والوں کو انفارم نہیں کیا تھا تو یقیناً وہ لوگ پریشان ہوسکتے تھے۔ اسی سوچ کے پیش نظر اس نے فوراً لینڈ لائن نمبر سے اپنے گھر کا نمبر پریس کیا تھا۔ دوسری جانب فون اس کے پاپا نے ہی ریسیو کیا تھا۔

"اسلام علیکم پاپا۔"

"وعلیکم السلام اب کیسی طبیعت ہے بھابی کی میکال بتا رہا تھا وہ ٹھیک نہیں ہیں۔"

"جی جی اسی لیے میں ادھر آگئی تھی۔ اب وہ ٹھیک ہیں آپ پریشان مت ہوں۔"

"چلو شکر ہے مالک کا میں کل چکر لگاؤں گا ادھر کا تمہیں وہاں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے نا؟"

"نہیں سب ٹھیک ہے میں اب فون رکھتی ہوں خدا حافظ۔" وہ صفدر صاحب سے زیادہ فرینک نہیں تھی۔ ہمیشہ مختصر بات کرتی تھی۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ یقیناً میکال نے اپنی ماں کی ناسازی طبیعت کا بہانہ بنا کر اسے وہاں لانے کا عذر پیش کیا تھا۔ وہ بے مقصد ہی اسے سوچے گئی یونہی سوچتے سوچتے جانے کب آنکھ لگ گئی۔

میکال کمرے میں آیا تو وہ گرم کمبل میں دبک کر پرسکون نیند سو رہی تھی۔ وہ اچٹتی سی ایک نظر اس پر ڈالتا واش روم میں گھس گیا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس نے برش کیا اور ہانیہ کے پہلو میں آکر ٹک گیا۔ رات دھیرے دھیرے آگے سرکتی جارہی تھی۔ اس نے یونہی ٹی وی آن کرلیا۔ مگر کچھ منٹ کے بعد ہی دل اچاٹ ہوگیا تو اسے بھی آف کردیا۔ ہانیہ اتفاق سے اسی کی طرف کروٹ لیے سو رہی تھی۔ وہ دائیں ہاتھ پر سر ٹکا کر فرصت سے اسے دیکھے گیا۔ خوب صورت گوری کلائی میں پڑی گہرے نیلے رنگ کی کانچ کی چوڑیاں اس کا دل مٹھی میں جکڑ گئی تھیں۔

یونہی ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کی کلائی میں پڑی چوڑیوں کو چھوا تھا۔ پہلی بار زندگی میں کوئی کھنک اسے بے حد بھلی لگی تھی۔ چوڑیوں پر دل پھسلا تو طلب مزید بڑھتی گئی۔ بازو پر پھسلتا ہاتھ اس کے شفاف چہرے پر آرکا تھا۔ شہادت کی انگلی سے اس کے خوب صورت چہرے کے ایک ایک نقوش کو چھوتے ہوئے اس کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ سانسیں بھی تیز ہوئی تھیں۔ ہانیہ اس کی قربت پر ذرا سی کسمسائی تھی۔ تبھی اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کیا تھا۔

"ہانیہ۔"

قطعی بے خودی کے عالم میں مدہوش ہوتے ہوئے جانے کیوں وہ اسے پکار بیٹھا تھا۔ تبھی اسی پل ہانیہ کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اسے پیچھے ہٹانا چاہتی تھی مگر میکال کی تیز

ہوتی گرم سانسوں نے اسے بے بس کر کے رکھ دیا۔ ہانیہ اس کے گریز کو کوئی اہمیت دیے اس نے اس کے دونوں ہاتھ اوپر کر کے اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اپنا روم چھوڑ کر اس کے کمرے میں کیوں آیا تھا۔ ہانیہ نے اس کی طبیعت صاف کرنے کا دعویٰ کر کے آخر ایسا کیا کہا تھا اس سے کہ وہ یکسر تبدیل ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ اس کی گرفت سے نکلنا چاہتی تھی مگر وہ ایسا کوئی موقع دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ نہایت نرمی اور اپنائیت سے وہ یوں اس پر چھایا کہ وہ احتجاج بھی نہیں کرسکی تھی۔ گرم سانسوں نے اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ہی مفلوج کر ڈالی تھیں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے سامنے یوں کمزور پڑ جائے گی۔ ہانیہ کو لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم سے جان نکلتی جارہی ہو۔ کسی شکستہ سپہ سالار کی طرح اس نے اپنا آپ نہایت آسانی سے اس کے سپرد کردیا تھا۔ وہ اس سے محبت کی دعوے دار نہیں تھی مگر پھر بھی اس وقت اس کی قربت نے اسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔

صبح ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی جب وہ بستر سے نکل گئی تھی۔ بے ترتیب ہوتی سانسوں اور بے جان ہوتے جسم نے اسے لڑکھڑانے پر مجبور کردیا تھا۔ میکال نے اٹھ کر اسے سہارا دینا چاہا مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی فوراً کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ اگلے پون گھنٹے میں جس وقت وہ فریش ہوکر نیچے لاؤنج میں آئی چائے پیتے ہوئے نہال نے اسے خاصے اچنبھے سے دیکھا۔

"ارے...... تم کب آئیں؟"

"رات کو۔ انکل لوگ نظر نہیں آرہے؟"

"کیسے نظر آسکتے ہیں آؤٹ آف سٹی ہیں دونوں۔ آج وہ سہ پہر یا شام تک آئیں گے تم رات کس کے ساتھ آئیں میکال بھائی کے ساتھ؟"

"ہوں۔" اس کے مقابل صوفے پر ٹکتے ہوئے وہ سر جھکا گئی تھی۔ نہال اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"ہادیہ بتا رہی تھی کہ تمہارا کلیش ہوا ہے میکال بھیا کے ساتھ مجھے کیوں نہیں بتایا تم نے؟"

"کیوں بتاتی میں تمہیں ویسے بھی تم شہر میں نہیں تھے۔"

"شہر میں نہیں تھا تو کیا ہوا دنیا میں تو تھا نا اتنی بڑی بات ہوگئی اور تم نے مجھ سے شیئر تک کرنا گوارا نہیں کیا کیوں؟" وہ گلہ کر رہا تھا ہانیہ رخ پھیر گئی۔

"میں اس وقت تم سے جھگڑے کے موڈ میں نہیں ہوں نہال اگر تم فری ہو تو پلیز مجھے گھر چھوڑ دو۔"

"اتنی صبح؟"

"ہوں۔"

"تو پھر آئیں کیوں تھیں رات؟"

"اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی زبردستی لے کر آئے تھے وہ مجھے۔"

"مگر کیوں؟"

"انہی سے پوچھنا کیوں، مجھے نہیں پتا اتر گیا ہوگا سر سے عاشقی کی محبت کا بھوت۔"

"چلو یہ تو اچھی بات ہے میں نے ناشتا نہیں کیا پلیز ناشتا بنادو پھر چھوڑ آتا ہوں۔"

"خود بنالو اٹھ کر میرا موڈ نہیں ہے۔" وہ جلد از جلد وہاں سے فرار چاہ رہی تھی۔ میکال حسن سے دوبارہ سامنے کا تصور ہی اس کی جان پر بنا رہا تھا۔ کتنی نفرت اور غرور سے اس نے اسے دھتکارا تھا۔ کتنے اعتماد سے اس نے کہا تھا کہ وہ اس پر اور اس کی رفاقت پر لعنت بھیجتی ہے۔ وہ بھی ہزار بار مگر صرف ایک بار میں ہی وہ کتنی کمزور پڑ گئی تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ تھپڑ مار مار کر اپنا چہرہ سرخ کرلیتی۔

"تم میکال بھائی کا غصہ مجھ پر کیوں نکال رہی ہو؟"

"کیوں میں نے تمہیں کیا کہا ہے اگر تم اس وقت مجھے چھوڑ کر نہیں آسکتے تو ٹھیک ہے میں خود ہی چلی جاتی ہوں۔"

"چپ کرو آئی بڑی خود جانے والی۔"

"نہال۔" اسے ڈپٹ کر وہ ابھی اٹھا ہی تھا کہ میکال نے اسے پکار لیا۔ بلیک پینٹ شرٹ میں ملبوس وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔

"جی بھائی۔" اس کی پکار پر نہال فوراً پلٹا تھا۔

"میں بانیہ کو چھوڑ کر آتا ہوں تم ناشتا کر کے آفس پہنچو کچھ ڈسکس کرنا ہے تم سے۔" کف فولڈ کرتے ہوئے وہ بے دھیانی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ بانیہ کو لگا اس کے سر پر منوں بوجھ آ پڑا ہو۔

"جی ٹھیک ہے۔" نہال کی فرمانبرداری عروج پر تھی۔ وہ کڑھ کر رہ گئی۔

"چلو۔" اگلے ہی پل وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ بانیہ سے سر اٹھانا دشوار ہو گیا۔ گاڑی میں میکال کے ملبوس سے اٹھنے والی پرفیوم کی دلفریب خوش بو نے اسے خوامخواہ مضطرب کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔

"میں نے سنا ہے بادیہ اور جاذب کی شادی ہو رہی ہے کیا سچ ہے؟" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بالآخر اسی نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

"پتا نہیں۔"

"تمہیں نہیں پتا تو پھر کسے پتا ہے؟"

"میکال حسن میں اس وقت آپ سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" وہ اس کے سوال برائے سوال پر چڑ گئی تھی۔ میکال نے لب بھینچ لیے۔

"او کے۔" گہری سانس بھر کر کہتے ہی اس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی۔ باقی کا سارا سفر خاموشی کی نذر ہو گیا تھا اگلے چالیس منٹ کے بعد وہ اپنے گھر پر تھی اور میکال بڑے ہال میں بیٹھا صفدر صاحب اور جاذب کے ساتھ گپیں لگا رہا تھا۔

"دیکھا یہ ہوتی ہے مردوں کی خاصیت جتنا مرضی کسی مرد کو دوسرے مرد کے خلاف اکسا دو مجال ہے جو ان میں تو تو میں میں ہو جائے اور ایک ہم عورتیں ہیں کہ ذرا کسی سے کوئی بات پتا چلی نہیں اور ہماری جنگیں شروع ہوئی نہیں۔" بادیہ کچن میں تھی۔ بانیہ اس کی مدد کے لیے آئی تو وہ ایک نظر ہال میں بیٹھے میکال پر ڈالتے ہوئے بول اٹھی۔ اس کی تقلید میں بانیہ نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ عین اسی پل کسی بات پر سر اٹھاتے ہوئے میکال کی نظر بھی اس پر پڑی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور ایک پل کے لیے جیسے دونوں ہی عجیب سے سحر میں جکڑے گئے۔

"بانیہ۔" بادیہ نے اسے پکارا تھا وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

"ہوں۔"

"کدھر دھیان ہے تمہارا میں تم سے ناشتے کا پوچھ رہی ہوں اور تم ہو کہ جواب ہی نہیں دے رہی ہو۔"

"بس سوری مجھے دھیان نہیں رہا تھا کیا پوچھا ہے تم نے؟"

"پاگل لڑکی میں پوچھ رہی تھی کہ میکال بھائی ناشتا کر گئے ہیں یا نہیں۔ میں ان کا ناشتا بھی ساتھ ہی تیار کر رہی ہوں۔"

"ہاں کر دو میرے خیال میں وہ یہیں ناشتا کریں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے میں ناشتا بناتی ہوں تم ذرا یہ چیزیں ٹیبل پر سیٹ کر دو آنی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔"

"سوری بادیہ میری بھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تم ملازمہ کو ساتھ لگا لو۔ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں سونے کے لیے سوری کین۔" بادیہ کی ریکویسٹ پر صاف جواب دیتی وہ فوراً کچن سے نکل آئی تھی۔ اس وقت جو اس کا حال تھا اس حال میں ریسٹ کرنا واقعی اس کے لیے بہت ضروری ہو گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

کہانیاں اب بدل گئی ہیں
نہ اب وہ آنکھیں کہ جن میں خوابوں کے سارے موسم
گلاب موسم بنے ہوئے تھے
نہ اب وہ شامیں کہ جن میں تیری حسین باتیں
رفیق لگتی تھیں ذہن و دل کو
وہ سارے منظر بدل گئے ہیں
نہ وصل کا کوئی خواب باقی
نہ اب وہ حرف سخن رہا ہے
کہانیاں اب بدل گئی ہیں
تمہارے جانے کے بعد یوں بھی
جو خواب آنکھوں میں چاہتوں کا یقین بن کر ٹھہر گئے تھے

وہ خواب سارے بکھر گئے ہیں
ملال دل میں اتر گئے ہیں
نہ زندگی ہے نہ زندگی میں وصال موسم کی چاہ کوئی
نہ شاعری ہے نہ شاعری میں جو دکھ ہے اس سے پناہ کوئی
جو سچ تھا اب جھوٹ ہوگیا ہے
جو دن میں سورج بنا ہوا تھا
وہ شب کی تاریک وادیوں میں ہی کھوگیا ہے
کہانیاں اب بدل گئی ہیں......

"ارتج......؟" گاڑی کی ہیڈ لائٹس وجود پر پڑتے ہی وہ زخموں کی پروا کیے بغیر اٹھی تھی اور فوراً ارتج کی گاڑی پر جھک آئی تھی مگر وہ شخص اس وقت شدید نشے میں تھا۔ تبھی گاڑی کا انجن بند کرنے کے بعد خاموش بیٹھا اجنبی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

"ارتج...... جمال کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ خدا کی قسم مجھے نہیں پتا تھا وہ کب گھر سے نکلا پلیز میری مدد کرواؤ امی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے تم انہیں سمجھاؤ پلیز۔" کھڑکی کے شیشے پر جھکی ہوئی وہ کسی بھکارن کی طرح اس کی منت کررہی تھی مگر وہ جیسے کچھ بھی سننے اور سمجھنے سے قاصر دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی دروازہ کھول کر خاموشی سے اندر کی طرف بڑھ گیا پیچھے عائشہ سسکتی رہ گئی تھی۔ گھر کے اندر جیسے کہرام مچا تھا۔ جمال کے ایکسیڈنٹ کی نوعیت شدید تھی۔ وہ زخموں کی تاب نہیں لا سکا تھا۔ ارتج کا نشہ ایک پل میں اڑن چھو ہوگیا۔ وہ رات اس گھر کے تمام مکینوں کے لیے رت جگے کی رات تھی۔

اگلے روز فقط پچیس سال کی عمر میں عائشہ اذہان پر بیوگی کا داغ لگ گیا تھا۔ گھر کے ایک کونے میں وہ بکھری بیٹھی وہ ہر آنے والے سے جانے کیسے کیسے جملے سنتی رہی تھی۔ اس پر اس کی ساس اور نند نے بھی بیٹے کا ماتم کرنے کی بجائے اسے کوسا تھا۔ اس روز وہ جان پائی تھی کہ پاگل ہی سہی مگر اس کا شوہر اس کے لیے کتنی بڑی عافیت تھا۔ جمال کی موت کا تیسرا دن تھا جب اس کی ساس اس کے کمرے میں چلی آئی۔

"چل نکل یہاں سے دفع ہوجا۔" عائشہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی تبھی بوکھلا کر رہ گئی۔

"کک کہاں نکل جاؤں میرا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔"

"کوئی ٹھکانہ نہیں تو جاکر کسی کوٹھے پر بیٹھ جا منحوس عورت ایک بیٹا تو کھا گئی میرا کیا دوسرا بھی تیرے حوالے کردوں؟" اس بار اس کی ساس نے اس کے چہرے پر دو تھپڑ رسید کیے تھے۔ وہ منہ کے بل سائیڈ پر جاگری۔

"میرا کیا قصور ہے اس میں میں نے تو نہیں مارا ان کو۔"

"چپ کر بے غیرت زبان چلاتی ہے آگے سے؟" دو تھپڑ اور لگے تھے تبھی ارتج کمرے میں چلا آیا۔

"امی یہ کیا کررہی ہیں آپ؟ پتا بھی ہے کہ وہ عدت میں ہے اس سے پہلے اس گھر سے نہیں جاسکتی۔ پھر بھی آپ اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔"

"ارے بھاڑ میں گئی اس کی عدت میں اس منحوس لڑکی کو ایک منٹ بھی اس گھر میں برداشت نہیں کرسکتی۔"

"تو ٹھیک ہے آپ دبئی چلی جائیں کمال بھائی کے پاس جب اس کی عدت پوری ہوجائے تب آجایئے گا۔"

"ہاں تم تو یہی چاہتے ہو میں چلی جاؤں اور تمہیں اس کے ساتھ گل چھرے اڑانے کا موقع مل جائے۔"

"میں گل چھروں کا ترسا ہوا نہیں ہوں اپنی محبت ہے میری، منگیتر ہے اسی کے ساتھ کروں گا جو کرنا ہوا اپنے بھائی کے جھوٹے پر آنکھ نہیں رکھی میں نے۔" پہلی بار وہ حلق کے بل چلایا تھا۔ عائشہ کا دل چاہا کاش زمین پھٹے اور وہ اس میں سماجائے۔

"کیوں بھول رہی ہیں آپ کہ اسی لڑکی کے بھائی کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کیے ہوئے ہیں آپ۔ اگر اسے اس حالت میں گھر سے نکال دیں گی تو وہ آپ کی بیٹی لیں گے؟"

"میری بیٹی کو رشتوں کی کمی نہیں ہے۔"

"پتا ہے مجھے جتنی لائنیں لگی ہوئی ہیں رشتے کے لیے۔" تلخی سے سر جھٹکتے ہوئے اس نے عائشہ پر نگاہ ڈالی تھی۔

"آپ جائیں اپنے کمرے میں جب تک میں اس

گھر میں ہوں آپ کو کوئی نہیں نکال سکتا۔" عائشہ کی سماعتیں جیسے انہی الفاظ کی منتظر تھیں۔ ممنون نگاہوں سے ارتج کو دیکھتی وہ فوراً منظر سے ہٹ گئی تھی۔

اگلے چار ماہ اس نے جیسے کسی دوزخ میں بسر کیے تھے۔ اس کی ماں بیٹے کے پاس دبئی جابسی تھیں۔ بہن نے بھی بھول کر بھی اس کے گھر کا رخ نہیں کیا۔ جبکہ میکال کو اس نے خود منع کردیا تھا کسی بھی قسم کا رابطہ رکھنے کے لیے۔ گزرے چار ماہ میں ارتج سے بھی بہت کم سامنا ہوا تھا اس کا۔ بس ایک چار دیواری تھی اور اس میں جہنم کے داروغہ کا کردار ادا کرتی اس کی ساس اور نند۔

گزرے چار ماہ میں وہ رنگوں کو ترس کر رہ گئی تھی۔ اس کی ساس نے اس کے جہیز اور بری کے سارے کپڑے اٹھا کر لاک اپ میں رکھ دیے تھے۔ میک اپ تو اس نے پہلے بھی کبھی نہیں کیا تھا اور جیولری سے وہ ازل سے ہی محروم تھی۔ صبح سے رات تک کولہو کے بیل کی مانند وہ گھر کے کام میں جتی رہتی تھی۔ مگر کھانے کے وقت ہر روز اس کی ساس کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ایسا ڈرامہ کرتی کہ اس سے ایک نوالہ نگلنا بھی مشکل ہوجاتا تھا۔ جس روز گھر میں کوئی اچھی چیز پکتی اس روز اسے بھوکا ہی سونا پڑتا تھا۔ کیونکہ اس کی ساس اس روز خود کھانا تقسیم کرتی تھی۔ بچ جانے والا کھانا اٹھا کر فریج میں لاک کردیتی۔ بات بات پر ہندو عورتوں کی طرح اسے بیوہ ہونے کا احساس دلایا جاتا۔ ایک طرح سے وہ ہر قسم کی خوشی کے لیے ترس کر رہ گئی تھی۔ محض چار ماہ میں اس کی رہی سہی صحت بھی ڈھانچے میں تبدیل ہوکر رہ گئی تھی۔

اس کی عدت کے دن پورے ہوچکے تھے۔ ادھر اس کی عدت پوری ہوئی اور ادھر گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ عائشہ جو پہلے ہی گھر کے کاموں میں ہلکان تھی۔ مزید مشین بن کر رہ گئی۔ ایک روز وہ ارتج کے ساتھ مارکیٹ آئی تھی اس کی نند بھی ساتھ تھی تبھی وہ پوچھ بیٹھا تھا۔

"آپ نے شادی کے لیے اپنی شاپنگ مکمل کرلی؟" قطعی غیر متوقع سوال پر اس نے احمقوں کی طرح سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی اس کی نند بول پڑی تھی۔

"بھابی کو شاپنگ کی ضرورت نہیں ہے ہمارے گھروں میں بیوہ عورت سنگھار نہیں کرتی ویسے بھی ان کی شاپنگ ادھر دبئی میں ان کی امی کررہی ہیں۔"

"تم چپ رہو تمیرا میں نے جس سے سوال پوچھا ہے وہی جواب دے گی۔" پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے اس نے اسے ڈپٹا تھا۔ جواباً وہ منہ بنا کر رخ پھیر گئی۔

"چلو تم گاڑی میں بیٹھو تمہاری شاپنگ مکمل ہوگئی ہے اور آپ میرے ساتھ آئیں پلیز۔" اپنی بہن کو گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دے کر وہ عائشہ کو اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ عائشہ ڈر رہی تھی کہ پتا نہیں اب اس کے ساتھ کیا ہوگا؟

وہ حیران تھی کہ اس کے لیے شاپنگ بھی وہ خود ہی کررہا تھا۔ اپنی پسند کے دیدہ زیب ملبوسات، جیولری، جوتے، چوڑیاں جانے کیا کیا خرید رہا تھا وہ اس کے لیے ابھی وہ شاپنگ کر ہی رہا تھا کہ ایک نازک سی خوب صورت لڑکی ان کی طرف چلی آئی ارتج کے چہرے پر اسے دیکھتے ہی سکون آمیز مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"مجھ سے تو کہہ رہے تھے آفس میں کام ہے اور یہاں پتا نہیں کس کو شاپنگ کروا رہے ہو۔" قریب آتے ہی اس نے ارتج کے بازو پر مکا رسید کیا تھا جواباً وہ مسکرایا۔

"چڑیل یہ بھابی ہے میری پچھلے دنوں جس بھائی کی ڈیتھ ہوئی تھی ان کی مسز ہیں۔"

"او...... اچھا سوری کیسی ہیں بھابی؟"

"جی میں ٹھیک الحمدللہ۔" عائشہ خواہ مخواہ کنفیوژ ہوئی تھی تبھی وہ بولی۔

"میرا نام عائلہ ہے میں اور ارتج ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں یہ دیکھیں پچھلے دنوں اس نے مجھے رنگ بھی پہنائی ہے ان شاءاللہ عنقریب ہی ہم بھی شادی کررہے ہیں۔" موٹی گڑیا سی وہ لڑکی بے حد خوش دکھائی دے رہی تھی۔

عائشہ نے دل ہی دل میں ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔

واپسی کے سفر میں عائلہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ ارتج نے اسے بھی بصد اصرار شاپنگ کروائی تھی۔ اپنا گھر آنے

تک وہ پورے راستے چہکتی رہی تھی۔ حمیرا منہ بنائے بیٹھی رہی۔ جس وقت وہ لوگ گھر پہنچے گویا ایک طوفان ان کا منتظر تھا۔ گھر پہنچتے ہی حمیرا نے ماں کو شکایت جڑ دی اور پھر اریج تو نکل گیا مگر عائشہ کی شامت آ گئی۔ اگلے روز اس کا منہ بری طرح سوجا ہوا تھا اریج نے دیکھا تو ششدر رہ گیا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ محض تھوڑی سی شاپنگ پر اس کی ماں اس لڑکی کا ایسا حال کرے گی۔ پوری رات وہ سگریٹ پھونکتا رہا تھا اور سوچتا رہا تھا۔ کیا ملا تھا اس لڑکی کو اس گھر میں آ کر محض دکھ اذیت ذلت......

کیوں؟ صرف اس لیے کہ اس نے اپنی ماں کی خواہش اور حکم کے سامنے سر جھکایا تھا۔ جتنا وہ سوچتا جا رہا تھا اتنا ہی اس کا دل کڑھتا جا رہا تھا۔

اگلے روز حمیرا کا مایوں تھا۔ جانے کہاں کہاں سے مہمانوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اریج تو جیسے گھن چکر بن کر رہ گیا تھا۔ جبکہ بڑا اکمال، جمال کی موت کی طرح بہن کی شادی پر بھی نہیں آیا تھا۔ ہاں اس نے کچھ پیسے ضرور بھجوا دیے تھے۔ عائشہ نوکرانیوں کے حلیے میں ملبوس کچن میں مہمانوں کی آؤ بھگت کر کے پاگل ہو رہی تھی۔ مگر اس کا احساس کرنے کی فرصت وہاں کسی کے پاس نہیں تھی۔ اس کی ماں نے بیٹے کی برات کے ساتھ آنا تھا اور شاید بہن نے بھی مگر اسے امید نہیں تھی کہ وہ لوگ آ کر بھی اس کا کوئی احساس کریں گے۔

صبح سے رات تک وہ کاموں میں جتی رہی تھی۔ نہ اس نے کپڑے تبدیل کیے تھے نہ تقریب میں آ کر شمولیت ہی کر سکی تھی۔ اریج خاموشی سے دیکھتا رہا آج کی تقریب میں عائلہ بے حد خوب صورت دکھائی رہی تھی۔ وہ سارا وقت اسی کے اردگرد رہا۔ مایوں کی طرح مہندی کی تقریب بھی عائشہ کے لیے شجر ممنوع ہی رہی تھی۔ رات گئے تک تھکن سے چور ہونے کے باوجود کسی نے اسے کھانے تک کا نہیں پوچھا تھا۔ رات بھیگنے سے قبل تقریب ختم ہو گئی تھی۔ ٹھنڈا ہوا کھانا، مسلے ہوئے رنگ، بکھری ہوئی مہندی، بجھتے قمقمے کیا کوئی جان سکتا تھا کہ اس تقریب کے دلہا کی بہن کس حال میں ہے؟ اپنے کمرے میں آنے کے بعد وہ دیر تک روتی رہی تھی۔

اگلے روز اس کے گھر والے آ گئے تھے۔ اس کی ماں نے مقابل آتے ہی اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ بھائی ابھی گھر نہیں آیا تھا اور بہن بھی تاحال نہیں پہنچی تھی۔ وہ ماں کے گلے لگ کر رونا چاہتے ہوئے رو پڑی تھی مگر وہ اس کا درد محسوس نہیں کر سکی تھیں۔ انہوں نے اس کے آنسوؤں کو اپنی جدائی پر محمول کیا تھا، عائشہ چاہتے ہوئے بھی ان کے سامنے زبان نہیں کھول سکی تھی۔

برات آ گئی تھی سبھی گہما گہمی میں مصروف تھے مگر وہ پھر کاموں میں جتی ہوئی تھی۔ تبھی اریج اس کے پاس چلا آیا تھا۔

"آپ تیار نہیں ہوئیں؟" وہ چونکی تھی اور پھر سر جھکا گئی۔

"نہیں بس ابھی دو سوٹ پریس کر کے ہوتی ہوں۔"

"چھوڑیں سوٹوں کو اور چلیں جا کر تیار ہوں پلیز۔"

"اریج میں......؟"

"آپ کو سمجھ نہیں آ رہی میں کیا کہہ رہا ہوں۔" اس کے منمنانے پر وہ برہم ہوا تھا۔ عائشہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ یہی وہ پل تھا جو خار بن کر اریج کی ماں کی نگاہوں میں چبھا تھا۔ کسی چیل کی مانند لپکتے ہوئے وہ قریب آئی تھیں۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟ اور تم ادھر کیا کر رہے ہو سوائے اس کے آگے پیچھے پھرنے کے تمہیں اور کوئی کام نہیں ہے؟"

"میں کسی کے آگے پیچھے نہیں پھر رہا ہوں آپ بھابی سے کہیں کہ یہ کپڑے تبدیل کر لیں بس۔"

"کیوں کپڑے تبدیل کرے یہ تمہیں کیوں ہر وقت اس سے ہمدردی کے مروڑ اٹھتے رہتے ہیں؟"

"میں انسان ہوں اس لیے۔"

"اچھا تو ہم سب کیا تمہیں جانور دکھائی دیتے ہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں پتا بس میں اپنی آنکھوں کے سامنے کسی پر اتنا ظلم ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔"

"بس رہنے دو یہ مفت کی ہمدردی بہت اچھی طرح

سے جانتی ہوں میں کیا گل کھلا رہے ہو تم دونوں مل کر۔"

"اماں پلیز مت اتنا دماغ خراب کریں میرا کہ میں کچھ کر بیٹھوں۔"

"کچھ کرنے کے نہیں ہو تم بس کتے کی طرح اس کے آگے پیچھے پھرنا آتا ہے تمہیں اور کچھ نہیں۔"

"اماں۔"

"کیا اماں؟ تم کیا سمجھتے ہو میں کچھ جانتی نہیں۔ ایسے ہی بیٹا نہیں مارا اس نے میرا۔ ایک نمبر کی چڑیل اور حرافہ عورت ہے یہ۔ جان بوجھ کر اس نے میرے معصوم بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اب یہ تمہارا خون پینا چاہتی ہے مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ بہت مزے کر لیے تم دونوں نے اب یہ لڑکی ایک منٹ کے لیے بھی اس گھر میں نہیں رہے گی۔" بیٹے کے چلانے کا قطعی اثر لیے بغیر وہ اس سے بھی تیز آواز میں چلا رہی تھیں اور عائشہ کی ماں کے ساتھ دیگر مہمان بھی تھے کہ منہ میں انگلی ڈالے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

"اماں آپ بہتان لگا رہی ہیں۔ وہ بھی ایک معصوم لڑکی پر اور میں یہ ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔"

"مر جاؤ" آیا بڑا اماں کو دھمکیاں دینے والا میں بھی دیکھتی ہوں کون رکھتا ہے آج کے بعد اسے اس گھر میں۔" درجنوں مہمانوں کے درمیان بنا عائشہ کی ماں کی کوئی پروا کیے وہ جاہلوں کی طرح چلا رہی تھیں۔ اریج کا دماغ جیسے بھنا اٹھا۔

"میں بھی دیکھتا ہوں کون نکالتا ہے آج کے بعد اسے اس گھر سے۔" نہایت غصے سے کہتے ہوئے وہ عائشہ کا ہاتھ تھام کر گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ باہر بڑے سے شامیانے میں مولوی صاحب بیٹھے نکاح کی تیاری کر رہے تھے وہ قطعی مشتعل انداز میں اسی طرف چلا آیا۔

"مولوی صاحب یہ میری بیوہ بھابی ہیں عدت پوری کر چکی ہیں اپنی میں نکاح کرنا چاہتا ہوں ان کے ساتھ ابھی ہو سکتا ہے کہ نہیں۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا یہ تو بڑے ثواب کا کام ہے۔"

"کتنا ثواب تو نہیں جانتا میں آپ بسم اللہ کیجیے پلیز۔"

"اریج۔" پھیلی پھیلی سی آنکھوں کے ساتھ سہمی ہوئی عائشہ نے پہلی بار کچھ بولنے کی ہمت کی تھی۔ مگر اریج کے غصے اور بے نیازی نے اسے احتجاج کا موقع ہی نہیں دیا۔ خود اس کی اپنی ماں جیسے پتھر بن کر رہ گئی تھی۔

بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ سر پھرا شخص اپنی محبت چھوڑ کر اس سادھوی لڑکی کو اپنا لیتا۔ خود عائشہ کی ماں اور بھائی بھی شاکڈ کھڑے تھے۔ تاہم اس کی بہن ابھی ابھی پہنچی تھی اور وہ قدرے حیران ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد خوش تھی۔

وہاں اس دیہاتی ماحول میں جو ہونے جا رہا تھا وہ کسی کے بھی وہم و گمان میں نہیں تھا۔ لوگ یوں جمع ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے جیسے کوئی مداری بندر کا کھیل دکھا کر بچوں کو محظوظ کر رہا ہو۔ اریج کا دماغ اس وقت قطعی کام نہیں کر رہا تھا اس کے اور عائشہ کے گھر والے قریب کھڑے تھے مولوی نے سب کی موجودگی میں اللہ کا نام لے کر اس کا نکاح عائشہ سے پڑھوا دیا۔ عائشہ ساکت بیٹھی تھی گویا اس میں جان ہی نہ ہو۔

عائلہ جس وقت بن سنور کر وہاں آئی گویا اک قیامت اس کی منتظر تھی۔ سر جھکائے کھڑے اریج کا نکاح عائشہ لوہان کے ساتھ ہو چکا تھا اور نکاح کے فوری بعد اس کا کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں نکل گیا۔ لوگوں کی چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا تو کوئی کچھ مگر اس کی سماعتیں تو جیسے کام کرنا ہی چھوڑ گئی تھیں۔ کتنے سالوں کا ساتھ تھا اس کا اور اریج کا مگر کیسے ایک پل میں خوابوں کے سارے محل ٹوٹ کر زمین بوس ہو گئے تھے۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر صدمہ اتنا شدید تھا کہ آنکھیں آنسو لانا ہی بھول گئیں۔

اگلے روز اریج کو اس کے بارے میں خبر ملی تھی۔ عائلہ نروس بریک ڈاؤن ہونے کے باعث اسپتال میں تھی وہ جیسے تڑپ کر رہ گیا۔

کل پورا دن شراب کے نشے میں دھت رہنے کے بعد رات اس نے کسی زخمی پرندے کی مانند تڑپ کر پھڑپھڑاتے ہوئے گزاری تھی۔ عائلہ کے بغیر جینا ایسے ہی تھا جیسے پھول کا خوشبو کے بغیر رہنا۔ کیسے کیسے خواب

وابستہ نہیں تھے اس کی ذات سے وہ یاد کرتا رہا اور روتا رہا۔

وہ دن پاگلوں کی طرح ساری دنیا سے کنارہ کشی کیے اس نے اسپتال میں عائلہ کے پاس ہی گزارے تھے۔ ان دو دنوں میں اسے کچھ کھانے پینے کا ہوش رہا تھا نہ اپنے حال پر توجہ کرنے کا اگر کوئی دھن سر پر سوار تھی تو بس یہی کہ عائلہ کو ہوش آ جائے اور بالآخر اسے ہوش آ گیا تھا۔

تیسرے روز صبح ہی صبح وہ ہوش میں آ گئی تھی مگر اس کی آنکھوں کے سوتے خشک نہیں ہوئے تھے۔ اریج نے جان بوجھ کر خود کو اس کے سامنے جانے سے روکے رکھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے دیکھ کر پھر سے کوئی نقصان اٹھائے۔ تاہم اس کے ہوش میں آنے کے بعد وہ قدرے ریلیکس ضرور ہو گیا تھا۔ تین روز کے بعد گھر واپسی پر اس نے عائشہ کو دیکھا تھا۔ بے حد اجڑے ہوئے رف حلیے میں وہ اس کے لیے بے حد متفکر دکھائی دے رہی تھی۔ اریج تھکا تھکا سا لاؤنج میں دھرے صوفے پر ٹک گیا۔

"ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟"

"جج...... جی......!" بوکھلا کے جن کی طرح اثبات میں سر ہلاتی وہ کچن کی طرف لپکی تھی۔ اگلے دس منٹ کے بعد وہ چائے کا کپ لے کر آئی تو اریج دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ عائشہ کے ہاتھ سے گرما گرم چائے کا کپ تھامنے کے ساتھ ہی اس نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" بکھرے بکھرے سے حلیے میں کتنا قابل رحم لگ رہا تھا وہ۔ عائشہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"میرے یہاں سے جانے کے بعد امی نے تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ تو نہیں کیا؟" رشتہ بدلا تھا تو طرز تخاطب بھی بدل گیا تھا۔ وہ آہستہ سے نفی میں سر ہلا گئی۔

"ہوں' حمیرا تو چلی گئی یقیناً امی کو مجھ پر بہت غصہ ہو گا۔ مگر میں کیا کرتا' میرا دماغ پھٹ رہا تھا ادھر عائلہ کو نروس بریک ڈاؤن ہو گیا سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کا سامنا کیسے کروں گا۔" اضطراری انداز میں چائے کے کپ کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے اس نے اپنی الجھن اس سے شیئر کی تھی۔

"بہت حساس لڑکی ہے وہ بہت محبت کرتی ہے مجھ سے ابھی پچھلے دنوں ہی لمبی ناراضگی کے بعد صلح ہوئی تھی ہماری خیر تمہارے گھر والے چلے گئے یا ابھی یہیں ہیں؟"

"پتا نہیں شادی والے روز کے بعد وہ ادھر نہیں آئے صرف بھائی کال آیا تھا حمیرا کو لینے اور بس۔"

"یار مجھے نہیں لگتا کہ تمہاری امی تمہاری سگی ماں ہوں گی۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی سگی ماں کو اتنا بے حس نہیں دیکھا۔"

"کھانا لاؤں آپ کے لیے؟" نظریں چراتے ہوئے عائشہ نے فوراً بات بدل دی تھی۔

"نہیں میں بس چائے پی کر ریسٹ کروں گا۔ تم نے ناشتا کیا ہے؟"

"ہوں...... نہیں......!" غیر متوقع سوال پر نفی میں سر ہلا کر وہ فوراً اثبات میں سر ہلانے لگی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"جاؤ لے کر آؤ ناشتا۔" اس بار خاموشی سے اسے دیکھتے ہوئے اس نے حکم جاری کیا تھا۔ عائشہ بے حد کنفیوژ ہو کر فوراً اٹھ گئی۔ جس وقت وہ ناشتا لے کر آئی وہ اپنی چائے ختم کر چکا تھا۔

"چلو شروع کرو میرے سامنے۔" جونہی اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اس نے نیا حکم جاری کر دیا۔ وہ شاکڈ ہی تو رہ گئی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو ناشتا کرو پھر میں جاتا ہوں ریسٹ کے لیے۔" گہری سانس بھر کر سر صوفے کی پشت گاہ سے ٹکاتے ہوئے اس نے اپنی نگاہ اس پر جمائی تھی وہ پریشان سی چھوٹے چھوٹے نوالے توڑنے لگی۔

"کم از کم اب یہ سارا ناشتا اچھی طرح سے ختم کرنا ہے میرے سر میں بہت درد ہے میں ذرا آرام کر لوں۔" اسے اطمینان سے ناشتا کرتے دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔ کتنے سالوں کے بعد اس نے یوں پہلی بار رغبت سے ناشتا کیا تھا گو ہر لمحہ ساس کے آ جانے کا خوف لاحق رہا مگر اس نے کھانے سے ہاتھ نہیں روکا تھا۔

صبح سے شام ہو گئی تھی وہ کام سے فارغ ہو کر اریج کے کمرے میں آئی تو وہ جاگ رہا تھا۔ عائشہ کو دیکھ کر کروٹ کے بل اٹھ بیٹھا۔

"ادھر آؤ۔" سرخ سرخ سی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ابھی بیدار ہوا ہے۔ عائشہ دھڑکتے دل کے ساتھ قریب آ کر بیٹھ گئی۔ تبھی اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

"امی نے ابھی تک تمہارے کپڑے واپس نہیں کیے؟"

"جی...... نہیں......؟"

"ٹھیک ہے میں ذرا فریش ہو جاؤں پھر مارکیٹ چلتے ہیں جیولری اور میک اپ وغیرہ پسند ہے تمہیں کہ نہیں؟"

"نہیں۔"

"مگر میں چاہوں گا کہ تم میک اپ کرو اور ہاں اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں نے کسی ہمدردی یا خدا ترسی کے لیے تم سے شادی کی ہے تو پلیز ایسا کوئی خیال دماغ میں مت آنے دینا۔ کیونکہ میں کسی لحاظ سے اپنی زندگی برباد کرنے والا بندہ نہیں ہوں۔ نا ہی تم کوئی لولی لنگڑی بے کار لڑکی ہو جس پر ترس کھا کر اس سے شادی کی جائے میرا خیال ہے میری بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو گی۔"

"جی۔" دھڑکتے دل کے ساتھ عائشہ اذہان کا سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔ ٹھنڈی سانس بھرتا بستر سے اٹھ گیا۔ اگلے دو گھنٹوں میں وہ اس کے ساتھ مارکیٹ میں تھی۔ بے حد اپنائیت و محبت سے اس کا ہاتھ تھامے قدم سے قدم ملا کر چلتا وہ شخص اسے کتنا معتبر کر رہا تھا۔ اگر یہ ہمدردی یا ترس نہیں تھا تو پھر کیا تھا۔ ابھی چند دن پہلے اسی جگہ پر اس نے وہ لڑکی دیکھی تھی جو بے حد حسین تھی اور جسے وہ ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ جلد ہی وہ دونوں شادی کے خواہش مند بھی تھے۔ تو پھر یہ سب کیوں ہو گیا ہے؟ ایک اس کی زندگی کو آزمائشوں سے نکالنے کے لیے اس شخص نے اپنی اور عائلہ کی زندگی کیوں سولی پر ٹانگ دی تھی؟

کتنی سوچیں تھیں جو سارا دن اس کے دماغ کا گھیراؤ کیے ہوئے تھیں؟ کتنے تکلیف دہ خیالات تھے جو اسے ہمہ وقت پریشان کیے رکھتے تھے۔ اسے لگتا تھا جیسے جلد ہی وہ پاگل ہو کر رہ جائے گی۔ کسی کے خوابوں کو نوچ کر ارمانوں کا خون کر کے بھلا وہ کیسے خوش رہ سکتی تھی؟ جبکہ بچھڑ جانے کی اذیت کو بھلا اس سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اریج سے بات کر کے اسے سمجھائے۔ مگر جانے کیوں وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے اس ٹاپک پر بات کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔

اریج اب اس کے لیے جوتا خرید رہا تھا۔ وہ من ہی من میں اسے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ وہ بنا اس کی توجہ پر غور کیے اس کی

راحیلہ

السلام علیکم! ڈیئر آنچل فیملی اینڈ فرینڈز امید ہے آپ سب پھولوں کی طرح ہنستے مسکراتے ہوں گے۔ میرا نام راحیلہ ہے اور گھر میں سب راحیلہ ہی کہتے ہیں میں 25 جون 1989ء کو ملتان میں پیدا ہوئی' ہم چھ بہن بھائی ہیں' تین بھائی اور تین بہنیں ہیں اور میں سب سے چھوٹی ہوں' میں نے ایم اے کے پیپرز دیے ہیں اور ڈبل ایم اے کے لیے اپلائی کیا ہے اس کے علاوہ میں نے کچھ کورسز بھی کیے ہیں' کوکنگ مجھے ہر قسم کی کرنا آتی ہے' رنگوں میں مجھے سیاہ رنگ پسند ہے لباس میں شلوار قمیص اور ساڑھی پسند ہے مجھے بیڈمنٹن کھیلنا بہت پسند ہے' مجھے مخلص لوگ بہت پسند ہیں اور جو دوسروں کے لیے رول ماڈل ہوں میں ہر ایک کے ساتھ جلدی دوستی کر لیتی ہوں اور میری دوستوں' کزنز کے نام میمونہ' صائمہ' سدرہ' رومانہ' اقصیٰ' کرن' عصمت وغیرہ ٹیچرز میں مجھے سر حفیظ پسند ہیں جو ہمارے اسکول ٹیچر تھے اور میڈم صابرہ پسند ہیں' مجھے مغرور لوگ بہت برے اور پُرخلوص لوگ اچھے لگتے ہیں' اس کے علاوہ مجھے کتابیں بہت پسند ہیں' جو سائنس سے متعلق ہوں اور رائٹرز میں مجھے شیلے' رسکن' ولیم ورڈز ورتھ' ہاشم ندیم اور اشفاق احمد' اقراء صغیر اور نمرہ احمد اور فرحت اشتیاق بہت پسند ہیں اور مجھے سبق آموز شاعری پسند ہے۔ آخر میں جاتے ہوئے یہ بات کہوں گی جہاں رہیں خوش رہیں اور ہنستے مسکراتے رہیں۔

شلوار کو ٹخنوں سے ذرا اوپر اٹھا کر جھکتے ہوئے خود اسے جوتا پہنا رہا تھا۔ بے حد خوب صورت شفاف ہاتھ اس کے پیر چھو رہے تھے۔ وہ کرنٹ کھا کر رہ گئی۔

"مم...... میں خود پہن کر دیکھ لیتی ہوں۔" بڑی مشکل سے جھکتے ہوئے اس نے اپنے سرد ہاتھ اس کے خوب صورت ہاتھوں پر رکھے تھے۔ وہ خاموشی سے سائیڈ پر ہوگیا۔ اسی رات تھکن سے چور سارے کاموں سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں آئی تو اریج کمپیوٹر پر کسی کام میں مصروف تھا۔ وہ بے چین سی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

"وہ...... مجھے کچھ بات کرنی تھی آپ سے۔" ہاتھوں کو مسلتے ہوئے بہ مشکل وہ کچھ بولنے کی ہمت کر پائی تھی۔ اریج نے اچٹتی سی ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر دیا۔

"ہوں کہو۔" اپنی سیٹ سے اٹھ کر وہ بیڈ پر اس کے ساتھ ہی آ بیٹھا تھا۔

"وہ...... میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ...... امی آپ سے بہت ناراض ہیں۔ اسی لیے انہوں نے کمال بھائی کے پاس جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ پرسوں رات کی فلائیٹ ہے ان کی بھائی سے سارا کام کروالیا ہے انہوں نے تب ہی اور وقت وہ میری شکل دیکھنے کی روادار بھی نہیں ہیں۔ مم...... میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کو مجھ سے نکاح نہیں کرنا چاہیے تھا...... آپ عائلہ کو پسند کرتے تھے آپ کو اسی سے شادی کرنی چاہیے تھی۔"

"پسند کرتا تھا نہیں پسند کرتا ہوں۔ پہلی محبت ہے وہ اور اگر امی مجھے اتنا مجبور نہ کردیتیں تو لازمی طور پر میں اسی کے ساتھ شادی کرتا اور یہ شادی تو ابھی بھی ہو سکتی ہے۔ آپ میری محبت میں تو جتلا نہیں ہیں جو دوسری شادی کی اجازت نہیں دیں گی۔ جہاں تک امی کی بات ہے تو مجھے ان کی ناراضی سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ ہماری سگی ماں نہیں ہیں۔ نہ ہم بھائیوں کو انہوں نے کبھی پیار سے اپنا سمجھ کے پالا ہے۔ وہ صرف حمیرا کی ماں ہیں اور بس۔" سر جھکتے ہوئے اس کی ٹون یکسر بدلی تھی۔ عائشہ حیرانی سے دیکھتی رہ گئی۔

"خیر چھوڑو ادھر آؤ۔" اگلے ہی پل اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ عائشہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اسے کیسا مقام دینے والا ہے۔ کس قدر پیار اور اپنائیت سے اس نے اسے اس کا حق دیا تھا۔ وہ سرشاری جس سے وہ قطعی ناآشنا تھی اس نے کس درجہ محبت و ذمہ داری کے ساتھ اسے اس سرشاری سے متعارف کروایا تھا۔ حقیقی معنوں میں سہاگن کیا تھا۔

وہ تو محض اس کا نام ملنے پر ہی اس کی شکر گزار تھی کہ اس نے سہاگن بھی بنا دیا تھا۔ عائشہ کو لگا وہ زندگی میں کبھی اس کے سامنے سر نہیں اٹھا پائے گی۔ اسی روز شام میں اس کی اور عائلہ کی ملاقات ہوئی تھی وہ رو رہی تھی۔ محض تین دن کے اندر ہی اس کا سراپا اجڑ کر رہ گیا تھا۔ اریج نے بے ساختہ نظر چرالی۔

"کیسی ہو عائلہ؟"

"تمہیں کیسی لگ رہی ہوں؟"

"پتا نہیں۔"

"کیوں اریج کیوں؟ کیوں کیا تم نے ایسا ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچا تم نے کہ میرا کیا ہوگا۔ تمہاری اس خیانت کے بعد میں کیسے جیئوں گی؟"

"سوچنے سمجھنے کا ٹائم نہیں تھا عائلہ بس میرے سامنے ایک انسان کی زندگی داؤ پر لگی تھی میں نے اسے بچالیا۔ تمہیں تو مجھ سے بھی اچھا لڑکا مل سکتا ہے مگر اسے نہیں۔"

"اچھا لڑکا نہیں چاہیے مجھے تم اسے دے دو سارا دنیا مجھے بس میرا اریج دے دو پلیز۔" رو کر اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ سسکی تھی۔ اریج تڑپ کر رہ گیا۔

"سیکنڈ میرج کرو گی میرے ساتھ؟" اس سوال کے جواب پر اس کی ہستی کی بنیاد ہلی تھی۔ عائلہ کے آنسو اس کی پلکوں پر اٹک گئے۔

"ہاں اگر تم فوری اسے طلاق دے دو تو؟"

"اور اگر میں اسے طلاق نہ دوں تو؟"

"کیوں طلاق نہ دو تم میرے ہو اریج صرف اور صرف میرے میں تمہیں کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرسکتی۔"

"جانتا ہوں میں نے بھی کبھی نہیں چاہا تھا کہ تم مجھے کسی کے ساتھ شیئر کرو مگر اب حالات بدل گئے ہیں عائلہ میں کسی کا ہاتھ تھام کر اسے اوندھے منہ گرانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"چاہے میں مر جاؤں اریج؟" کانچ سی آنکھوں میں رکتے آنسوؤں کے ساتھ اس نے اسے دیکھا تھا۔ اریج کی اپنی آنکھوں کے گوشے نم ہوگئے۔

"نہیں۔"

"نہیں تو ابھی فیصلہ کرو تم اسے طلاق دے رہے ہو کہ نہیں؟"

"نہیں اسے علیحدہ رکھوں گا عائلہ وہ بہت بے ضرری لڑکی ہے کبھی ہمارے درمیان نہیں آئے گی۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے اریج۔"

"عائلہ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہیں۔ وہ بہت اکیلی ہے کوئی اپنا نہیں ہے اس کا دنیا میں تم کیوں مجھے اس کے سامنے کم ظرف ثابت کرنا چاہتی ہو۔"

"اریج تم اسے طلاق دے رہے ہو کہ نہیں؟"

"عائلہ پلیز۔"

"تو کے فیصلہ ہو چکا ہے۔" لہو رنگ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کھڑی ہوئی تھی۔

"بہت غرور تھا مجھے خود پر کہ تم صرف مجھ سے پیار کرتے ہو میں اگر تم سے کہوں گی کہ اریج میرے لیے ساری دنیا کو چھوڑ دو تو تم چھوڑ دو گے مگر میں غلط تھی۔ خوش فہم ہوگئی تھی میں تمہیں مجھ سے کبھی پیار نہیں رہا۔ جو کچھ بھی اب تک ہمارے درمیان تھا۔ سب بکواس تھا۔ جھوٹ تھا سب نظر کہا تھا تم نے کہ میں تمہاری زندگی ہوں بکواس کافی تم نے ساری۔ میں لعنت بھیجتی ہوں تمہاری محبت پر تعلق پر یہ لو اپنی رنگ...... میں سمجھوں گی کہ میرا تمہارا تعلق کبھی رہا ہی نہیں۔"

اگلے ہی پل سے اس کی پہنائی رنگ اتار کر اس پر پھینکتے ہوئے وہ وقفی ہوئی وہاں سے نکل گئی تھی۔ اریج شکستہ انداز میں رنگ اٹھا کر پاکٹ میں ڈالتے ہوئے وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ کہنا کتنا آسان ہوتا ہے کہ میں خود کو سمجھالوں گا۔ مگر دنیا میں سب سے مشکل کام خود کو سمجھانا ہوتا ہے محبت کے در بار سے در بدری کے بعد خود کو سمجھانے اور سنبھالنے میں عمریں بیت جاتی ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے مسائل پر ہزاروں لوگوں کو سمجھا کر ان کی سوچ تبدیل کرنے والے بھی سالوں اپنے اندر چھڑی جنگ میں پاگل ہوتے رہتے ہیں۔ اس رات اس نے پھر بہت شراب پی تھی۔ اسے لگا جیسے اب تک کا اریج مر گیا ہو اور اب اسے ایک نئے اریج کا روپ لے کر جینا ہو۔

جدائی دینے والے تجھ سے امید وفا کیسی؟
تعلق ٹوٹ جائے جب محبت روٹھ جائے جب
تو پھر رسم دعا کیسی؟
طلب کی التجا کیسی؟
بھنور میں ڈوبتی کشتی کو ساحل کی تمنا کیا؟
اکھڑتی سانس ہو تو زندگی کی آرزو بھی کیا؟
جو منزل کھو چکی ہو پھر سے اس کی جستجو بھی کیا؟
راز دوست پہ اچھا سر تسلیم خم کرنا
سسکنے سے کہیں بہتر ہے ناامیدی مرنا
مگر دل نے تمہیں کس واسطے سے یاد رکھا ہے
تمہیں کیوں شاعری میں آج تک آباد رکھا ہے
ابھی تک میں نے کیوں خود کو بہت برباد رکھا ہے
جدائی دینے والے آشنائی کی قسم تم کو
تمہاری کج ادائی بے وفائی کی قسم تم کو
مجھے اتنا بتا دینا
وفا کی چاہتوں کی مشعلیں کیسے بجھاتے ہیں
نشاں کیسے مٹاتے ہیں
بھلانا ہو جنہیں ان کو بھلا کیسے بھلاتے ہیں

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

جھیل کنارے گھر

نازیہ کنول نازی

جواداس ہیں تیرے ہجر میں جنہیں بوجھ لگتی ہے زندگی
سر بزم انہیں دیکھ کر تیرا منہ چھپانے کا شکریہ
جو زمانے بھر کا اصول تھا وہ اصول تم نے نبھا دیا
یہ رسم ٹھہرے گی معتبر مجھے بھول جانے کا شکریہ

اپنی شخصیت کے بارے میں آپ کی رائے؟

فرصت بھی ملے تو پڑھنا مجھے ضرور
ناکام زندگی کی مکمل کتاب ہوں

حساس لوگوں کے لیے سب سے مشکل کام اپنی شخصیت کو خود اپنے الفاظ میں بیان کرنا ہوتا ہے۔ دنیا میں اگر کوئی حقیقتاً میری شخصیت کے کن گاتا ہے تو وہ میری مما ہیں ان سے آپ میری جتنی مرضی تعریفیں کروالیں۔ ہر روز جھنوں کے نجانے کیسے کیسے محسور کر دینے والے جملے سنتی ہوں مگر پھر بھی جیسے میری ماں مجھے اندر سے جانتی اور پہچانتی ہیں شاید ہی کوئی اور جان سکے۔ اپنی نظر سے اگر خود کو دیکھوں تو تپتے صحرا کے اندر کہیں کوئی ندی سی رل رہی ہے۔ پتھر سے بھی زیادہ مضبوط ذات کے قلعے میں زندہ چیختی ہوئی کوئی اداس کشتی پھر رہی ہے۔ ضرورت سے زیادہ سادہ مخلص تنہائی پسند اور حساس ہوں۔ لکھنے کے معاملے میں بہت جنونی ہوں عزت نفس پر ضرب کسی صورت بھی قبول نہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کافی ٹھہراؤ آ گیا ہے شخصیت میں۔ میرا شمار ان لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جو بجھ کر بھی راکھ نہیں ہوتے کوئی بھی دکھ اور معاشرتی المیہ نچوڑتا ہے۔ بالکل بھی مستقل مزاج نہیں ہوں بہادر اتنی ہوں کہ حق بات کے لیے ساری دنیا سے لڑسکتی ہوں اور بزدل اتنی ہوں کہ کسی عزیز کی ذرا سی بے رخی یا تیکھا پن بھی برداشت نہیں۔ آنچل میں اب تک جتنی تحریریں بھی میں نے لکھی ہیں میرا خیال ہے وہ میری شخصیت کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔

تعلیمی قابلیت؟

کچھ خاص نہیں قابلیت تو سرے سے ہے ہی نہیں۔ تعلیم میں اردو ادب اور تاریخ میں ماسٹرز کی ڈگری مل گئی ہے یہی کافی ہے۔ ندامت شرمندگی محسوس کیے مجھے پورا اعتراف ہے کہ اردو ادب اور گرامر پر میری گرفت مضبوط نہیں۔ بچپن میں پڑھنے کا بہت جنون تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس جنون میں خاصی کمی آ گئی ہے۔ مزے کی بات میٹرک سے ماسٹرز تک صرف امتحان دینے کے شوق میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا ورنہ مطالعہ سے کوئی دعا سلام نہیں رکھی۔ ہر سال امتحان میں محض دو تین دن پہلے تیاری کا ہوش آتا تھا اکثر تو ایسا ہوتا تھا تیاری اسلامیات کی کرتی اور امتحانی سینٹر میں جا کر پتا چلتا کہ پرچہ تو معاشرتی علوم کا ہے۔ رائٹنگ کی وجہ سے ہمیشہ نگران اور ساتھی لڑکیاں صدقے واری جاتی تھیں بہت سی خوب صورت یادیں اس سلسلے سے وابستہ ہیں۔

تحریری سفر کب شروع کیا؟

صدیاں ہوئیں صدیوں سے لکھ رہی ہوں اور لگتا ہے صدیوں تک یونہی لکھتے لکھتے ایک دن مر جاؤں گی۔ آنچل میں میرا پہلا افسانہ "اک تیرے ملن کا موسم" تھا جو 2003ء میں شائع ہوا تھا (غالباً) تب سے اب تک یہ سفر جاری ہے۔

موجودہ مصروفیات؟

سونا سونا اور صرف سونا۔ دنیا دار تو میں کبھی بھی نہیں رہی مگر مما کی بیماری کے بعد بہت زیادہ گوشہ نشین ہو کر رہ گئی ہوں۔ پتا ہی نہیں چلتا وقت کیسے گزر جاتا ہے۔

مشاغل، شوق؟

میں نے بہت زیادہ مشاغل اور شوق نہیں پالے۔ چند سال پہلے لکھنے اور ریڈیو سننے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ ٹیلی وژن ڈرامے اور فلمیں بہت شوق سے دیکھتی تھی گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں ہم بہن بھائیوں کی ٹی وی کے لیے لڑائی ہو جاتی تھی۔ بہت عرصے تک ریڈیو میرے حواس پر چھایا رہا طالب علمی کے دور میں میوزک سننے کا بہت شوق تھا۔ میرے خیال میں سینکڑوں کلاسیکل گیت مجھے زبانی حفظ ہوتے تھے۔ اب کوکنگ کا کافی شوق ہے ایک اور شوق جو پچھلے کچھ دنوں سے دماغ پر چھا گیا ہے وہ ڈرائیونگ سیکھنے کا ہے۔ کسی کی بھی مدد کے لیے وظائف کرنے کا بہت شوق ہے۔ کسی بھی آنکھ سے آنسو چننے اور ساری دنیا میں خوشی اور راحت بکھیرنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ میرا ایک شوق عظیم انسان "قائداعظم محمد علی جناح" کے ساتھ شام کی چائے پینے کا بھی تھا مگر افسوس یہ شوق پورا نہیں ہو سکتا۔

پسند، ناپسند؟

بہت کچھ پسند ہے جیسے بارش، پھول، کتابیں، بے لوث محبت کرنے والے مخلص لوگ، چٹ پٹی ڈشز اور کھانے، اپنی مما کا پیار، اپنے آنچل اور طاہر صاحب و مشتاق انکل کی بہت زیادہ اپنائیت، آپی کی ادا سی، اپنی ماہ رین کی دوستی، کیف کی یاد، صدف کی ذات، بہت پیاری دوست شمیلا خان کی پر خلوص محبت اور شاعری، نبیلہ عزیز کے ناول، اپنی سمندری گہری آنکھیں، بے وقت سوچا بجھتی آنکھوں میں غیر متوقع طور پر خوشی کی چمک، دیکھنا خوابوں کی دنیا میں رہنا۔

ناپسند؟

ناپسندیدگی میں سب سے پہلے جھوٹ کا نمبر آتا ہے پھر منافقت کا۔ گھٹیا پن اور چاپلوسی بالکل پسند نہیں۔ پاپ میوزک اور بے حیائی کے نام پر آزادی سخت ناپسند ہے۔ ظلم خواہ انسانوں پر ہو یا جانوروں پر بہت برا لگتا ہے۔ دوسروں کی زندگیوں پر اپنے فیصلے اور مرضی مسلط کر کے خدائی کرنے والے لوگ قطعی پسند نہیں۔ وفادار پر بدگمانی اور اعتبار جیت کر پاؤں تلے سے زمین کھینچ لینے والے لوگ زہر لگتے ہیں۔ کینہ پرور اور کسی کو تکلیف پہنچا کر اپنا الو سیدھا کرنے والے لوگ بھی پسند نہیں۔ ر ہ جانے فرض سے آنکھیں چرا کر اپنے عہدے اور مقام کا ناجائز فائدہ اٹھا کر مخلوق خدا کو ستانے والوں سے شدید نفرت ہے۔ گرمیاں بالکل پسند نہیں چائے اور آئس کریم سے دور بھاگتی ہوں۔

آپ کی خوبیاں اور خامیاں؟

میں ہوں کھلی ہوئی سچائی مجھے جاننے والے جانتے ہیں
میں نے کن لوگوں سے نفرت کی اور کن لوگوں کو پیار دیا

میرا ستارہ عقرب ہے اور اس ستارے کی تمام خوبیاں اور خامیاں بدرجہ اتم مجھ میں موجود ہیں میری سسٹرز کے بقول میں بہت ضدی انا پرست، بے وقوف اور جذباتی ہوں۔ انسانوں کی بالکل پہچان نہیں جو کہہ دے کہ آپ کا مخلص ہوں فوراً یقین کر لیتی ہوں۔ ضرورت سے زیادہ صاف گو اور خوددار ہوں۔ کسی حد تک بہت سست اور بھلکڑ بھی ہوں۔ جتنی ذمہ دار ہوں اپنے معاملے میں اتنی ہی بے پروا بھی ہوں۔ اپنی قیمتی چیزوں کی کوئی قدر نہیں یہی وجہ ہے کہ آئے روز کوئی نہ کوئی چیز گم ہوئی رہتی ہے۔

خوبیاں؟

یہ سوال میں نے اپنی اماں سے کیا ہے کیونکہ میری نظر میں مجھ میں کوئی خاطر خواہ خوبی نہیں البتہ مجھے اس وقت بہت خوشی ہوتی ہے جب ہمارے رشتے دار میری وجہ سے میری مما پر فخر کرتے ہیں مما کے بقول: "میری بیٹی بہت ذہین اور سمجھدار ہے نیک حسین اور فرماں بردار ہے۔ بہت ہمدرد بیٹی اور دوسروں کے لیے جینے والی ہے مشکل میں سب کی مدد کرنے والی اور محبت کرنے والی ہے۔" اپنی فرینڈز کے بقول بہت سادہ مخلص درویش ٹائپ اور رشتوں پر جان دینے والی ہوں۔ مما کہہ رہی ہیں۔ میری بیٹی بہت خوبیوں کی مالک ہے سب تعریفیں گنواؤں گی تو نظر لگ جائے گی (آہم)۔

سالگرہ کا دن کیسے مناتی ہیں؟

اُف کتنا مشکل سوال پوچھ لیا آپ نے سچی بات یہ ہے کہ مجھے کبھی سالگرہ کا دن یاد ہی نہیں رہتا۔ نہ اپنی نہ کسی اور کی اس لیے کبھی خصوصی طور پر سیلیبریٹ کرنے کا اہتمام بھی نہیں کیا۔ فرینڈز اور گھر والے البتہ ضرور وِش بھی کرتے ہیں اور کبھی تحائف بھی دیتے ہیں۔ اس سال یوں ہوا کہ کسی فین نے 23 اکتوبر کی بجائے 22 اکتوبر کو ہی وِش کر دیا تو اس کے دیکھا دیکھی فیس بک پر نیک تمناؤں اور خوب صورت پیغامات کے ڈھیر لگ گئے۔ کوئی سینکڑوں احباب کی طرف سے مبارک باد وصول کر کر کے میں تو اتنی محبتوں پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی جب شام میں اچانک صدف کی کال نے ان خوشیوں پر گھڑوں پانی ڈال دیا یہ کہتے ہوئے۔ "بولی کوئی عقل نام کی چیز ہے تم میں کہ نہیں؟ آج 22 اکتوبر ہے تیری سالگرہ کل ہے۔" تو بس جس کے بُرا حال ہو گیا یہ ہے اپنا حال۔ چلو جی میرا خیال اپنے محبوب قارئین کی بصارتوں اور برداشت کا اتنا امتحان کافی ہے خوش رہیں خوش رکھیں (اپنے خرچے پر) پائندہ محبت باقی (رب راکھا)۔

تم ہو برگ سماں تم ہو بادِ صبا
تم کو معلوم کیا؟
ہم نے تم سے رنگ حنا مانگ کر
شب کی تنہائی میں گنگناتے ہوئے مسکراتے ہوئے
اپنے غم کا فسانہ کیا ہے رقم
اور کم ہو گئی اس میں حرف قلم
تم کو معلوم کیا؟
تم تو ہو لذت غم سے ناآشنا
آہ کس سے کہیں ہم نے کس شوق میں
اپنے زخموں کو رشک بہاراں کیا
شاخ ہاں میں ہم نے چراغاں کیا
تم سے ہم کیا کہیں؟ تم کو معلوم کیا
ہم نے کاٹی ہے کیسے شب زندگی
ہم نے کیسے اٹھایا ہے بار وفا
چاند نکلا نا تاروں نے تا دلداری
سر پہ کالے اندھیرے برستے رہے
اور جنت نشینوں کے اس شہر میں
روشنی کے لیے ہم ترستے رہے

"دو پتر چناراں دے ......
ساڈا دکھ من کے روندے پتھر پہاڑاں دے
بھری دوپہر میں شیشم کے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا وہ پلکیں موندے گنگنا رہا تھا۔ جب کرم داد پیچھے سے اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"لے تو ادھر بیٹھا ہوا ہے اور میں پورے پنڈ میں اپنے یار کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔"

"کیوں خیریت؟"

اپنے سکون میں خلل اسے پسند نہیں آیا تھا۔ جبھی تو آنکھیں کھولتے ہوئے اس نے خفگی بھری نگاہ کرم داد پر ڈالی تھی جواباً وہ کھسیا گیا۔

"خیریت ہی ہے چوہدرانی نے حویلی بلایا ہے تجھے۔"

"کیوں؟"

"یہ تو چوہدرائن کو پتا کل چھوٹی بی بی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ رات شہر سے ڈاکٹر بلوایا تھا مجھے تو لگتا ہے اسی سلسلے میں یاد کر رہی ہوں گی تجھے؟"

"ہوں اب کیسی طبیعت ہے چھوٹی بی بی کی؟"

"پتا نہیں چوہدرائن بتا رہی تھیں بخار نہیں ٹوٹ رہا ان کا۔"

"ٹھیک ہے تو جا آ جاتا ہوں میں تھوڑی دیر تک۔"

"جاتا ہوں مگر تو اس ویلے یہاں نہ بیٹھ وہ بابا جوگی کی کہانی نہیں سنی تو نے؟ وہ بھی یونہی بھری دوپہروں میں درختوں کے نیچے اکیلا بیٹھا رہتا تھا۔ دیکھ لے کیسے کملاتے جھلا کر دیا تھا اسے "اوپری ہواؤں" نے۔" زائر کے لب اس کے فکر اور ہدایت پر ذرا سے مسکرائے تھے۔

"تیرے یار پر "اوپری ہوائیں" اثر نہیں کرتیں کرم داد تو جا بے فکر ہو کر۔"

"ہوں عشق کی ست جنہیں لگ جاتی ہے ان پر تو بڑے بڑے طوفان اثر نہیں کرتے اوپری ہواؤں نے کیا اثر کرنا ہے۔" منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کرم داد اس کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ زائر اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔

غلام فریدا میں تے دوزخ سڑساں بے میں کھ ماہی کولوں موڑاں
مکّی کر کے چھوڑ دیتا ایں تے بیٹھی لکھ گیاں دے دلاں
یار باجھوں من جیون کھیڑا تے میرے اندر درد ہزاراں

غلام فریدا اس تے ہتھ روہوں جیویں وچھڑی کونج قطاراں

پلکیں موند کر پھر سے درخت کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے وہ بابا غلام فرید کا کلام گنگنانے لگا تھا۔ بھولے بسرے دنوں کی یادوں میں ثانیہ عباس کا عکس پھر سے دل میں چٹکی کاٹنے لگا۔

زائر نے جیسے نڈھال ہو کر خود کو ان دل فریب یادوں کے سپرد کر دیا تھا۔

❁......❁......❁

کشادہ صحن میں رزق کی تلاش کے لیے ادھر ادھر پھدکتی چڑیوں کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ زائر ملک کے مضبوط بازوؤں کی پناہ میں سوئی وہ اس کے کشادہ سینے سے لگی تھی۔ ثانیہ کے ذہن میں اس کی کل والی باتیں گونج اٹھیں۔ کتنی سفاکی سے اس نے اسے اپنے اصول اور اس کا مقام یاد کروایا تھا۔ کتنی بے حسی سے اس نے کہہ دیا تھا کہ۔

"تم یہاں انسان کی بچی بن کر رہو تو زیادہ بہتر ہے ورنہ دیہاتی مردوں کو بہت اچھی طرح سے عورتیں سدھار کر رکھنی آتی ہیں۔" تبھی فوراً سے پیشتر زائر کی پناہ سے نکلتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی تھی۔

"بہت مشکل سے میری ماں نے تمہیں اپنی بہو تسلیم کیا ہے بہت خوفزدہ رہتی ہیں وہ شہری لڑکیوں سے اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ کم از کم جو کچھ تم اور تمہاری ماں مل کر آج کر رہے تھے اس کے بعد تو بالکل نہیں۔" اس کا ذہن اس کے نشتر نما لفظوں کی گرفت سے نکل ہی نہیں پا رہا تھا۔

"زائر ملک صرف ایک بار ٹھوکر کھاتا ہے اس کے بعد راستے کے پتھر خود بخود اس کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ تم تو پھر میری ہم سفر ہو اور ہم سفر بھی وہ کہ جس کی کوکھ میں...... بہرحال خود کو میرا بہترین انتخاب ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کرنا نہیں تو یاد رکھنا میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" بے چینی ہی بے چینی تھی۔ کروٹ پر کروٹ بدل کر وہ تھک گئی تھی۔

تبھی زائر نے اس کی کمر میں اپنے بازو حمائل کیے تھے۔

"صبح ہو گئی ہے چلو اٹھ کر ناشتے کی تیاری کرو یہاں دیہات میں عورتیں اتنی دیر تک نہیں سوتیں۔"

"تو میں کیا کروں میں نے کہہ دیا تھا کل مجھے دیہات میں رہنے کی عادت نہیں ہے۔" اپنے وجود سے اس کے ہاتھ پرے جھٹکتے ہوئے وہ بیزاری سے اٹھ بیٹھی تھی۔

"پڑ جائے گی عادت' پکی دیہاتی عورت نہ بنا دیا تمہیں تو میرا نام بھی زائر ملک نہیں۔" ہاتھ بڑھا کر اسے تنگ کرنے کی غرض سے اس نے پھر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ ثانیہ کسی بے بس پرندے کی مانند پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

"زائر ملک' تم زبردستی مجھے اس ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر سکتے۔"

"کیوں؟" اس کی بے بسی سے حظ اٹھاتے ہوئے اس نے معصوم سی شرارت بھی کر لی۔ ثانیہ کی آنکھیں اپنی اس درجہ بے بسی پر ضبط کی ہزار کوششوں کے باوجود بھر آئیں۔

"میں تمہاری غلام نہیں ہوں۔"

"بیوی تو ہو نا؟" وہ کہاں اس کے آنسوؤں کو خاطر میں لانے والا تھا۔ ثانیہ کو لگا شہر سے گاؤں میں آ کر جیسے وہ سرتا پیر بدل کر رہ گیا ہو۔

"چلو اٹھو شاباش' پہلے جھاڑو دو اس سے پہلے کہ اماں جھاڑو پکڑ لیں۔"

"مجھے جھاڑو دینی نہیں آتی۔"

"میں سکھا دوں گا کوئی مسئلہ نہیں۔"

"جب سکھائیں گے تو خود دے بھی دینا میں یہ کام نہیں کر سکتی۔"

"تم بھی کرو گی ڈیئر ثانی' یہ شہر نہیں ہے جہاں شوہر بچوں نیپیاں تک تبدیل کرتے پھریں۔"

"یو نو' تم مجھے کسی بھی کام کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔"

"کر سکتا ہوں مگر کرنا نہیں چاہتا کیونکہ عورت پر جبر میری فطرت میں نہیں ہے۔"

"اور اس کے باوجود تم یہی کر رہے ہو۔"

"اس کے پیچھے بھی ایک وجہ ہے میں نہیں چاہتا تمہاری وجہ سے یہاں کسی کے سامنے بھی میرا سر جھکے۔"

"واہ عجب منطق ہے تم دیہاتی مردوں کی' عورت کو جھکا کر اس کی عزت نفس کو کچل کر ہر طرح سے اسے ذلیل کر کے تم لوگ سمجھتے ہو تمہاری شان میں اضافہ ہو گیا ہے۔"

"افسوس ناک حقیقت ہے مگر سچ یہی ہے۔ بہرحال چلو اٹھو میں نہاتا ہوں تم گھر صاف کرو۔"

"مجھے نہیں کرنا۔" زائر کے بستر چھوڑنے پر بھی اس نے اپنی ضد نہیں چھوڑی تھی۔ تبھی اسے غصہ آیا تھا۔

"تم چاہتی ہو میں تمہارے ساتھ جاہل مردوں والا سلوک کروں؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے اب تک جو سلوک تم نے میرے ساتھ کیا ہے وہ پڑھے لکھے مردوں والا ہے؟"

"ہاں...... چلو اٹھو اب۔" تنگ کرتے اس نے ثانیہ کو بازو سے پکڑ کر بستر سے اٹھا دیا۔ وہ کڑھ کر رہ گئی جب صحن میں زائر کی ماں نماز فجر کے بعد صفائی ستھرائی کا کام مکمل کر چکی تھیں۔ تب زائر کو بے حد شرمندگی ہوئی۔

"یہ کیا اماں میں نے کہا بھی تھا آپ یہ کام نہیں کریں گی اب۔" صحن میں آتے ہی ثانیہ کا بازو چھوڑ کر وہ ماں کے قریب آ بیٹھا تھا۔ تبھی وہ چولہا جلاتے ہوئے مسکرائی تھیں۔

"بھلا پتر نہ بن میرا میں نہیں کروں گی تو کون کرے گا یہ کام؟"

"وہ کرے گی جسے اپنا نام دے کر اس گھر میں لایا ہوں۔"

"نا پتر' وہ شہری بچی ہے اسے ان کاموں کی عادت نہیں ہے۔"

"کیوں؟ شہروں میں من و سلویٰ اترتا ہے وہاں بھی لوگ مل جل کر ہی زندگی کا وجود قائم رکھتے ہیں آپ خوامخواہ سر پر مت چڑھائیں اسے۔"

وہ ثانیہ کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر اس کی نگاہوں کی تپش اس کے لفظوں سے بخوبی محسوس کی جا سکتی تھی۔ تبھی وہ بولی تھی۔

"اپنی حد میں رہو زائر ملک' خرید کر نہیں لائے تم مجھے جو اس طرح کا سلوک کر رہے ہو میرے ساتھ۔"

"بکواس بند کرو اپنی' میں اس وقت تم سے مغز ماری کے موڈ میں نہیں ہوں۔" پلٹ کر ثانیہ کو دیکھتے ہوئے وہ دہاڑا تھا۔ جواباً وہ خاصی بے یقینی سی نگاہوں سے اسے دیکھتی شدید ہتک محسوس کرتے ہوئے کمرے میں واپس چلی گئی۔

دن بھر دوبارہ نہ اس کا زائر ملک سے سامنا ہوا اور نہ وہ کمرے سے باہر نکلی۔

اس نے ٹھان لیا تھا چاہے کچھ ہو جائے وہ کسی طور ملازمہ بن کر نہیں رہے گی۔ نہ ہی زائر کی ضد پوری ہونے دے گی۔ مگر اس کا یہ ارادہ اسی رات مٹی کی دیوار ثابت ہو گیا تھا۔ رات کے ساڑھے نو بجے کا ٹائم تھا جب وہ کمرے میں آیا تھا۔ ثانیہ جاگنے کے باوجود آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔

"ویلڈن ثانیہ عباس' ویری ویلڈن...... مجھے گمان نہیں یقین تھا کہ آپ یہی کریں گی کوئی بات نہیں میں عورت ذات پر ہاتھ اٹھانے کا قائل نہیں ہوں۔ نہ ہی گالی گلوچ کو پسند کرتا ہوں۔ تمہیں گھر کا کام نہیں کرنا کوئی بات نہیں آج کے بعد میرا وعدہ ہے تم سے میں بھی تمہیں کسی گھریلو کام کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔" بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگائے وہ بہت سنجیدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ثانیہ کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔

یہ وہ شخص کیا کہہ رہا تھا؟ وہ چونکی تھی اور اس نے خاصی حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں تمہیں بیوی بنا کر اس گھر میں لایا ہوں۔ خرید کر لایا ہوتا تو زبردستی کام بھی کرواتا مگر بیوی کے حقوق سے تو انکار نہیں ہے نا تمہیں؟" اب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈالے کہہ رہا تھا۔ ثانیہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"مطلب؟"

"مطلب سمجھا دوں گا آج رات تمہیں۔ ظاہر ہے میں تو فی الحال فارغ رہتا ہوں۔ تم بھی فارغ رہو گی تو شوہر کے حقوق تو ادا کرو گی نا؟ میں اس معاملے میں بہت فیاض ہوں۔ میرا خیال ہے اس معاملے میں زیادتی پر تم نہ تو کسی سے میری شکایت کرسکتی ہو نہ مجھے روک سکتی ہو کیا خیال ہے میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" اسے جھکانے کا بہت انوکھا طریقہ ایجاد کیا تھا اس نے وہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"نہیں تم ایسا کچھ نہیں کرو گے میرے ساتھ۔"

"کیوں؟ کون روک سکتا ہے مجھے؟" اس کے ہراساں ہونے پر وہ ذرا سا مسکرایا تو ثانیہ سلگ کر رہ گئی۔ واقعی وہ اسے ایسے کسی معاملے میں روکنے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔

"اب خدارا، خدا کے قہر سے مت ڈرانا مجھے کیونکہ جس معاملے میں تم خود بے حس ہو اسی معاملے میں مجھ سے انسانیت کی توقع نہیں رکھ سکتیں تم پھر سارے دن فارغ رہو گی کم از کم شوہر کو تو خوش رکھنا چاہیے نا تمہیں ہر پل ہر لمحہ ہر گھڑی۔"

ثانیہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ ایسی بھی کوئی چال چل سکتا ہے۔ بہت اچھی طرح سے وہ اس کی فطرت سے آگاہ تھی۔ وہ شخص جو ٹھان لیتا تھا اسے ہر قیمت پر کر کے دم لیتا تھا اسے لگا وہ ایکدم سے ہار گئی ہو۔

"تم میری حالت کے بارے میں جانتے ہو پھر بھی......؟" ایک آخری امید کے سہارے اس نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ مگر وہاں بے نیازی ہی بے نیازی تھی۔

"ہوں پھر بھی۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کرلیا۔ وہ جو دن بھر کی بھوکی تھی اس کے اس سنگدلانہ اقدام پر تڑپ کر رہ گئی۔

اگلی صبح زائر کے بیدار ہونے سے قبل ہی وہ کمرے سے نکل آئی تھی۔ زائر فریش ہو کر صحن میں آیا تو وہ جھاڑو ہاتھ میں لیے عجیب روئی روئی سی صورت بنائے سارا صحن صاف کر رہی تھی۔ کھلی زلفوں کی آوارہ لٹیں اسے زائر کی طرح ہی تنگ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ بار بار وہ ہاتھ سے انہیں کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے ہلکان ہوئی جارہی تھی۔

"اس" مشقت سے "یہ" مشقت بہرحال بہتر تھی۔ وہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔

اماں خود بھی ایک ہی دن میں یہ معجزہ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ جیسی تیسی جھاڑو سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ دھو کر وہ کچن میں گھس آئی۔ اماں صحن میں پلنگ پر بیٹھی تھیں جبکہ وہ خود چولہے میں آگ جلانے میں مصروف تھا۔ ثانیہ عباس کی روئی روئی سی سرخ آنکھیں اور چھوٹی سی سرخ ناک جانے کیوں اس لمحے اسے بہت لطف دے رہی تھی۔

آگ جلانے کے دوران کئی بار سر اٹھا کر اس نے شرارتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ اسی پل بیرونی دروازہ کھلا تھا اور سائرہ افضل کے قدم اس گھر کی دہلیز پر پڑے تھے۔

"سلام خالہ۔" زائر کے کانوں میں جیسے ہی اس کی آواز پڑی اسے لگا جیسے ساری دنیا تھم گئی ہو۔ جلتی لکڑی پر اس کے ہاتھ جیسے جم گئے تھے۔ ثانیہ نے خاصی حیرانی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"وعلیکم السلام سائرہ آؤ......کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں خالہ! امی غضب بتا رہی تھیں زائر نے شادی کرلی ہے؟" اس کی آواز میں آج بھی ویسی ہی کھنک تھی۔

اماں نے اسے پاس ہی بٹھالیا۔

"ہوں۔"

"ہائے سچ اسے لڑکی کس نے دے دی؟" کوئی چھتر تھا جو اس نے کھینچ کر تازیانہ زائر کو مارا تھا۔ ثانیہ نے ایک بار پھر چونک کر اسے دیکھا۔ وہ جلتی لکڑی پر ہاتھ جھٹکنے سے قطعی بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔

"منہ سنبھال کر بات کر سائرہ، میرے زائر کو کمی ہے لڑکیوں کی؟"

"نہیں تو لڑکی بھی نہیں تھی بڑی خالہ، تو تو برا ہی مان گئی۔ میں نے تو پڑوسن سے سنا تھا کہ کسی شہری لڑکی کو بھگا کر لایا ہے زائر سوچا ذرا دیکھ آؤں۔" بنا اماں کی خفگی کو کوئی اہمیت دیے وہ اپنا ہی راگ الاپ رہی تھی۔

زائر کا چہرہ ضبط اور غصے کی شدت سے سرخ پڑ گیا۔ ایک دم سے وہ اٹھا تھا اور سائرہ افضل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ عجیب درد اور ویرانی کا اظہار کرتی نگاہیں گویا احتجاج کرتی اس کے چہرے پر جم گئی تھیں۔

"مجھے ساری زندگی اس بات کا افسوس رہے گا سائرہ کہ

میرے دل نے محبت کے لیے تم جیسی لڑکی کا انتخاب کیا۔"

"ہوں اب تو یہی کہو گے نہ، وہ کیا کہتے ہیں سیانے 'کھسیانی بلی کھمبا نوچے'۔"

"جسٹ شٹ اپ، تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔"

"جا رہی ہوں، کوئی ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آئی میں، آیا بڑا نواب کہیں کا۔" وہ کسی بھی طور اس کے رعب میں آنے والی نہیں تھی۔

زائر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

سائرہ افضل کے جانے کے بعد وہ خود بھی گھر سے نکل گیا تھا۔ ثانیہ محسوس کرسکتی تھی کہ اس رات وہ بہت ڈسٹرب رہا تھا۔ اس نے سائرہ افضل کو نہیں دیکھا تھا مگر وہ یہ اندازہ بخوبی لگا سکتی تھی کہ "سائرہ افضل" زائر ملک کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتی تھی۔ بستر کی دوسری سائیڈ پر کروٹ لیے بہت دیر تک وہ روتا رہا تھا اور جتنی دیر وہ روتا رہا تھا اتنی دیر وہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

وہ کیسی محبت تھی جو اس نے سائرہ افضل جیسی لڑکی سے کی تھی؟ وہ کیا وجہ تھی جس نے سائرہ افضل کو اس سے متنفر کردیا تھا؟

اس رات بہت دیر تک سائرہ افضل کے بارے میں سوچتے ہوئے جاگ کر بالآخر اس نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ جیسی بھی تھی زائر ملک سے اس کا جیسا بھی تعلق تھا تاہم وہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ زائر ملک نے جو حق سائرہ افضل کو دیا تھا وہ اسے کبھی نہیں دیا تھا۔

اگلی صبح وہ ابھی سو رہی تھی جب زائر نے اسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔

"اذان ہوگئی ہے اٹھ کر نماز پڑھو۔" اس کی آنکھ کھلتے ہی بہت سنجیدہ لہجے میں اس نے نیا حکم جاری کیا تھا۔ وہ مندی مندی سی آنکھوں کو بمشکل کھولے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"پڑھ لوں گی ابھی تو دن نکلنے میں بہت دیر ہے۔"

"فجر کی نماز دن نکلنے سے پہلے پڑھی جاتی ہے میں مسجد جا رہا ہوں واپس آؤں تو تمہیں بستر پر نہ دیکھوں۔"

"زائر ملک تم اپنی خدائی سے واسطہ رکھو، عبادت کا معاملہ خالصتاً میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"تمہیں اس گھر کی چار دیواری کے اندر تمہارے سارے معاملے میری ذات سے جڑے ہیں جو بھی تمہیں میرے حوالے سے دیکھے بس دیکھتا ہی رہ جائے ڈھونڈنے سے بھی تمہارے اندر کوئی کمی یا خامی نہ ملے کسی کو۔"

"مگر کیوں جب مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہی نہیں زندگی ہی نہیں گزارنی تو پھر میں کیوں آئیڈیل بنوں؟"

"کیونکہ فی الحال تمہاری زندگی میرے ساتھ ہی گزر رہی ہے اور جب تک تمہاری کوکھ میں میری امانت ہے تمہیں مجبوراً میرے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد میرا وعدہ ہے تم سے میں ایک دن کے لیے بھی تمہیں اپنے پاس نہیں رکھوں گا۔" قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ کمرے میں نہیں ٹھہرا تھا۔ ثانیہ کا خون مزید جل گیا۔

نیند کا آنا اب ممکن نہیں تھا لہٰذا اٹھ کر وضو کیا اور خالص دلی آمادگی کے ساتھ اس نے کئی دنوں کے بعد فجر کی نماز ادا کی تھی۔ زائر مسجد سے واپس آیا تو وہ دعا مانگ رہی تھی۔

"شکریہ۔" بیڈ پر بیٹھنے کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے ثانیہ کی طرف دیکھا تھا جو ابھی دعا مکمل کر کے جائے نماز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کس بات کے لیے؟"

"میری ہدایت پر عمل کے لیے۔"

"اپنی خوش فہمی دور کرلیں۔ میں عبادت صرف اللہ کی محبت اور رضا کے لیے کرتی ہوں اور میں ہی کیا ہر مسلمان اللہ سے محبت اور اس کی خوشنودی کے لیے نماز قائم کرتا ہے۔"

"اچھا اللہ کی محبت اور خوشنودی کے لیے اسلام میں شوہر کے بھی بہت سے حقوق ہیں وہ کیوں یاد نہیں رہتے تمہیں۔"

"اس لیے کیونکہ میں نے دل سے آپ کو اپنا شوہر تسلیم نہیں کیا۔"

"تو کیا ہوا؟ میرے حقوق تو پھر بھی لاگو ہوتے ہیں نا تم پر جن حالات میں بھی سہی بہرحال نکاح تو ہوا ہے نا ہمارا۔"

"زائر ملک میں اس وقت آپ سے بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"تو اچھی بات ہے نا نیک پروین بیویاں بلاوجہ اپنے شوہروں سے بحث کرتی اچھی بھی نہیں لگتیں چلو شاباش آجاؤ بیڈ پر۔" کہنی کے بل بیڈ پر کروٹ بدلتے ہوئے اس نے اسے مزید جلایا تھا۔

ثانیہ گھور کر اسے دیکھتی رخ پھیر گئی۔

"بہت سے کام ہیں ابھی جو مجھے سر انجام دینے ہیں آپ لوٹیں میٹھی نیند کے مزے۔" زائر کے لبوں پر اس کے الفاظ نے میٹھی مسکان بکھیر دی تھی۔ تاہم وہ اس کی مسکراہٹ دیکھنے کے لیے ٹھہری نہیں تھی۔ زائر آج کل شہر میں جاب ڈھونڈ رہا تھا۔ بھی صبح کا نکلا شام کو گھر واپس آتا۔ ابا آج کل اپنی بیماری سے لڑ رہے تھے لہٰذا ان کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزرتا تھا۔ گاؤں کی عورتوں کے آج کل زائر کے گھر کچھ زیادہ ہی چکر لگنے لگے تھے۔ بہانے بہانے سے لڑکیاں ادھر آتی تھیں اور ثانیہ کو گھیر کر بیٹھ جاتی۔ ان کی باتیں بھی ہو جاتیں اور باتوں باتوں میں وہ ثانیہ کا ہاتھ بھی بٹا دیتیں۔ فقط دو ماہ میں وہ واقعی اسی ماحول کا حصہ لگنے لگی تھی۔

اماں بھاگ بھری (زائر کی ماں) اس سے بہت خوش تھیں۔ بے شک وہ سائرہ سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ اتنے دنوں میں اس نے کبھی ان سے یا ان کے شوہر سے بدتمیزی نہیں کی تھی۔ سارا دن وہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ کوئی ضرورت کی بات ہوتی تو کرلیتی نہیں تو چپ رہتی شروع شروع میں اسے گیلی لکڑیوں اور پاتھیوں سے آگ جلانا سخت مشکل لگتا تھا۔ اکثر وہ رو بھی پڑتی تھی۔ پھونکیں مار مار کر اس کا حال بھی برا ہو جاتا تھا۔ مگر پھر رفتہ رفتہ اسے اس پر بھی عبور حاصل ہو گیا۔ پہلے پہل دودھ دوہا کرتے ہوئے وہ آدھے سے زیادہ دودھ نکال دیتی تھی مگر اب ایسا نہیں ہوتا تھا۔ سارے کاموں کے ساتھ ساتھ اب وہ ہاتھ سے کپڑے دھونا بھی سیکھ گئی تھی۔ زائر نے اس روز کے بعد اسے کبھی غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔ اس شام وہ گھر واپس آیا تو وہ بھیگے پائنچوں کے ساتھ نل کے نیچے بیٹھی کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔ اتنا خوب صورت اور بھرپور منظر تھا کہ وہ بے ساختہ دہلیز پر رک کر اسے دیکھنے لگا۔ تاہم وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ بھاری بھاری کپڑوں کو نچوڑ کر سائیڈ پر رکھتے ہوئے وہ اسے بے حد پیاری لگی۔ شام کا کھانا تیار تھا۔ وہ ابا کے کمرے میں کچھ دیر بیٹھ کر اماں سے ثانیہ کی تعریفیں سننے کے بعد اپنے کمرے میں آیا تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی کھانا لے کر آ گئی۔ زائر نے دیکھا اس کے چہرے کی رنگت ماند پڑ رہی تھی۔

"ثانی......؟" کھانے کی ٹرے سائیڈ پر رکھنے کے بعد اس نے بہت اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"جی۔"

"بہت مصروف ہو گئی ہو تھوڑا سا ٹائم تو رکھ لیا کرو میرے لیے بھی۔"

"آتی ہوں کپڑے بدل کر۔"

"نہیں، بیٹھو یہاں آج میں تمہارے لیے شہر سے کچھ لایا ہوں۔"

"کیا؟"

"بیٹھو گی تو بتاؤں گا نا۔" ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے اس نے جیب سے کچھ نکالا تھا۔ اگلے ہی پل کانچ کی ڈھیر ساری رنگ برنگ چوڑیاں ثانیہ کی جھولی میں آ پڑی تھیں۔

"میں مانتا ہوں تم نے دل سے مجھے اپنا شوہر تسلیم نہیں کیا میرے جیسا آوارہ ناکام شخص تم جیسی پیاری لڑکی کے قابل بھی نہیں سوائے شکل صورت کے اور ہے ہی کیا میرے پاس؛ مگر پھر بھی یہ حقیقت ہے ثانی...... میرے دل میں تمہارے لیے بہت جگہ ہے۔ شاید سائرہ افضل سے بھی زیادہ۔" اس کا ہاتھ تھام کر دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے خود اسے چوڑیاں پہنانی شروع کردی تھیں۔

"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم جیسی لڑکی میری ہم سفر بنے گی وہ بھی اس طرح سے کہ کوئی پلان ہی نہیں ہوگا۔ بے شک اللہ بہت بڑا پلانر ہے بہرحال بہت ستالیا میں نے تمہیں سب اور نہیں میری جاب لگ گئی ہے شہر میں نوکری ہی کروں گا اب اور تمہیں کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہاں گاؤں میں بہت عورتیں مل جاتی ہیں کام کے لیے۔ میں چاہوں تو تمہیں اپنے پاس شہر میں بھی رکھ سکتا ہوں مگر شہر کا ماحول ہمارے بچے کے لیے ٹھیک نہیں ہے جو خالص فضا جو خالص خوراک خیال اور محبت تمہیں یہاں مل سکتی ہے وہ شہر میں نہیں مل سکتی۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات۔"

"ہوں۔"

"ناراض ہو مجھ سے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر خاموش کیوں رہنے لگی ہو کچھ اور نہیں تو جھگڑا ہی کرلیا کرو۔"

"کیوں جھگڑا کرنے سے مسائل حل ہو جاتے ہیں؟"

"نہیں، مگر رشتوں کی اہمیت اور خوب صورتی کا احساس باقی رہتا ہے۔"

"مگر ہمارے رشتے میں صرف جبر اور ہوس ہے خوب صورتی نہیں۔" چبا چبا کر کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ زائر ملک اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس شام اس نے کھانا نہیں کھایا۔ جاب ملنے کی خوشی پر بھی جیسے اوس پڑ گئی تھی۔ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ چپ چاپ سو گیا تھا۔ ثانیہ سارے کاموں سے فارغ ہو کر باہر صحن میں رکھی چارپائی پر ٹک گئی تھی۔ کچھ دنوں سے اس کی اندر کی دنیا بدل رہی تھی۔ اسے زائر ملک اچھا لگنے لگا تھا۔

اس کی ہر بات ہر انداز اچھا لگنے لگا تھا۔ اس کا گھر اس کا گاؤں اس گاؤں کے لوگ رسم و رواج، کھیت، شامیں، موسم سب اچھے لگنے لگے تھے۔ اب تو اسے یہ بھی اچھا لگنے لگا تھا کہ وہ زبردستی اس پر اپنا حق جمائے مگر پھر بھی جب وہ سامنے آ جاتا تھا تو پتا نہیں کیوں وہ اپنے پرانے رنگ میں واپس لوٹ آتی۔ شاید وہ اس کے سامنے شکست تسلیم کرنے میں ڈرتی تھی۔

آسمان بادلوں سے ڈھکا تھا۔ ہلکی ہلکی سرد ہوائیں چاندنی رات کے حسن کو چار چاند لگا رہی تھیں۔ گہرے کالے بادلوں کی اوٹ میں آنکھ مچولی کھیلتے چاند کو دیکھنا اسے ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا تھا۔ مگر اس پل موسم میں اچانک تبدیلی آ گئی تھی گہرے بادلوں نے چودھویں کے چاند کو مکمل طور پر اپنے حصار میں لیتے ہوئے برسنا شروع کردیا تھا۔ وہ اٹھ کر جلدی جلدی صحن میں پڑی چیزیں سمیٹنے لگی۔ سب کچھ سمیٹ کر جس وقت وہ کمرے میں آئی زائر گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔ پہلی بار وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ بلاشبہ وہ بے حد حسین اور پرکشش شخص تھا مگر اس کے کام ٹھیک نہیں تھے۔ عقل کی خاصی کمی تھی اس کے پاس۔ تبھی اس کی نظر اپنی کلائی میں پڑی خوب صورت رنگ برنگ چوڑیوں پر پڑی تو آپ ہی آپ اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کلائی سامنے کرتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹ چوڑیوں پر رکھے تھے۔ کچھ ہی فاصلے پر دھرے میز پر شام کا کھانا جوں کا توں رکھا تھا اسے بے حد ملال ہوا۔ بے شک جو زائر نے کیا وہ ٹھیک نہیں تھا مگر بدلے میں جو کچھ وہ اس کے ساتھ کر رہی تھی وہ بھی تو ٹھیک نہیں تھا۔ اس کا دل چاہا وہ اسے جھنجوڑ کر جگائے اور کھانا کھانے کے لیے کہے مگر پھر اس کی نیند خراب نہ کرنے کا سوچ کر رک گئی۔

باہر اب بارش تیز ہو گئی تھی۔ ثانیہ کو ایک دم سے اپنے اندر کا حبس بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ زائر کے پہلو سے اٹھ کر وہ ایک مرتبہ پھر باہر صحن میں چلی آئی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ اسے ہمیشہ سے اس موسم سے ڈر لگتا تھا گرجتے بادلوں اور کڑکتی بجلی کے خوف سے وہ کبھی بارش میں نہیں نہائی تھی مگر اس وقت وہ بارش میں نہا رہی تھی۔ اپنے اندر کے حبس کو دور کرنے کے لیے وہ بارش کے سرد قطروں سے خود کو سیراب کر رہی تھی۔ مگر یہ حبس اس کے اندر کا حبس تھا۔ بارش کے سرد قطرے اس حبس کو دور کرنے میں ناکام دکھائی دے رہے تھے۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور اس کے آنسو گالوں کو بھگوتے چلے گئے تبھی اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

زائر سینے پر ہاتھ باندھے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"بارش میں بھیگنے کا یہ کون سا وقت ہے؟" نیند سے بوجھل لہجے میں اس نے پوچھا۔ ثانیہ نے فوراً پلٹ کر اسے دیکھا اور پھر جانے کیا ہوا ایک دم سے بھاگتے ہوئے وہ اس کے کشادہ سینے میں چھپ گئی۔

زائر کو لگا جیسے وہ پتھر ہو گیا ہو۔

اے مسلمان!

اے مسلمان! تُو اپنی قسمت پر اعتبار کیوں نہیں کرتا
تُو دکھاوے کے نعرے لگاتا ہے
خود کو مسلمان کہلواتا ہے
تُو سچے دل سے پیار کیوں نہیں کرتا
تیری طرف نبیوں کا سردار آیا
جس نے جان کی بازی لگا کر حق پہنچایا
تُو اپنے ضمیر کو بیدار کیوں نہیں کرتا
تُو اس کے کاموں پر عمل کر کے
تُو اس کے نقش قدم پر چل کے
اے گناہ گار اپنے لیے راہ ہموار کیوں نہیں کرتا
اے مسلمان! تُو اپنی قسمت پر اعتبار کیوں نہیں کرتا

سمیرا علی شیری...... رینالا اوکاڑہ

"کیا ہوا؟" کپکپاتے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھنے کے بعد اس نے پوچھا مگر وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس کے دل کی تیز دھڑکن زائر کا سکون برباد کر گئی تھیں۔ ثانیہ کے وجود کے گرد اس کی گرفت سخت ہوئی اور پھر جیسے اس نے اسے اپنے اندر ہی جذب کرلیا۔ کتنی دیر تک دونوں ایک دوسرے کی تیز دھڑکنوں کا شور سنتے بارش میں بھیگتے رہے تھے۔

⊙......❀......⊙

اگلی صبح ثانیہ کی آنکھ کھلنے سے پہلے ہی وہ شہر کے لیے رخصت ہو چکا تھا۔ پچھلے دو تین ماہ میں پہلی بار اسے صبح اچھی نہیں لگی تھی۔ دو ماہ رہ گئے تھے اس کی ڈلیوری میں مگر زائر کے بغیر اسے جیسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس روز اس کا فون آیا تھا کمپنی اسے ایمرجنسی ویزے پر باہر بھجوا رہی تھی۔ وہ خوش تھا بے حد خوش مگر ثانیہ کا دل بجھ کر رہ گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد بھی وہ گھر نہیں آیا تھا اور ایک ہفتے میں اس نے جانا تھا کہ وہ زائر کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ اس روز بھی موسم بہت ابر آلود ہو رہا تھا۔

ثانیہ نے تندور پر روٹیاں لگانی سیکھ لی تھیں۔ وہ ابھی شام کی روٹی پکا کر فارغ ہوئی تھی کہ ساتھ والی امبری کا بلاوا آگیا۔ امبری کی شادی کے دن رکھے جا چکے تھے اور ثانیہ کے ساتھ اس کی خاصی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ اپنی ساس اور سسر کو کھانا دینے کے بعد وہ ان سے اجازت لے کر امبری کی طرف آئی اور وہیں گاؤں کی اکٹھی ہوئی عورتوں میں ایک عورت اسے بہانے سے سائیڈ پر لے جا کر اس کی ماں کے حوالے کر آئی۔

"مما۔" اتنے دنوں کے بعد اپنی ماں کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہی تو ہوگئی تھی۔ جواب میں انہوں نے بھی اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

"کیسی ہو ثانی؟"

"ٹھیک ہوں مما! آپ کیسی ہیں؟"

"کیسی ہو سکتی ہوں تمہارے بغیر پچھلے تین ماہ سے پاگلوں کی طرح ڈھونڈتی پھر رہی ہوں تجھے۔ کہاں کہاں نہیں تلاشا ہسپتال سے تمہارے غائب ہونے کے بعد میں اور اشعر بس تمہاری تلاش میں ہی رہے ہیں۔ یہ جو عورت تھی اس کا بیٹا شہر میں زائر کا دوست تھا اسی کی مدد سے یہاں تک پہنچے ہیں۔"

"تو مما! میری وجہ سے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا آپ کو بہرحال میں یہاں بہت خوش ہوں۔ زائر اور اس کے گھر والے بہت اچھے ہیں۔ آپ ان سے ملیں گی تو آپ کو بھی بہت اچھا لگے گا۔"

"ثانی...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" مسز عباس کے لیے اس کے الفاظ کسی دھچکے سے کم نہیں تھے۔ وہ حیرانی سے بیٹی کا منہ تکتی رہ گئی تھیں۔

"جی مما! یہاں آکر میں نے جانا ہے کہ زندگی کی اصل خوب صورتی کیا ہے اور آپ کو پتا ہے زائر کو شہر میں جاب بھی مل گئی ہے وہ کمپنی کی طرف سے باہر گیا ہوا ہے۔"

"تو......؟"

"تو یہ مما کہ میں اب یہیں رہوں گی۔ بہت پیار کرتا ہے زائر مجھ سے، وہ مجھے تحفظ دینا جانتا ہے۔ آپ یقین کریں میں یہاں بہت بہت خوش ہوں۔" جتنی خوشی اور بے نیازی سے وہ کہہ رہی تھی مسز عباس کے چہرے پر اتنے ہی رنگ آجا رہے تھے۔ انہیں قطعی گمان نہیں تھا کہ ان کی بیٹی ان کے ساتھ اتنا بڑا فریب بھی کرسکتی ہے۔ کافی دیر تک تو انہیں سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اب وہ کیا کریں۔ کیسے بتاتیں وہ اسے کہ انہوں نے اشعر حسین کو صرف اس کا لالچ دے کر تو بلایا ہے۔ اب بھی اگر وہ اسے مایوس کرتی ہیں تو وہ ان دونوں ماں بیٹی کو چھوڑے گا نہیں۔ ان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا جبھی ثانیہ نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"چلیں مما! میں آپ کو زائر کے گھر والوں سے ملواتی ہوں۔" زائر کا گھر ساتھ ہی تھا اس سے پہلے کہ مسز عباس انکار کرتیں وہ انہیں کھینچ کر اپنے گھر لے گئی۔

"اماں! اماں دیکھیں تو کون آیا ہے؟" خوشی سے اس کا حال برا تھا۔ اماں بھاگ بھری چاولوں کو کونڈے میں لیے اپنے کمرے سے نکلیں۔

"کون آیا ہے پتر؟"

"میری مما آئی ہیں۔ کزن بھی ہے ساتھ۔"

"اچھا...... ماشاءاللہ۔"

"السلام علیکم!" مسز عباس نے مصافحہ کے لیے پہلے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

"وعلیکم السلام جی آئیں بیٹھیں۔"

"بیٹھنے کا ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔ اشعر باہر گاڑی میں انتظار کر رہا ہے مہربانی ہوگی اگر آپ ثانیہ کو ہمارے ساتھ

جانے کی اجازت دے دیں۔" ان کے مطالبے پر جہاں لیلیٰ حیران ہوئی تھیں وہیں ثانیہ بھی حیرانی سے ان کا منہ دیکھنے لگی تھی۔

"مگر مما ابھی آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔ ایک دو روز میں زائر آنے والا ہے وہ آ جائے تو پھر ہم دونوں چلیں گے۔"

"تم چپ رہو ثانیہ یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔ ویسے بھی بڑے بولتے ہوں تو چھوٹوں کو چپ رہنا چاہیے۔"

"مگر مما......" وہ مچل کر احتجاج کرنا چاہتی تھی مگر مسز عباس نے اسے ڈپٹ کر چپ کروا دیا۔

ثانیہ عباس اور زائر ملک کی زندگی میں یہی وہ موڑ تھا جہاں ان دونوں کے بیچ جدائی آ گئی تھی۔ نہ صرف جدائی آئی تھی بلکہ وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ بدگمانی اور نفرت کی اتنی اونچی فصیلیں قائم ہوگئی تھیں دونوں کے درمیان کہ اب وہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں تھام سکتے تھے۔

❁......❁......❁

نہ بجھا چراغ دیار دل، نہ بچھڑنے کا تو ملال کر
تجھے دے کے جینے کا حوصلہ میری یاد رکھ لے سنبھال کر
یہ بھی کیا کہ ایک ہی شخص کو بھی سوچنا، کبھی بھولنا
جو نہ بجھ سکے وہ دیا جلا، جو نہ ہوسکے وہ کمال کر
تم آرزو میری جستجو میں سمٹ کے آ گیا روبرو
یہ سکوت مرگ ہے کس لیے میں جواب دوں تو سوال کر
تو بچھڑ رہا ہے تو سوچ لے تیرے ہاتھ ہے میری زندگی
تجھے روکنا میری موت ہے میری بے بسی کا خیال کر
میرے صد کا میرے ضبط کا میری بے بسی میرے صبر کا
جو یقین نہ آئے تو دیکھ لے تو ہوا میں پھول اچھال کر

تین روز سے اس کا بخار نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ جانے کیسی بے چینی تھی کہ اسے کسی کروٹ سکون نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ کتنی کمزور ثابت ہوئی تھی وہ زائر ملک سے محبت کے معاملے میں؟ پانچ سال گزرنے کے باوجود وہ اسے بھول نہیں پائی تھی۔

بارشیں جیسے جان کا روگ بن کر رہ گئی تھیں۔ اس کے لیے زائر ملک کی رفاقت کے آخری دل فریب لمحے اسے ہر گھڑی بے قرار رکھتے تھے۔ پچھلے پانچ سال میں وہ "تنگ" ہونے کے لیے ترس گئی تھی۔

اس روز جب مسز عباس زبردستی اسے اپنے ساتھ شہر لے آئی تھیں۔ اس کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ زائر کے دوست کی وہ کال جس نے اس کی مجبوری کی تھی۔ وہ بھی ان کے ہمراہ تھی مسز عباس نے اسے شہر میں اپنے گھر میں نوکری کا لالچ دیا تھا۔ حمل کے ساتویں ماہ میں قطعی غیر متوقع طور پر اس کا آپریشن ہوا تھا اور اس نے جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا۔ ایک بیٹے اور ایک بیٹی کو۔ اسے شہر آئے وہ تیسرا دن تھا جب مسز عباس نے اسے بتایا۔ وہ کچن میں کھڑی نوڈلز تیار کررہی تھی کہ وہ قریب آئی تھیں۔

"جانی وہ زائر کا فون آیا تھا تم نے اسے میرے نمبر سے کال کی تھی؟"

"جی مما کیوں کیا ہوا؟"

"بہت غصے میں ہے زائر گالیاں دے رہا تھا تمہیں اسے لگتا ہے جیسے تم اس کے بچوں کو لے کر مفرور ہوگئی ہو عجیب جنونی شخص ہے پتا نہیں تمہیں کیا نظر آیا اس میں؟"

"مما پلیز آپ نے مجھ سے بات کیوں نہیں کروائی اس کی۔ وہ غلط فہمی کا شکار ہوگا آپ کو اس کی غلط فہمی دور کرنی چاہیے تھی۔"

"دلوں میں گنجائش ہو تو غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔ اس نے تو بات ہی ختم کردی۔"

"کیا مطلب۔" نوڈلز کا باؤل اس کے ہاتھ سے گرا تھا تبھی وہ نظر چراتے ہوئے بولی تھیں۔

"ڈائیورس دے دی ہے اس نے تمہیں۔ بہت کوشش کی میں نے سمجھانے کی مگر اس نے میری ایک نہیں سنی۔ کہہ رہا تھا کہ ایک دو روز میں پیپرز بھی بھجوا دے گا۔" فقط سانپ بچھو کیسے بن جاتے ہیں یہ اس سے کوئی ثانیہ عباس سے پوچھتا۔ زمین پاؤں سے جیسے کھسکی تھی ثانیہ عباس نے اس روز جانا تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ غم کی شدت سے بے حال وہ تیورا کر گری تھی اور بے ہوش ہوگئی تھی۔

اگلے روز اس نے جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا۔ ڈاکٹرز ان بچوں کے زندہ رہنے سے متعلق پرامید نہیں تھے مگر اللہ نے ان معصوم کلیوں کو زندہ رکھا تھا۔ سات ماہ کے ان بچوں کو انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا تھا۔ دو روز کے بعد ثانیہ کی حالت بہتر ہوئی تو اس نے فوراً شعر سے موبائل لے کر زائر کا نمبر پریس کیا مگر اس کا نمبر مسلسل آف جا رہا تھا۔ تب اس

نے گھر کے نمبر پر کال کی اور اس بار اس کی ساس نے اس کی کال اٹینڈ کی تھی۔

"السلام علیکم اماں۔"

"وعلیکم السلام کیسی ہو بیٹی؟" اماں کی آواز بجھی بجھی سی تھی۔ ثانیہ کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

"ٹھیک ہوں اماں آپ کیسی ہیں؟"

"کیسی ہوسکتی ہوں جو قیامت گزری ہے مجھ پر اس کے بعد کیسی ہوسکتی ہوں میں؟"

"کک...... کیا...... مطلب...... اماں آپ کو پتا ہے آپ دادی بن گئی ہیں دو جڑواں بچوں کی دادی اماں پلیز زائر سے کہیں مجھ سے بات کرے اور کچھ نہیں تو اپنے بچوں کو ایک نظر آ کر دیکھ لے پلیز اماں......!"

"وہ جنونی بھلا اس قابل ہی کہاں رہا ہے بیٹا؟" اماں نے کہا تھا اور پھر پھپھک کر رو پڑی تھیں۔ ثانیہ جیسے گنگ رہ گئی۔

اس کا مطلب تھا کہ اس کی ماں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ زائر کی ماں بھی اس حادثے سے آشنا تھی جو اس کے ساتھ ہوگیا تھا۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو اس نے کہا تھا۔

"جب تک تمہاری کوکھ میں میری امانت ہے تمہیں مجبوراً میرے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد میرا وعدہ ہے تم سے ایک دن کے لیے بھی تمہیں اپنے پاس نہیں رکھوں گا۔" زائر کی آواز کے ساتھ ہی ذہن کے کسی کونے میں سائرہ افضل کی آواز گونجی تھی۔

"ہائے بیچ کسے لڑکی کس نے دے دی؟" دوسری طرف سے لائن کٹ ہوچکی تھی۔

ثانیہ نے خاموشی سے سیل شعر کے حوالے کردیا۔ کتنا عجیب تھا وہ شخص...... اس نے اپنی مرضی اور خواہش پر زبردستی اس سے تعلق بنایا اپنی مرضی سے جہاں چاہا وہاں رکھا اور پھر اپنی مرضی سے ہی چھوڑ دیا۔ ثانیہ کی رضا اس کی خوشی اس کا بھلا کہیں بھی نہیں تھا اس رشتے میں۔ تبھی وہ پھر سوچوں میں آیا تھا۔

"میں مانتا ہوں تم نے دل سے مجھے اپنا شوہر تسلیم نہیں کیا مجھ جیسا آوارہ ناکام شخص تم جیسی پیاری لڑکی کے قابل ہی کہاں سوائے شکل صورت کے اور ہے ہی کیا میرے پاس تمہیں دینے کے لیے مگر پھر بھی یہ حقیقت ہے جانی میرے دل میں تمہارے لیے بہت جگہ ہے شاید سائرہ افضل سے بھی زیادہ۔"

"زائر......!" بخار وگرد کی پروا کیے وہ زور سے چیخی تھی۔

اقراء احسان وڑائچ

اقراء کی طرف سے آنچل اسٹاف اور آنچل قارئین اور تمام رائٹرز بہنوں کو سلام۔ کیا حال چال ہے آپ کا؟ میرا نام اقراء احسان وڑائچ ہے ہم چھ بہنیں ہیں میرا نمبر چوتھا ہے میں سیکنڈ ائیر میں پڑھتی ہوں میری تاریخ پیدائش 29 دسمبر ہے میں سرگودھا میں پیدا ہوئی مزاجاً خوش بھی رہتی ہوں اداس بھی رہتی ہوں غصہ بھی جلدی آ جاتا ہے اور نرم دل بھی ہوں۔ مجھے فاسٹ میوزک بہت پسند ہے شرارتی بھی ہوں خامیاں بھی بہت زیادہ ہیں اور خوبیاں بھی بہت زیادہ ہیں۔ گھر کے کاموں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں کھانے پینے کی کوئی خاص شوقین نہیں ہوں جو مل جائے کھالیتی ہوں مجھے اپنی تمام بہنوں سے بہت پیار ہے کزنز میں میری خالہ زاد تمنا سے بنتی ہے۔ پسندیدہ رنگوں میں مجھے سفید کالا سرخ فیروزی پسند ہیں باقی رنگ بھی اچھے لگتے ہیں۔ مجھے پاک آرمی اپنے وطن سے بہت پیار ہے ڈرپوک بھی بہت ہوں میری دوستی کا دائرہ کافی وسیع ہے بہترین دوستوں میں صبا ناصر آصفہ صبا قمر فاریہ بختاور سائرہ شامل ہیں۔ باقی سب سے بھی گپ شپ ہے میں اپنی دوستوں سے بہت پیار کرتی ہوں۔ میک اپ کا بہت شوق ہے شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے بہترین ٹیچرز میں سے میڈم "عفت النساء" بہت پسند ہیں میں بہت جلد کسی پر اعتبار کرلیتی ہوں مجھے جیولری میں بریسلیٹ چوڑیاں اور ائیر رنگز پسند ہیں ٹی وی دیکھنے کا شوق ہے گانے بھی سنتی ہوں۔ ایف ایم 96 بہت شوق سے سنتی ہوں مجھے 96 کے آر جے بہت اچھے لگتے ہیں مجھے بارش پسند ہے لیکن صرف دن کے وقت اچھی لگتی ہے ڈریسز میں مجھے شلوار قمیص ساڑھی فراک لہنگا بہت پسند ہے۔ مجھے کرکٹ بہت پسند ہے بہت لمبا تعارف ہوگیا ویسے میں نے سب کو بور بھی بہت کیا ہے نا۔ کوئی بات نہیں برداشت کرنے کا شکریہ میری دعا ہے آپ سب لوگوں اور آنچل کے ساتھ ہیں اللہ آپ سب کو خوش رکھے اور خوشیوں سے ہمکنار کرے آمین دعاؤں میں یاد رکھیے گا خدا حافظ۔

مسز عباس اور اشعر گھبرا کر رو گئے۔ اسپتال میں شور مچ گیا تھا ثانیہ عباس مسلسل چلا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اسے قابو کر کے نیند کا انجکشن دیا گیا تھا کئی دن تک وہ سوتے میں زائر کو پکارتی رہی تھی۔ کسی بھی عورت کی زندگی میں تخلیق کا مرحلہ سب سے بڑا مرحلہ ہوتا ہے۔ سب سے کٹھن اور تکلیف دہ ہر عورت اس مرحلے پر اپنے ہم سفر کو اپنے ساتھ دیکھنا چاہتی ہے مگر...... ثانیہ عباس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بھی اس مرحلے پر زائر کو اپنے ساتھ دیکھنا چاہا تھا مگر...... وہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ بنا اس کی رائے لیے مرضی پوچھے۔ اگلے دو روز میں طلاق کے پیپرز بھی موصول ہو گئے۔

خوابوں کے سمندر کنارے خواہشوں کی ریت سے امید کا جو خوب صورت گھر بنا تھا وہ ڈھے گیا تھا۔ ثانیہ کو لگا جیسے وہ اب زندگی میں کبھی مسکرا نہیں سکے گی اور واقعی پچھلے پانچ سالوں میں کسی نے اسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ بچوں کی پیدائش کے دو ماہ بعد ہی وہ انگلینڈ چلی گئی تھی۔ اس نے ارادہ کیا تھا وہ اب کبھی پاکستان واپس نہیں آئے گی۔ مگر وہ اپنے اس ارادے پر قائم نہیں رہ سکی تھی۔ دو سال پہلے مسز عباس کی رحلت ہوئی تھی اچانک فالج کے حملے کے بعد جسم کے ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ بولنا چاہتی تھیں مگر بول نہیں پاتی تھیں۔ بس آنسو تھے جو بے دریغ بہتے چلے جاتے تھے۔ اسی حالت میں ان کی رحلت ہوئی تھی۔

مسز عباس کے بعد اشعر اس کا واحد سہارا تھا بہت کوشش کی اس نے ثانیہ کو شادی کے لیے رضامند کرنے کی مگر اس کی ناں کو بھی ہاں میں نہیں بدل سکا۔ تنگ آ کر اس نے کسی اور لڑکی سے شادی کر لی۔ ثانیہ اب اپنے باپ کا بزنس سنبھال رہی تھی۔ اس کے بچے بڑے ہو گئے تھے۔ مسز عباس کی رحلت کے بعد پاکستان میں اس کے ددھیال والوں نے اسے پاکستان بلانے کے لیے بہت کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ تاہم اب اپنے دادا اور تایا کی وفات کے بعد جانے اس کے من میں کیا آئی کہ وہ اچانک پاکستان چلی آئی۔ بچے اشعر کے پاس ہی تھے وہ انہیں ساتھ لے کر نہیں آئی تھی کیونکہ وہ پڑھ رہے تھے۔ اس نے انہیں بتا رکھا تھا کہ ان کا باپ پاکستان میں رہتا ہے اسی لیے وہ پاکستان کی سرزمین کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ تاہم جب اسے زائر سے اپنی علیحدگی کا خیال آتا تو اس کے احساسات جیسے برف کے ہو جاتے۔ وہ ٹھان لیتی کہ وہ اس شخص کو کبھی اپنے بچوں کی شکل دیکھنے نہیں دے گی۔ مگر اب یہ ارادہ بھی اسے ریت کی دیوار ثابت ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے بچوں پر مزید ظلم نہیں کر سکتی تھی۔ ان کا باپ زندہ سلامت تھا اور اسی گاؤں میں تھا جہاں تقدیر نے اسے پہنچا دیا تھا۔ بچوں کے امتحان کے بعد خود انگلینڈ جانے کے بجائے وہ انہیں پاکستان بلوانا چاہتی تھی مگر اچانک بگڑ جانے والی طبیعت نے اسے نڈھال کر چھوڑا تھا۔

❁ ❁ ❁

اتنی تیرگی نہ بناؤ میرے اندر محسن
میں چراغ جلاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

رات گہری تاریکی میں ڈھل چکی تھی۔ عائشہ کچن سے فارغ ہونے کے بعد لاؤنج میں ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی۔ کل شام اس کی ساس اپنی بیٹی کے پاس ملک بدر ہو گئی تھی۔ گھر میں ایک دم سے جیسے سناٹا چھا گیا تھا۔ اوپر سے برساتی موسم نے الگ جان نکال رکھی تھی۔ اس نے کئی بار ارتج کا نمبر پریس کیا تھا مگر وہ ریسپانس نہیں دے رہا تھا۔ وقفے وقفے سے گرجتے بادل اس کی جان پر بنا رہے تھے۔ گھر میں ناچتے سناٹے اور تنہائی کے احساس کے ساتھ صوفے پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھی وہ ارتج کی واپسی کی دعائیں کر رہی تھی جب ڈور بیل بج اٹھی۔ لاؤنج سے باہر گیٹ تک کا سفر اس کے لیے ایک پل صراط ثابت ہوا تھا۔

"السلام علیکم!" نشے میں دھت وہ گاڑی سے نکل کر کمرے میں آیا۔ جب وہ گیٹ لاک کرتے ہوئے اس کے پیچھے ہی کمرے میں چلی آئی تھی۔ تاہم وہ اسے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

"ارتج۔" اسے تشویش ہوئی تھی تبھی ارتج نے نشے سے بند ہوتی سرخ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"ہوں۔"

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟"

"ہوں۔"

"کھانا لاؤں آپ کے لیے؟"

"نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"ڈرنک کی ہے آپ نے؟"

"ہوں...... جاؤ نہیں...... پلیز اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ دو میں کچھ دیر سکون چاہتا ہوں۔" نشے میں بھی اس نے خود پر کنٹرول کر رکھا تھا۔ عائشہ پریشان سی اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے نکل گئی۔ اگلے روز فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد اس نے ناشتا تیار کیا اور ارتج کے جاگنے کا انتظار کرنے لگی۔ دن کے بارہ بج گئے تھے مگر وہ کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ تبھی وہ کمرے میں آئی تھی۔

"ارتج۔" اسے بستر میں بے سدھ پڑے دیکھ کر اس نے دھیمی آواز میں پکارا تھا۔ جب اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

"ہوں۔"

"دن کے بارہ بج گئے ہیں اٹھیں گے نہیں۔"

"اٹھ ہی رہا تھا بس ہمت نہیں ہو رہی۔"

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟"

"ہوں۔"

"ناشتا لاؤں آپ کے لیے؟"

"نہیں دل نہیں چاہ رہا۔"

"آپ نے رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔"

"ہوں۔" کہنی کے بل اٹھ کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے سر بیڈ کی پشت گاہ سے ٹکا دیا تھا۔ عائشہ نے دیکھا اس کا چہرہ بے حد ستا ہوا تھا۔ جبکہ آنکھیں شب بیداری یا شاید رونے کی وجہ سے سوج رہی تھیں۔ تبھی وہ بولی۔

"اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا ارتج۔"

"ہاں کہو۔" پٹ سے آنکھیں کھولتے ہوئے اس نے اپنی توجہ اس پر مبذول کی تھی۔

عائشہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

"میں جانتی ہوں آپ اور عائلہ ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ بہت انڈراسٹینڈنگ ہے آپ دونوں کی اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ محبت کے دربار سے دربدری کے بعد انسان ساری عمر بند گلیوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ حالات اور تقدیر کی لہریں جانے کہاں سے کہاں بہا کر لے جاتی ہیں لیکن میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ میری وجہ سے آپ کے اور عائلہ کے خواب ٹوٹیں۔ پلیز آپ میری وجہ سے اپنی اور اس کی زندگی برباد مت کریں۔"

"میں اپنی اور اس کی زندگی برباد نہیں کر رہا عائشہ وہ خود اپنی اور میری زندگی برباد کر رہی ہے۔ تمہیں پتا ہے اس نے اپنی محبت کی قیمت کیا رکھی ہے۔" تمام تر اپنائیت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا تھا۔

عائشہ کے آنسو اس کی پلکوں پر ہی اٹک گئے۔

"کیا؟"

"طلاق، وہ چاہتی ہے میں تمہیں طلاق دے دوں۔"

اس بار ارتج کے الفاظ نے اس کا دل کچل ڈالا تھا وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آنسوؤں کو بہنے سے نہ روک سکی۔

"اس کا مطالبہ کچھ ایسا عجیب بھی نہیں ہے ارتج۔ آپ اس سے محبت کرتے ہیں اور جہاں محبت ہوتی ہے وہاں تقسیم نہیں ہوتی۔ نہ ہی کمپرومائز ہوتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو مگر میں خود غرض انسان نہیں ہوں۔"

"یہ خود غرضی نہیں ہے ارتج۔ تین زندگیوں کا سوال ہے اب تک آپ نے میرا جتنا خیال کیا مجھے جتنا مان اور اہمیت دی اس کے لیے میں ساری زندگی آپ کی مقروض رہوں گی مگر میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ اس احسان کے بدلے میں آپ کو ساری عمر کی بے سکونی اور آنسو دے دوں۔ مجھے محض اپنا نام دے کر آپ ہر لمحہ اس کی یادوں میں نڈھال شراب کے نشے میں مدہوش رہیں۔ آپ بہت اچھے انسان ہیں ارتج بہت ہمدرد اور نیک دل ہیں میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے ایسے نیک دل انسان کی خوشیوں کو گہن لگے۔ میں کہیں نہ کہیں جاب کر کے رہ لوں گی۔ مگر پلیز آپ میری وجہ سے اپنے خوابوں کا سودا مت کریں پلیز۔" جتنے لفظ اس کے لبوں سے نکل رہے تھے اتنے ہی آنسو اس کی آنکھیں لٹا رہی تھیں۔

ارتج گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"میں محبت کو روگ بنا کر زندگی برباد کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں عائشہ پریکٹیکل سا بندہ ہوں میں میرا ایمان ہے آپ لاکھ جتن کر لیں مگر آپ کو وہی ملتا ہے جو آپ کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔ میں عائلہ کی محبت سے دستبردار نہیں ہوا۔ بہت پرانا ساتھ ہے ہمارا مگر وہ میرے نصیب میں نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو میرا نکاح تم سے کبھی نہ

ہوتا۔ تقدیر پر شاکر رہنے والا بندہ ہوں میں خدا کے فیصلوں کو مانتا ہوں۔ اس نے اگر عائلہ کی جگہ تمہیں میری قسمت میں لکھا ہے تو اس میں ضرور اس کی کوئی حکمت ہی ہوگی۔ میں رشتوں کو ریت کے دیوار نہیں سمجھتا کہ جب دل چاہا بنا لیں جب دل چاہا گرا دیں۔ جب بزرگوں لوگوں کے سامنے اپنے نام کا تحفظ دینے کا وعدہ کیا ہے تو اس وعدے کو پورا بھی کروں گا۔ تمہارا کوئی قصور نہیں کہ ہمیشہ در بدر کی ٹھوکریں تمہارے نصیب کا حصہ بنی رہیں۔ جہاں تک ڈرنک کا سوال ہے تو میں لب سے نہیں کرتا بہت سال ہو گئے اس وقت شروع کی تھی۔ شاید چھٹی یا ساتویں میں پڑھتا تھا اماں کی رحلت ہوئی تھی اور بابا میرا کی ماں کو ہماری اسٹیپ مدر بنا کر لے آئے میرے ذہن نے اسے قبول نہیں کیا اور شاید کمال بھائی اور جمال بھائی کے ذہن نے بھی۔ اسی لیے ہمارے ماموں ہمیں وہاں سے لے گئے۔ سوتیلی ماں تو تمہیں پتا ہے سوتیلی ہی ہوتی ہے۔ اس نے ہمیں روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ماموں شرابی تھے اور دیگر نشہ بھی کرتے تھے انہوں نے ہمیں بھی اسی کام پر لگا دیا۔ وہ تین سال کے بعد ان کے بیٹے نے کمال بھائی کو دبئی بلوا لیا۔ جمال بھائی کو ہیپاٹائٹس ہوا تو پھر وہ ٹھیک ہی نہیں ہوئے۔ علاج میں سستی اور غیر مناسب دیکھ بھال نے انہیں پاگل کر دیا تب بابا اسے گھر لے گئے۔ مجھے ماموں نے کمال بھائی کے پاس دبئی بھجوا دیا۔ سالوں وہیں رہا ہوں میں اور سچ پوچھو تو اگر بابا کی رحلت کے بعد اماں، جمال بھائی کی شادی والا کارنامہ سرانجام نہ دیتیں تو شاید میں کبھی پاکستان نہ آتا۔ عائلہ اور میری محبت بھی دبئی میں ہی پروان چڑھی تھی۔ بہرحال میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ ڈرنک کر کے گھر نہیں آؤں گا۔"

اپنا مختصر بائیوڈیٹا بتانے کے بعد اس نے نرمی سے عائشہ کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"میں نہیں جانتا عائشہ کہ تم نے زندگی میں کسی سے محبت کی ہے یا نہیں مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ محبت کو کھو کر زندہ رہنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔ بڑی تبدیلیاں آ جاتی ہیں انسان کے اندر ہو سکتا ہے میں بھی کچھ معاملات میں غفلت برت جاؤں اگر ایسا ہو جائے تو پلیز معاف کر دینا تم بہت اچھی لڑکی ہو بہت سلیقہ مند اور خوب صورت کوئی بھی بہترین سے بہترین شخص تمہارا ہم سفر ہو سکتا تھا میں کوشش کروں گا خود کو تمہارا بہترین ہم سفر ثابت کرنے کی۔ کیونکہ جو کچھ بھی ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں میں نے جو کیا اللہ کی رضا کے لیے کیا اور اللہ جو کرتا ہے بہترین کرتا ہے بے شک وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔" ٹوٹے ٹھہرے سے گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اس کے ہاتھ سہلائے تھے عائشہ بمشکل اپنے آنسو پیتے ہوئے خاموش بیٹھی رہی۔ تبھی وہ پھر بولا۔

"مجھے بولڈ اور خود اعتماد لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ میں چاہوں گا تم اسی طرح رہو پُراعتماد اور مضبوط۔"

"جی۔"

"کل چلو اب ناشتا کرو میں تو صرف چائے پیوں گا بلکہ اس کے لیے بھی ابھی دل نہیں چاہ رہا تم ایسا کرو پلیز میرے سینے پر سر رکھ کر لیٹ جاؤ میں تمہارے بال سہلاتا ہوں۔" عائشہ اس شخص کی اندرونی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ خود بھی اسی تکلیف سے گزری تھی۔ شاید بھی اس نے اس کے حکم پر خاموشی سے عمل کیا تھا۔

"بہت سے معاملات انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے عائش! ان کے معاملے میں اسے اپنی تقدیر پر راضی بارضا رہنا پڑتا ہے۔ تم سمجھ لینا اللہ نے ہمارا ملنا بھی ایسے ہی لکھا تھا۔" مدت کے بعد کسی نے اسے "عائش" کہہ کر پکارا تھا۔ اس کی آنکھیں یکلخت آنسوؤں سے بھر آئیں۔ بکھرے ہوئے وجود اور احساسات میں ایک بھونچال اٹھا تھا۔

اس نے چھو کر مجھے پتھر سے پھر انسان کیا
مدتوں بعد میری آنکھوں میں آنسو آئے

کسک کچھ بھی نہیں تھی۔
نقصان کوئی بھی نہیں تھا۔
کہیں کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

مگر پھر بھی وہ ارتج کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ میکال حسن سے جدائی اور اپنے رشتوں کی بے حسی کا سارا دکھ اس نے آنسوؤں کی صورت میں ارتج کے سینے پر بہایا تھا۔ وہ امتحان جو اس کے دل نے اس سے لیا تھا بے شک وہ اس امتحان میں سرخرو ٹھہری تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

جھیل، کنارے، کنکر
نازیہ کنول نازی

دل میں جو بات ہے وہ دل میں دبی رہنے دے
مرے ہونٹوں پہ شکایات رُکی رہنے دے
جانے دے مجھ کو تجھے میری محبت کی قسم
ایک ہلکی سی ملاقات کبھی رہنے دے

کچی بستی کے بام ودر پر
اترتی جاڑے کی زرد شام میں
شفق کی گہری اداس شاموں میں دھیرے
دھیرے سمٹتا سورج
میں بالکونی میں زرد ہوتے گلابی پھولوں کو دیکھتی ہوں
تو سوچتی ہوں......
گھروں سے اٹھتے دھوئیں کے بادل فضا میں
تحلیل ہورہے ہیں
نجانے ایسے اداس موسم میں تم کہاں ہو؟
چلے بھی آؤ کہ اب اداسی کی شال اوڑھے
سسکتے ماہتاب کی نگاہوں میں
تیرے ہجر وفراق کا دکھ لکھا ہوا ہے
چلے بھی آؤ کہ اب تو راہوں کے نرم جگنو بھی سو
گئے ہیں
چلے بھی آؤ کہ روتے روتے یہ آنسو پتھر کے
ہوگئے ہیں

دن ڈھل رہا تھا۔ غروب ہوتے سورج کی نارنجی کرنیں شہر خاموشاں کی چھوٹی سی دیوار کے اس پار اداسی کے کفن میں لپٹی سسکتی محسوس ہورہی تھیں۔ تھکے تھکے قدموں کو بمشکل گھسیٹتی آج بہت دنوں کے بعد وہ مٹی کے اس ڈھیر کے قریب آئی تھی جہاں اس کی تمام حسرتیں اور خواب دفن تھے۔

بہت دنوں کے بعد پتھرائی نگاہوں سے آنسوؤں کا ریلا یوں جاری ہوا تھا جیسے کسی خشک جھیل میں صدیوں کے بعد پانی کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بلیک چادر جھٹ کندھوں سے یہی نہیں سر سے بھی ڈھلک گئی تھی مگر اسے خبر ہی کہاں تھی؟ ٹوٹ ٹوٹ کر بہتے آنسوؤں کی دھند میں قبر کی خشک مٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ جیسے ڈھے گئی تھی۔

"کیسے ہو ایاد؟ میں جانتی ہوں آپ مجھ سے ناراض ہو آپ کو ناراض ہونا بھی چاہیے مگر میں کیا کروں دنیا بہت تنگ پڑ گئی ہے مجھ پر۔ ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں دنیا میں رہوں اور آپ کو بھول جاؤں۔" ٹپ...... ٹپ...... ٹپ گرتے آنسوؤں کے ساتھ قبر کی خشک مٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا گلا جیسے رندھ گیا تھا۔

کون تھا کائنات میں جو اس کے دل کے درد کو جانتا سوائے اللہ کے۔

حکومتوں کی نااہلی اور آپس کی جنگ میں کھی مچھروں کی طرح مرتے عوام اور سسکتے دنوں کی کہانی کو کون جان سکتا تھا؟ سوائے اللہ کے۔

ڈھلتی شام کے ساتھ اس کا دل بھی جیسے ڈوبتا جا رہا تھا۔

سرد روسیا الجھا لہجہ
کھوئی آنکھیں ٹھنڈے ہاتھ
بےرنگ چہرہ بداخلاق

دیکھو تم بن کون ہوں میں؟

"ایاد عبدالھدی" کے بغیر ساری دنیا جیسے اس کے لیے بے معنی ہوکر رہ گئی تھی۔ دنیا کے سپرد کر کے گیا تھا وہ شخص اسے؟

اس دنیا کے کہ جس سے اس کی کبھی بنی ہی نہیں تھی؟

وہ دنیا جو کبھی کسی کی ہوئی ہی نہیں؟

اس کے تو سارے سلسلے اب بھی مٹی کے اسی ایک ڈھیر سے وابستہ تھے۔

دنیا میں ہوتے ہوئے بھی وہ دنیا میں نہیں تھی۔ اس کا وجود عالم برزخ میں لٹک کر رہ گیا تھا۔ روز لمحوں کی برچھیاں اس کا وجود چیرتی تھیں۔

آتی جاتی سانسوں کی مالا میں اٹکی روح روز کانٹوں کے بستر پر ادھڑتی تھی اور سمٹ جاتی تھی حورعین عبدالسمیع کیا تھی اور کیا ہوکر رہ گئی تھی۔ آسمان گھنگھور بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔ تبھی اس کی نظریں اوپر آسمان کی طرف اٹھیں۔

"اللہ......!" بہت دنوں کے بعد بہت اذیت کے عالم میں اس نے اپنے معبود حقیقی کو پکارا تھا۔ کیا نہیں تھا اس پکار میں۔

درد......
تڑپ......
کسک......
بےبسی......

انسان جب ساری دنیا سے مایوس ہوکر تھک جاتا ہے تو اسے اللہ یاد آتا ہے اور وہ بھی دنیا سے مایوس ہوئی تھی۔ اسے بھی اللہ یاد آرہا تھا۔ اسے خبر ہی نہیں رہی تھی کہ وہ کہاں ہے کیوں ہے؟ تبھی کسی نے اسے پکارا۔

"بی بی۔" حورعین نے اس پکار پر فوراً گردن پھیر کر دیکھا۔ بے حد رف کپڑوں میں ملبوس قبرستان کا بوڑھا گورکن لوگوں کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچاتے پہنچاتے خود تھکن سے نڈھال ہورہا تھا۔

"موسم ٹھیک نہیں ہے بیٹی دن بھی ڈھل رہا ہے اکیلی عورت کا اس وقت قبرستان میں آنا اچھی بات نہیں ہے۔" اس کے گردن موڑ کر دیکھنے پر اس ادھیڑ عمر گورکن نے اسے تلقین کی تھی۔

حورعین اس کی ہدایت پر آہستہ سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے سر جھکا گئی۔

کیا ایاد عبدالھدی سے ملنے کے لیے اس کے دل کو موسموں کے مزاج کی پروا تھی؟

گورکن اسے گھر واپسی کی تلقین کرنے کے بعد اپنی راہ پر چل پڑا تھا۔ وہ بے بس سی سر جھکائے بیٹھی ایاد عبدالھدی کی قبر کی خشک مٹی کو اپنے آنسو دان کرتی رہی۔ آج پہلی بار اس نے مٹی کے اس ڈھیر سے باتیں نہیں کی تھیں۔

آج پہلی بار اس کے پاس ایاد عبدالھدی کو دان کرنے کے لیے پھول نہیں تھے۔ قبرستان سے گھر واپسی کے سفر میں صرف تھکن اس کے ہمراہ تھی۔

❁ ❁ ❁

آسمان گدلے بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔

قبرستان سے گھر پہنچنے تک وہ ناصرف ہانپ گئی تھی بلکہ بری طرح بارش میں بھیگ بھی گئی تھی۔ اسے لگا جیسے بارش کی صورت کسی نے اپنے صدیوں سے رکے آنسو بہائے ہوں۔ لاؤنج میں آئی تو سب لوگ جیسے اسی کا انتظار کررہے تھے۔

"حورعین بیٹی کہاں رہ گئی تھیں؟ دیکھو سب لوگ کتنا پریشان ہورہے ہیں تمہارے لیے۔" بڑی ماں کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی وہ بول اٹھیں۔

حورعین کے لیے اپنی واپسی کی وضاحت کرنا

مشکل ہوگیا۔ وہاں بیٹھے افراد میں کوئی شخص بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گئی تھی اور کیوں؟؟ "سوری وہ موسم خراب ہوگیا تھا ٹیکسی نہیں ملی تو پیدل گھر آنا پڑا۔"

"ارے ایسی بات تھی تو فون کردیتیں بیٹے" نمیر دو بار مارکیٹ جاکر تمہارا پتا کرکے آیا ہے۔"

"سوری دادو میں سیل فون ساتھ لے کر نہیں گئی تھی۔ اگلی بار خیال رکھوں گی۔"

"اچھی بات ہے چلو اندر جاکر جلدی سے کپڑے تبدیل کرلو یہ بھوکے لڑکے تمہارے انتظار میں یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے ہیں۔"

"جی ٹھیک ہے۔" اگلے ہی پل نئے حکم پر سوائے سر جھکانے کے اس کے پاس اور کوئی چارا نہیں تھا۔ حالانکہ اس وقت سوائے بستر میں گر کر ڈھیر سارا رونے کے اس کا اور کسی کام کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کتنے زخم تھے جو رس رہے تھے مگر اسے ان سب کو خوش رکھنا تھا۔ واقعی دنیا کتنی تنگ پڑ گئی تھی اس پر کتنے گھاؤ تھے جو ناسور بن کر روح کو چاٹنے لگے تھے۔

چپ چاپ کچن میں آکر اس نے مٹر پلاؤ کی تیاری شروع کردی۔ اس گھر میں پناہ اور اپنی عزت و جان کی حفاظت کے لیے اسے اس گھر کے مکینوں کی خوشی اور آرام کا خیال تو رکھنا ہی تھا۔ اگلے پینتالیس منٹ میں اس نے کھانا ٹیبل پر لگا دیا۔ سب رغبت سے کھا رہے تھے اور اس کی خوب تعریف بھی ہو رہی تھی۔ مگر حورعین کا دل اس وقت کسی چیز کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ اسے ایاد عبدالھدی کی یاد ٹوٹ کر آرہی تھی۔

کھانے کے بعد جس وقت وہ سب کو چائے سرو کر رہی تھی عمیر نے اس کی بھیگی ہوئی پلکوں کو بغور دیکھا یہی وجہ تھی کہ چھٹکو (زبیر) کو ہوم ورک کروانے کے بعد وہ کچن میں اس کے پاس چلا آیا تھا۔

"السلام علیکم۔"

حورعین جو رونے کے ساتھ ساتھ سر جھکائے برتن دھو رہی تھی اس کے سلام پر جلدی سے آنسو پونچھ گئی۔

"وعلیکم السلام۔"

"میں برتن دھونے میں مدد کرواؤں آپ کی؟"

"نن...... نہیں۔" وہ آفر کر رہا تھا اس نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔ تبھی وہ کپڑا اٹھا کر دھلے ہوئے برتنوں کو خشک کرنے لگ گیا۔

"عمیر میں کرلوں گی خود تم اپنے کام نبٹالو۔"

"نہیں آپی میں باقی سب لوگوں کی طرح خود غرض اور کمینہ نہیں ہوں۔"

"پاگل ایسا نہیں کہتے۔"

"ٹھیک ہے مگر آپ رو کیوں رہی ہیں کیا خذیر بھائی نے کچھ کہا ہے یا پھر گھر کی یاد آرہی ہے؟"

"گھر...... گھر تو میرا رہا ہی نہیں۔ کتنے ماہ ہوگئے زمانے کی ٹھوکروں میں پڑے ہوئے۔"

"تو پھر خذیر بھائی نے کچھ کہا ہے؟"

ذرا سا سر جھکاتے ہوئے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ حورعین نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں انہوں نے کیوں کچھ کہنا ہے؟"

"کچھ کہنے کے لیے وجہ کی ضرورت تو نہیں ہوتی میری پیاری بہن' بے قصور بھی بہت کچھ ہوجاتا ہے۔ جیسے پرسوں جیل کی تاریک بیرک میں شہزاد کی موت ہوگئی۔ اس شہزاد کی جس نے قطعی بے گناہ ہوتے ہوئے سالوں جیل کاٹی' ماریں کھائیں' اپنی زمین گنوا کر نمبردار کو راضی کیا' انصاف کے حصول کے لیے آہنی سلاخوں سے سر ٹکراتے ٹکراتے پاگل ہوا اور بالآخر مر گیا۔ پتا نہیں روزانہ ہی تاریک کوٹھریوں میں ایسے کتنے ہی شہزاد جینے کی حسرت دل میں لیے اذیت اور بے بسی کی موت کو گلے لگاتے ہوں گے۔

کتنا ذہین اور باصلاحیت نوجوان تھا۔ اے کاش کسی ترقی یافتہ ملک میں پیدا ہوتا تو ایسی بے بسی کی موت نہ مرتا۔" عمیر کے لہجے میں دکھ کی آمیزش تھی۔

حورعین اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"یہاں صرف ایک شہزاد کی موت کا مسئلہ نہیں ہے عمیر' ہمارا المیہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے لوگوں کے ذہن بے حسی میں بہت پختہ ہوگئے ہیں کوئی کتنا ہی مظلوم' بے گناہ' باصلاحیت اور نامساعد تقدیر و حالات کا مارا ہو یہاں ہم لوگوں کے ذہنوں میں ان بے بس بدنصیب قیدیوں کے لیے سوائے نفرت کے اور کچھ نہیں۔ یہی سوچ بن گئی ہے ہماری کہ جس پر کوئی جرم عائد ہوگیا وہ مجرم ہے' خواہ اس نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو ہماری فرض شناس پولیس نے اگر کسی کو حصار میں لے لیا تو مرتے دم تک وہ شخص نہ ہماری نگاہوں میں معتبر ہوتا ہے نہ ہم اسے کسی انسانیت' کسی ہمدردی کے قابل سمجھتے ہیں۔"

وہ جذباتی ہوئی تھی اور عمیر ان جذبات کی قدر کرتا تھا۔ تبھی کپڑا اسائیڈ پر رکھتے ہوئے بولا تھا۔

"جی ہاں' صحیح کہہ رہی ہیں آپ ہمارے ذہن ایسے بنا دیے گئے ہیں کہ لفظ قیدی سے ہم نے صرف نفرت کرنی ہے۔ ہمیں کوئی دلچسپی نہیں اس چیز میں کوئی کن حالات میں قانون کی بھینٹ چڑھا۔ کسی کو اس کے قصور پر سزا ہوئی یا یونہی بے قصور پھنسا دیا گیا۔ کوئی حوالہ یاد نہیں آتا ہمیں اپنے دین کا کہ ہمارے دین میں ہمارے پیارے نبیؐ اور ان کے بعد جتنی بھی نیک اور برگزیدہ ہستیاں دنیا میں آئیں انہوں نے قید میں آنے والے لوگوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا؟ لوگ اپنے کتوں کا بھی خیال رکھتے ہیں مگر ہمارے ہاں' گرمی کے قہر برساتے مہینوں میں بجلی تو ایک طرف پینے کو پانی بھی نہیں دیا جاتا ان بدنصیب مجبوروں کو...... گندے غسل خانوں اور لیٹرینوں میں پانی کے دو گھونٹ پینے کے لیے گھنٹوں سلاخیں پکڑ کر شور مچاتے ہیں آوازیں لگاتے ہیں گرمی اور مچھروں سے پریشان چھوٹے چھوٹے قبرنما سیلوں میں ساری ساری رات گریہ زاری کرتے ہیں کاش میں آپ کو بتا سکتا کہ گرمی ان بدنصیب قیدیوں کے لیے کیسا عذاب لے کر آتی ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے عمیر' بھلا مجھ سے زیادہ قید کی صعوبتوں کو کون جان سکتا ہے؟" رخ پھیرتے ہوئے بہت مدھم لہجے میں اس نے جیسے سرگوشی کی تھی۔ کیسے کیسے مناظر تھے جو ذہن کی اسکرین پر جھلملائے تھے۔

"تم نہیں جانتے عمیر' جیلیں خواہ امریکا کی ہوں' بھارت کی یا پاکستان کی دوزخ کا دوسرا روپ ہیں دنیا میں اور وہ لوگ جن کا یہاں اختیار چلتا ہے جہنم کے داروغوں سے کم نہیں ہیں۔ فانی دنیا میں عارضی طاقت اور اختیار کے نشے میں مست لوگ بے بس انسانوں پر قہر ڈھاتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ وقت جیسی ظالم چیز نے تو نمرود' فرعون اور قارون جیسے لوگوں کو عبرت بنا کر رکھ دیا یہ کیا چیز ہیں؟"

"بالکل سچ کہا آپ نے اب دیکھیے نا اکثر کیسز میں میں نے دیکھا ہے کہ اگر ایک عدالت نے فیصلہ سنا دیا تو دوسری عدالت اس فیصلے کو چیلنج ہی نہیں کرتی بلکہ اس عدالت کے فیصلے کا احترام کرتے ہوئے بنا نظرثانی کیے اسے ویسے ہی برقرار رکھتی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ میں توہین عدالت نہیں کر رہا۔ مگر مجھے دکھ ہے ایک انسان ہوتے ہوئے ہم کسی دوسرے انسان کی زندگی کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے جبکہ میں نے کہیں پڑھا تھا کسی بوڑھی عورت پر ظلم ہوا تھا تو اس نے بادشاہ کی سواری کو راہ میں روک کر اس

سے پوچھا تھا کہ تم میرا انصاف نہیں کرو گے یا روز محشر خدا کے سامنے تمہارا گریبان پکڑوں؟ اور وہ بادشاہ بڑھیا کی بات سن کر کانپ اٹھا تھا مگر اب شاید ان باتوں پر توجہ دینے کی فرصت بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔"

"یہی تو ساری بات ہے عمیر مشرکین کو کیا کہیں یہاں قرآن اور کلمہ پڑھنے والوں کو بھی آخرت کا کوئی خوف نہیں' تم دیکھو سعودیہ میں خالص اسلامی قانون نافذ ہے کسی کی مجال نہیں کہ وہاں ذاتی عناد یا دشمنی میں کسی بھی شخص پر جھوٹا الزام لگا کر اسے سزا کروا سکے۔ معمولی سے معمولی کیس کی چھان بین بھی یوں ہوتی ہے کہ کسی کو مورد الزام ٹھہرا کر پھنسانے والا الٹا خود اپنے جال میں پھنس کر عبرت پا جاتا ہے۔ کاش یہاں بھی ایسا ہی کوئی سسٹم ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا' مگر...... یہاں غیر ملکیوں کے لیے رحم کی گنجائش ہے ان کی اپیلیں قبول بھی ہو جاتی ہیں اور سزائیں بھی معاف ہو جاتی ہیں مگر اپنے شہریوں کے لیے کہیں کسی رحم کی گنجائش نہیں ان کے لیے تو صرف سزا ہے قہر ہے اور بس......!"

"ہاں یہی تو بات ہے...... کسی بھی ملک میں کسی بھی مذہب میں انسانیت کا درجہ پہلے نمبر پر ہے مگر یہاں دنیا میں سب سے زیادہ امن پسندی اور جمہوریت کا نعرہ لگانے والوں نے بھی سب سے زیادہ انسانیت کی مٹی پلید کر رکھی ہے۔ کتے کے پلوں کے لیے بھی نرم دل رکھنے والوں نے انسانوں کے ساتھ وہ سلوک کیے ہیں کہ خود انسان کو اپنے انسان ہونے پر شرمندگی ہے ذرا سوچیں' آج انسانیت کو سائیڈ پر رکھ کر بے گناہوں پر قہر ڈھانے والے روز محشر بادشاہ کائنات کے سب سے بڑے منصف کے سامنے کس منہ سے رحم کی اپیل کر سکیں گے؟" وہ

کہہ رہا تھا حورعین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ اس کے ذہن میں اس وقت مہدی حسن کی سدابہار آواز گونج رہی تھی۔

"چاند میری زمیں' پھول میرا وطن
میرے کھیتوں کی مٹی میں لعل و یمن
چاند میری زمیں' پھول میرا وطن
میرے ملاح لہروں کے پالے ہوئے
میرے دہقاں پسینوں کے ڈھالے ہوئے
میرے فوجی جواں' جرأتوں کے نشاں
میرے اہل قلم عظمتوں کی زباں
میرے مزدور اس دور کے کوہ کن
چاند میری زمیں' پھول میرا وطن

"کتنی عجیب بات ہے نا آپی ہمارا ملک اسلامی ہے یہاں اللہ کا قانون سب سے بڑا قانون ہے مگر پھر بھی ہم اپنے معاملات زندگی میں تقلید ان لوگوں کی کر رہے ہیں جو اسلام اور مسلمان دونوں کے دشمن ہیں۔ جن کی آنکھ میں اللہ اور اس کے پیارے رسول محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والے کنکر بن کر چبھ رہے ہیں۔ اب ایک طرف وہ ہمیں مار رہے ہیں اور دوسری طرف ہم خود اپنے آپ کو مار رہے ہیں۔ موت دونوں طرف مسلمان کی ہو رہی ہے اور بدنامی کا طوق پھر بھی ہمارے ہی گلے میں فٹ ہے۔ آپ دیکھیے آپی صرف ایک ورلڈ ٹریڈ سینٹر تباہ ہوا اس میں بھی ہم ملوث نہیں تھے مگر اس کے باوجود وہاں کے ناخداؤں نے بدلے میں سیکڑوں' ہزاروں نہیں لاکھوں مسلمانوں کو چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیا کون لے گا اس کا حساب؟"

"اللہ......!" عمیر کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے لب پکار اٹھے۔

"تم کیا سمجھتے ہو عمیر! یہ جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے اللہ کے نیک اور پرہیزگار بندوں کے ساتھ ہو رہا ہے شیر اور گیدڑ کو ایک ہی گھاٹ پر لا کر پانی پلایا جا رہا ہے اللہ اس سے بے خبر ہے؟ نہیں! اس رحمٰن و رحیم کی ایک صفت جبار و قہار بھی ہے اس کا قہر جب برستا ہے تو زمین بھی تھر تھر کانپ اٹھتی ہے۔ سمندر کے بازو پھیلتے ہیں اور چلتے پھرتے لوگ اس کی لامحدود گہرائیوں میں جا چھپتے ہیں۔ وہ پاک ذات بے خبر نہیں ہے عمیر سارے عمل لکھے جا رہے ہیں چھوٹے سے چھوٹا ہر عمل اس کی نگاہ میں ہے ایک ایک جان ایک ایک خون کے قطرے کا حساب لے گا وہ۔ بہت پیار ہے اسے اپنے بندوں سے اور اختیار سارا صرف اللہ کا ہے وہ اپنے معصوم بندوں کا خون رائیگاں نہیں جانے دے گا۔ یہ ظلم یہ فسادات یہ انسانی درندگی یہ ہماری شکست یا ہمارا عبرت ناک انجام نہیں ہے عمیر! آزمائش ہے ہماری امتحان ہے۔ وہ واحد و لاشریک! اسی طرح اپنے بندوں کو کڑی آزمائشوں میں ڈال کر ان کا ایمان آزماتا ہے اور پھر جو لوگ راہِ حق سے بھٹک جاتے ہیں ان منافقین کو علیحدہ کر لیتا ہے۔ ہمیں کوئی ملال نہیں ہے عمیر اللہ نے مومنوں کی جان جنت کے بدلے خرید لی ہے۔ ہمیں جنت کے بدلے نفس کا سودا مہنگا نہیں ہے ہماری آخرت ابھی باقی ہے۔ بادشاہوں کے بادشاہ کے حضور ہمارا حساب اور انصاف ابھی باقی ہے۔ ہماری شاندار تاریخ ہمارا فخریہ حوالہ ہے۔ کسی میں دم نہیں کہ مسلمانوں کے خون کو پانی کی طرح بہا سکے سوائے خود مسلمانوں کی مدد کے یہ صدی یہود و نصاریٰ کی فتوحات اور عروج کی صدی ہے عمیر! دنیا کا قالین سمٹ رہا ہے اللہ دیکھ رہا ہے کون اس کا ہے اور کون اس کے دشمنوں کا۔ ورنہ یہی یہود و نصاریٰ تھے جن پر صدیوں مسلمان حکمرانوں نے حکومت کی اور اپنے دورِ حکومت میں بہترین امن اور انصاف کی یادگار مثالیں قائم کیں یہی تھے جو عاجزی سے ہمارے آباؤ اجداد کے شاندار درباروں میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ آپس میں بھی لڑ پڑتے تو انصاف کے لیے ہمارے ہی آباؤ اجداد کے در کھٹکھٹاتے تھے مگر آج وقت ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے اسی لیے یہ لوگ ہمارے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کر سکتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے ماضی میں انہوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔ بیت المقدس کی فتوحات کے موقع پر صلیب کے پرستاروں نے اپنے گھوڑوں کے سم مسلمانوں کے خون سے تر بتر کر دیے مگر اسی بیت المقدس کو جب صلاح الدین ایوبی نے فتح کیا تو وہاں امن و عدل کی وہ مثالیں قائم کیں کہ خود ان کے آباؤ اجداد ان کے مورخ بھی اس کے معترف ہیں آج پھر ان کے عروج کا دور ہے عمیر۔ اسی لیے فلسطین عراق برما افغانستان شام فلسطین لیبیا اور کتنے ہی ایسے کمزور ممالک کا چپہ چپہ چلا چلا کر ان کے مظالم اور انسانی دشمنی کا پول کھول رہے ہیں۔ یہ ہمیں کہتے ہیں کہ ہم دہشت گرد ہیں۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ دہشت گرد ہم نہیں یہ ہیں۔ دنیا کے امن کو ہم نے نہیں انہوں نے نقصان پہنچایا ہے۔ ہمارا مذہب تو امن کا مذہب ہے وہ مذہب ہے جس کا فائدہ اٹھا کر خود انہی نے امن اور سلامتی پائی جگہ جگہ تاریخ کے پنوں میں ہماری عظمتوں اور کامرانیوں کی مثالیں چھپی ہوئی ہیں۔ اندلس کی سرزمین ہو یا فلسطین کی ہندوستان ہو یا بحیرہ قلزم تاریخ گواہ ہے ہم نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی بہترین سلوک کیا۔ ہمارے مجاہد آج بھی وہی ہیں۔ اگر یہ لوگ ہمارے خون کو پانی کی طرح نہ بہائیں ہماری عزتوں کو پامال نہ کریں بے قصور ہم پر قہر نہ ڈھائیں تو ہم بھی اپنی صلاحیتوں اپنی ہنرمندی اپنی تعلیم کو بروئے کار لا کر امن و سکون کی زندگی جئیں۔ ہمیں صحراؤں کی خاک چھاننے اور سنگلاخ پہاڑوں میں رلنے کا شوق نہیں ہے۔ مگر افسوس ہمارے موجودہ سالاروں نے دنیاوی مفادات کے لیے ہماری جانوں کے سودے کر دیے ہیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم خود پر ہونے والے مظالم کا مقابلہ خود بندوق اٹھا کر کریں۔ ورنہ امن و سکون کی زندگی کسے اچھی نہیں لگتی؟"

"صحیح کہہ رہی ہیں آپی! چوٹ لگتی ہے تو پتھر بھی صدا دیتے ہیں ہم تو پھر جیتے جاگتے انسان ہیں کتنی دلچسپ حقیقت ہے نا کہ اگر دنیا کے کسی مسلمان کے ہاتھوں کسی امریکی کسی اسرائیلی کسی بھارتی کو نقصان پہنچتا ہے تو ساری دنیا میں کھلبلی مچ جاتی ہے ایک فرد کی جان کے بدلے دس مسلمانوں کو مار کر غصے کی آگ ٹھنڈی کی جاتی ہے مگر دوسری طرف اگر کوئی پاکستانی کوئی عراقی کوئی کشمیری کوئی افغانی ان ممالک کے مظالم پر ان سے نفرت کا اظہار بھی کرتا ہے تو اس پر فوراً دہشت گردی کی مہر لگ جاتی ہے۔ ساری دنیا کے سامنے بنا کسی جرم اور قصور کے اس پر جھوٹے مقدمات بنا کر اسے تڑپا تڑپا کر مار دیا جاتا ہے۔ مگر کہیں کوئی کھلبلی نہیں مچتی 58 قبروں میں گہری میٹھی نیند سوئے ہمارے مسلم ممالک یوں خاموشی اور بے بسی سے تماشہ دیکھتے رہ جاتے ہیں جیسے روزِ قیامت انہیں اللہ رب العزت کے حضور حاضر ہی نہیں ہونا۔ طاقت کے بل بوتے پر چاہے یہ ساری دنیا کو ادھیڑ کر رکھ دیں کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں۔ ان کی امن پسندی پر کوئی حرف ہی نہیں آتا۔"

"یہی تو دکھ ہے عمیر...... یہ وطنِ عزیز...... یہ زمین کا پیارا ٹکڑا اس کی مثال بس ایک زخمی پرندے کی سی ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس والے جنگلی قانون کے باعث یہاں کے شیر چیتے اور گدھوں کے منہ کو اس زخمی پرندے کا خون لگ چکا ہے۔ اسی لیے اگر انہیں دربدری کے باوجود جان خطرے میں ڈال کر بھی یہاں آنا پڑتا ہے تو وہ آتے ہیں اقتدار کا لالچ انہیں ہزار آسائشات کے باوجود دیارِ غیر میں سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ بس اب قیامت آ جائے اللہ رب العزت کی عدالت لگے اور سارا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں آپی جس اخلاقی پسماندگی میں ہم گر چکے ہیں ایک اسلامی ملک میں غیر اسلامی روایات کو پروان چڑھا کر روز اللہ کے قہر کو آواز دے رہے ہیں اس سے تو یہی بہتر ہے کہ بس اب اللہ کا انصاف دیکھیں۔"

"ہوں! زبیر کو ہوم ورک کروایا؟"

"جی کروا دیا ہے لیکن مما کی رحلت کے بعد وہ بہت چپ ہو کر رہ گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ اسے ٹائم دیں اسے ایک نارمل لائف کی طرف لے کر آئیں۔" حورعین کے موضوع بدلنے پر اس نے بھی گفتگو کا رخ پھیر دیا۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

اس روز کے بعد وہ اپنا زیادہ ٹائم زبیر کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔ اسے اسکول کے لیے خود تیار کرتی کھانا کھلاتی ہوم ورک اپنی نگرانی میں کرواتی اور رات میں کہانی سنا کر اسے اپنے ساتھ ہی سلا لیتی کچھ ہی دنوں میں وہ اس سے بہت کلوز ہو گیا۔

سارا گھر اس سے بے حد خوش تھا۔ دادی عذیر کا منہ چومتی نہیں تھکتی تھیں کہ اس نے اتنی اچھی اور قابل لڑکی کا انتخاب کیا اور وہ ہر بار شرمندہ ہو کر رہ جاتا۔ حورعین رفتہ رفتہ جس طرح سے اس گھر کے مکینوں

کے دلوں میں اپنا مقام بنا رہی تھی وہ الجھتا جا رہا تھا سلمٰی سے بھی اس کی لڑائی ہوگئی تھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

اس روز وہ آفس سے گھر آیا تو حورعین زبیر کے ساتھ اس کے کمرے میں بیٹھی اسے کہانی سنا رہی تھی۔

"ایک وادی تھی بہت خوب صورت سرسبز وہاں سب بہت خوش رہتے تھے۔ وہاں کا بادشاہ مسلمان تھا اور اپنی ساری رعایا کے ساتھ بہت اچھا اور انصاف کا سلوک کرتا تھا دوسرے مذہبوں کے لوگ بھی اپنے ہم مذہبوں کے ہاتھوں پریشان اس کے پاس انصاف کے لیے آتے اور خوش ہوکر جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ بادشاہ کمزور اور بوڑھا ہوتا گیا بادشاہ کے جو بچے تھے وہ لاابالی اور بے نیاز قسم کی طبیعت کے مالک تھے۔ پھر اچانک ایک دن اس کی وادی پر ایک بلا قابض ہوگئی بہت بڑے منہ والی خوفناک بلا......!" بہت انہماک سے کہانی سناتے ہوئے وہ جیسے کہیں کھوگئی تھی۔ جبکہ ننھا زبیر آنکھیں پھیلائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھتے ہی دیکھتے اس بلا نے بادشاہ کے بچوں کو نگل لیا۔ وادی کے لوگ اس بلا سے خوف کھانے لگے۔ جس جگہ پر اس بلا کے قدم پڑتے وہاں انسانوں کا صفایا ہوجاتا یوں تو وہ بلا کسی کو بھی نہیں چھوڑتی تھی مگر مسلمانوں کا خون اسے زیادہ پسند تھا۔ جہاں اسے کوئی مسلمان نظر آتا فوراً نگل لیتی۔"

"بھابی کوئی شہزادہ نہیں تھا جو اس بلا کو مار دیتا۔" جونہی وہ سانس لینے رکی زبیر نے فوراً پوچھ لیا جواب میں اس کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"شہزادہ پتا نہیں کتنے ہی شہزادوں کو اس بلا نے نگل لیا تھا۔"

"اتنی بڑی بلا تھی وہ؟" اب کے زبیر نے آنکھیں پھیلائی تھیں۔ حورعین نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی گود میں لٹالیا۔

"ہوں بادشاہ جو مر گیا تھا اس وادی کا اسی لیے بلا طاقت ور ہوتی گئی کوئی اس کا مقابلہ کرنے والا جو نہیں تھا۔ آس پاس کی وادیوں کے لوگ بس تماشہ دیکھتے تھے۔"

"پھر تو اس بلا نے سب کو نگل لیا ہوگا؟"

"ہوں بڑے ظلم کرتی تھی وہ بلا جس کو ایک پنجہ مار دیتی وہ دوبارہ اٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ایسے میں وہاں جو بچے کچھ مسلمان تھے انہوں نے سوچا کہ اگر وہ بلا سے لڑیں گے تو بلا انہیں کھا جائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ وہ بلا کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں وہ جو ظلم بھی کرے کرنے دیں۔ بس اپنی اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے رہیں۔ بلا کو ان کے اس فیصلے کا پتا چلا تو بہت ہنسی اس نے ان لوگوں سے کہا کہ اگر وہ لوگ اسے اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں تو وہ انہیں نہیں کھائے گی مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔"

"کیا مطلب؟" زبیر منہ اٹھائے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

حورعین کی نظریں کھڑکی کے اس پار سڑک کی دوسری سائیڈ پر تنہا کھڑے درخت پر جم گئیں۔ وہ بولی تو اس کا لہجہ بہت کھویا ہوا تھا۔

"اپنی اپنی جان بچانے کے لالچ میں وادی کے ان لوگوں نے بلا کو اور بھی طاقت ور بنا دیا تھا۔ اب وہ ایک ایک کو پکڑ کر اپنے پاس قید کرتی اور کھا لیتی روز بروز لوگ ڈرتے گئے اور کمزور ہوتے گئے۔"

"پھر۔"

"پھر اس بلا نے اپنے پر پھیلا لیے اس کے پیر بھی بہت بڑے بڑے تھے جس جگہ مسلمان رہتے تھے وہاں وہ اپنے پیر رکھتی تھی اور سب کو بنا کسی قصور

کچل مسل کر رکھ دیتی۔"

"کیوں بھابی...... بلا مسلمانوں کے ساتھ ہی ایسا کیوں کرتی تھی؟" زبیر سر اٹھائے پھر پوچھ رہا تھا۔ وہ مسکرادی۔

"نفرت جو کرتی تھی وہ مسلمانوں سے۔ اسے خوف تھا کہیں مسلمان شہزادے اسے ختم نہ کردیں۔"

"لیکن انہیں تو اس نے کمزور کردیا تھا پھر وہ اسے کیسے ختم کرسکتے تھے۔"

"بس خوف جو تھا اسے وادی میں مشہور تھا کہ صرف مسلمان ہی اس بلا کو مار سکتے ہیں اسے ڈر لگتا تھا کہیں کوئی شہزادہ باہر سے آ کر اسے مار نہ دے۔"

"پھر......؟" زبیر کا انہماک کہانی میں بڑھ چکا تھا۔

وہ کھڑکی کے اس پار تنہا کھڑے درخت کو یاسیت سے دیکھتی رہی۔

"پھر کل سناؤں گی۔ ابھی آپ سو جائیں کیونکہ صبح آپ کو اسکول بھی جانا ہے۔"

"نہیں بھابی پلیز کہانی سنائیں نا اتنی اچھی کہانی تو کبھی مما نے بھی نہیں سنائی۔" وہ کہانی جاری رکھنے کے لیے بضد تھا تبھی عمیر وہاں چلا آیا۔

"حورآپی آپ کو دادو بلا رہی ہیں۔"

"کیوں خیریت؟"

زبیر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ چونک اٹھی تھی عمیر مسکرادیا۔

"جی خیریت ہی ہے ابھی نماز سے فارغ ہوئی ہیں۔ میں ان کے کمرے میں گیا تو پوچھنے لگیں۔ حورعین جاگ رہی ہے یا سوگئی؟ میں نے کہا زبیر کے پاس ہے تو کہنے لگیں بلا کر لاؤ ضروری بات کرنی ہے۔"

"ضروری بات؟"

"ہوں ہماری شکایت ہی کرنی ہوگی اور کیا ضروری بات ہوسکتی ہے۔" ایک مرتبہ پھر وہ مسکرایا تھا۔

حورعین کے لبوں پر بھی ویسی ہی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ٹھیک ہے زبیر آپ اب آرام کرو میں دادو کی بات سن کر آتی ہوں۔"

"جی ٹھیک ہے۔" منہ بنا کر سر ہلاتے ہوئے اس نے گردن جھکائی تھی۔ وہ نرمی سے اس کے بال سہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اگلے دو منٹ میں وہ دادو کے کمرے میں آئی تو وہ تسبیح کرتے ہوئے اسی کا انتظار کررہی تھیں۔ وہ انہیں ادب سے سلام کرنے کے بعد ان کے قریب ہی بیڈ پر ٹک گئی۔

"جی دادو آپ نے بلایا؟"

"ہوں سارے دن موئے گھر کے کاموں میں خود کو مصروف رکھتی ہو کبھی بوڑھی دادی کے پاس بھی پل دو پل کے لیے بیٹھ جایا کرو۔" حورعین کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ شکایت کررہی تھیں۔ وہ شرمندہ ہوگئی۔

"معافی چاہتی ہوں دادو میرا دل چاہتا ہے آپ سے ڈھیروں باتیں کرنے کو مگر......!"

"میں سب کچھ سمجھتی ہوں بیٹے نسرین (عذیر کی ماں) کے بعد جس طرح سے تم نے اس بکھرے ہوئے گھر کو سنبھالا ہے۔ میرے پاس تمہاری تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہے ہوسکتا ہے نسرین ہوتی تو خود بھی اتنی اچھی بہو تلاش نہ کرسکتی۔"

"یہ سب آپ کی محبت ہے دادو ورنہ میں نے تو ایسا کچھ بھی خاص نہیں کیا۔"

"نہیں میرا دل بہت خوش ہے تجھ سے میری بچی،

دیکھنا اللہ تمہیں اس خدمت کا صلہ دے گا۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھے اسے دعا دے رہی تھیں۔

حورعین کا سر مزید جھک گیا۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ یہ "خدمت" کس مجبوری کے تحت تھی؟

"عذیر بہت اچھا ہے عورت کی عزت کرنا جانتا ہے مگر پھر بھی میں چاہوں گی کہ تمہیں اس گھر میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ عذیر، سمیر، نمیر، عمیر، زبیر سب شرارتی ضرور ہیں مگر بدنظر یا بددماغ نہیں ہیں۔ بہت محبت سے پالا ہے نسرین نے اپنے بچوں کو وہ جان لیوا حادثہ نہ ہوتا تو تم دیکھتیں وہ کتنی محبت کرنے والی ماں تھی۔"

آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر مسکراہٹ سجائے وہ اسے بتا رہی تھیں یوں جیسے تصور ہی تصور میں اپنی مرحومہ بہو کو زندہ دیکھ رہی ہوں۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

"عذیر بتا رہا تھا تم ملی ہو اس سے پھر تو دیکھا ہی ہوگا تم نے وہ کتنی اچھی عورت تھی۔"

"جی ایک بار ملی تھی میں ان سے واقعی وہ بہت اچھی خاتون تھیں۔"

"ہوں سارا علاقہ اس کی اچھائی کے گن گاتا ہے لگتا ہی نہیں کہ وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔" بوڑھی آنکھوں میں اب گہری نمی تھی وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"عذیر کے دادا کی سگی بھانجی تھی نسرین۔ میں اپنی بھانجی لانا چاہتی تھی اسی رنجش میں کبھی اسے وہ پیار نہیں دے سکی جو اس کا حق تھا۔ بہت خواہش تھی اس کی گاؤں میں سب کے ساتھ رہنے کی مگر میں نے اپنی بھانجی کو خوش کرنے کے لیے اسے اپنے گھر سے نکال دیا۔ تب وہ یہاں شہر میں آ بسی۔ جاوید (عذیر کے پاپا) خیال رکھتا تھا اس کا مگر پھر بھی وہ روتی رہتی تھی۔

مجھے پتا ہوتا یہاں ان کے لیے جان لیوا حادثہ چھپا بیٹھا ہے تو کبھی یہ ظلم نہ کرتی۔" دوپٹے میں منہ چھپائے وہ اب رونے لگی تھیں جب حورعین نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"صبر کریں دادو، شاید ان کی قسمت میں ایسا ہی لکھا ہوا ہو۔"

"ہوں تو بیٹھ میں نسرین کی امانت دیتی ہوں تجھے، عذیر اور زبیر سے بہت پیار کرتی تھی وہ، عذیر کی دلہن کے لیے بڑے پیار سے اس نے کنگن بنا کر رکھے ہوئے ہیں۔ آج وہ زندہ ہوتی تو اپنے ہاتھوں سے تجھے پہناتی۔"

دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ اٹھیں اور اپنی الماری سے دو خوب صورت کنگن نکال کر لے آئیں۔

"یہ لو آج کے بعد یہ ہمیشہ تمہاری کلائی میں رہیں اور ہاں، ذرا بن سنور کے رہا کرو مرد کو اچھا لگتا ہے۔" کنگن اسے تھماتے ہوئے انہوں نے ساتھ ہی نصیحت بھی کی۔ حورعین بوکھلا کر رہ گئی۔

"مرد جتنا بھی اچھا ہو مگر ایک ہی عورت کا پابند بن کر نہیں رہتا کبھی۔ اسی لیے سمجھا رہی ہوں تمہیں جلدی سے کوئی بچہ وچہ کر لو اولاد میاں بیوی کے تعلق کو مضبوط کرتی ہے۔" وہی بات جو عذیر نے اس سے کہی تھی دادی نے اس کے سامنے بھی دہرا دی۔

حورعین کو لگا جیسے اس میں سانس لینے کی سکت بھی نہ رہی ہو۔

"السلام علیکم دادی۔"

اگلے ہی پل عذیر نے کمرے میں قدم دھرے تھے۔ حورعین کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں جبکہ اس کا دل اس وقت بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"وعلیکم السلام ماں صدقے جائے بڑی لمبی عمر ہے میرے لعل کی۔" اسے دیکھتے ہی دادی نے اس کی

بلائیں لے ڈالی۔ وہ ان کے قریب ہی ٹک گیا۔

"کیوں خیریت؟ یاد کر رہی تھیں مجھے؟"

"ہوں، یاد کر رہی تھی بتا رہی تھی حور کو کہ نسرین کتنا پیار کرتی تھی تجھ سے کتنی خواہش تھی اسے تیرے بچوں کو گود میں کھلانے کی مگر جو میرے سوہنے رب کی رضا، پرسوں تیری تائی آ رہی ہے گاؤں سے ثانیہ بیٹی بھی ساتھ ہوگی۔ میں نے طے کر لیا ہے پرسوں ہی تمہاری اور حور بیٹی کا ولیمہ کر دیتی ہوں تا کہ سارے خاندان کو پتا لگ جائے۔" نان اسٹاپ بولتی دادی کی خوشی دیدنی تھی۔

حورعین اور عذیر دونوں گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"مگر دادو اس کی کیا ضرورت ہے۔" عذیر بولا تو دادی کو غصہ آ گیا۔

"ارے ضرورت کیوں نہیں، شادی کی ہے تم نے کوئی بھگا کر لڑکی نہیں لائے جو ہم خاندان والوں کو خبر ہی نہ کریں اور یونہی فضول چہ میگوئیاں سنتے رہیں۔"

"مگر دادی، میں ابھی بہت مصروف ہوں۔ پلیز کچھ دنوں کے لیے اسے ملتوی کر دیں۔"

"ہرگز نہیں تم مصروف ہو تو رہو مگر میں اب مزید ایک دن کی رعایت بھی دینے والی نہیں بس۔" دادی پکا پروگرام بنائے بیٹھی تھیں۔

حورعین کے اندر جیسے الاؤ دہک اٹھا۔ وہ بولنا چاہتی تھی مگر لب جیسے آپس میں پیوست ہو کر رہ گئے تھے۔

"اور ہاں، صبح میں خود حورعین بیٹی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہی ہوں۔ تم رہو اپنے کاموں میں مصروف۔ میں چاہتی ہوں ایک ساتھ دو دو خوش خبریاں دوں سب کو دیکھنا سب کیسے منہ میں انگلیاں داب کر رہ جائیں گے۔"

کاش میں بادل ہوتی

کاش میں بادل ہوتی
ہواؤں کے سنگ اڑتی پھرتی
نگر نگر گھومتی پھرتی آسمانوں کو چومتی
صحراؤں میں برستی بنجر دھرتی کو سیراب کرتی
میں محبت بھری اک چھاگل ہوتی
کاش میں بادل ہوتی
زمانے کا نہ مجھ کو کوئی ڈر ہوتا
دکھوں غموں سے بے خبر ہوتی
کاش فاصلہ میرے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتا
میں جاہتی اڑ کر تیرے پاس آ جاتی
تجھ کو چھوتی تیرے سنگ ڈولتی
کچھ ایسی میں پاگل ہوتی
کاش میں بادل ہوتی
کاش میں بادل ہوتی

نوشین اقبال نوشی ...... گاؤں بدھر مرجان

دادی کے اپنے ہی خواب تھے حورعین جیسے کرنٹ کھا کر رہ گئی۔ جبکہ عذیر کے چہرے پر شرمندگی تھی۔

"دادی پلیز، آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کہا ہے نا میں لے جاؤں گا پلیز۔"

"بس رکھو اپنا پلیز اپنے پاس۔ تیرے تایا کی بیٹی بڑی اچھی ڈاکٹر بن گئی ہے میں نے بات کر لی ہے اس سے میں خود ساتھ جاؤں گی تو بس چھوڑ آنا ہمیں اس کے اسپتال۔"

دادی پکا ارادہ کیے بیٹھی تھیں۔ عذیر بالوں میں انگلیاں پھنسا کر رہ گیا۔ جبکہ حورعین مزید برداشت نہ کرتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ اس گھر میں پناہ اسے بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔

مسیحا ہو کے بھی تم سے مسیحائی نہیں ہوتی
اسے کیسے مسیحا ہو؟

سبھی بجھتی ہوئی آنکھیں
رگِ جاں توڑتی سانسیں
یہ سارے جاں بلب چہرے
تیرے دستِ شفا کی ایک جنبش کو
ترستے آخری سرحد پہ آ پہنچے
جہاں بس ایک لمحے میں
وہ جیون ہار جائیں گے
ارے کیسے مسیحا ہو
شفا کی بات کرتے تھے
جفا کا روپ بن بیٹھے
جو تم کو چھاؤں کہتے تھے انہی پر دھوپ بن بیٹھے
بجا کچھ خواہشیں، کچھ خواب تیرے بھی ہیں پر
سن لو
کسی کی جان سے کھیلو گے تو بازی ہار جاؤ گے
ارے کیسے مسیحا ہو؟

ہانیہ خاصی رش ڈرائیونگ کے بعد "میکال ہاؤس" پہنچی تو اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ تیزی سے گیٹ عبور کرکے وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو لان میں کام کرتے حفیظ بابا کی نگاہیں اسے دیکھ کر چمک اٹھیں۔

"ہانیہ بیٹے آپ یہاں؟" انہیں جیسے اپنی بصارتوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ سر جھٹکتی ان کے قریب چلی آئی۔

"جی بابا السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام بیٹے جیتی رہیں۔"

"شکریہ وہ سنی کہاں ہے؟"

"جی چھوٹے صاحب تو اپنے کمرے میں ہیں شاید پڑھ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے شکریہ۔" وہ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ حفیظ بابا اسے حیرانی سے دیکھتے رہ گئے۔ عین اسی لمحے گیٹ کے اس پار میکال کی گاڑی رکی تھی۔ وہ لان میں حفیظ بابا کو کھڑے دیکھ کر وہیں چلا آیا۔

"صاحب...... وہ ہانیہ بی بی......!"

"معلوم ہے بابا...... اپنے بیٹے سے ملنے آئی ہے وہ ہمارے لیے نہیں آئی۔" حفیظ بابا کے لب کھولنے پر ایک گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے کہا۔ پھر سر جھٹک کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

سنان اپنے کمرے میں بیڈ پر ڈھیر ساری کتابیں بکھیرے گم صم بیٹھا تھا۔ جب آہٹ کی آواز پر ہانیہ کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا۔

"مما...... آپ آ گئیں؟" پھرتی سے کتابیں پھلانگ کر بیڈ سے زمین پر چھلانگ لگاتے ہوئے وہ ہانیہ سے لپٹ گیا۔ جواب میں ہانیہ کا دل جیسے تڑپ اٹھا۔

پہلا سوال ہی کیسا امتحان میں ڈالنے والا تھا۔ وہ خاموشی سے آنسو بہاتی اسے بے تحاشا چومنے لگی۔

"آئی مس یو مما مجھے روز آپ کی یاد آتی ہے مگر پاپا مجھے آپ کے پاس لے کر نہیں آتے وہ مجھے ہوم ورک بھی نہیں کرواتے اور روز چپس بنا کر بھی نہیں دیتے۔" بہت ساری شکایتیں تھیں جو اس نے جمع کر رکھی تھیں۔ ہانیہ کا دل جیسے کٹنے لگا۔

"مما تو ہوم ورک کرواتی ہیں ناں بیٹے" مما تو چپس بنا کر بھی دیتی ہیں اور رات میں کہانی بھی سناتی ہیں نہ بیٹا۔"

"جی مما۔" فوراً سے پیشتر اس کے بیٹے نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔ جب وہ بولی۔

"تو بس ٹھیک ہے مما اب ہمیشہ کے لیے اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔ چلو گے نا مما کے ساتھ؟"

"جی مما۔"

"شاباش گڈ بوائے۔"

جھک کر سنان کے گالوں پر پیار کرتے ہوئے وہ سرور ہوئی۔ جب میکال وہاں چلا آیا۔

"کہاں لے جا رہی ہو میرے بیٹے کو ورغلا کر۔" ہانیہ کی پشت پر اس کی آواز ابھری اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"پاپا مجھے مما کے ساتھ جانا ہے۔" سنان کے مطالبے نے ہانیہ کی مشکل آسان کی تھی۔ جب وہ دو قدم آگے بڑھا۔

"ٹھیک ہے مگر پہلے آپ کھانا کھا لیں پھر مما کے پاس جانا۔" اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

ہانیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی۔ تاہم اس نے فوری ہاتھ کی پشت سے انہیں رگڑ ڈالا۔

"حفیظ بابا۔" میکال نے وہیں کھڑے کھڑے پلٹ کر حفیظ بابا کو آواز لگائی تھی جب وہ فوراً دوڑ آئے۔

"جی صاحب۔"

"سنی بابا کو کھانا کھلائیں لے جا کر پلیز۔"

"جی ٹھیک ہے۔"

ہاتھ باندھ کر حکم پر فوری عمل درآمد کرتے ہوئے وہ سنان کو کندھوں سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔

انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ محض تھوڑے سے پیسوں کے لیے اپنے دنیاوی مالک کا ہر حکم عاجزی سے پورا کرتا ہے اس کی جرأت نہیں ہوتی کہ حکم پر عمل درآمد کو ذرا سی دیر کے لیے ہی سہی موقوف کر دے مگر اللہ جو کائنات کا رب ہے انسان کا حقیقی مالک ہے رزق کے ساتھ ساتھ جس نے آنکھ، ناک، کان، دل، گردے، پھیپھڑے سب کچھ دیا ہے۔ اس کے حکم کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس کے باوجود انسان چاہتا ہے کہ اللہ اس سے راضی رہے۔

وہ مالک جو بڑی سے بڑی خطا اور گناہ کو پل میں اپنے کرم اور رحمت سے معاف کر دیتا ہے مگر انسان جس دنیاوی مالک کو خوش کرنے میں لگا رہتا ہے وہ کبھی معمولی سی بھول بھی معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ کر بھی دے تو انسان ہزار ہزار طریقوں سے اس کا شکر گزار ہوتا ہے۔ حالانکہ اللہ کو پا کر کبھی کسی نے کچھ نہیں کھویا چاہے فاقے ہی کیوں نہ کرنے پڑیں مگر اللہ کو کھو کر کسی نے کچھ نہیں پایا۔ خواہ محلوں میں ہی کیوں نہ رہتا ہو۔ مگر انسان سمجھتا ہی نہیں اور جب اسے سمجھ آتی ہے تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

حفیظ بابا کے کمرے سے جانے کے بعد ہانیہ نے بھی قدم آگے بڑھائے تو وہ مقابل آ گیا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

"اپنے گھر۔" رخ پھیر کر بنا اس کی طرف دیکھے اس نے جواب دیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"گھر تو تمہارا یہی تھا مگر......!"

دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے ایک نظر ہانیہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک قدم مزید آگے بڑھا آیا۔

"آج کی رات تم کہیں نہیں جاسکتیں، سمجھی؟"

"کیوں؟"

جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی وہ برہم ہوئی۔ جبکہ وہ بے نیازی سے بولا۔

"میں کہہ رہا ہوں اس لیے۔"

"تم کون ہو اور میرا کیا واسطہ ہے تم سے؟" ہانیہ کی آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ وہ کٹ کر رہ گیا۔

"واؤ صرف چھ ماہ میں تمہیں یہ بھی بھول گیا کہ میں کون ہوں؟"

"راستا چھوڑو میرا میں کم از کم اس وقت تمہارے منہ لگنا نہیں چاہتی۔" وارننگ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ گھٹے گھٹے سے لہجے میں بولی۔ جب وہ رخ پھیر گیا۔

"نقصان کر رہی ہو تم اپنا ہانیہ صفدر اور شاید میرا بھی۔"

"جسٹ شٹ اپ، میرے نفع و نقصان کی پروا کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟"

"سمجھو تو سب کچھ نہ سمجھو تو کچھ بھی نہیں۔"

"تم اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہو میکال حسن، ہٹو سامنے سے۔"

قطعی تلخ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اسے سائیڈ پر دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا وہ لڑکی جو کبھی اپنی سانسوں سے بھی بڑھ کر اس سے پیار کرتی تھی اب شاید اس لڑکی کے دل میں اس کے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اس نے اسے جتنا کمزور سمجھا تھا وہ اتنی ہی مضبوط اور طاقت ور ثابت ہوئی تھی مگر...... اب وہ خود کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ بے شک گزرتے وقت نے اسے بہت گہری مات دی تھی۔

***

"ایسا کیا ہوا تھا تمہاری اور میکال حسن کی زندگی کے ساتھ کہ تمہارے راستے ہی الگ ہو گئے۔ کیوں ڈائیورس لی تم نے میکال حسن سے، کیوں؟"

فارحہ جو پچھلے چھ ماہ میں ہانیہ کی بہترین دوست بن گئی تھی اس سے پوچھ رہی تھی تاہم وہ ہمیشہ کی طرح لبوں پر چپ کا قفل لگائے خاموشی بیٹھی سمندر کی شوریدہ سر لہروں کو دیکھتی رہی۔

"تم اس سے پیار کرتی تھیں ہانیہ، اپنی جان، اپنی سانسوں سے بڑھ کر چاہتی تھیں تم اسے پھر کیوں اپنے راستے الگ کیے اس سے جبکہ وہ تمہارے بچے کا باپ بھی تھا۔"

"تو؟" پہلی بار اس کے لب کھلے تھے فارحہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"تو یہ کہ تمہیں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ سوچنا چاہیے تھا اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے تم نہیں جانتیں دنیا کی ہر نعمت قریب ہوتے ہوئے بھی وہ خوش نہیں ہے۔ سارا سارا دن بند کمرے میں پڑا تمہاری تصویر سے باتیں کرتا رہتا ہے اپنی اور میکال کی جنگ میں تم نے اس معصوم کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کی ہے۔"

"بس یا کچھ اور بھی کہنا ہے تمہیں؟" سمندر کی وسعتوں پر نظر جمائے اس بار اس نے خاصی تلخی سے

پوچھا۔ جواب میں وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"میں تمہاری دوست ہوں ہانیہ' بھلا چاہتی ہوں تمہارا۔"

"مگر مجھے بھلا نہیں چاہیے۔" اس بار ارد گرد کے لوگوں کی پروا کیے بغیر وہ چلائی تھی۔

"مت بھلا کیا کرے میرے ساتھ کوئی' پہلے ہی میں اپنے اوپر لدے احسانات کے بوجھ تلے دب کر مر رہی ہوں مسخ ہو کر رہ گیا ہے میرا وجود' میری شخصیت میرا سب کچھ۔"

"حادثے انسانوں کے ساتھ ہی ہوتے ہیں ہانیہ' مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خود پر زندگی کو حرام کر کے بیٹھ جائے۔"

"کیسی زندگی؟ میری تو زندگی کے ساتھ کبھی بنی ہی نہیں' پھول دان کرنے والے دنوں میں بھی مجھے تو زندگی نے آنسو ہی دیے ہیں۔ یہاں مرد اور اس کے کردار پر انگلی اٹھانے والا کوئی نہیں۔ چھری کے نیچے آ کر بھی عورت سے ہی قربانی اور سمجھداری کی امید رکھی جاتی ہے۔ صرف اسے ہی سمجھایا جاتا ہے۔ مرد کو اس کی زیادتیوں کا کوئی احساس نہیں دلایا جاتا۔"

"میں میکال کی سائیڈ نہیں لے رہی ہوں ہانیہ۔ میں صرف تمہارے نقصان کی پروا کر رہی ہوں۔"

"میرے نقصان کی پروا مت کرو فارحہ پلیز۔" گیلی ریت کو مٹھی سے نیچے پھینکتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

فارحہ بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایسا کب تک چلے گا ہانیہ' تمہیں اپنے لیے کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"فی الحال میں اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی فارحہ پلیز۔" قطعی بیزاری سے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔ پیچھے فارحہ بھی گہری سانس بھر کر چل پڑی۔

اس لڑکی کو سمجھنا واقعی بہت مشکل تھا۔

❁......❁......❁

حویلی سے وہ سیدھا گھر چلا آیا۔

سائرہ افضل رونی پکار رہی تھی۔

وہ اسے نظر انداز کرتا اندر کمرے میں چلا آیا۔ سر درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا۔ کرم داد نے اسے فوری حویلی حاضری کا پیغام دیا۔ مگر اس کے لیے اس وقت حویلی جانا ممکن نہیں تھا۔ تبھی وہ گھر چلا آیا۔ اماں شاید پڑوس میں کہیں گئی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گیا۔

کتنا بڑا دغا کیا تھا زندگی نے اس کے ساتھ؟ بقول شاعر

جس شاخ پہ ہم نے ہاتھ رکھا
وہ شاخ وہیں سے ٹوٹ گئی

پہلے سائرہ افضل اور پھر ثانیہ عباس...... دونوں کو ہی اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا اور دونوں ہی اسے چھوڑ گئی تھیں۔

وہ ماضی کے سمندر میں بہنا نہیں چاہتا تھا مگر یادوں کی لہریں اسے کھینچ کر گزرے ہوئے وقت کے سمندر میں لے آئی تھیں۔

❁......❁......❁

اس رات بہت دیر تک ثانیہ عباس کے ساتھ بارش میں بھیگنے کے بعد اگلے روز وہ شہر آ گیا تھا۔ بہت عجیب حالت ہو رہی تھی دل کی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی زندگی سائرہ افضل پر آ کر ختم ہو گئی ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔

سائرہ افضل اگر اس کی محبت تھی تو ثانیہ عباس کی ذات سے اسے عشق ہو گیا تھا۔ وہ اس کے بغیر جینے کا تصور کرتا تو سانس الجھنے لگتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ

کیا کرے؟ ابھی وہ اسی الجھن میں تھا کہ کمپنی کے مالک نے اس کی محنت اور ذہانت کو سراہتے ہوئے اپنے چار پسندیدہ ورکرز میں اس کا نام بھی شامل کر کے اسے شارٹ کورس کے لیے ابروڈ بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔

اس کا دل چاہا تھا وہ گھر جا کر سب کو خوش خبری سنائے مگر پھر خود ہی اس نے یہ ارادہ موقوف کر دیا۔ اب وہ کچھ بن کر ہی اس بہاری لڑکی کے سامنے آنا چاہتا تھا۔ مگر وقت نے اس کی مہلت نہیں دی۔

ابروڈ میں شارٹ کورس کے دوران گھر کال کرنے پر اماں نے اسے بتایا تھا کہ ثانیہ کی ماں وہاں گاؤں آئی تھی اور اسے اپنے ساتھ شہر لے گئی۔ اماں کی طرف سے ہمیشہ اسے ایسی ہی شاک پہنچانے والی خبریں سننے کو ملتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ جیسے فریز ہو کر رہ گیا تھا۔ دل کی بے چینی اپنی انتہا پر تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیسے رابطہ کرے۔ سمندر پار کے فاصلے سے وہ صرف کڑھ سکتا تھا اور وہ کڑھ رہا تھا۔

اسی دوران ایک روز جب وہ واش روم میں تھا اس کے سیل پر پاکستان سے کال آئی۔ اجنبی نمبر تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا تھا۔ بال خشک کرنے سے بھی پہلے اس نے کال بیک کی۔ کئی بار کوشش کے بعد اس کی کال اٹھانے والی عورت ثانیہ کی ماں تھی۔

زائر کا شک درست نکلا تھا۔ پاکستان کا وہ اجنبی نمبر ثانیہ عباس سے ہی منسلک تھا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام کون؟"

اس کے سلام کے جواب میں دوسری طرف خاصی مصروفیت سے پوچھا گیا تھا۔ زائر ایک پل

علم و عشق

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور' علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقام صفات' عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات' عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال' عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات' سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں' عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب
شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورش طوفاں حلال' لذت ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب' عشق ہے ام الکتاب

کلام علامہ اقبال' انتخاب: نرعانہ اچھوت...... خیرپور

غزل

رگوں میں دوڑتا جتنا لہو ضروری ہے
ہمارے واسطے اتنا ہی تو ضروری ہے
کوئی جواز تو ہو اپنے زندہ ہونے کا
سکوت شب سے کسی گفتگو ضروری ہے
کچھ ایسی سرد ہوائیں گزرنے والی ہیں
ترا حصار مرے چار سُو ضروری ہے
ہمارا تذکرہ کرتا پھرے جو غیروں سے
ہجوم دوستاں میں اک عدو ضروری ہے
جو چاہتے ہو وہ عرفان مل ہی جائے گا
تمام عمر مگر جستجو ضروری ہے

عرفان صادق...... لاہور

کے لیے خاموش ہوا پھر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔
"زائر ملک بات کررہا ہوں آپ کا داماد۔"
"او..... تو داماد صاحب کو یاد آگئی ہماری؟" توقع کے عین مطابق تعارف سنتے ہی اس کی ساس کے لہجے میں طنز اور حقارت در آئی تھی۔ وہ ضبط کر گیا۔
"جی مہربانی ہوگی اگر آپ ثانیہ سے میری بات کروا دیں تو پلیز۔"
"اتنی عاجزی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے ثانیہ تمہارے گھر' تمہاری رفاقت' تمہارے تعلق ہر چیز پر دو حرف بھیج کر ہمیشہ کے لیے یہاں آگئی ہے میرے پاس۔ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ تم اس کی جان چھوڑ دو اور اسے طلاق بھجوا دو۔ نہیں تو تم اچھی طرح سے جان سکتے ہو کہ تمہارے ساتھ کیا کرسکتی ہوں میں۔"
"جو کرنا ہے کرلیں آپ ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہے مجھے مگر ثانیہ میری بیوی ہے۔ اس کی کوکھ میں میرا بچہ ہے میں کسی صورت اسے ڈائیورس نہیں کرسکتا۔"
"چلو یہ تو وقت بتائے گا تم کیا کرسکتے ہو کیا نہیں' مگر ثانیہ کے ساتھ آئندہ زندگی میں کبھی بھی وقت گزارنے کا خیال اپنے دل و دماغ سے نکال دو' کیونکہ میرے جیتے جی اب زندگی میں دوبارہ کبھی بھی تم اس کی شکل نہیں دیکھ پاؤ گے۔"
"خوش فہمی ہے آپ کی دنیا کی کوئی طاقت مجھے ثانیہ سے ملنے سے نہیں روک سکتی۔ کوئی بھی چیز میرے اور اس کے درمیان جدائی کی دیوار کھڑی نہیں کرسکتی۔"
"چلو پھر دیکھ لو پھڑ پھڑا کر مگر سوری ثانیہ اب تمہیں کبھی نہیں مل سکتی۔"
قطعی چیلنجنگ انداز میں کہتے ہوئے مسز عباس نے کال کاٹ دی تھی۔
زائر متفکر سا سیل فون کی روشن اسکرین کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ جانتا تھا مسز عباس اپنے کہے کو پورا کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتی ہے۔ اسی لیے اس نے واپسی کے لیے کوششیں شروع کردی تھیں۔ ابھی وہ انہی کوششوں میں مصروف تھا کہ اچانک اس روز وہ روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہوگیا اس کے بازو اور ٹانگیں بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ شام میں اس کے دوستوں نے اس کی ماں اور باپ کو اس کے ساتھ پیش آئے حادثے کی اطلاع کردی تھی۔
اسے یقین تھا کہ اس کے ساتھ پیش آنے والے اس حادثے کے بعد ثانیہ کا دل ضرور نرم پڑجائے گا۔ وہ پھر سے اس کی زندگی میں لوٹ آئے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اپنی ماں سے اپنے دو جڑواں بچوں کی پیدائش کا سن کر وہ پاگل ہی تو ہوا تھا خوشی سے مگر وہاں اسپتال کے اس بستر پر اس کی خوشی کا خیال بھی کسے تھا۔
اس کا سیل فون ٹوٹ چکا تھا۔ دوست سے موبائل لے کر اس نے بار ہا مسز عباس کے نمبر کو ٹرائی کیا مگر ہر بار ان کا نمبر آف ہی ملتا تھا۔ بے بسی ہی بے بسی تھی۔ ایک ایک دن پہاڑ بن کر گزر رہا تھا۔
اڑھائی ماہ کے بعد اسپتال سے فارغ ہوکر پہلی فرصت میں وہ پاکستان آیا تو اسے یہ جاں بلب خبر سننے کو ملی کہ ثانیہ عباس اپنے بچوں کو لے کر اپنی ماں کے ساتھ بیرون ملک شفٹ ہوگئی ہے اور یہیں وہ ٹوٹا تھا۔
وہ لڑکی جسے اس نے زبردستی اپنی زندگی میں شامل کیا تھا ایک روز یوں چپ چاپ اس کی زندگی سے چلی جائے گی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔
(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

میری ماں

نادیہ فاطمہ رضوی

کیسی ہے یہ ماں کی جدائی
نوحہ کناں ہے ساری خدائی
کاش کسی کی ماں نہ بچھڑے
بڑی کٹھن ہے ماں کی جدائی

"امی حد کرتی ہیں آپ' مجھے آلو گوشت سے سخت نفرت ہے اور آج آپ نے یہی سالن پکالیا۔" کائنات چولہے پر رکھی دیگچی کا ڈھکن تقریباً پٹختے ہوئے انتہائی نخوت سے بولی تو سائرہ نے ایک بے بس سی نگاہ اپنی چودہ سالہ بیٹی پر ڈالی جو اپنے باپ کے بے حد لاڈ پیار سے دن بہ دن خودسر ہوتی جارہی تھی اور تو اور اس سے دو سال چھوٹی زارا بھی بدتمیزی کی حد تک نافرمان ہوگئی تھی۔
"سائرہ میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ بچیوں کی پسند کا کھانا بنایا کرو آخر میں کمانا کس کے لیے ہوں' نجانے تم انہیں غصہ دلوا کر اپنی کون سی خوشی پوری کرتی ہو۔" ارباز حسن کمرے سے باہر آتے ہوئے ناگواری سے بولے تو سائرہ محض خاموشی سے سر جھکا گئیں ورنہ اگر وہ کچھ کہتی تو دونوں بچیوں کی زبان درازی اسے دکھ و اذیت کے پاتال میں گرا دیتی۔
"ابو چلیے ہم باہر چل کر کھانا کھاتے ہیں' یہ کھانا امی خود ہی کھائیں۔" زارا بے زاری سے بولی اور پھر کچھ دیر بعد تینوں ڈنر کے لیے باہر چلے گئے۔ جب کہ سائرہ گھر میں تنہا رہ گئی۔

***

سائرہ اور ارباز حسن کی شادی دونوں گھرانوں کی باہمی رضامندی سے ہوئی تھی ارباز حسن ایک خشک اور روکھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ سائرہ کی ذات سے اس کی دلچسپی برائے نام تھی اس کی کیا وجہ تھی وہ سائرہ بھی نہیں جانتی تھی۔ شادی کے اگلے سال ہی کائنات سائرہ کی گود میں آئی تو سائرہ شوہر کی بے اعتنائی اور عدم توجہ کے احساس کو فراموش کرگئی۔ کائنات اس کی زیست کا حاصل تھی وہ بڑی محبت و توجہ سے کائنات کی پرورش کررہی تھی اور پھر دو سال بعد زارا اس کی زندگی میں آئی تو گویا سائرہ کو زندگی جنت ہی لگنے لگی۔
ارباز سائرہ کے وجود سے بے پروا ضرور تھا مگر کائنات اور زارا میں گویا اس کی جان تھی وہ دونوں ہی بیٹیوں کو بے تحاشا چاہتا تھا مگر دونوں کی محبتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ سائرہ بچیوں کی پرورش ایک بیٹی کی طرح بہت سلیقے اور قرینے سے کرنا چاہتی تھی' جب کہ ارباز کو یہ قطعی گوارا نہیں تھا کہ وہ بچیوں سے اونچی آواز میں بات کرے۔ سائرہ غلط بات پر بچیوں کو ٹوکتی تو ارباز کو انتہائی ناگوار گزرتا اور بچیوں کے سامنے ہی سائرہ کو بُری طرح جھڑک دیتے' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سائرہ کا رعب اور اہمیت بچیوں کے نزدیک بالکل صفر ہوگیا۔ کائنات اور زارا کو ماں سے کوئی خاص رغبت اور لگاؤ نہیں تھا کیوں کہ سائرہ کی روک ٹوک انہیں بے حد بُری لگتی تھی جب کہ ارباز حسن کی وہ بے حد چہیتی اور لاڈلی تھیں' جوان کے منہ

سے نکلی ہر بات کو فرض کی طرح پورا کرتا تھا۔ ارباز کے والدین نے بھی ارباز کو بیٹیوں کے اس قدر نخرے اٹھانے پر تنبیہہ کی تھی مگر وہ تو جیسے کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔

❁…❁…❁

وقت سرعت سے گزرتا رہا کائنات بیس سال کی خوب صورت دوشیزہ کے روپ میں ڈھل چکی تھی، جب کہ زارا زندگی کی اٹھارہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ دونوں بیٹیں بے حد حسین اور ذہین تھیں مگر زبان کی اتنی ہی تیکھی اور کڑوی تھیں کہ نگی خالائیں اور کزنز بھی پناہ مانگتے تھے۔ سائرہ نے کئی بار ارباز کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ بیٹیوں کا معاملہ ہے آخر کو انہیں پرائے گھر بھی جانا ہے اور اس بات کا جواب ارباز ہمیشہ یونہی رعونت سے دیتا۔

"ارے میری بچیوں پر کوئی زیادتی کرکے تو دیکھے میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ قیامت تک یاد رکھے گا۔" سائرہ انتہائی پریشان ہو کر اپنا سر ہاتھوں میں گرالیتی۔

❁…❁…❁

"ارے یار بس کیا بتاؤں آج صبح آنکھ ہی نہیں کھلی، رات کو بہت دیر سے سوئی تھی ڈیئر!" کائنات پچھلے آدھے گھنٹے سے لہک لہک کر لاؤنج میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے موبائل پر کسی سے باتیں کررہی تھی جب کہ کچن میں موجود سائرہ برتن دھوتے ہوئے بڑی بے چینی سے کائنات کی یہ گفتگو سن رہی تھی۔

"کیا بکواس ہے اب ریمز کا تذکرہ میرے سامنے مت کرنا۔ وہ بونگا میرا دوست بننے کے لائق نہیں ہے۔" کائنات کا یہ جملہ سن کر سائرہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی اس سے پہلے بھی سائرہ نے کائنات کے منہ سے اس طرح کی باتیں سنی تھیں۔ اسے کافی ڈانٹا بھی تھا۔ نتیجتاً کائنات نے اپنی ماں سے بے انتہا بدتمیزی کی تھی اور تو اور ارباز سے نجانے کیا ایسا کہا تھا کہ وہ الٹا سائرہ پر ہی برس پڑا تھا۔

"یا اللہ! میں کیا کروں، میری بچیاں تو بالکل ہی ہاتھوں سے نکلتی جارہی ہیں۔" زارا کے رنگ ڈھنگ بھی کائنات سے مختلف نہیں تھے، ماں کی ہر بات پر مخالفت کو دونوں نے اپنی عادت بنالی تھی۔ سائرہ نے انتہائی دکھ سے سوچا تھا۔

❁…❁…❁

"امی میں مہروز سے شادی کرنا چاہتی ہوں، کل اس کے گھر والے رشتہ لے کر آئیں گے آپ اور ابو کل ہی بات طے کرلیجیے گا۔" کائنات نے گویا سائرہ کے سر پر دھماکا کر ڈالا اس نے انتہائی حیرت سے اپنی بیٹی کو دیکھا جو اپنی بات کہہ کر سکون سے چینل سرچنگ میں مصروف ہوگئی تھی، سائرہ کے اندر حیرت کی لہر اب اشتعال میں ڈھل چکی تھی۔

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا کائنات! تم اسی مہروز کی بات کررہی ہو نا جو تمہاری شکل ماہ نور کا انتہائی بے ڈھنگا بھائی ہے اور تو اور تم یہ بات کیسے فراموش کرگئیں کہ ان کے اور ہمارے خاندان میں دن و رات کی مانند تضاد ہے۔"

"کیا بکواس ہے امی یہ خاندان واندان پرانے زمانے میں دیکھے جاتے تھے آج کل لڑکا لڑکی میں صرف انڈر اسٹینڈنگ دیکھی جاتی ہے اور وہ ہم دونوں میں بہت زیادہ ہے۔" کائنات نے سائرہ کی بات کو چٹکیوں میں اڑایا تھا۔ سائرہ اس کی بے باکی پر اندر سے بُری طرح کھول گئی۔

"تم ابھی اور اسی وقت مہروز کو منع کردو، ہمیں اس خاندان میں تمہارا رشتہ نہیں کرنا جس سے ہماری بالکل مطابقت نہیں نہ زبان میں اور نہ تہذیب میں اور نہ....."

"یہ کیا آپ نے خاندان خاندان کی رٹ لگا رکھی ہے۔" کائنات نے ریموٹ کاؤچ پر پٹختے ہوئے انتہائی تنتنا کر سائرہ کی بات کاٹی۔ "میں اور مہروز ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور یہی بات ہمارے لیے کافی ہے اگر آپ عزت سے رشتہ طے کردیں تو ٹھیک ہے ورنہ ہم کورٹ میرج کرلیں گے۔" یہ کہہ کر کائنات وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی جب کہ اس پل سائرہ نے اپنے سینے کے بائیں جانب ایک زبردست ٹیس اٹھتی محسوس کی اس نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھا تھا۔ کائنات کے لفظوں کی بازگشت ابھی بھی اس کی سماعتوں میں چکرا رہی تھی۔ اس نے جونہی داخلی دروازے کی جانب دیکھا ارباز حسن بُت بنے کھڑے تھے اک نظر دھواں دھواں چہرے کو دیکھا اک ملال و تاسف نے انہیں آ گھیرا۔

❁…❁…❁

ارباز حسن اور سائرہ لٹے ہوئے مسافر کی مانند خالی ہاتھ بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہ کائنات کو مہروز کے سنگ رخصت کرکے فارغ ہوئے تھے نجانے کتنے لوگوں کے کٹیلے جملے اور طنزیہ نگاہیں ان دونوں نے برداشت کی تھیں ارباز اس پل سائرہ سے بے حد شرمندہ تھا آج اسے ہر وہ منظر یاد آ رہا تھا جب اس کی بیوی بچیوں کو کسی غلط حرکت پر ڈانٹنے کی کوشش کرتی اور وہ اپنی بچیوں کے پاس ایسے لپکتا جیسے چیل جھپٹا مارنے والی ہو اور وہ اس سے ان کو بچانے دوڑا ہو۔ وہ سائرہ سے اس بات کا اقرار کرنا چاہتا تھا کہ یہ سب کرکے اس نے بہت بُرا کیا تھا مگر ایسا کرتے ہوئے اس کی مردانہ انا آڑے آرہی تھی۔

❁…❁…❁

ابھی مشکل سے کائنات کی شادی کو چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ زارا پر بھی شادی کا بھوت سوار ہوگیا اور وہ پڑھائی کو خیرباد کہہ کر اپنے منگیتر سے شادی کرکے لندن چلی گئی۔

اب گھر میں صرف سائرہ اور ارباز تھے، دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم گویا چلتے پھرتے مُردے ہوں کیونکہ ان کی بیٹیوں کے کرتوتوں کے بعد اب خاندان کا کوئی فرد ان کے گھر جھانکتا تک نہیں تھا نہ اپنی خوشی غمی میں بلاتا تھا۔ آج سائرہ کو بچیوں کی بہت یاد آرہی تھی، دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس نے کائنات کو فون کرہی ڈالا۔

"اُفوہ امی! یہ ماں بننا کتنا بورنگ اور مشکل کام ہے، مجھے اتنی جلدی ماں نہیں بننا چاہیے تھا میں اتنی بے ڈھنگی اور بے ڈول ہوگئی ہوں۔" کائنات منہ بسور کر بولی تو سائرہ اس کی بات سن کر بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"ارے پگلی! ماں بننا تو کائنات کا سب سے حسین تحفہ ہے۔ اللہ تمہیں اپنی سب سے پیاری نعمت سے نوازنے والا ہے۔" سائرہ محبت بھرے لہجے میں بولی مگر حسب معمول کائنات نے ماں کی بات نظر انداز کردی۔

اور پھر ایک شام کائنات نے ایک خوب صورت سی بچی کو جنم دیا اور جس پل نرس نے اس کی گود میں گلابی سی

بچی ڈالی کائنات کی گویا پوری کائنات ہی پلک جھپکتے ہی بدل گئی ممتا و محبت کا نجانے وسیع و بیکراں سمندر اس کے اندر سے امڈ آیا تھا۔ کائنات نے کسی قیمتی متاع کی طرح اسے سینے سے لگایا تو اسی پل مہروز کمرے میں داخل ہوا۔

"ایک تو بیٹی کو جنم دیا ہے اور اب اسے یوں لپٹا رہی ہو جیسے ماں بننے کی تمہیں بڑی چاہت تھی۔" مہروز انتہائی ناگواری سے بولا تو آج پہلی بار کائنات کا دل چاہا کہ مہروز کو خوب کھری کھری سنائے۔ بیٹا نہیں بیٹی پیدا ہوئی تو کیا ہوا تھی تو اس کی اولاد نا۔

❁ ❁ ❁

"مہروز! کومل میری بھی بیٹی ہے آخر تم اور تمہارے گھر والے ہی کیوں اس پر قبضہ جمائے رکھتے ہیں۔" کائنات کے اندر کومل کی پیدائش کے بعد بہت بدلاؤ آ گیا تھا' خودسری' بددماغی اور اکڑ نجانے کہاں منہ چھپا کر فنا ہو گئی تھی۔

"کومل ایک لڑکی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس کی پرورش اور تربیت اچھے خطوط پر ہو۔" مہروز اخبار پڑھنے کے دوران روکھے انداز میں بولا تو کائنات نے انتہائی اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا مہروز! کومل میری اولاد ہے میں اس کی ماں ہوں آخر مجھ سے زیادہ اچھی تربیت اس کی کون کر سکتا ہے۔"

"تم اور کومل کی تربیت کرو گی؟" کائنات کی بات پر مہروز نے اسے استہزائیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کاٹ دار انداز میں کہا۔

"اپنی ماں کے ساتھ خود کا سلوک بھول گئیں کیا؟" اور اس پل مہروز کے اس ایک جملے نے آئینے میں ابھری اس کی جو شبیہہ دکھائی اسے دیکھ کر وہ مٹی کی مانند ڈھیر ہو گئی' اس پل اسے اپنی ماں شدتوں سے یاد آ گئی۔

❁ ❁ ❁

گھر میں غیر معمولی سناٹا محسوس کر کے نجانے کیوں کائنات کا دل بے ترتیب انداز میں دھڑکا۔

"امی...... امی......" وہ بے ساختہ دہشت زدہ سی ہو کر آوازیں لگاتی ہوئی تیزی سے ماں کے کمرے کی جانب لپکی مگر یہ کیا...... دروازے کی چوکھٹ پر بت کی طرح کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ابو ماں کے قدموں پر بیٹھے نجانے کیا بڑبڑا رہے تھے جب کہ ماں انتہائی سکون سے آنکھیں موندے شاید سو رہی تھی' انتہائی میٹھی اور گہری نیند......

"ا...... ا...... امی......" بمشکل کائنات کے حلق سے یہ لفظ خرخراہٹ کی صورت میں نکلے تو ارباز نے جلدی سے اپنی انگشت شہادت ہونٹوں پر رکھ کر "شش" کہا۔

"بیٹا تمہاری ماں سو رہی ہے بہت گہری نیند سو رہی ہے اسے مت جگاؤ' بہت پریشان اور بے سکون تھی اب کہیں جا کر سوئی ہے اسے مت جگاؤ اسے سونے دو۔"

ارباز حسن کے الفاظ نے کائنات پر ایک سکتہ سا طاری کر دیا تھا' وہ گھٹنوں کے بل چوکھٹ پر ڈھے گئی اور اس پل اس کے ہونٹوں سے انتہائی دھیمی آواز میں یہ لفظ نکلے تھے۔

"میری ماں......" اور پھر وہ ان دو لفظوں کو دہراتی چلی گئی۔ آج علی الصبح ہی سائرہ اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال کر گئی تھی۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ کر اپنی کوتاہیوں کی معافیاں مانگتی رہی۔

"ماں آنکھیں کھولو' اٹھیں مجھے...... میں نے بہت غلط کیا نا آپ کے ساتھ دیکھیں آج میرے ساتھ بھی کیا ہو رہا ہے اپنی ہی بچی کو دیکھنے کے لیے ترس گئی ہوں۔ دیکھیے نا پلیز ایک بار بول دیں کہ آپ نے مجھے معاف کیا۔" کائنات جذباتی انداز میں بولے جا رہی تھی مگر اسے جواب دینے والی ہستی اس سے بہت دور جا چکی تھی' شاید یہی اس کی سزا تھی۔ ارباز نے روتی ہوئی کائنات کو اپنے سینے سے لگایا' آج اس کی انا کا بت بھی مسمار ہو گیا تھا وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

❁

جھیل، کنارہ، کنکر
نازیہ کنول نازی

ویسے تو اس سے وصل کا امکان تک نہیں
مولا! اسی کے ہاتھ کی تقدیر کر مجھے
کوئی اجنبی نہیں ہوں میری آنکھ میں اُتر
میں عکس ہوں اگر کوئی تصویر کر مجھے

اسے کہنا قسم لے لو
تمہارے بعد جو ہم نے کسی کا خواب دیکھا ہو
کسی کو ہم نے چاہا ہو کسی کو ہم نے سوچا ہو
کسی کی آرزو کی ہو کسی کی جستجو کی ہو
کسی کی راہ دیکھی ہو کسی کا قرب مانگا ہو
کوئی دل میں اتارا ہو جو ہم کو تم سے پیارا ہو
کوئی دل میں بسایا ہو کوئی اپنا بنایا ہو
کوئی روٹھا ہو تو ہم نے اسے رو رو منایا ہو
دسمبر کی حسیں رت میں کسی کا ہجر جھیلا ہو
کسی کی یاد کا موسم میرے آنگن میں کھیلا ہو
کسی کی بے وفائی پر کبھی یہ نین برسے ہوں
کسی سے بات کرنے کو کبھی یہ ہونٹ ترسے ہوں
کبھی راتوں کو اٹھ اٹھ کر تیرے دکھ میں نہ روئے ہوں
اسے کہنا قسم لے لو......
کبھی جگنو کبھی تارا کبھی ماہتاب دیکھا ہو
اسے کہنا قسم لے لو
تمہارے بعد جو ہم نے کسی کا خواب دیکھا ہو

میکال کے گھر سے واپسی کے بعد وہ فارحہ کی طرف چلی گئی تھی وہیں سے دونوں نے لانگ ڈرائیو کا پروگرام بنایا تھا اور اب تھکن سے چور جسم کے ساتھ وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر اوندھے منہ پڑی تھی۔

سائیڈ ٹیبل پر اس کی اور نہال حسن کی شادی کی تصویر جیسے اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھی اور بال سمیٹ کر پیچھے کرتے ہوئے اس نے وہ تصویر اٹھالی۔ نہال مسکرا رہا تھا یوں جیسے اس کی دل کی بہت بڑی تمنا پوری ہوئی ہو مگر وہ خوش نہیں تھی۔ میکال حسن سے نہال حسن کی ذات تک کے اس سفر نے اسے بہت بُری طرح سے تھکا ڈالا تھا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے نہال حسن کے مسکراتے ہوئے چہرے کو چھونے کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

کتنا مختصر ساتھ تھا اس کا اور نہال حسن کا مگر...... وہ اس کی زندگی پر بہت گہری چھاپ چھوڑ گیا تھا۔

آنسوؤں کا سلسلہ جو شروع ہوا تو پھر زور پکڑتا چلا گیا تھا۔ نہال حسن کا خوب صورت چہرہ اب اس کی آنسوؤں کی برسات میں بھیگ رہا تھا۔ ہانیہ نے تصویر ذرا سی اوپر اٹھائی اور اپنے لب اس کے گال پر رکھ دیے۔

''آئی مس یو نہال حسن! آئی مس یو ویری مچ۔''

بہت دنوں کے بعد وہ پھر بہت رو رہی تھی مگر وہاں کوئی اسے چپ کروانے والا نہیں تھا۔ صفدر صاحب کی ڈیتھ ہوگئی تھی' حسن صاحب اور ان کی بیگم انگلینڈ جا بسے تھے کمال اور ان کی بیوی عنا کے پاس' مائرہ اور سارا کی آگے پیچھے شادیاں ہوگئی تھیں۔ جاذب اور ہادیہ بھی پچھلے سال ہی دیارِ غیر میں مقیم ہوگئے تھے مگر وہ ہزار کوششوں اور اصرار کے باوجود اپنا آبائی گھر چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئی تھی۔

عرصہ ہوگیا تھا کسی نے ہانیہ صفدر کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ نہال حسن کی ڈیتھ کے بعد تو یوں بھی وہ بہت گوشہ نشین ہوکر رہ گئی تھی۔ ہفتوں اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتی' ہادیہ روز اسے ٹائم نکال کر کال کرتی تھی مگر وہ کبھی اٹینڈ کرتی' کبھی نظر انداز کر جاتی۔

اکثر و بیشتر مسٹر اینڈ مسز رحیم شام میں اس کی طرف چکر لگا لیتے تھے تو اس کا دل بہل جاتا تھا' کل بھی تقریب سے قبل وہ دونوں اس کے گھر آئے اور اسے بصد اصرار اپنے گھر میں ہونے والی تقریب میں شمولیت کی دعوت دے کر گئے تھے۔

عرصہ ہوا اس نے اس طرح کی تقریبات میں جانا چھوڑ دیا تھا مگر مسٹر اینڈ مسز رحیم کو مایوس کرنا اسے مناسب نہیں لگا تبھی وہ ان کے گھر چلی آئی تھی۔ مگر اسے گمان نہیں تھا کہ وہاں میکال حسن بھی ہوگا کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق وہ پیرس میں سیٹل ہوچکا تھا' اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ اگر وہ ذرا سی بھی اس کی آمد سے باخبر ہوتی تو شاید آج کی تقریب میں کبھی نہ آتی۔

خاموشی سے گہری ہوتی پُر فسوں شب کے بارہ بج گئے تھے اس نے ایک نظر سامنے لگے وال کلاک پر ڈالی پھر تکیہ سیٹ کرکے لیٹ گئی۔ پچھلے کچھ دنوں سے موسم میں خنکی بڑھ گئی تھی۔

روز آفس سے واپسی کے بعد شدید تھکن کے باوجود وہ اسٹڈی روم میں گھس جاتی اور ساری ساری رات کتابوں کو چاٹتی رہتی' اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جن کی زندگی میں قسمت صرف اندھیرے لے کر آتی ہے۔

کروٹ کے بل لیٹ کر دونوں ہاتھ بائیں گال کے نیچے رکھتے ہوئے اس کی نظر پھر اپنی اور نہال حسن کی شادی کی تصویر سے ٹکرائی تھی' اسی کے ساتھ وہ تمام دن جنہیں وہ کبھی یاد کرنا نہیں چاہتی تھی اس کی سوچوں میں در آئے تھے۔

تیری آہٹ......
سلگتی دوپہر کو شام کرتی ہے
اترتی ہے سوادِ ہجر میں کچھ اس طرح
صدائے آشنا کوئی
گھنے گہرے اندھیرے جگنوؤں کی بے یقینی میں
رخِ منزل دکھاتی ہے
روشنی کا کام کرتی ہے

❁......❁......❁

جاذب اور ہادیہ کی شادی کی ڈیٹ فکس ہوگئی تھی۔ انگلینڈ جانے سے قبل میکال پھر ان کے گھر آیا تھا' کل جب وہ میکال کے ساتھ صبح صبح گھر واپس آئی تھی اسی روز ناشتے کے بعد اس نے ہادیہ کو ساری بات بتادی تھی۔ کل رات جو کچھ میکال نے زبردستی اس کے ساتھ کیا تھا وہ چاہتے ہوئے بھی ہادیہ سے چھپا نہیں سکی تھی' جواب میں ہادیہ نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ میکال کی برائیوں اور اس کے ماضی کی محبت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرکے اس کے ساتھ اپنے تعلق کو خوش گوار بنائے تاہم ہانیہ فی الحال اس کی بات پر کان دھرنے کو تیار نہیں تھی۔ اپنے کردار کے بارے میکال حسن کے الفاظ اسے سانپ بچھو بن کر کاٹتے تھے۔ اسی روز شام میں جب وہ ہادیہ کے ساتھ رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی' وہ پھر آ دھمکا تھا۔ جاذب گھر پر نہیں تھا تاہم صفدر صاحب اور ان کی بیوی ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے نیوز سن رہے تھے جب وہ وہیں ٹی وی لاؤنج میں چلا آیا۔

''السلام علیکم انکل اینڈ آنٹی! کیسے ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام بیٹے! بڑی لمبی عمر ہے تمہاری' ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔''

''خیریت؟''

''ہوں' تمہاری آنٹی تمہارا ذکر کر رہی تھیں۔'' صفدر صاحب نے بتایا تھا جواب میں وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''ذکر خیر تو نہیں ہو رہا ہوگا' ہے ناں؟''

''نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں' بہت تعریف کر رہی تھیں تمہاری' ہادیہ بتا رہی تھی کہ تم انگلینڈ جا رہے ہو؟''

''جی انکل! اصل میں کافی عرصہ وہاں رہا ہوں تو بہت سی چیزیں ہیں جنہیں صرف میں ہی ہینڈل کرسکتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں سب کچھ کلوز کرکے پاکستان آ جاؤں پکا پکا یا پھر کمال بھائی کے سپرد کر آؤں۔''

''اچھی بات ہے' واپس کب تک آ ؤ گے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا' یہ تو وہاں جا کر ہی پتا لگے گا۔''

''کچھ بھی ہو لیکن سارا کام نپٹا کر فوری واپس آ ؤ کیونکہ جاذب اور ہادیہ کی شادی کی ڈیٹ فکس ہوگئی ہے اور تمہارا اس موقع پر یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔''

''میں کوشش کروں گا انکل! ان شاء اللہ آپ پریشان نہ ہوں۔'' اس کے چہرے اور آنکھوں میں بشاشت تھی' صفدر صاحب کو پہلی بار وہ بہت خوش دکھائی دیا تھا تبھی وہ مطمئن سے مسکرا دیے تھے۔

ہانیہ تھوڑی دیر بعد ہادیہ کے مجبور کرنے پر چائے لے کر آئی تو وہ صفدر صاحب سے کہہ رہا تھا۔

''وہ اصل میں انکل! میں ہانیہ کے ساتھ باہر ڈنر کرنا چاہ رہا تھا' اگر آپ کی اجازت ہو تو......''

''ہاں ہاں کیوں نہیں' بھئی بیوی ہے تمہاری' کوئی گرل فرینڈ تھوڑی ہے جو اجازت مانگ رہے ہو۔'' میکال کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی انہوں نے اجازت دے ڈالی تھی۔

ہانیہ محض انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

"ایم سوری پاپا! میرے سر میں درد ہو رہا ہے میں اس وقت کہیں بھی جانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"بُری بات ہانیہ! میکال کل انگلینڈ جا رہا ہے پتا نہیں کب واپسی ہو' چلو اٹھو شاباش تیار ہو کر آؤ' میں اس وقت تمہارا انکار سننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"مگر پاپا......"

"کوئی اگر مگر نہیں' چلو اٹھو شاباش! اور پانچ منٹ میں واپس آؤ۔"

وہ آرمی سے وابستہ رہے تھے اور یہ چیز ان کے اندر جیسے رچ بس گئی تھی۔ ہانیہ بے حد ہرٹ ہو کر وہاں سے اٹھی تھی کتنے دکھ کی بات تھی کہ سب کچھ جاننے کے باوجود وہ میکال کو سر آنکھوں پر بٹھا رہے تھے اور اس کی اب بھی وہی اہمیت تھی۔

بے بس...... لاچار......

اگلے بیس منٹ میں وہ انہی کپڑوں میں بال سیدھے کرکے آ گئی تھی۔ میکال اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوکے انکل! ہم اب نکلتے ہیں گھر واپسی پر مجھے پیکنگ بھی کرنی ہے اس لیے معذرت مزید نہیں بیٹھ سکوں گا۔"

"کوئی بات نہیں' ہانیہ کا خیال رکھنا۔"

"ان شاء اللہ' اللہ حافظ۔"

صفدر صاحب سے ہاتھ ملا کر ذکیہ بیگم سے پیار لیتے ہوئے وہ فوراً گھر سے باہر نکل آیا۔ جب کہ ہانیہ کو ہادیہ کندھوں سے تھام کر باہر لائی تھی۔ اس کے جانے کے بعد صفدر صاحب نے گہری سانس بھرتے ہوئے ذکیہ بیگم سے کہا۔

"میں جانتا ہوں ہانیہ! میرے فیصلوں سے خوش نہیں ہے مگر وہ نہیں جانتی ذکیہ کہ جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں وہاں سو فیصد لڑکے کے گلٹی ہونے کے باوجود دن رات بیٹی کے ماں باپ ہاتھ باندھے اپنے سمدھیوں کے سامنے کھڑے رہتے ہیں صرف اس لیے کہ بس ان کی بیٹی کا گھر آباد رہے۔ چاہے وہ وہاں سولی پر ہی کیوں نہ چڑھی ہو بس اس کے آباد رہنے کا بھرم قائم رہے کیونکہ وہ جانتے ہیں اگر کسی بھی وجہ سے ان کی بیٹی واپس ان کے گھر آ گئی تو بربادی کا سارا ملبہ صرف ان کی اور ان کی بیٹی کی ذات پر گرے گا۔ لڑکے والوں کے نام پر کوئی حرف نہیں آئے گا' یہی اس معاشرے کی ریت ہے۔" بولتے بولتے ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تبھی ذکیہ بیگم نے ہاتھ بڑھا کر ان کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

ہانیہ باہر میکال کی گاڑی میں آ کر بیٹھی تو سرد ہواؤں نے بے ساختہ اسے کپکپانے پر مجبور کر دیا۔ میکال نے بس ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

ریسٹورنٹ تک دونوں خاموش رہے' تاہم جس وقت اس نے کھانا آرڈر کیا اس نے ہانیہ کو مخاطب کیا۔

"مجھے کھانے میں تمہاری پسند کا علم نہیں ہے پلیز تم جو بھی کھانا چاہو منگوا سکتی ہو۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' آپ یہی لے آئیں پلیز۔" ہانیہ سے توجہ ہٹا کر اس نے ویٹر کو وہی ڈشز اوکے کر دی جو اس نے پسند کی تھیں وہ سر ہلا کر واپس مڑ گیا۔

"ابھی تھوڑی دیر میں یہاں رحیم صاحب اور آپا بھی آنے والے ہیں۔ اسی لیے تمہارے نا چاہنے کے باوجود میں تمہیں یہاں لے آیا کیونکہ انہیں ہمارے اختلافات کی خبر نہیں ہے۔"

"کس کس سے اپنے اختلافات کو چھپاتے پھریں گے مسٹر میکال حسن صاحب! ایک نہ ایک دن تو دنیا کو پتا چل ہی جائے گا کہ ہمارے رشتے کی حقیقت کیا ہے۔"

"ہوں مگر دنیا کو پتا چلنے سے قبل ہی میں اس رشتے کو مضبوط کر لوں گا۔" مخمور لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ہانیہ کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

"میں مانتا ہوں تم مجھ سے بہت ناراض ہو' یقیناً مجھے معاف کرنے کا بھی تمہارا کوئی پروگرام نہیں مگر میں پھر بھی تم سے ملے بغیر یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔"

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکالتے ہوئے اس نے رخ پھیر لیا۔

"جانتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اس شادی کے لیے دل سے رضامند نہیں تھیں' سارا اور مائرہ کے بقول تمہارا اور نہال کا آپس میں پسندیدگی کا رشتہ تھا شاید اس نے مما پاپا کے سامنے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ اسی لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ تم میرے ساتھ کوئی تعلق بناؤ کیونکہ میں خود ایک ٹوٹا ہوا انسان ہوں۔ عائشہ ازہان کو کھونے کے بعد زندگی بہت بے رنگ سی ہو کر رہ گئی ہے میرے لیے' تم خود سوچو ایک انسان جو پہلے ہی ٹوٹا ہوا ہو کیا اسے کوئی منتشر فرد سکون دے سکتا ہے؟"

"میں منتشر نہیں ہوں' نہ ہی مجھے اس چیز میں کوئی دلچسپی ہے کہ عائشہ ازہان آپ کے لیے کیا تھی کیا نہیں تھی' میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں ایک برتے ہوئے انسان کے ساتھ اپنی خوب صورت زندگی کا سفر شروع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک ایسا انسان جس کے پاس آپ کو دینے کے لیے نہ خالص خواب ہوں نا جذبے' میری پسند ایسا انسان نہیں تھا اسی لیے میں نے اس شادی سے انکار کیا تھا' مجھے نہیں پتا نہال کے دل میں میرے لیے کیا ہے کیا نہیں ہے مگر میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ ایک بہترین انسان ہے' رشتوں کو برتنے اور ان کی قدر کرنے کے معاملے میں وہ آپ سے کئی درجے بہتر انسان ہے۔" رخ پھیرے وہ قدرے جذباتی ہو گئی تھی۔ میکال یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

"اور ہاں یہ شادی میں نے بھی ویسے ہی مجبور ہو کر کی تھی جیسے آپ نے مجبور ہو کر کی ورنہ عائشہ ازہان کے عاشق میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی پھر بھی صرف اپنے ماں باپ کی عزت رکھنے کے لیے انسانی ہمدردی کے تحت میں نے آپ کو اپنا ہم سفر قبول کیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید آپ کا اعتبار جیت کر میں آپ کی کھوئی ہوئی خوشیاں آپ کو دوبارہ لوٹا سکوں گی مگر یہ میری بھول تھی' کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ ہمدردی بھی نہیں کی جا سکتی اور آپ کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے مسٹر میکال! میں اب تک خاموش ہوں تو صرف جاذب اور ہادیہ کی خوشیوں کے لیے ورنہ آپ جیسے پراگندہ سوچوں کے مالک شخص کے ساتھ میں چند گھڑیاں گزارنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں۔ شادی ضرور کی ہے میں نے مگر اس شادی کے بدلے میں اپنے کردار اور اپنی عزتِ نفس کا سودا نہیں کیا میں نے بہرحال میں اب چلتی ہوں اس سے پہلے کہ پھر موسم خراب ہو جائے اور مجھے زبردستی آپ کے ساتھ آپ کے گھر جانا پڑے' مسٹر اینڈ مسز رحیم کو میری طرف سے معذرت کہہ دیجیے گا۔"

دل کا غبار نکال کر اپنی بے عزتی کا بدلہ اچھی طرح چکانے کے بعد وہ بنا میکال کے جذبات کا خیال لیے کرسی پیچھے کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی تبھی ویٹر کھانا لے آیا تھا۔

"کھانا کھا کر جاؤ ہانیہ! پھر میں تمہیں خود تمہارے گھر ڈراپ کر آتا ہوں۔" ویٹر کے سامنے سبکی کے احساس سے اس نے ہانیہ کا ہاتھ تھام لیا وہ بھی موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"میں جانتا ہوں تم بہت خوددار اور انا پرست ہو' میرا خدا جانتا ہے میں عورت کی عزت اور احترام کا دل سے قائل ہوں۔ میرے دل میں تمہارے لیے کچھ بھی غلط نہیں ہے' میں

نے جو کچھ بھی تم سے کہا وہ وہی تھا جو سارا اور مائرہ نے سنا' بہرحال میں تمہیں قطعی مجبور نہیں کروں گا کہ تم میرے جیسے برتے ہوئے شخص کے ساتھ زبردستی زندگی گزارو میں اپنی برباد زندگی کے لیے کسی کی بھی ہمدردی کا متمنی نہیں ہوں میرا وعدہ ہے تم سے تم جب بھی مجھ سے رہائی چاہو گی میں تمہیں آزاد کردوں گا۔" ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہتا وہ ہانیہ کو ساکت کرگیا۔ کیا واقعی اس شخص کے لیے تعلق بنانا اور پھر انہیں ختم کردینا اتنا ہی آسان تھا؟

"چلو اب کھانا کھاؤ پلیز پھر چلتے ہیں۔" بنا ہانیہ کے چہرے پر نگاہ ڈالے وہ کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ ہانیہ خاموشی سے سرہلا کر رہ گئی۔

آدھ گھنٹے کے بعد بنا کچھ کھائے وہ گھر واپسی کے لیے میکال حسن کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ دل کو چھو لینے والی سبک رو ہوا سے ہانیہ کا اڑتا آنچل میکال کے ساتھ اس کے سفر کو حسین بنا رہا تھا تاہم وہ دونوں چپ تھے۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی جوان کے ریسٹورنٹ سے نکلنے کے ساتھ ہی شروع ہوچکی تھی اب آہستہ آہستہ تیز بارش کی صورت اختیار کرگئی۔ میکال کے لیے ڈرائیونگ میں مشکل پیش آنے لگی' تیزی سے کام کرتا وائپر بھی سامنے روڈ کو کلیئر کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا' تبھی سنسان روڈ پر ایک دم سے گاڑی بند ہوگئی۔

"او مائی گاڈ! اسے بھی ابھی بند ہونا تھا۔" اسٹیئرنگ ویل پر ہلکا سا مکا رسید کرتے ہوئے میکال نے اپنے غصے کا اظہار کیا' وہ گھبرا گئی۔

"کیا مطلب؟ کیا گاڑی اب نہیں چلے گی؟"

"پتا نہیں دیکھتا ہوں۔"

اسے تسلی دے کر وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔ ہانیہ منہ ہی منہ میں مختلف قرآنی آیات کا ورد کرنے لگی۔ موبائل کے سگنل بھی خراب موسم کی وجہ سے کام نہیں کررہے تھے اوپر سے بجلی کی کڑک الگ دل دہلا رہی تھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ انجن پر جھکا رہنے کے بعد وہ گاڑی میں واپس آیا۔

"سوری ہانیہ! گاڑی کا انجن کام نہیں کررہا' ہمیں کسی دوسری سواری کا انتظار کرنا پڑے گا؟"

"کیا...... لیکن اتنی سنسان جگہ پر کوئی دوسری سواری کیسے ملے گی؟"

"مل جائے گی ان شاء اللہ! تمہیں ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں' میں ہوں ناں تمہارے ساتھ؟" ہانیہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے کچھ اس اپنائیت سے کہا کہ اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

"مجھے اس موسم سے بہت ڈر لگتا ہے اتنی زور سے بادل گرج رہے ہیں اگر اس گاڑی پر بجلی گر پڑی تو؟"

"ہاہاہا...... تو کیا اکٹھے جی تو نہیں سکے کم از کم اکٹھے مر تو جائیں گے۔"

"مگر میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟"

"ابھی کوئی نیکی جو نہیں کی ہے میں نے۔" اتنی معصومیت سے اس نے کہا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑا' وہ لڑکی اندر سے کتنی سادہ اور معصوم تھی۔

"اوکے ہم ایسا کرتے ہیں گاڑی کو لاک کرکے یہیں رہنے دیتے ہیں اور خود کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر موسم کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے ہیں؟" ہانیہ کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خاموشی سے سرہلا گئی۔

ہانیہ بھی ڈرتے ڈرتے اس کے پیچھے باہر نکل آئی تو میکال نے گاڑی لاک کردی۔ موسم کی شدت میں مزید اضافہ ہو رہا تھا وہ دونوں تیز بارش میں بھیگتے قریب ہی ایک پرانی سی دکان کے شیلٹر کے نیچے کھڑے ہوئے۔

"پاکستان کے لوگوں کی طرح پاکستان کے موسموں کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے' پل میں کیا سے کیا ہوجاتے ہیں۔" کورٹ سے پانی جھاڑتے ہوئے اس نے ایک نظر اوپر آسمان کی طرف دیکھا تھا ہانیہ خاموش کھڑی رہی۔

گزرتے ہر لمحے کے ساتھ بارش کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی سردی کا احساس بھی بڑھتا جارہا تھا تاہم وہاں بہتری کی فی الحال کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ تبھی میکال کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"دعا کرو خیریت سے گھر پہنچ جائیں یہاں اس روڈ پر آئے روز بہت وارداتیں ہوتی ہیں۔" وہ سنجیدہ تھا ہانیہ کا دل زور سے دھڑکا' تبھی اس نے ڈر کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہوں سچ کہہ رہا ہوں' اسی لیے میں نے گاڑی میں بیٹھنے کو ترجیح نہیں دی۔"

"اگر آپ کو یہ سب پتا تھا تو آپ کو اس ٹائم گھر سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ پتا تو ہے شہر کے حالات کا اور میں تو آنا بھی نہیں چاہتی تھی آپ کے ساتھ مگر ہمیشہ کی طرح آپ زبردستی ساتھ لے آئے اب اگر کچھ ہوا تو میں آپ کو معاف نہیں کروں گی۔"

"پہلے کب کررہی ہو؟" بے نیازی سے ہاتھ پینٹ کی پاکٹس میں گھساتے ہوئے اس نے سامنے روڈ پر نظر دوڑائی تھی۔

ہانیہ لب بھینچ کر رہ گئی' سردی کی شدت سے اس کا سارا جسم کپکپا رہا تھا۔ ہونٹ جیسے نیلے ہو رہے تھے اوپر سے بارش کی ترچھی بوندوں نے اچھی طرح بھگو ڈالا تھا۔ وہ میکال پر اپنا حال ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی مگر جسم کی کپکپاہٹ اور نیلے ہوتے ہونٹوں نے اس کا بھید کھول دیا تھا۔

"سردی لگ رہی ہے؟" میکال کا ہاتھ اس کے کندھے پر آیا تو اس نے آہستہ سے نفی میں سرہلا دیا۔

"تو پھر کپکپا کیوں رہی ہو اور یہ اپنے ہونٹوں کو دیکھو کیسے نیلے ہو رہے ہیں؟"

"اِٹس اوکے۔"

"نہیں...... سب ٹھیک نہیں ہے' پتا نہیں موسم کب ٹھیک ہو' تم زیادہ دیر مزید کھڑی بھی نہیں رہ سکتیں۔ میں دیکھتا ہوں شاید یہاں کوئی بیٹھنے کی جگہ ہو۔"

ہلکے سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے وہ مڑ گیا۔ ہانیہ نے دونوں بازو اپنے کندھوں کے گرد لپیٹ لیے' تقریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ دوبارہ اس کے پاس آیا۔

"چلو۔"

"کہاں؟"

"شوہر ہوں تمہارا کہیں بھی لے جاسکتا ہوں فی الحال پیچھے ایک کمرا ہے شاید کچھ روز پہلے تک کوئی وہاں اپنا گھوڑا باندھتا رہا ہے' اتنے خراب موسم میں فی الحال یہ پناہ بہترین جگہ ہے۔"

"آپ کے لیے ہوگی مگر میں کسی ایسی جگہ پر نہیں بیٹھ سکتی جہاں مجھ سے کھل کر سانس بھی نہ لیا جاسکے۔"

"وہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے تھوڑی سی خشک گھاس ہے اور بس موسم کے تیور تم دیکھ رہی ہو' موبائل کام نہیں کررہا' روڈ سنسان اور خطرناک ہے۔ خدانہ کرے ابھی ہمیں یہاں کھڑے دیکھ کر کوئی اسلحہ لے کر آگیا تو کیا کریں گے۔ میں تو خیر بھاگ بھی لوں گا مگر تم سے تو بھاگا بھی نہیں جائے گا۔"

"اللہ نہ کرے کہ ایسا کچھ ہو۔"

"ٹھیک ہے تو تم کھڑی رہو یہیں میں جارہا ہوں' مجھ سے تو مزید ٹھنڈ برداشت نہیں ہو رہی۔" چڑ کر کہتے ہوئے وہ پلٹ گیا مگر ہانیہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی وہیں کھڑی رہی لیکن کب تک؟

میکال کی باتیں واقعی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھیں۔ اوپر سے بارش تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی' چار پانچ منٹ میکال کا مزید انتظار کرنے کے بعد وہ بھی اس کے پیچھے ہی اس کھلے سے ہال نما کمرے میں چلی آئی جہاں سیمنٹ کے فرش پر کچھ خالی پانی کی بوتلیں اور قدرے خشک گھاس کا ڈھیر پڑا تھا۔ میکال نے وہ گھاس پھیلا کر بڑے مزے سے اپنے لیے بستر کا انتظام کرلیا تھا۔

ہانیہ ایک نظر اس پر ڈالتی سائیڈ پر بیٹھ گئی' پتا نہیں اس کے گھر والے اس کے لیے کتنے فکرمند ہوں گے یہی خیال اسے بار بار پریشان کررہا تھا۔ بادل اتنی زور سے گرج رہے تھے کہ وہ دہل کر رہ جاتی' رہ رہ کر اسے میکال پر غصہ آرہا تھا جو اسے ضد کرکے زبردستی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ دوسری طرف اس کی

غزل

زندگی سے نظر ملاؤ کبھی
ہار کے بعد مسکراؤ کبھی
ترکِ الفت کے بعد امیدِ وفا
ریت پر چل سکی ہے ناؤ کبھی
اب جفا کی صراحتیں بے کار
بات سے بھر سکا ہے گھاؤ کبھی
شاخ سے موجِ گل تھمی ہے کہیں
ہاتھ سے رک سکا بہاؤ کبھی
اندھے ذہنوں سے سوچنے والوں
حرف میں روشنی ملاؤ کبھی
بارشیں کیا زمین کے دکھ بانٹیں
آنسوؤں سے بجھا الاؤ کبھی

بشریٰ امین...... چاہی نہالہ

نکٹ ضائع ہونے کا بھی افسوس تھا' اچھا ہی تھا کہ وہ انگلینڈ چلا جاتا اور وہ پُرسکون ہو جاتی۔

بارش کی شدت کے ساتھ ہی ہوا میں بھی تیزی آ گئی تھی' طوفانی ہوا کے جھکڑ اسے برف بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ اوپر سے بدن کے ساتھ چپکے گیلے کپڑوں نے علیحدہ مصیبت میں مبتلا کر رکھا تھا۔

میکال دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھے گیلے کپڑوں کے ساتھ بڑے مزے سے لیٹا کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ہانیہ کی جان پر بنتی جا رہی تھی مگر اسے جیسے پروا ہی نہیں تھی۔

کچھ ہی دیر میں اس نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں تو وہ خود بخود اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔

''سنو.....'' میکال کا بازو ہلاتے ہوئے اس نے اسے جگایا۔

''ہوں۔''

''آپ نے کہا تھا یہ خطرناک جگہ ہے کیا یہاں کوئی اسلحہ لے کر نہیں آئے گا؟''

''آنا تو نہیں چاہیے مگر کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا خیر تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ ہے ناں ہمارے ساتھ اور پھر تم کوئی اکیلی تھوڑی ہو' میں ہوں ناں۔'' اس کے پریشان ہونے پر اس نے تسلی دی مگر جواب میں ہانیہ نے خاصی ناراض نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا' جیسے کہنا چاہ رہی ہو ہاں دیکھ رہی ہوں میں کتنے تم میرے ساتھ ہو۔

''چلو لیٹ جاؤ میرے ساتھ' شاباش!'' اگلے ہی پل اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے اوپر گرا لیا۔

''کم از کم آج کی رات گھر واپسی ممکن نہیں ہے' تم سمجھو ہم ہنی مون ٹرپ پر آئے ہوئے ہیں' ایڈونچر سے بھرپور ٹرپ پر۔'' اپنی ہی ترنگ میں کہتے ہوئے اس نے ہانیہ کے گرد اپنے بازوؤں کی گرفت خاصی سخت کر دی تھی وہ محض پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

''مجھے آپ کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی میکال حسن! چھوڑو مجھے۔''

''میرے ساتھ ہی زندگی گزرے گی تمہاری' لکھ کر رکھ لو۔'' اب کے اس نے اسے اپنے پہلو میں گرا لیا۔

''وہ سارے خواب جو میں نے عائشہ کے حوالے سے دیکھے تھے ان خوابوں کی تعمیر تم ہو گی ہانیہ! یہ ٹھیک ہے کہ میرے دل کا ایک کونا اس لڑکی کی محبت سے ہمیشہ آباد رہے گا' مگر یہ بھی سچ ہے کہ مجھے تمہاری بددعا لگ گئی ہے۔ میں جو تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا تھا' خالق کائنات نے مجھے بے بس کر کے ایک اسی شکل میں میرے لیے سکون رکھ دیا ہے۔''

''سوری! مگر میرے دل میں اب آپ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں' جس خالق و مالک نے مجھے تمہارے معاملے میں بے بس کیا ہے یقیناً وہی تمہارے دل میں میرے لیے بھی ضرور محبت ڈالے گا میں اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔'' پُریقین لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ہانیہ کا سر اپنے بازو پر رکھا تبھی پہلی بار اس نے اس کی آنکھوں کو دیکھا تھا۔ دمکتے ستاروں کی مانند جگمگاتی ہوئی بے حد حسین آنکھیں' وہ جھکا اور انتہائی محبت سے اپنے لب ان ستاروں پر ثبت کیے تھے۔

''میکال میں......'' ہانیہ کسمسائی مگر میکال نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''ششش...... کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے' اپنے ہونٹ دیکھو کتنے نیلے ہو رہے ہیں۔'' سرگوشیانہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ہانیہ کے لبوں پر انگلی پھیری اور ساتھ ہی اس کی صبیح پیشانی سے چپکے بال ہٹا دیئے۔ وہ اٹھنا چاہتی تھی مگر میکال نے اسے ایسا کوئی موقع نہیں دیا۔ وہ جھکا اور اپنے ہونٹ ہانیہ کے لبوں پر رکھ دیئے۔ ہانیہ کو لگا جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہو تبھی میکال کو پیچھے دھکیلتے ہوئے وہ اٹھی اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ مزید تذلیل نہیں کر سکتے میکال حسن!'' زیر و بم ہوتی سانسوں کے ساتھ اس کی آنکھیں بھرائی تھیں' مگر وہ مسکرا دیا۔

''ہوں مگر پیار تو کر سکتا ہوں ناں؟''

ادھر جیسے اس کے غصے کا کوئی اثر ہی نہیں تھا وہ بے بسی سے نم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئی یوں لگتا تھا جیسے برستے موسم نے اسے بے بس کر ڈالا ہو تبھی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہانیہ صفدر کے گرد بازو ٹکاتے ہوئے وہ پھر اس پر جھکا اور اس بار اس نے اس کی گردن کو نشانہ بنایا تھا۔ ہانیہ مزاحمت کرنا چاہتی تھی مگر...... ایک مرتبہ پھر اس کی ہمت

جواب دے گئی تھی ایک مرتبہ پھر میکال حسن نے اسے شکست دے ڈالی تھی۔

اگلے روز صبح میکال کی آنکھ کھلی تو وہ اس جگہ پر نہیں تھی شاید نہیں یقیناً وہ اس سے بہت زیادہ خفا ہو چکی تھی وہ مسکرایا اور اگلے ہی پل اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

بارش تھم چکی تھی مگر سرد ہواؤں کے تھپڑوں کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ ہانیہ سڑک کی طرف رخ کیے کھڑی تھی اور زیر لب مسکراتا اس کے برابر میں آ کھڑا ہوا۔

"السلام علیکم صبح بخیر!" اس کے سلام پر وہ چونکی مگر رخ نہیں پھیرا۔

"آپ کی حسرتیں اگر پوری ہو گئی ہوں تو چلنے کی تیاری کریں' میں اپنے گھر والوں کو اس سے زیادہ اذیت نہیں دے سکتی۔" بنا اس کے سلام کا جواب دیئے وہ بے رخی سے بولی۔ میکال اسے دیکھتا رہ گیا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے میرے گھر والے سکون سے بیٹھے ہوں گے؟"

"مجھے نہیں پتا میں اس وقت آپ سے بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں یقیناً موبائل کام کر رہا ہوگا۔" اس کے خراب موڈ کے پیش نظر وہ فوراً ہی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اگلے تیس منٹ میں جاذب کی گاڑی ان دونوں کے مقابل تھی۔ نہال شہر میں نہیں تھا ورنہ وہ اسے ہی بلواتا' ہانیہ کو جاذب کے ساتھ رخصت کرنے کے بعد وہ اپنے گھر چلا آیا۔

اگلے دو روز کے بعد وہ انگلینڈ چلا آیا جب کہ ہانیہ شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی تھی۔ دو ماہ اسی میں گزر گئے نہ اس نے کبھی ہانیہ کو فون کر کے اس کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کی نہ ہانیہ نے ہی کبھی اسے یاد کیا' انہی دنوں ایک دوست کے بے حد اصرار پر اس نے ماڈلنگ شروع کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ بے حد وجیہہ ہے مگر اپنی خوب صورتی اور وجاہت کو کیش کرانے کا خیال اسے کبھی نہیں آیا تھا' تاہم انگلینڈ میں قیام کے دوران قریبی پاکستانی دوست کے اصرار پر بحالت مجبوری وہ اسے انکار نہ کر سکا اور اس نے ایک کمرشل کر لیا' ہانیہ جو بری طرح شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی اسے ٹی وی پر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

پہلی بار میکال حسن کے ساتھ کسی دوسری لڑکی کو چپکے ہوئے دیکھ کر اس کا دل جلا اور وہ کڑھ کر رہ گئی' اس کے بعد ہر لمحہ جیسے اس پر عذاب بن کر آیا تھا۔ میکال حسن کو وہ کھو سکتی تھی مگر اسے تقسیم کرنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا' یہی وجہ تھی کہ مصروفیات کے باوجود وہ پریشان رہنے لگی تھی۔

پچھلے ایک ہفتے سے اس کی طبیعت ناساز تھی مگر اس روز تو حد ہی ہو گئی تھی اچھی بھلی وہ کچن میں چائے بنانے گئی کہ زور کے چکر نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ ہادیہ اگر اسے فوری طور پر نہ تھام لیتی تو اس کا گر جانا یقینی تھا۔ اسی روز ہانیہ کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی اور وہیں اسے ہانیہ کے حاملہ ہونے کی خوش کن خبر ملی تھی۔

مارے خوشی کے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے تاہم ہانیہ خوش نہیں تھی اس کے لبوں کو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ ہادیہ نے اس کے منع کرنے کے باوجود سب کو اس خوش خبری سے آگاہ کر دیا تھا۔ میکال کو بھی اسی نے خبر دی تھی جواباً وہ بے حد مسرور ہوا تھا حسن صاحب اور ان کی بیگم کی خوشی بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

اگلے روز ہادیہ کا مایوں تھا' ہانیہ منہ سر لپیٹے پڑی تھی کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا تاہم بیگم حسن کی ڈانٹ پر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کپڑے تبدیل کرنے پڑے تھے۔ ہادیہ نے زبردستی پکڑ کر ہلکا پھلکا میک اپ بھی کر دیا۔

مسز رحیم بھی جلد ہی پہنچ گئی تھیں' ہانیہ مصروفیات کے باوجود انہیں کمپنی دیتی رہی بھی ہادیہ نے اسے بلا لیا تھا۔

"ہانی......!"

"ایکسکیوزمی! میں ذرا ہادیہ کی بات سن آؤں۔" مسز حسن کو مسز رحیم کے پاس بیٹھا چھوڑ کر وہ ہادیہ کے پاس چلی آئی۔

"ہوں۔"

"میرے گجرے کہاں رکھے ہیں؟"

"مجھے کیا پتا؟ میں نے تو تمہارے سپرد کر دیئے تھے۔"

"یار مجھے نہیں مل رہے ابھی رسم شروع ہو جائے گی' پلیز میرے کمرے سے لا دو پلیز......"

"تم بھی ناں ہادیہ! ایک دم سے پاگل اور فضول لڑکی ہو' مجھے اس حال میں چکر پر چکر لگوا رہی ہو۔"

"کچھ نہیں ہوتا' ابھی شروع شروع ہے خوب ورزش کیا کرو۔" وہ ہنسی تو ہانیہ اسے گھور کر رہ گئی۔

گجرے ہادیہ کے کمرے میں ہی رکھے تھے انہیں وہاں سے اٹھا کر وہ ابھی سیڑھیوں کی طرف آ رہی تھی کہ اچانک لائٹ چلی گئی پھر اس سے پہلے کہ کوئی جنریٹر آن کرتا' کسی نے ہاتھ بڑھا کر ہانیہ کو تاریک راہداری میں کھینچ لیا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر کھینچنے والے کا ایک ہاتھ قطعی مضبوطی سے اس کے منہ پر جما تھا۔ ہانیہ کی جان پر بن گئی اگلے ہی پل جنریٹر آن ہوا اور اس کے ساتھ ہی ہانیہ کو کھینچنے والے کا چہرہ بھی۔

"کیسی ہو؟" جونہی ہانیہ نے سر اوپر کر کے اس کا چہرہ دیکھا وہ مسکرا دیا۔

"چھوڑو مجھے۔" وہ بری طرح گھبرائی مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

"کیوں چھوڑوں؟ اتنے دنوں کے بعد تو ملی ہو اب بھی چھوڑ دوں؟"

"یہ کون سا طریقہ ہے ملنے کا ابھی کوئی اوپر آ گیا تو؟"

"تو آ جائے میں کسی سے نہیں ڈرتا ویسے بھی شوہر ہوں تمہارا' کوئی روک تھوڑی سکتا ہے ملنے سے۔"

"میکال پلیز......"

"سوری!" کندھے اچکاتے ہوئے اس نے اس کی درخواست رد کر دی۔

"ہانیہ!" اسے پکارتے ہوئے کوئی اوپر آیا تھا۔ ہانیہ کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا مگر میکال اسے آزاد کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"چھوڑ دیں پلیز' میں اس وقت آپ سے مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"تو اچھی بات ہے ناں' اچھی بیویوں کو مزاحمت کرنی بھی نہیں چاہیے۔"

"ہانیہ!" جاذب کی اسے پکار رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اوپر آتا ہانیہ نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑوایا اور لپک کر سیڑھیوں کے قریب آ گئی۔

"جج......جی......"

"کہاں تھیں یار! کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔" وہ سیڑھیوں کے دہانے پر کھڑا تھا' ہانیہ شرمندہ ہو گئی۔

"یہیں تھی' وہ ہادیہ نے گجرے منگوائے مل نہیں رہے تھے وہی ڈھونڈ رہی تھی۔"

"اچھا مگر یہ تمہاری سانس کیوں پھولی ہوئی ہے؟"

"وہ......وہ میں بھاگ کر آئی ہوں ناں اس لیے۔"

"اچھا چلو جلدی آ جاؤ' ہادیہ بلا رہی ہے۔" اسے تلقین کرتے ہوئے وہ وہیں سیڑھیوں کے دہانے سے ہی واپس پلٹ گیا تھا۔ ہانیہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک نظر پیچھے پلٹ کر میکال حسن کو دیکھنے کے بعد تیزی سے سیڑھیاں اتر آئی۔

"کہاں رہ گئی تھیں؟" ہادیہ اسے دیکھتے ہی غصے ہوئی' وہ سر جھکا گئی۔

"وہ......میکال نے پکڑ لیا تھا اوپر۔"

"ہیں......یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"سچ کہہ رہی ہوں۔"

"لیکن وہ انگلینڈ سے کب آیا؟"

"مجھے کیا پتا' میں تو خود شاکڈ رہ گئی تھی۔"

"اچھا کیا کہہ رہا تھا؟"

"کچھ نہیں' ڈیوں رومینس جھاڑ رہا تھا۔"

"تمہاری پریگنینسی کا سن کر آیا ہوگا' مانو یا نہ مانو میرا دل کہتا

ہے اسے تم سے محبت ہوگئی ہے ہانیہ!''

''مائی فٹ...... میں نے بٹی ہوئی محبتوں کا اچار نہیں ڈالنا۔''

''ایسا نہیں کہتے ہانیہ! محبت کسی کی جاگیر نہیں ہے جو بٹ سکے، یہ تو ریاست کی طرح ہے جس پر کبھی کوئی حکمران ہوتا ہے تو کبھی کوئی...... میکال حسن کا دل بھی جمہوریاست ہے، جس پر کل کسی عائشہ ازہان کی حکومت تھی مگر آج اسی دل پر تمہاری حکومت ہے۔''

''اور کل...... میرے مرنے کے بعد کسی اور کی حکومت ہوگی۔''

''شٹ اپ! میری سمجھ میں نہیں آتا تم ہمیشہ منفی ہی کیوں سوچتی ہو۔''

''کیوں کہ میں پاگل ہوں اس لیے اب برائے کرم تم اپنی پروفیسری بند کرو اور جلدی سے جا کر اسٹیج پر بیٹھو تاکہ رسم شروع کی جائے۔'' منہ بنا کر کہتے ہوئے وہ ہادیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج کی طرف لے آئی تھی جہاں جاذب بڑی شان سے بیٹھا میکال حسن کے ساتھ گپیں لگا رہا تھا۔

''لو جی ایک نہ شد دو شد۔'' ہادیہ کی نظر جونہی سامنے پڑی وہ بولے بغیر نہ رہ سکی جب کہ ہانیہ آہستہ سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر کھڑی ہوگئی۔

''چلو تم بیٹھو میں آتی ہوں ابھی۔''

''کیوں...... تم کہاں جا رہی ہو؟''

''نافیاں بٹ رہی ہیں محلے میں، وہ لینے جا رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے میرے لیے بھی لے آنا۔'' ہانیہ کے گھورنے پر وہ مسکرائی تو ہانیہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ سامنے بیٹھے میکال حسن نے اس منظر کو بہت دلچسپی سے دیکھا تھا۔

تیل لگ رہا تھا۔ خاندان کی تمام خواتین اسٹیج کے گرد اکٹھی ہوئی خوش گپیوں میں مصروف تھیں جب کہ ایک طرف مرد حضرات کا ٹولہ اپنی گپ شپ میں مصروف تھا۔ ہانیہ بھی اسٹیج کے قریب ہی کھڑی تھی جبھی میکال نے چپکے سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''کیسی ہو؟'' بظاہر وہ سامنے دیکھ رہا تھا مگر اس نے ہانیہ کے کان میں سرگوشی کی تھی، وہ سٹپٹا گئی۔

''ٹھیک ہوں، ہاتھ چھوڑیں میرا۔''

''چھوڑنے کے لیے تو نہیں تھاما۔''

''میکال پلیز......''

''تم اتنی بے مروت تو نہیں تھیں ہانیہ! اتنے دنوں بعد ملے ہیں بندہ حال چال ہی پوچھ لیتا ہے۔''

''بہت لوگ ہیں آپ کا حال چال پوچھنے والے یہاں، میری مزاج پرسی کی ضرورت نہیں۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟'' بنا اس کے لہجے کی تلخی کو محسوس کیے وہ پوچھ رہا تھا، وہ کٹ کر رہ گئی۔

''آپ کیوں اتنے لوگوں میں میرا تماشہ بنانا چاہتے ہیں؟''

''کیا تماشہ بنایا ہے میں نے تمہارا...... ہوں...... تماشہ تو تم میرا بنا رہی ہو جس بات کے لیے میں بارہا ایکسکیوز کر چکا ہوں، اسی بات کو ایشو بنا کر تم مسلسل مجھے رد کر رہی ہو۔'' وہ صحیح کہہ رہا تھا، واقعی ہانیہ کے پاس اب اس سے نفرت کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا پھر بھی جانے کیوں وہ اس سے بھاگ رہی تھی۔

''ہانیہ......'' وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ صفدر صاحب کی پکار نے اسے چونکا دیا، وہ اسے بلا رہے تھے۔

''ایکسکیوزمی! میرے پاپا مجھے بلا رہے ہیں۔'' سرعت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکالتے ہوئے وہ پلٹ گئی۔ میکال سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

''بنی بات؟'' اگلے ہی پل مسز رحیم اس سے پوچھ رہی تھیں۔

''نہیں۔''

''کوئی بات نہیں بن جائے گی، دلوں کی ریاست پر حکمرانی کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔'' اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے انہوں نے تسلی دی تھی وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

مایوں کی رسم اپنے عروج پر تھی جب اچانک سیکنڈ فلور کے مین کمرے میں بھڑک اٹھنے والی آگ نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مہمانوں میں کھلبلی مچ گئی، جاذب اور میکال صفدر صاحب کو تسلی دینے لگے۔

''آپ پریشان نہ ہوں زیادہ خطرے والی بات نہیں ہے۔''

''جی...... ابھی ملازم گئے ہیں اوپر ان شاء اللہ جلدی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ان شاء اللہ...... ہانیہ کہاں ہے؟''

"ہانیہ یہیں کہیں ہوگی' میں دیکھتا ہوں اسے۔" ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے جاذب پلٹا تھا جب وہ بولے۔

"او میرے خدا! اسے تو میں نے اوپر بھیجا تھا کچھ چیزیں لانے کے لیے۔"

"مائی گاڈ!" جاذب نے کہا مگر اس سے پہلے ہی میکال سیڑھیوں کی طرف لپک گیا۔ جاذب بھی اس کے پیچھے ہی بھاگا۔ صفدر صاحب کی جان جیسے لبوں پر آگئی اوپر مین کمرے سے آگ کی لپٹیں باہر کی طرف آرہی تھیں جاذب کے بھیجے ہوئے دونوں ملازم پانی ڈال کر آگ بجھانے کی کوشش کررہے تھے مگر وہاں اس کمرے کی آگ بجھنے کی بجائے اور زیادہ بھڑکتی جارہی تھی تبھی ان دونوں کو اسی کمرے سے ابھرتی ہانیہ کی چیخوں کی آواز سنائی دی۔

❀......❀......❀

سنو تم نے کبھی ساحل پہ بکھری ریت دیکھی ہے؟
سمندر ساتھ بہتا ہے مگر
اس کے مقدر میں
ہمیشہ پیاس رہتی ہے
سنو تم نے کبھی صحرا میں جلتا پیڑ دیکھا ہے؟
سبھی کو چھاؤں دیتا ہے
مگر اس کے مقدر میں ہمیشہ دھوپ رہتی ہے
سنو تم نے کبھی شاخوں سے بچھڑے پھول دیکھے ہیں؟
وہ خوشبو بانٹ دیتے ہیں بکھر جانے تلک لیکن ہوا کا ساتھ دیتے ہیں
سنو تم نے کبھی میلے میں بجتا ڈھول دیکھا ہے؟
عجب ہے المیہ اس کا بہت ہی شور کرتا ہے
مگر اندر سے خالی ہے
یہی میرا فسانہ ہے' بس اتنی سی پہیلی ہے

آنکھوں پر بازو دھرے بیتے ہوئے دنوں کی یادوں کے سنگ وہ بہت دور نکل آیا تھا جب اچانک اسے اپنے پیروں پر کسی کے نرم ہاتھوں کے لمس کا احساس ہوا' ایک جھٹکے سے بازو آنکھوں کے اوپر سے ہٹاتے ہوئے اس نے سامنے دیکھا' سائرہ افضل اس کی چارپائی کی پائنتی پر بیٹھی تھی۔

"کھانا کھالے زائر! ٹھنڈا ہورہا ہے۔" اس کے دیکھنے پر اس نے فوراً اپنا ہاتھ اس کے پیر سے ہٹالیا تھا۔

"بھوک نہیں ہے مجھے' واپس لے جا۔"

"کیوں واپس لے جاؤں' کل بھی تُو نے سارا دن کچھ نہیں کھایا' اتنی محنت کرتا ہے سارے دن' ایسے تو بیمار پڑ جائے گا۔"

"تو پڑ جاؤں بیمار! تجھے کس بات کی تکلیف ہے؟" قطعی برہمی سے دھاڑتے ہوئے وہ اسے جیسے کھانے کو پڑا تھا۔

سائرہ لب کاٹ کر رہ گئی۔

"مجھے ہی تو تکلیف ہے' مجھ سے تیرا یہ حال دیکھا نہیں جاتا آخر کب تک اس بے وفا شہرن کا روگ دل میں پالے رکھے گا تُو؟"

"میرا درد سر ہے یہ کہ کب تک پالے رکھتا ہوں' تُو جا...... جا کر کام کر اپنا۔"

"سارے کام ختم کرکے آئی ہوں' اب تو بس یہی کام ہے کہ تیری خدمت کروں۔"

"مجھے تیری خدمتوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نہ سہی' مجھے تو تیری ضرورت ہے ناں۔"

"خوش فہمی ہے تیری کہ میں اب بھی پلٹ کر تیری طرف دیکھوں گا۔"

"نہ دیکھ' وقت بڑی ظالم چیز ہے ایک نہ ایک دن پھر سے گھیر کر تجھے میری طرف لے ہی آئے گا۔"

"میرا سر نہ کھا سائرہ افضل! جا...... جا کر کام کر اپنا۔" اس بار اس نے بے زاری سے کہا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو اکتا کر خود ہی کمرے سے نکل آیا۔

دن ڈھل رہا تھا وہ حویلی جانے کے موڈ میں نہیں تھا مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا تبھی اس کے قدم حویلی کی بڑی بڑی دیواروں کی طرف اٹھ آئے تھے۔

"سلام چوہدرانی!"

"وعلیکم السلام! جیتے رہو' ابھی میں تجھے ہی یاد کررہی تھی۔" چوہدرانی کے چہرے پر اسے دیکھتے ہی رونق آ گئی تھی۔ وہ بڑے سے صحن میں ان کے قریب ہی موڑھا کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"خیریت؟"

"خیریت کہاں ہے زائر! جب سے میری دھی ولایت سے ادھر گاؤں میں آئی ہے دیری بخار ہی جان نہیں چھوڑ رہا کل رات بھی ایک سو تین تھا' شہر سے ڈاکٹر بھی بلوایا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا' پچھلے تین دن سے پانی پر گزارہ کررہی ہے' میری دیوانی رہتی ہے شہر اس کے بیٹے کا ولیمہ ہے' سوچ رہی

ہوں ثانیہ کو ساتھ لے جاؤں شاید شہر کی فضا راس آ جائے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ چوہدرانی نے جواب میں اسے لسی کا بڑا گلاس تھما دیا۔

"تیرے لیے کیا حکم ہونا ہے پتا تو ہے تجھے' تیرے سوا میں کسی اور پر اعتبار نہیں کرسکتی' آج شام شہر جانے کا ارادہ ہے میرا' تُو تیاری کرلے۔"

"ٹھیک ہے کتنے دن کا قیام ہوگا آپ کا وہاں؟"

"یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا' مگر ثانیہ بیٹی کو میں وہیں چھوڑ آؤں گی۔"

"چلیں ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔" گلاس خالی کرکے سائیڈ پر رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"گاڑی لے آتا ہوں میں آپ اور ثانیہ بی بی تیاری کرلیں۔"

"ٹھیک ہے رب سوہنا تجھے دنیا جہان کی خوشیاں نصیب کرے۔"

چوہدرانی کی دعا اسے کسی تمانچے کی طرح لگی تھی۔ ساتھ ہی آنکھوں کے گوشوں میں نمی جھلک آئی۔

"مجھے خوشیوں کی دعا نہ دیا کریں چوہدرانی! خوشی زیادہ دیر راس نہیں آتی مجھے۔"

"دل چھوٹا نہ کر زائر! میرا دل کہتا ہے' بہت جلد تجھے میری دعائیں لگیں گی۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" وہ کہنا چاہتا تھا مگر اس نے کہا نہیں' کہا تو محض یہی......

"اب چلتا ہوں چوہدرانی! آپ تیاری کرلیں' میں ٹائم پر آجاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے سوہنے رب کے حوالے۔" اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چوہدرانی نے اسے رخصت کیا' صحن سے اٹھ کر وہ ثانیہ کے کمرے میں آئیں تو وہ جاگ رہی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے پُتر!" وہ اس کے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"ٹھیک ہوں' آپ کس سے باتیں کررہی تھیں؟" ثانیہ نے ان کا ہاتھ تھام کر سینے پر رکھ لیا تھا تبھی وہ بولیں۔

"زائر کو بلوایا تھا میں نے شہر جانے کے لیے' وہی آیا تھا۔"

"کیوں؟ کیا وہ حویلی میں ملازمت کرتا ہے؟"

"ناں پُتر! اسے ملازمت کی کیا ضرورت ہے' خیر سے اس کی اپنی زمین ہے۔"

"تو پھر وہ حویلی کے کام کیوں کرتا ہے؟"

"سارے کام پیسے کے لیے تو نہیں کیا جاتے ناں پُتر! کچھ کام رشتوں کے تقدس کے لیے بھی کرنے پڑتے ہیں۔"

"مگر اس حویلی سے کیا تعلق ہے اس کا؟"

"پالا ہے اس حویلی نے اسے...... اسی حویلی کے در و دیوار میں پل کر جوان ہوا ہے وہ' اس کا باپ تیرے دادا جی کا بہت ہی

نوشین اصغر

آنچل اسٹاف' قارئین اور رائٹرز کو میرا پیار بھرا سلام۔ میرا نام نوشین ہے اور سب مجھے پیار سے نوشی کہتے ہیں میں 2 جنوری کو گجرات کے گاؤں حاجی والہ میں پیدا ہوئی۔ میں نے میٹرک تک پڑھ کے قرآن پاک حفظ کیا ہے۔ میرے چار بھائی اور دو بہنیں ہیں' میرا نمبر چوتھا ہے میں سادگی بہت پسند کرتی ہوں اور خود بھی بہت سادہ رہتی ہوں' کھانے میں مجھے بریانی' قورمہ اور کچے قیمے کی ٹکیاں بہت پسند ہیں۔ میٹھے میں مجھے رس ملائی اور فروٹ' کسٹرڈ پسند ہیں۔ میٹھے کے بغیر بالکل نہیں رہ سکتی۔ مجھے خوشبو میں بلولیڈی باڈی اسپرے پسند ہے۔ مجھے سارے موسم اچھے لگتے ہیں' اب اپنی خوبیاں اور خامیاں بتاتی ہوں' مجھے غصہ بہت زیادہ آتا ہے مگر جلدی اُتر جاتا ہے میں ہر ایک کا خیال رکھتی ہوں پھر بھی سب مجھ سے ناراض ہی رہتے ہیں۔ مجھے خود پسند لوگ پسند نہیں۔ میری بُری عادت یہ ہے کہ میں ٹی وی بہت شوق سے دیکھتی ہوں جس کی وجہ سے امی اور بھائیوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے' مجھے اسلامی کتابیں اور ناولز پڑھنے کا بہت شوق ہے' ویسے تو میں قرآن مجید بھی بہت شوق سے پڑھتی ہوں' اب آتی ہوں رائٹرز کی طرف مجھے نازیہ کنول نازی' اقرا صغیر احمد اور نمرہ احمد بہت پسند ہیں۔ میرا آنچل سے بہت پرانا تعلق ہے آنچل سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے' کسی بھی خوشی اور دکھ میں تنہا نہیں ہونے دیتا مجھے احمد فراز کی شاعری بہت پسند ہے' اچھا اب میں اجازت چاہوں گی۔

قابل بھروسہ منشی تھا۔ تیرے دادا جی نہیں رہے تو اس نے بھی حویلی چھوڑ دی' مگر زائر کا تعلق نہیں ٹوٹا ان در و دیوار سے' بہت عرصہ شہر رہا ہے وہ مگر حویلی کو نہیں بھولا' زمینوں کو سارا حساب کتاب' دیکھ بھال وہی کرتا ہے' شہر والوں کو تو فرصت ہی نہیں کہ کبھی سال میں ایک چکر ہی لگا لیں۔''

''شادی شدہ ہے؟''

''ہاں بچپن میں اسی گاؤں کی ایک لڑکی سائرہ سے منگنی ہوئی تھی اس کی مگر اس نے زائر کے گاؤں کے نمبردار کے بیٹے کے ساتھ چھپ کر نکاح کر لیا' تب سنا ہے کہ کسی شہری لڑکی کو بھگا کر لایا تھا وہ مگر وہ بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔'' ثانیہ کا دل اس لمحے بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا' تبھی وہ بولیں۔

''اللہ جانے پتر! کسی سے اس موضوع پر بات ہی نہیں کرتا وہ خیر تُو چھوڑ اسے' جلدی سے اٹھ کر تیاری کر لے۔ وہ بس گاڑی لے کر آتا ہی ہوگا۔''

''مجھے شہر نہیں جانا پلیز۔''

''تنگ نہ کر ثانیہ! تُو جانتی ہے میرا وہاں جانا ضروری ہے مگر تجھے اس حال میں' میں یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔''

''کچھ نہیں ہوتا دادو! میں رہ لوں گی۔''

''نہیں تُو اٹھ کر تیاری کر بس' اگر دل نہ لگے تو میرے ساتھ ہی چلی آنا۔'' دادو کسی صورت اسے رعایت دینے کی پوزیشن میں نہیں تھیں وہ سر ہلا کر پلکیں موند گئی' دل کو بھلا اب کہاں لگنا تھا؟

❀……❀……❀

دل کا دیا جلایا میں نے
دل کا دیا جلایا
تجھ کو کہیں نہ پایا میں نے
تجھ کو کہیں نہ پایا

نسیم بیگم کی آواز بہت مدھم سروں میں گونج رہی تھی۔ ثانیہ عباس جو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی' بے کل ہو کر گاڑی کے باہر کے مناظر میں کھو گئی۔ اسٹیئرنگ وہیل پر جمے زائر ملک کے خوب صورت ہاتھ اسے بہت کچھ یاد دلا رہے تھے۔

''میں مانتا ہوں تم نے دل سے مجھے اپنا شوہر تسلیم نہیں کیا' میرے جیسا آوارہ ناکام شخص تم جیسی پیاری لڑکی کے قابل بھی نہیں' سوائے شکل صورت کے اور ہے ہی کیا میرے پاس؟ مگر پھر بھی یہ حقیقت ہے ثانی! میرے دل میں تمہارے لیے بہت جگہ ہے شاید سائرہ افضل سے بھی زیادہ۔'' اس کی آنکھیں کب بھر آئی اسے پتا ہی نہ چل سکا۔ اگلے ہی پل زائر کی جگہ اس کی ماں نے لے لی تھی۔

''بہت غصے میں ہے زائر! گالیاں دے رہا تھا تمہیں' اسے لگتا ہے جیسے تم اس کے بچوں کو لے کر مفرور ہو گئی ہو۔ عجیب چینڈو شخص ہے پتا نہیں تمہیں کیا نظر آیا اس میں؟''

پچھلے پانچ سالوں میں یہ الفاظ بددعا بن کر اس کا پیچھا کرتے رہے تھے۔ مفرور ہی تو ہو گئی تھی وہ اس کے بچوں کو لے کر زائر کا ڈر اس نے پورا کر دیا تھا۔

''طلاق دے دی تھی اس نے تمہیں' بہت کوشش کی میں نے سمجھانے کی مگر اس نے میری ایک نہیں سنی' کہہ رہا تھا کہ ایک دو روز میں پیپرز بھی بھجوا دے گا۔'' سانپ بچھو بنے لفظوں کی بازگشت نے اس کے اندر جیسے سناٹے ڈال دیئے تھے۔

پچھلے پانچ برسوں میں کتنی بار اسے اس شخص کی ضرورت محسوس ہوئی تھی مگر وہ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ نارسائی کے سارے عذاب اس نے تنہا جھیلے تھے۔

باپ کے ہوتے ہوئے پچھلے پانچ سالوں میں کتنی بار اس کے بچے اپنے باپ کے لیے ترسے تھے' وہ شخص صرف اس کے خوابوں کا نہیں اپنے بچوں کی معصوم حسرتوں کا بھی قاتل تھا۔ اپنی ڈھب سے جینا سکھا کر زندگی چھین لی تھی اس نے۔

ثانیہ کو لگا جیسے اس کے اندر آگ جل رہی ہو۔

زائر ملک سے نفرت کی آگ……

زائر ملک بیک ویو مرر سے بار بار اس پر نگاہ ڈال رہا تھا۔ ثانیہ نے جیسے نڈھال ہو کر سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

ہم تھے جن کے سہارے
وہ ہوئے نہ ہمارے
ڈوبی جب دل کی نیّاں
سامنے تھے کنارے
ہم تھے جن کے سہارے

کیسٹ ٹریک تبدیل ہوا تھا' ثانیہ کا دل زور سے دھڑک اٹھا اسے یہ گیت بہت زیادہ پسند تھا۔

ہے بھی کچھ جہاں میں
دوستی بے وفا ہے
اپنی ہی کم نصیبی
ہم کو نہ کچھ بھی ملا ہے

ہم تھے جن کے سہارے
وہ ہوئے نہ ہمارے
ڈوبی جب دل کی نیاں
سامنے تھے کنارے

"دادی! میوزک بند کروائیں پلیز' میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس سے مزید برداشت نہ ہوسکا تو بول اٹھی' زائر نے جیسے سنا ہی نہیں۔

کیا محبت کے وعدے
کیا وفا کے ارادے
ریت کی ہیں دیواریں
جو بھی چاہے گرادے
ہم تھے جن کے سہارے
وہ ہوئے نہ ہمارے
ڈوبی جب دل کی نیاں
سامنے تھے کنارے

ایک ایک بول اس کے جذبات کی عکاسی کررہا تھا۔ مگر ثانیہ عباس کے زخم جیسے پھر سے ہرے ہوگئے تھے' پچھلے پانچ سالوں میں سہی جانے والی ایک ایک تکلیف دل میں ناخن چبھونے لگی تھی۔

اسے یاد آرہا تھا جب اس نے وقت سے پہلے اپنے دونوں بچوں کو جنم دیا تھا تو اس وقت وہ کس اذیت میں تھی' اس احساس کے ساتھ کہ زائر نے اسے چھوڑ دیا ہے ہر لمحہ سانس گھٹتی محسوس ہوتی تھی اسے پھر پاکستان سے انگلینڈ شفٹ ہونے کے بعد جب اس کے دونوں بچے بیمار پڑے تو انہیں تنہا سرد کمرے میں گود میں لیے ڈاکٹرز کی مایوسی دیکھتے ہوئے اس نے کتنی تکلیف سہی تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کہیں سے زائر ملک اس کے سامنے آئے اور وہ اسے شوٹ کرڈالے۔

زائر نے دوبارہ میوزک آن نہیں کیا' پھر بھی درد سے پھٹتے سر کے ساتھ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی جب اس کا سیل بج اٹھا۔

"السلام علیکم!" نمبر دیکھ کر فوراً سے پیش تر اس نے کال پک کی۔

زائر نے گاڑی کی اسپیڈ دانستہ کم کردی۔

"جی اشعر میں ٹھیک ہوں' آپ کیسے ہیں اور بچوں کا کیا حال ہے؟" بچوں کے ذکر پر زائر کا دل بہت تیزی سے دھڑکا تھا۔

"ریئلی...... واؤ! یہ تو بہت خوشی کی بات ہے کب تک پہنچ رہے ہیں آپ؟"

"اچھا ٹھیک ہے آپ ائرپورٹ پہنچتے ہی مجھے انفارم کریں' میں اس وقت شہر کی طرف ہی جارہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے خدا حافظ۔" کال کاٹتے ہی اس کے سر کا درد اڑن چھو ہوگیا تھا۔ زائر بیک ویو مرر سے اسے دیکھے گیا۔

"اشعر کا فون تھا؟" دادو نے پوچھا۔

"جی دادو! وہ بچوں کو لے کر پاکستان پہنچ رہا ہے' ابھی کچھ دیر میں۔"

"چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے' بیوی بھی ساتھ آرہی ہے اس کی؟"

"نہیں...... بیوی کو چھوڑ چکا ہے وہ۔"

"ہائے! میری سمجھ میں نہیں آتا یہ آج کل کے مردوں کو ہوکیا گیا ہے' ذرا ذرا سی بات پر بیویوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک ہمارا زمانہ تھا' شہزادے جیسے لڑکے کو بھی ماں باپ کسی جھنگن سے بیاہ دیتے تو ساری زندگی اسی کے پہلو سے بندھا رہتا تھا آج کل کے لڑکوں نے تو مانو سچ مچ عورت کو پیر کی جوتی سمجھ لیا ہے جب دل چاہا بدل لی۔"

"صحیح کہہ رہی ہیں آپ! میں پہلے ائرپورٹ جاؤں گی دادو! اشعر کی فلائٹ بس پہنچنے ہی والی ہے۔"

اشعر حسین اور اپنے بچوں کے معاملے میں وہ جتنی بے تاب دکھائی دے رہی تھی۔ زائر کا دل اتنا ہی بے کل ہوکر رہ گیا تھا تبھی چوہدرانی اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"زائر پتر! گاڑی پہلے ائرپورٹ کی طرف موڑلو۔"

"جی اچھا!"

وہ ڈسٹرب ہوکر رہ گیا تھا مگر پھر بھی اسے خود پر ضبط تھا۔ فلائٹ پورے ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ تھی مگر پھر بھی اس نے بڑے حوصلے سے انتظار کیا...... تاہم جس وقت اشعر حسین کے ساتھ چلتے اسے اپنے دونوں بچے دکھائی دیئے اس کا دل جیسے قابو سے باہر ہوگیا۔ ثانیہ نے لپک کر دونوں کو گلے سے لگا کر چوما تھا پھر وہ اشعر حسین کے گلے لگی تھی اور یہیں اس کا خون ابلا تھا' ثانیہ عباس سے ترکِ تعلق کے باوجود وہ اسے یہ حد پار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا تبھی پلٹ کر گاڑی کے بونٹ کو زوردار ٹھوکر ماری تھی۔ کیا یہی تھا وہ شخص جس کے لیے اس نے اس کی رفاقت کو ٹھوکر ماری تھی؟ اس کی وفا' اس کی عزت' اس کی جانثاری سب کو داؤ پر لگا کر چلی گئی تھی؟ کیا اسی شخص کے لیے اس نے اس کے اعتبار کا خون کیا تھا؟

کتنے سوال تھے جو کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے مگر وہ رخ موڑے کھڑا رہا۔ ثانیہ اب بچوں کو گاڑی کی طرف لا رہی تھی۔

"یہ کون ہے؟" اشعر حسین نے گاڑی کے قریب پہنچ کر اس سے پوچھا تھا جب وہ اچٹتی سی ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"ڈرائیور ہے آپ بیٹھیں گاڑی میں پلیز۔"

کوئی نشتر تھا جو زائر ملک کے دل میں پیوست ہوا تھا بھلا اس سے زیادہ اس کی ذات کی حقارت کیا ہوئی تھی؟ اس کے بچے اس کی آنکھوں کے سامنے تھے مگر وہ انہیں چوم نہیں سکتا تھا بھلا اس سے زیادہ زندگی کی بے بسی کیا ہوئی تھی؟

اشعر حسین اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا جب کہ اس کے بچے پیچھے ثانیہ کے پاس تھے۔

"سوری دادو! میں اب آپ کے ساتھ کسی کے گھر نہیں رک سکوں گی' مجھے گاؤں جانا ہے' اشعر بھی تھکا ہوا ہے میں اپنے مہمان کو بے آرام نہیں کرسکتی۔"

"ہوں اب تو میرے لیے بھی رکنا مشکل ہوجائے گا۔ زائر پتر! گاڑی گاؤں کی طرف ہی موڑ لے رشید (عذیر کی والی) سے میں خود ہی فون پر بات کرلوں گی۔" ثانیہ سے کہتے ہوئے انہوں نے اگلے ہی پل زائر کو حکم صادر کیا تو وہ چپ چاپ گاڑی موڑ گیا۔

گاؤں پہنچ کر وہ ایک پل کے لیے بھی حویلی نہیں رکا تھا۔ اگلے روز صبح ہی صبح اسے پھر حویلی سے بلاوا آگیا مگر اس کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ اٹھ ہی نہ سکتا تھا۔ کل پوری رات اس کا وجود بخار میں جلا تھا' سائرہ نے دروازے سے ہی پیغامبر کو واپس بھجوادیا۔

ثانیہ اشعر اور اپنے بچوں کے ساتھ ناشتہ کررہی تھی جب ملازم نے آکر زائر کی ناسازیِ طبیعت کا بتایا۔ دادو کا ہاتھ فوراً ناشتے سے رک گیا۔

"تمہانہ منانا ثانیہ! مگر تجھے کل زائر کو ڈرائیور نہیں کہنا چاہیے تھا۔ بہت حساس بچہ ہے وہ بچپن سے جانتی ہوں اسے' ضرور اس نے یہی بات دل کو لگائی ہوگی۔"

تمنا

تم اُجالے کے تمنائی ہو
تم سویرے کے طالب ہو
لیکن کیا تم کو معلوم ہے؟
کہ
چاند کو پانے کے لیے
رات کے اندھیروں کو بھی
سہنا پڑتا ہے

(خواجہ عرفانہ محبوب...... جتوئی)

"کیا مطلب دادو! ڈرائیور کو ڈرائیور نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ وہ میرا شوہر تو نہیں ہے جو اس کی عزت وتکریم کرتی' اتنا بھی سر نہ چڑھایا کریں ملازموں کو پلیز۔"

"ملازم نہیں ہے وہ بیٹا بنا کر پالا ہے اسے میں نے۔"

"پالا ہوگا' میرے لیے وہ ایک ملازم ہی ہے اور بس۔" آپ ہی آپ اس کے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔ دادو دل مسوس کر رہ گئیں بلاشبہ زائر کے دونوں بچے بے حد خوب صورت تھے۔

اگلے روز انہیں زمینوں کی سیر کرنی تھی' بچے پاکستان آکر بہت خوش تھے۔ زائر کاٹن کی چنوائی کروا رہا تھا' جب اس نے ثانیہ کو اشعر حسین اور اپنے بچوں کے ساتھ اسی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

"مما! آپ نے کہا تھا ہمارے پاپا پاکستان میں رہتے ہیں' اب تو ہم پاکستان آگئے ہیں آپ پاپا سے کہیے ناں وہ ہمیں آکر مل لیں۔" اس کی بیٹی کو اچانک یاد آیا تھا' عذیر ملازمین کو ہدایت دیتا وہیں ٹھٹک گیا۔

"جی مما! مجھے بھی پاپا سے ملنا ہے۔" بیٹے نے بھی لب کھولنے ضروری سمجھا۔ وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔

"پاپا ابھی آپ لوگوں سے نہیں مل سکتے مانو! چلو آپ بھائی کا ہاتھ پکڑو' مما آپ کو بہت مزے مزے کی چیزیں دکھانے والی ہیں۔"

"ہمیں مجھے چیزیں نہیں دیکھنی پاپا سے ملنا ہے۔" اس کی بیٹی ضد کررہی تھی۔

ذرا سے غصے میں آتے ہوئے اس نے اپنی بیٹی کو ڈانٹا تھا' وہ منہ بسور کر رہ گئی۔ کچھ ہی فاصلے پر مالٹوں کا باغ تھا' میٹھے امرود بھی پکے ہوئے تھے۔ اس کا بیٹا مالٹوں کو دیکھتے ہی ان کی طرف لپکا۔ اشعر حسین کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"دیکھا ثانیہ! ان بچوں کے خون میں بھی اپنے دیہاتی باپ کا ہی اثر ہے' دیکھو کیسے پیڑوں کو دیکھتے ہی ان کی طرف لپکے ہیں۔"

"ہوں...... یہ تو ہے۔" شرمندہ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنے دونوں بچوں پر ڈالی۔ وہ دونوں بہت خوشی سے پیڑ پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ثانیہ کا دل چاہا کہ انہیں ڈانٹ دے مگر پھر کسی خیال کے تحت اس نے اپنی نظر ان کے اوپر سے ہٹالی۔

"تم نے بتایا نہیں عائزہ (بیوی) کو طلاق کیوں دی؟"

"بس یار شک بہت کرتی تھی' جینا حرام کر کے رکھ دیا تھا اس نے میرا' تمہیں کال کرنے پر بھی پابندی تھی اسی لیے روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر جان چھڑالی میں نے۔"

"اور بچے......؟"

"بچوں کو وہ اپنے ساتھ لے گئی ہے مگر جلد ہی کورٹ کے ذریعے انہیں واپس لے لوں گا۔"

"آگے کیا پلان ہوگا؟"

"اللہ مالک ہے' میں نے کیا پلان کرنا ہے۔"

سبز ٹہنی جو اس کے ہاتھ میں تھی بے نیازی سے پرے پھینکتے ہوئے وہ مسکرایا' تبھی ثانیہ کے بیٹے کا پاؤں پیڑ کی چھال سے پھسلا اور وہ دھڑم سے زمین پر آ گرا زائر جو اسی طرف دیکھ رہا تھا' سارا کچھ چھوڑ کر فوراً اپنے بیٹے کی طرف لپکا مگر تب تک بچے کا سر پھٹ چکا تھا اور وہ بُری طرح رونا شروع کر چکا تھا۔

"دور رہو میرے بچوں سے۔"

بنا بیٹے کی چوٹ کی پروا کیے وہ دور سے ہی دھاڑی تھی جب کہ اشعر حسین بھی حیرانی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

❀......❀......❀

وہ اپنا مختصر سا سامان سمیٹ رہی تھی جب عذیر کمرے میں آیا تو حورعین اسے دیکھ کر پلٹی۔

"کیا کر رہی ہیں؟" پریشان سا وہ پوچھ رہا تھا جب وہ بولی۔

"کچھ نہیں' یہاں سے کوچ کی تیاری کر رہی ہوں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میرا اب مزید اس گھر میں قیام ممکن نہیں۔"

"کہاں جائیں گی یہاں سے نکل کر؟"

"پتا نہیں' جہاں نصیب لے گیا۔" وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ عذیر گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"کوئی دور نزدیک کا رشتہ دار ہے آپ کا۔"

"نہیں' ہوتا تو یہاں کیوں آتی؟"

"پھر بھی آپ یہاں سے جانا چاہتی ہیں؟"

"تو کیا کروں؟ دھوکہ دیتی رہوں ان لوگوں کو؟"

"جس دھوکے میں سب کی بہتری ہو وہ دھوکہ' دھوکہ نہیں مصلحت ہوتی ہے۔"

"آپ کی نظر میں ہوتی ہوگی' میں نے زندگی میں کبھی کسی سے جھوٹ نہیں بولا کل کو جب دادو پر میری اصلیت کھلے گی تو وہ کیا سمجھیں گی مجھے؟ ایک قطعی اجنبی کنواری لڑکی ان کی دانست میں ان کے جوان پوتے کے کمرے میں اکیلی سوتی ہے۔ میں کیسے ان کی ان نگاہوں کا سامنا کروں گی جو مجھے اندر سے چیر کر رکھ دیں گی' ساری زندگی وہ پھر کسی لڑکی کا اعتبار نہیں کر سکیں گی' میں ان کے اعتبار کو توڑنا نہیں چاہتی۔"

"اور آپ کے یوں چپ چاپ چلے جانے سے جو میرا اعتبار ٹوٹے گا ان کی نظر میں وہ؟ کیا بتاؤں گا میں انہیں کہ کون تھیں آپ اور کیوں چلی گئیں؟ کتنے سوال اٹھیں گے میری ذات پر' کس کس کا جواب دوں گا میں؟"

"میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے عذیر صاحب!"

"راستے نکل آتے ہیں اگر انسان ٹھنڈے دل و دماغ سے بیٹھ کر نکالنے کی کوشش کرے تو' ہمیشہ فرار ہی مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔"

"مگر......"

بے چین ہو کر کچھ کہنے کے لیے اس نے سر اٹھایا تھا تبھی اس کی نظر کمرے کی دہلیز پر کھڑی دادو پر پڑی اور وہ جیسے وہیں فریز ہو کر رہ گئی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

WWW.PAKSOCIETY.COM
جیباں، کنارہ، کنگرہ
نازیہ کنول نازی
www.paksociety.com
www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

زندگی اک مستقل شرحِ تمنا تھی مگر
عمر بھر تیری تمنا سے رہے بیگانہ ہم
تجھ میں بھی کچھ ہوشمندانہ ادائیں آ گئیں
تجھ سے بھی اب بدگماں ہیں اے دلِ دیوانہ ہم

جب درد پرانے ہو بیٹھے
جب یاد کا جگنو راکھ ہوا
جب آنکھ میں آنسو برف ہوئے
جب زخم سے دل مانوس ہوا
تب مجھ پہ کھلا میں زندہ ہوں
پھر دل کو دھڑکنا یاد آیا
جب کرب کی لمبی راہوں میں احساس کے بال سفید ہوئے
جب آنکھیں بے سیلاب ہوئیں
جب چاند بجھا حالِ بے دردی کا
جب ریت پہ لکھی یادوں کو بے مہر ہوا نے چھین لیا
جب یادیں بھی بیدار ہوئیں
تب مجھ پہ کھلا میں زندہ ہوں
پھر دل کو دھڑکنا یاد آیا
پھر وقت نے کچھ کروٹ لی
پھر سوچ کی قبر سے دھول اڑی
پھر پیاس کا برزخ بھول گیا
اک ہجر سے کیا آزاد ہوئے سو ہجر نئے ایجاد ہوئے
پھر اشک میں درد یقیں ہوا
پھر دھڑکن میں بھونچال چڑھے
پھر عشق کا جوگی گلیوں میں تقدیر کا سانپ اٹھا لایا
پھر عشق کا جنگل سبز ہوا پھر زلف کے تیور شام ہوئے
اس شام میں پھر مہتاب چڑھا
پھر ہونٹ کی لغزش گیت بنی
پھر روز لبادہ بن بیٹھا پھر کرب کا قرب جوان ہوا
پھر مجھ پہ کھلا میں زندہ ہوں
پھر دل کو دھڑکنا یاد آیا!

"دادی ماں....." حورعین کی پھٹی پھٹی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے عذیر نے بھی پلٹ کر دیکھا اور پھر جیسے اس کے پاؤں تلے بھی زمین کھسک گئی اسی پل دادی ماں اندر آئی تھیں۔

"کیا ہوا تم دونوں کے چہرے کے رنگ تو یوں اڑ گئے جیسے دادی کی بجائے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔" وہ مسکرا رہی تھیں۔ عذیر کی جان میں جان آئی۔

"کیا راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں دادی سے چھپ کر؟"

"کک..... کچھ نہیں دادو! شادی کی تقریب سے متعلق ہی ڈسکس کر رہے تھے۔"

"ہوں..... اچھی بات ہے وہ میں یہ بتانے آئی تھی کہ تمہاری تائی ماں اور ثانیہ بھی نہیں آ رہے۔ ثانیہ کے بچے آئے ہیں انگلینڈ سے اس لیے فی الحال معذرت کر لی انہوں نے تیمیر کے پاس فون آیا تھا تو میں چاہ رہی تھی اگلی اتوار کو تقریب رکھ لیتے ہیں کچھ ہماری بھی تیاری ہو جائے گی۔"

"جی ٹھیک ہے میں بھی یہی چاہ رہا تھا۔"

"ہوں..... چلو نپٹالو سارے کام ایک ہفتے میں کیونکہ اس کے بعد مزید ایک دن کی رعایت بھی نہیں ملے گی تمہیں۔" عذیر کی تسلی پہ اسے وارن کرتے ہوئے وہ سرسری سی نگاہ حورعین کے جھکے سر پر ڈالنے کے بعد واپس پلٹ گئیں۔ عذیر نے بے ساختہ گہری سانس لی۔

"شکر دادو نے کچھ نہیں سنا۔" اب وہ براہ راست اسے دیکھ رہا تھا وہ رخ پھیر گئی۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ فرار ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا اس وقت آپ کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ کوئی عزیز رشتے دار بھی نہیں میں چاہوں تو آپ کی مدد کے لیے آپ کو کہیں بھی اچھا سا فلیٹ لے کر دے سکتا ہوں مگر..... تنہا لڑکی کا ہمارے معاشرے میں اس وقت جو حال ہے یقیناً اس سے بھی آپ بخوبی واقف ہوں گی اس لیے آپ کی حفاظت کے معاملے میں، میں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔" وہ شاید تمہید باندھ رہا تھا۔ حورعین اپنے آنسو ضبط کرتی رہی۔

"میں آپ کی عزت کرتا ہوں حورعین! جس طرح سے آپ نے میرے گھر والوں کا اعتبار اور دل جیتا ہے میرے دل میں آپ کی قدر بہت بڑھ گئی ہے خدا شاہد ہے کہ میں کسی بھی طور سے آپ کا نقصان نہیں چاہتا۔"

"میں جانتی ہوں مگر آپ یہ سب کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"میں آپ کے سامنے کچھ آپشن رکھنا چاہتا ہوں اس لیے۔"

"کیسے آپشن؟"

"دیکھیں حورعین! آپ میری منکوحہ کی حیثیت سے اس گھر میں آئی تھیں دادی ماں کی نظر میں آپ میری عزت ہیں۔ میں ان کی یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا تھا مگر آپ کے آنسو دیکھ کر اور آپ کی مجبوریاں جان کر میں نے اپنا ارادہ بدل لیا اب مسئلہ یہ ہے کہ نہ آپ یہاں رہنا چاہتی ہیں نہ یہاں سے نکل کر کہیں اور محفوظ رہ سکتی ہیں ایسے میں صرف یہی ایک راستہ رہ جاتا ہے کہ میں آپ سے فرضی نکاح کرلوں اس وقت تک کے لیے جب تک آپ کے گھر اور فیملی کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا پھر اس کے بعد جب آپ چاہیں گی میں آپ کو آزاد کر دوں گا آپ اچھی طرح سے سوچ کر بتا دیجئے گا مجھے۔" ٹراؤزر کی پاکٹس میں ہاتھ ڈالے اس نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ حورعین کو لگا جیسے اس کے پاؤں تلے زمین کھینچ لی گئی ہو پھٹی پھٹی نگاہوں سے عذیر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا مگر عذیر نے نہیں دیکھا اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ واپس پلٹ گیا تھا۔ وہ ہکا بکا سی [illegible] کے ساتھ گنگ ڈھیلے جسم کے ساتھ نیچے زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ ہادی عبدالہادی کی جگہ کسی اور کو دینا موت کے مترادف تھا اس کے لیے بھی اس کی سسکیاں نکل رہی تھیں۔

"نہیں..... میں ایسا نہیں کر سکتی کبھی بھی نہیں..... زندگی کی آخری سانس تک نہیں۔" زور زور سے سر دائیں بائیں مارتے ہوئے وہ تڑپ رہی تھی مگر وہاں اس کی تڑپ کا نظارہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

❀ ❀ ❀

"حورعین آپی!" دائیں بازو پر سر رکھے وہ اپنے بستر پر اوندھے منہ پڑی رو رہی تھی جب میر ہلکی سی دستک کے ساتھ اس کے کمرے میں آیا۔ حورعین کو نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھوں سے بازو ہٹانا پڑے۔

"اتنا اندھیرا کر رکھا ہے کمرے میں طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟" کمرے کی لائٹ آن کرتے ہوئے وہ قریب چلا آیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ہوں..... بس سر میں درد ہے۔"

"تو کیا یوں تمہیں یقیناً بخار بھی ہوگا ہے ناں؟"

"ہوں....."

"اُف! کاش میں آپ سے بڑا ہوتا تو اس وقت خوب ڈانٹتا آپ کو عادت ہو گئی ہے بیگانے پن کی۔" سر جھٹکتے ہوئے وہ قدرے خفا ہوا۔ حورعین نے آہستہ سے آنسو پونچھ لیے تبھی وہ قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"میں نے سنا ہے آپ یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہیں..... کیا یہ بات سچ ہے؟"

"ہوں....." اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پر کیوں؟" سب جانتے ہوئے بھی وہ انجان بن رہا تھا حورعین کی آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔

"میرا اب اس گھر میں قیام ممکن نہیں رہا دادی ماں میری اور عذیر کی شادی کی تقریب منعقد کرنا چاہتی ہیں جب کہ میری زندگی میں اس کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔"

"عذیر بھائی کا کیا کہنا ہے؟"

"کچھ نہیں، وہ فرضی نکاح کا کہہ رہے تھے مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

"پھر یہاں سے آپ جائیں گی کہاں آخر؟"

"پتا نہیں جہاں میری تقدیر لے جائے۔"

"ہوں آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں آپی! میرا کوئی حق نہیں بنتا کہ میں آپ پر اپنی کوئی رائے مسلط کروں مگر میں نے آپ کو بہن کہا ہے خدا شاہد ہے کہ دل سے سگی بہنوں کی طرح سمجھا ہے میں قطعی آپ کا کوئی نقصان نہیں چاہوں گا۔ دادی ماں ہماری بزرگ ہیں بہت اچھی طرح سے ہم ان کی سوچ اور ان کے مزاج کو جانتے ہیں۔ ان کو اگر ذرا سی بھنک بھی پڑ گئی کہ آپ اور عذیر بھائی کا نکاح نہیں ہوا ہے تو سارے گھر میں بھونچال آ جائے گا ہم اس عمر میں انہیں تکلیف پہنچانا نہیں چاہتے اس لیے پلیز آپ عذیر بھائی کی بات مان لیں وہ بہت اچھے ہیں آپ کو ان کی طرف سے بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ عذیر بہت اچھے ہیں مگر....."

"اگر مگر کو چھوڑیں آپی! پلیز..... آپ دیکھیں ناں عذیر بھائی بھی تو کسی سلمیٰ نام کی لڑکی میں انٹرسٹڈ ہیں خود سوچیں وہ بھی تو آپ کے لیے یہ سب کر رہے ہیں ناں..... پھر تھوڑے سے دنوں کی تو بات ہے جب حالات ٹھیک ہو جائیں پھر آپ چلی جایئے گا تب میں خود دادو کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا پلیز....." وہ اس کا سچا خیر خواہ تھا حورعین الجھن بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رخ پھیر گئی۔ اس کے آنسو یوں بہہ رہے تھے جیسے آنکھوں میں

سیلاب اٹھا یا ہو، عمیر کچھ دیر اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلتا ہوں آپی! امید ہے آپ میری بات کا مان رکھیں گی۔" وہ بھی شاید عذیر کی طرح مجبور تھا۔

حورعین کے آنسو اور بھی شدت سے بہنے لگے۔ زندگی کبھی کسی ایسے مقام پر بھی لے آئے گی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

❁ ❁ ❁

جیل بگرام سے راتوں رات بے ہوشی کی حالت میں اسے عراق میں قائم "جیل ابوغریب" میں منتقل کردیا گیا تھا کئی گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد جس وقت اس کی آنکھ کھلی کوئی انجانی لاچاری اور بے بسی کے ساتھ چلا رہا تھا۔ وہ کرنٹ کھا کر بیدار ہوئی چھوٹی سی تنگ کوٹھری جہاں وہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی بلیک یونیفارم میں ملبوس امریکی فوجی ایک چھوٹی سی معصوم بچی کو اپنی درندگی کا نشانہ بنا رہے تھے جب کہ اس معصوم عراقی بچی کا بھائی بھی قریب ہی کال کوٹھری میں بند تھا مگر وہ کچھ نہ کرسکتا تھا۔ بچی کے چلانے پر اس کا بھائی کوٹھری کی آہنی سلاخوں کے ساتھ سر مارتا تو اس پر اور بھی تشدد کیا جاتا وہ یہ منظر دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ ملک جس کا یہ کہنا تھا کہ اس نے افغانستان اور عراق پر قبضہ وہاں عوام کی خوش حالی اور جمہوریت کے قیام کے لیے کیا ہے اسی ملک کی بے رحم افواج کے افسران کے ہاتھوں جس طرح سے مختلف مسلم ممالک کے باشندوں پر وحشیانہ تشدد اور عزت نفس کی پامالی ہو رہی تھی حورعین دیکھتی رہ گئی۔

ساری دنیا میں امن کے قیام کا شور مچانے والے ملک کا اپنا اصل چہرہ کیا تھا؟ چھپے ہوئے عقوبت خانوں کی حقیقت اور کہانیاں کیا تھیں؟ امریکہ اگر امن کا خواہاں تھا تو کن کے لیے؟ برطانیہ جمہوریت چاہتا تھا تو کن کے لیے؟ وہ چیخنا چاہتی تھی تبھی کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"کیا کررہی ہو؟ کیا تمہیں نہیں پتا یہاں چیخنے والوں کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے؟"

وہ کوئی عراقی عورت تھی عورت کیا اسی کی طرح ایک نو عمر لڑکی تھی جس کی داہنی آنکھ پر گہرے زخم کا نشان تھا اور ایک ٹانگ بھی ٹوٹی ہوئی تھی حورعین نا سمجھی سے اسے دیکھتی رہ گئی تبھی وہ بولی۔

"میرا نام ہدی الفراوی ہے میں پچھلے پانچ سال سے یہیں قید ہوں۔ پانچ سال پہلے ہمارے ایک مخالف رشتہ دار نے امریکی فوجیوں سے وفاداری نبھاتے ہوئے انہیں یہ رپورٹ پہنچائی کہ ہم مجاہدین کے حامی اور عراق پر امریکہ کے قبضے کے خلاف ہیں اسی رپورٹ کے پس منظر میں امریکی فوج نے میرے بھائی علی کو گرفتار کرکے یہاں قید کردیا۔ مجھے اس بات کا پتا چلا تو میں اپنے چھوٹے بھائی معتز کے ساتھ شہر میں قائم امریکی چھاؤنی میں چلی گئی تاکہ اپنے معصوم بھائی کا پتا کرسکوں مگر وہاں موجود کیپٹن نے میرے استفسار پر ٹال مٹول سے کام لیتے ہوئے مجھے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھجوا دیا۔ کرسمس کی رات میں دوبارہ اپنے بھائی کا پتا کرنے آئی تو اسی افسر نے باتوں ہی باتوں میں اچانک یہ کہہ کر کہ ہم بھی ان کی قید میں ہیں مجھے حیران کردیا۔ علی کے بعد مجھے اور میرے دوسرے بھائی معتز کو بھی قید کردیا گیا۔ ابتدائی تین دن اور تین راتیں بنا کسی جرم کے ہم دونوں بہن بھائیوں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ چوتھے روز علی کی خون آلود لاش ہمارے قدموں میں لاکر پھینک دی گئی۔ بھائی کی خون میں لت پت لاش دیکھنے کے بعد میں بے ہوش ہوگئی تھی۔ اگلے دن ہوش میں آئی تو علی کی لاش کے ساتھ معتز بھی غائب تھا اور میرے ہاتھ میری پشت پر بندھے ہوئے تھے میں رو رہی تھی اور بُری طرح سے چلا رہی تھی۔ چیخ چیخ کر میرا گلا دُکھنے لگا تھا مگر وہاں کوئی نہیں آیا اگلے روز وہ لوگ مجھے وہاں سے نکال کر ایک اور عقوبت خانے میں لے گئے جہاں ایک مرتبہ پھر مجھے ذہنی اور جسمانی ٹارچر کیا گیا مختلف افسران آ آ کر مجھ سے مجاہدین کے بارے میں پوچھتے رہے اور میری لاعلمی پر مجھے تشدد کا نشانہ بناتے رہے۔ جب میں بے ہوش ہونے کے قریب ہوگئی تو ان لوگوں نے میرا منہ دیوار کی طرف کرکے مجھے کھڑا کردیا اس وقت میں اپنے پیچھے بہت سے قیدیوں کی چیخ پکار سن رہی تھی جو تشدد کی تاب نہ لاکر آہ و بکا کررہے تھے میرے بھائی معتز کی آواز ان میں نمایاں تھی۔ میرے بھائی پر وحشیانہ تشدد ہو رہا تھا اور اس سے بہیمانہ انداز میں تفتیش کی جارہی تھی وہ لوگ اس سے کہہ رہے تھے کہ تم مجاہدین کو امریکیوں کے قتل کے لیے اسلحہ فراہم کرتے ہو۔ معتز نے کہا یہ جھوٹ ہے جس پر اسے مارا گیا۔ میں بارہ گھنٹے ایک ہی پوزیشن میں دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑی رہی آدھی رات کے وقت انہوں نے مجھے کسی کوٹھری میں ڈال دیا جس کے اوپر چھت نہ تھی...... رات آسمان سے موسلا دھار بارش برستی رہی اور میں اپنے گھر والوں سے دور زخموں سے چُور وہاں بے بسی سے پڑی سسکتی رہی۔ اسی روز وہ لوگ معتز کی لاش بھی پھینک گئے تب سے اب تک نہیں چیخی پتھر کا مجسمہ دیکھا ہے تم نے کبھی یہاں چیخنے والوں کو پتھر کا مجسمہ بنا دیتے ہیں یہ لوگ۔" وہ باتیں جو اس نے رسالوں اور کتابوں میں پڑھی تھیں حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔

حورعین کا جسم کپکپا اٹھا اس کے ذہن میں دھماکے

ہونے لگے۔

"صدام حسین کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اس نے اپنی عوام کا جینا دوبھر کیا ہوا تھا۔ امریکہ بھی ویسا ہی ہے بلکہ اس سے بڑھ کے ... ہوا تھا پھر جمہوریت کہاں رہ گئی تھی؟" ہدی الفراوی کے زخمی چہرے کی طرف دیکھتی وہ نیچے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ جانے اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ ہدی بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی تبھی اس نے پوچھا تھا۔

"پانچ سال کے بعد بھی تشدد ہورہا ہے آپ پر؟"

"ہوں! عورت ہو یا مرد گناہ گار ہو یا بے گناہ یہ لوگ تفتیش کے دوران تیز روشنیوں اور شدید گرمی میں قیدیوں کی جلد جلا دیتے ہیں یہاں تک کہ قیدی اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں اور اپنی جان ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں میں تو یہ بھی نہیں کرسکتی۔" ہدی الفراوی کی نگاہیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"پتا نہیں تم کس ملک سے آئی ہو مگر یہ طے ہے کہ یہ لوگ تمہارا بھی بہت بھیانک انجام کریں گے۔" وہ اسے متنبہ کررہی تھی حورعین کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

حورعین کو اپنا وجود سرد پڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک طرف بش تھا تو دوسری طرف صدر مشرف اور اقوام عالم کا یہ حال تھا کہ وہ شریک خاموش تھی سکوت کے اس جرم میں جانے کب تک دنیا کو بھگتنا رہنا تھا مصلحت کی چادر جانے کب تک تنی رہنی تھی پتا نہیں کب تک مجبوریوں کے پردے کو لٹکے رہنا تھا؟

"عراق اور ابوغریب جیل کے علاوہ دنیا کے مختلف حصوں میں "نامعلوم مقامات" پر امریکی سی آئی اے کے متعدد ایسے عقوبت خانے قائم ہیں جن سے دنیا کو ابھی تک آگاہی نہیں ہے اور شاید ہوگی بھی نہیں کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ان عقوبت خانوں میں جانے والا کبھی واپس نہیں آتا۔ یہی وہ عقوبت خانے ہیں جنہیں عوام کی نظروں سے دور نامعلوم مقامات پر بنایا گیا ہے۔" دیوار سے ٹیک لگائے ہدی جیسے خود سے باتیں کررہی تھی حورعین نے بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"بلیک سائٹس کی بات کررہی ہیں آپ؟"

"ہوں۔"

"تمہیں پتا ہے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کے بعد ہر سال 11 ستمبر کی رات کو کیا ہوتا ہے؟"

"کیا ہوتا ہے؟" چونکہ ستمبر کا مہینہ ہی چل رہا تھا اس لیے وہ اس سوال کو نظر انداز نہیں کرسکی تھی۔ ہدی نے اس کے سوال پہ بے ساختہ گہری سانس بھرلی۔

"قیامت آتی ہے بے بس نہتے معصوم پاکستانی اور افغانی نوجوانوں کو عالم برزخ کی سیر کروائی جاتی ہے تمام امریکی افواج کو اجازت ہوتی ہے کہ 11 ستمبر کی رات وہ قیدیوں سے جو چاہے سلوک کریں ان سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔"

"پھر۔"

"پھر کیا...... نشے میں دھت یہ لوگ اتنا ظلم کرتے ہیں قیدیوں پر کہ وہ مرجاتے ہیں۔"

کتنی معلومات تھیں ہدی کے پاس' حورعین ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہ گئی۔

"ساری دنیا میں داڑھی والوں کو بدنام کرنے والے امریکی افسران خود کیا ہیں اگر تم جان لو تو تمہیں خود اپنے انسان ہونے سے نفرت ہوجائے' جس طرح یہ خاردار چھڑیوں سے ہمارے جسموں کو چھید کر ان پر موم گراتے ہیں' بدترین تشدد کی مثالیں دنیا کے پلیٹ فارم پر لاتے ہیں' ماضی کا کوئی انصاف پسند مسلم حکمران ہوتا تو ضرور ان کا گریبان پکڑ کر ان سے انسانیت کی اس درجہ تذلیل کا حساب لیتا مگر افسوس...... ہم ایسے دور میں پیدا ہوئے جہاں ہمارے حکمران خود ہم پر کسی عذاب سے کم نہیں' کوئی نہیں آج جو ہمارے حقوق کی بات کرے' کوئی نہیں جو ہماری داد رسی کرے ایک سینٹر میں چند سو مرنے والے افراد کا درد ساری دنیا کو نظر آتا ہے مگر اسی قوم کے ہاتھوں ان خفیہ عقوبت خانوں میں جانے کتنی ماؤں کے لعل بدترین دہشت کی بھینٹ چڑھتے ہیں کسی کو دکھائی نہیں دیتے۔ عالمی میڈیا بھی خاموش ہے کیونکہ جو کچھ 11 ستمبر کو ہوا وہ بڑا ظلم تھا مگر جو کچھ ان گمنام عقوبت خانوں میں ہو رہا ہے وہ ظلم نہیں ہے نہ وہ دہشت گردی نہیں ہے۔"

زخمی چہرے والی وہ مسلمان لڑکی اندر سے کتنی دکھی تھی حورعین اب جان پائی تھی۔

"ساری دنیا میں مسلمان مر رہے ہیں' کہیں یہودیوں کے ہاتھوں' کہیں ہندوؤں کے ہاتھوں' کہیں بدھ مت کے بھکشوؤں کے ہاتھوں' کہیں عیسائیوں کے ہاتھوں پھر بھی دنیا کے سکوت میں کہیں کوئی خلل نہیں پڑ رہا مگر ہمارے انہی لوگوں کے ہاتھوں دنیا کے کسی بھی حصے میں اگر کہیں کسی غیر مسلم کی موت ہوجاتی ہے تو بھونچال آجاتا ہے مسلم حکمران خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بے گناہ شہریوں کو پکڑ پکڑ کر ان کے حوالے کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے بڑی بہادری کا کارنامہ سرانجام دیا مگر کل اللہ رب العزت کے حضور روز محشر ان کے منہ دیکھنے والے ہوں گے کیسی سیاہی ہوگی جو ان کے چہروں پر مل جائے گی۔"

اچانک وہ جذباتی ہوئی تو حورعین کی آنکھیں سر جاوید بھائی کا تصور کرکے آنسوؤں سے بھر آئیں۔

"ہم غیور اور جفاکش قوم ہیں مگر ان حکمرانوں کی غلامی نے ہمیں غیر قوم کے سامنے ذلیل ورسوا کرکے رکھ دیا ہے صرف اسی کی وجہ سے لوگ ہمیں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔"

کتنا غبار تھا جو بہادر قوم کی اس بیٹی کے اندر جمع تھا۔ حورعین بے چینی سی اٹھ کھڑی ہوئی جبھی کچھ افسران اس طرف آئے تھے۔ آنے والے ان امریکی افسران میں ایک شخص "ایاد عبدالھادی" تھا۔

"ایاد عبدالھادی" کا خاندان پیدائشی جنگجو تھا۔ اس کا مسلمان باپ پہاڑوں کا بیٹا کہلاتا تھا کیونکہ اس کا تعلق افغانی سرزمین سے تھا۔ اسلحہ چلانا اور اسلحے سے کھیلنا اس کے موروثی مشاغل میں شامل تھا۔ اس کا تعلق ان قبائل سے تھا جہاں نسل در نسل خاندانی دشمنیاں چلتی ہیں جہاں خون کا بدلا خون جواں مردی اور انصاف کا دوسرا نام سمجھا جاتا ہے۔ مختلف قبائل کے ساتھ لڑائیوں میں اپنے نوعمر بیٹوں کے ہاتھوں قتل کو جو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ دس سال کی عمر میں اس کے باپ نے پہلے انسانی قتل کی صورت دشمنی اور انتقام کا جو پودا لگایا وہ اس کے مرنے تک پھل پھول کر تناور درخت بن چکا تھا اس کے باپ نے دو شادیاں کی تھیں پہلی شادی سولہ سال کی عمر میں خاندانی رسم ورواج کے مطابق اپنے قبیلے کی لڑکی سے کی جب کہ دوسری شادی امریکہ میں قیام کے دوران ایک امریکی خاتون سے کی جو اپنے انگریز شوہر سے طلاق کے بعد بے راہ روی کی زندگی گزار رہی تھی۔ ایاد اسی عورت کے بطن سے پیدا ہوا اور وہیں امریکہ میں اس نے پرورش پائی تھی مگر اس کی رگوں میں اپنے باپ کا فولادی خون تھا۔ اس کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد ایک لڑائی میں اس کے باپ کی موت ہوئی تھی تاہم اس نے اپنی ماں کی آنکھوں میں ہمیشہ اس شخص کے لیے آنسو دیکھے تھے۔ دو سال بعد ماں کی بھی موت ہوئی تو وہ اپنی نانی کے پاس آگیا یہیں سے مسلمانوں کے خلاف اس کے دل میں نفرت نے جڑ پکڑی تھی ایسی ایسی باتیں اس کے دل ودماغ میں مسلمانوں اور اس کے باپ کے خلاف اس کی نانی نے ڈال دیں کہ اسے لفظ مسلمان سے ہی نفرت ہوگئی تھی۔ اپنی اسکول، کالج اور یونیورسٹی لائف میں بھی اس نے کسی مسلمان طالب علم سے ضرورت کی حد تک بھی دعا سلام نہیں رکھی تھی۔

کتابوں میں اس نے پڑھا تھا کہ فتوحات اندلس کے وقت مسلمانوں نے اندلس کے خزانوں کو طب، حکمت، تعلیم اور دانائی سے بھر دیا تھا۔ صدیوں تک یہاں یونیورسٹیوں، تجربہ گاہوں اور دانش گاہوں میں مسلمان حکماء اور فلاسفرز کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھائی جاتی رہیں تاہم وہاں کے پادری اور پوپ جاہل ہوتا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے کہ کوئی شخص مسلمانوں سے متاثر ہوکر تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو کلیسا کے ارباب اختیار اسے زندہ گاڑ دیتے۔ واشنگٹن لائبریری کی کتابوں میں مسلمانوں کے عروج اور فتوحات کے ادوار میں غیر مسلموں کے ساتھ ان کے منصفانہ اور رحم دلی کے واقعات اسے اکثر الجھن میں مبتلا کرکے رکھ دیتے تھے لیکن پھر اس نے ایسی کتابوں کو پڑھنا چھوڑ دیا جن میں ذرا سی بھی مسلمانوں کے حق میں کوئی بات ہوتی تھی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی نانی کی خواہش پر اس نے آرمی جوائن کی تھی۔ مسلمانوں پر ظلم وتشدد کے لیے آرمی کے ارباب اختیار خاص طور پر اسے منتخب کرتے تھے اور اس نے کبھی انہیں مایوس نہیں کیا تھا کتنی ہی ایسی خفیہ جیلیں تھیں جہاں وہ خدائی کررہے تھے نہتے بے بس بدتر حالات کے مارے مظلوم مسلمانوں کو چیونٹیوں کی طرح مسلنے کا اپنا ہی مزا تھا۔ اس کے افسران اس سے بہت خوش تھے جبھی وہ ترقی پاتا گیا تھا اور اب اس کی ڈیوٹی بگرام جیل سے ابوغریب جیل میں لگ گئی تھی۔

شبرغان جیل میں ڈیوٹی کے دوران اپنے افسران کی ہدایت پر جو کچھ اس نے مسلمان قیدیوں کے ساتھ کیا تھا وہ اگر منظرعام پر آجاتا تو یقیناً دنیا میں ایک خوف کی لہر ضرور دوڑ جاتی۔ بظاہر دہشت گرد طالبانوں کے ساتھ جو سلوک اس نے کیا تھا اگر کوئی دیکھ لیتا تو لفظ دہشت گردی کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجاتا۔ مسلمانوں سے شدید نفرت اس وقت دوچند ہوجاتی جب تھوڑے سے پیسوں کے لالچ میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو پکڑوا دیتا۔ چند ڈالروں کے لیے مسلم ملک کا سربراہ گائے بھینسوں کی طرح اپنے ملک کے معزز شہریوں کو پکڑ پکڑ کر ان کے حوالے کرتا تب اپنی نانی کی کہی تمام باتیں اسے درست لگتی تھیں۔ داڑھی میں چھپا ہر مسلمان اسے اپنے باپ جیسا لگتا تھا جو اس کی نانی کے بقول اس کی ماں کو دھوکہ دے کر فرار ہوگیا تھا۔

امریکہ کے افغانستان پر حملے کے وقت جس طرح سے مقامی افغانیوں اور شمالی اتحاد والوں نے دولت کے لالچ میں ان کا ساتھ دیا اور اپنے ملک کے لاکھوں شہری ان کے ہاتھوں بے دردی سے مروائے اسے اور گھن آنے لگی تھی چند پیسوں میں اپنا ایمان بیچنے والے وہ لوگ ذلت کی انتہا کو چھو گئے تھے اسے ہنسی آتی تھی کہ کیا یہی وہ مسلمان تھے جسے ایک جسم اور ایک مٹھی کی مانند قرار دیا گیا تھا۔ عراق پر امریکی حملے کے وقت جن ممالک نے سب سے زیادہ اقتصادی، سیاسی اور اسٹریٹجک تعاون کیا وہ سب کے سب اسلامی ممالک تھے۔ عراق پر حملہ جن ممالک سے کیا گیا وہ بھی سب کے سب اسلامی ممالک تھے۔ عراق میں زخمی ہونے والے امریکی فوجیوں کو طبی امداد دینے کے لیے عراق میں آئے ہوئے میڈیکل

ٹیمز ہسپتالوں میں ڈاکٹرز بھی سب کے سب اسلامی ممالک سے آئے ہوئے تھے جنہوں نے امریکی سرکشی سے زخمی ہونے والے عراقیوں کا علاج کرنے سے انکار کرتے ہوئے امریکی فوجیوں کو ان پر فوقیت دی۔ عراق میں زخمی ہونے والے امریکی فوجیوں کے اخراجات اٹھانے والے بھی سب کے سب اسلامی ممالک تھے۔ یہی نہیں بلکہ 28 مئی 2004ء کو ایک عرب سفیر نے واشنگٹن میں عراق کو آزاد کرنے کے دوران زخمی وہلاک ہونے والے امریکی فوجیوں کے لیے 3.5 ملین ڈالر رقم کردہ کمیٹی کی طرف سے بطور عطیہ دیے اور اتنی ہی رقم امریکی فوجیوں کے اہل خانہ کو دینے کا اعلان کیا گیا جب کہ عراق جنگ میں قیدی بن کر رہائی پانے والی امریکی فوجی خاتون کو کویتی حکام نے دنیا کی سب سے مہنگی کار بطور تحفہ دی۔ پھر بھی وہ ایک جسم ایک بند مٹھی کی مانند قرار دیے گئے تھے اسے ہنسی آتی تھی۔

اکثر شراب کے نشے کے دوران وہ گھنٹوں اپنے باپ اور دیگر مسلمانوں کو گالیاں دیتا تھا کیسے کیسے مظالم نہیں تھے جو اس نے اپنے زیرحراست قیدیوں پر کیے تھے اور اب وہ حورعین عبد[illegible] کے سامنے کھڑا تھا جس کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا [illegible] افغانستان میں طالبان کی حامی اور پاکستان میں امریکہ کی حکومت برطانیہ کی مخالف ہے اور لوگوں کے دلوں میں ان [illegible] کے خلاف نفرت ابھارنے جیسے سنگین جرائم کی مرتکب [illegible] ہے۔

دبلے پتلے سے نازک جسم کی اس خوب صورت لڑکی کے عزائم جان کر وہ جتنا تلملایا تھا مگر جب سیل کا لاک کھول کر جس وقت وہ اندر داخل ہوا حورعین کی آنکھیں اسی پر جمی تھیں جبھی اس نے پوری طاقت سے اسے زوردار تھپڑ رسید کیا حورعین منہ کے بل زمین پر جا پڑی جب کہ جڑی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کا گلا گھونٹا تھا۔

"یو بچ...... ہمارا کھاتے ہو اور ہم ہی کو آنکھیں دکھاتے ہو جس ملک کا ویزہ حاصل کرنے کے لیے تمہاری ایڑھیاں گھس جاتی ہیں اسی ملک سے نفرت کا اظہار کرتے ہو منافقو...... پیسے کے لالچی ہو تم خود اپنا ایمان اپنی ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہو اور قصوروار ہمیں ٹھہراتے ہو۔" حورعین کے بال اپنی مٹھیوں میں جکڑتے ہوئے اس نے اسے زور سے دھکا دیا۔ حورعین کا سر سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا شدید درد کے احساس نے بے اختیار اسے چلانے پر مجبور کردیا تھا۔ اگلے ہی پل اپنے ماتحت افسر کو اشاروں کی زبان میں کچھ سمجھانے کے بعد وہ سیل سے نکل گیا۔ جڑی پریشان سی حورعین کے سر سے بہتے خون کو دیکھ رہی تھی پھر اسی نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا تھا۔ ایاد عبدالھادی کا ماتحت افسر بھی سیل سے نکل چکا تھا۔

حورعین چکراتے ہوئے زخمی سر کو پکڑتے وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

"وہ تم سے کیا کہہ رہا تھا؟" جڑی چونکہ انگلش سے ناواقف تھی جبھی پریشان سی اس سے پوچھ رہی تھی وہ کراہ کر رہ گئی۔

"کچھ نہیں...... ہم پاکستانیوں کو ہماری اوقات بتا رہا تھا۔"

"تت...... تم پاکستانی ہو؟" جدی کو حیرانی ہوئی تھی۔ وہ محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"اوہ...... میں نے پچھلے دنوں سنا تھا تمہارے ملک کے صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنے دورہ آسٹریلیا کے دوران دونوں ملکوں کے مابین دہشت گردی کو روکنے کی غرض سے خفیہ انفارمیشن کے تبادلے کے سمجھوتے پر دستخط کیے ہیں جیسے ہی ان کا دورہ آسٹریلیا ختم ہوا ویسے ہی خفیہ ادارے "آسٹریلیا سیکورٹی اینڈ انٹیلی جنس" نے اسلامی گروپوں اور سرگرم لوگوں کے خلاف چھاپوں کا سلسلہ تیز کر دیا تھا۔ سڈنی اور میلبورن میں آباد مسلمانوں کی اکثریت نے ہمیشہ کسی بھی قسم کی دہشت گردی اور اس قسم کے منصوبوں کو بھرپور انداز میں رد کیا ہے مگر اس کے باوجود میلبورن میں مختلف گھروں پر چھاپے مارنے کے دوران جانے کتنے ہی مسلمانوں کو ان کے گھروں سے گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا آسٹریلیا میں ہر شہری کے بنیادی حقوق ہیں اور ان حقوق میں ذاتی معاملات کی مکمل آزادی ہے۔ ASIO کے پاس اگر ان چھاپوں اور گرفتاریوں کی جائز وجوہات اور ٹھوس شواہد موجود ہیں تو انہیں منظر عام پر لایا جائے ورنہ یہ کارروائیاں عوام کو اعتماد میں لیے بغیر تعصب اور شبہ کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔"

"ہوں...... مگر تعصب اور شبہ کی نگاہ سے دیکھے گا کون؟ بنا کسی وجہ کے پوری دنیا میں مسلمانوں کے بچوں، بوڑھوں، عورتوں تک کو بے دردی و بے رحمی سے مارا جا رہا ہے۔ بدترین خون ریزی سے ان کی نسل کشی کی جا رہی ہے مگر کسی کے پاس ان کے زخم دیکھنے کی فرصت نہیں ہے نہ امن کے قیام کے لیے ہر پل چیخنے انسانی حقوق کی بڑی بڑی باتیں کرنے والوں کے پاس نہ امت مسلمہ کے پاس جانے بے حسی کا یہ کیسا نشہ ہے جس کا اثر ٹوٹ ہی نہیں رہا۔"

سر سے بہتے خون سے دونوں ہاتھ رنگے اس نے نہایت دکھ سے جدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا تبھی ایک فوجی افسر وہاں چلا آیا۔

"چلو۔" نہایت حقارت سے حور عین پر نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے دھاڑ کر کہا تو وہ ڈر گئی۔

"کہاں؟"

"چلو...... ابھی بتاتے ہیں کہاں؟" ہاتھ بڑھا کر اس افسر نے اسے گھسیٹ لیا تھا پھر سیل سے باہر نکلتے ہی اس کے دونوں ہاتھوں کو پیچھے باندھ کر اس کے منہ پر ایک بھورا لمبا تھیلا ڈال دیا گیا ایسا تھیلا جس میں سانس لینے کے لیے بھی کوئی سوراخ نہیں تھا وہ جیسے ہی چلتے ہوئے لڑکھڑائی فوجی افسر نے زور سے بیلٹ کا بٹ اس کے کندھوں پر دے مارا۔

"اللہ......" اس کے منہ سے آہ نکلی تھی مگر وہاں آہوں کی پروا کسے تھی؟ بھوک اور نقاہت کے ساتھ درد کی شدت نے اسے نڈھال کر چھوڑا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد سے ایک میٹر کی چھوٹی سی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا جس میں کوئی روشن دان نہیں تھا۔ حور عین کو لگا وہ مر جائے گی اس کے نازک اندام وجود میں اتنی صعوبتیں برداشت کرنے کی سکت نہیں تھی۔

❁ ❁ ❁
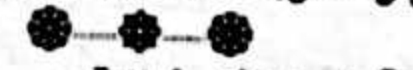
تم نے سوچا نہ تھا ہم نے چاہا نہ تھا
پھر یہ کیسے جدائی کی شام آ گئی؟
کس لیے بجھ گئے قربتوں کے دیے
کس طرح تیرگی اپنے نام آ گئی؟
ہم محبت کے ایسے مسافر ہے
جن کی راہوں میں سنگ گراں بھی نہ تھا
جن کی چاہت کا دشمن نہیں تھا کوئی
سر گراں جن سے یہ آسماں بھی نہ تھا
کون حاسد ہے جس کی نظر لگ گئی؟
کس کی تھی بددعا زد میں ہم آ گئے
ایسی پت جھڑ کی ظالم ہوائیں چلیں
پھول اپنی رفاقت کے مرجھا گئے
کیا خبر جب کبھی لوٹ کر آؤ گے تم
میری تربت کا نام و نشاں نہ ملے
تھک کے ہم تو زدہ شاعر بے سکون
پیار کا جب سے سائباں نہ ملے
آخری بار اے میری جانِ غزل!
آخری بار اپنی یہ ضد چھوڑ دے

بچے کے سر سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا جب زائر نے اسے زمین سے اٹھا کر اپنی گود میں لیا تھا اس کی بیٹی بھی پاس کھڑی رو رہی تھی۔ زائر نے ہاتھ بڑھا کر اسے بھی بازو کے حلقے میں لیا اور دونوں کو بے تحاشا چومنا شروع کر دیا۔ تبھی ثانیہ اس کے قریب پہنچی اور اس نے کسی چیل کی مانند اپنے بچوں کو اس سے جھپٹنا چاہا تھا۔

"دور رہو میرے بچوں سے دیہاتی جنگلی انسان......" حلق کے بل چلاتے ہوئے وہ دھاڑی تھی۔ بچے سہم کر اسے دیکھنے لگے تاہم زائر نے انہیں اپنی گرفت سے آزاد نہیں کیا۔ بچے کے سر سے بہتا ہوا خون اس کی جان پر بنا رہا تھا تبھی گردن پیچھے موڑ

ہوئے با آواز بلند اس نے کسی ملازم کو پکارا پھر اسے موٹر سائیکل نکالنے کی ہدایت کرنے کے ساتھ ہی بنا ثانیہ کے غصے کی پروا کیے وہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے گاؤں کے واحد ڈاکٹر کی طرف چلا آیا۔ ثانیہ اس کی جسارت پر ہکا بکا سی کھڑی رہ گئی تھی۔

"ثانیہ" کافی دیر خاموشی کے بعد اشعر حسین نے اسے پکارا تو...وہ جیسے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ہوں۔"

"جھوٹ بولا تھا ناں تم نے مجھ سے؟"

"کیسا جھوٹ؟" اشعر حسین کے گلے پر اسے جیسے کرنٹ لگا تو اشعر نے رخ پھیر لیا۔

"یہی کہ زائر ملک جس نے حویلی میں پرورش پائی ہے تمہارا ڈرائیور ہے۔"

"تو......؟"

"تو یہ کہ وہ صرف ڈرائیور نہیں ہے ان بچوں کا باپ بھی ہے یہ بات میں نے ایئر پورٹ پر ہی محسوس کر لی تھی جب ان بچوں کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ستارے جھلملائے تھے مگر اس نے لب دبا کر اپنا ضبط بحال رکھا تھا۔"

"کیا بکواس ہے یہ؟" کانپتے لبوں کے ساتھ وہ جھنجلائی تھی مگر اشعر حسین نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"بکواس نہیں ہے حقیقت ہے تمہارے بچے کے چوٹ لگنے سے جتنی تکلیف اس نے محسوس کی ہے شاید تم نے بھی نہیں کی... وہ محض ایک ڈرائیور ہوتا تو یوں دیوانگی کے ساتھ تمہارے بچوں کو چوم نہ رہا ہوتا۔"

"اشعر پلیز! مجھے زائر ملک کے بارے میں کوئی بات نہیں سننی۔"

"مت سنو مگر تم چاہ کر بھی اس حقیقت سے نگاہ نہیں چرا سکتیں... وہ تمہارے بچوں کا باپ ہے تم چاہو بھی تو اسے اس کے بچوں سے دور نہیں رکھ سکتیں۔" اشعر کی بات پر اس کا دل ضرور کانپ کر رہ گیا تھا۔ زائر ملک کی فطرت سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھی۔ جو چیز اسے آسانی سے حاصل نہیں ہوتی وہ اسے چھین لیتا تھا مگر وہ اپنے بچوں کے بارے میں ایسا کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھی تبھی اس نے فوراً اشعر سے شفٹنگ کا پروگرام بنایا تھا۔

رات جب وہ اپنے بچے کو مرہم پٹی کروا کر حویلی لایا تو ثانیہ جلے پیر کی بلی کی مانند ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہی تھی جانے کیوں اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اس کے بچے کو لے کر نہیں آئے گا۔ دادی ماں اسے تسلی دے رہی تھیں مگر اسے تسلی نہیں ہو رہی تھی جس وقت اس نے حویلی کے گیٹ سے زائر کو اندر آتے دیکھا تب اس کی جان میں جان آئی اس کا بیٹا زائر کے کندھے سے لگا سو رہا تھا۔ ثانیہ اسے دیکھتے ہی تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

"کیسا ہے میرا بیٹا...... اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

"ٹھیک ہے خون بہت بہہ گیا تھا ڈرپ لگ رہی تھی اس لیے۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے بچے کو ثانیہ کی گود میں دینا چاہا تھا تبھی اس کے ہاتھ ثانیہ کے ہاتھوں سے ٹکرائے تھے اور دونوں کو ہی جیسے جھٹکا سا لگا تھا وہ حویلی سے گھر واپس آیا تو سائرہ اسی کی راہ دیکھ رہی تھی اس کی دستک کے جواب میں دروازہ بھی اسی نے کھولا تھا۔

"کہاں رہ گئے تھے اتنی رات ہو گئی ہے ماسی پریشان ہو رہی تھی۔"

"تمہیں بتانے کا پابند نہیں ہوں میں ہٹو سامنے سے۔" اس کا موڈ آف تھا سائرہ دروازہ بند کرنے کے بعد روٹی لے کر اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

"لے کھانا کھا لے ہاتھ منہ دھو کر۔ تیری پسند کے کریلے گوشت بنائے ہیں میں نے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" بنا سائرہ اور کھانے پر نگاہ ڈالے وہ اپنے بستر پر ڈھے گیا۔ سائرہ ڈھٹائی سے ٹرے سائیڈ پر رکھتے ہوئے اسی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"کیوں بھوک نہیں ہے مجھے پتا ہے تو نے سارا دن بھی کچھ نہیں کھایا ہوگا۔"

"تو......؟ میں چاہے دس دن کچھ نہ کھاؤں تم کون ہوتی ہو میری فکر کرنے والی؟" وہ دھاڑا تو سائرہ گھور کر رہ گئی۔

"بچپن کی منگ ہوں تیری پیار کیا ہے میں نے تجھ سے تجھے تو سب کچھ بھول گیا پر مجھے ایک ایک دن یاد ہے جب تم میری محبت میں پاگلوں کی طرح میرے گھر کے چکر لگاتے تھے۔"

"پاگل تھا میں جو تجھ جیسی مفاد پرست لڑکی سے دل لگا بیٹھا مگر اب ایسا کچھ نہیں ہے نکل آیا ہوں میں ان دنوں کے فریب سے۔"

"پتا ہے مجھے اس شہر والی نے دماغ خراب کر رکھا ہے تیرا مگر وہ بھی تو چھوڑ کر چلی گئی ناں تجھے اس سے کیوں نہیں کرتا نفرت؟" فوراً سے پیشتر نہایت غصے میں وہ جواب دیتے ہوئے اس نے پھر وہی خنجر گھونپا تھا اس کے سینے میں کہ جس کا وار ہمیشہ اسے گھائل کر کے رکھ دیتا تھا اس وقت بھی وہ چپ کر گیا تھا تبھی وہ محبت سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"میں تیرا دل نہیں دکھانا چاہتی زائر اسوہنا رب جانتا ہے آج بھی دل سے پیار کرتی ہوں تجھے۔"

"نہیں چاہیے مجھے تیرا پیار، سنا تم نے۔ کسی کے پیار کی ضرورت نہیں ہے مجھے کہاں جا سویا تھا یہ پیار اس وقت جب تم میرے سسکتے ہوئے دل کی پروا کیے بغیر صرف دولت کے لالچ میں کسی اور کی سیج پر جا بیٹھی تھیں۔ اس وقت کہاں گئی تھی تمہاری یادداشت جب میرے سارے جذبوں پر پانی پھیر کر کسی اور کے نام کی مہندی ہاتھوں پر رچا کر بیٹھ گئی تھیں۔ مت کریدا کرو بجھی ہوئی راکھ سے چنگاریاں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دن یہی چنگاریاں تمہارے سارے وجود کو جلا کر راکھ کر دیں۔" دھاڑ کر اس میں ہاتھ کی انگلیاں اس کے نرم بازو میں پیوست کرتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اسے پرے دھکیلا مگر وہ لڑکھڑا کر پھر اسی کے بازو سے لپٹ گئی۔

"مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے زائر! بہت شرمندہ ہوں میں اپنی حماقت پر پتا نہیں کیسے میری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا ورنہ وہ مردود افضل تو تیرے پیر کی جوتی کے برابر بھی نہیں۔ مجھے معاف کر دے زائر! خدا کے واسطے معاف کر دے۔"

"میرے پاس تجھے دینے کے لیے اب کچھ نہیں ہے سائرہ! اس لیے نہ دماغ خراب کر میرا۔" اکتا کر رخ پھیرتے ہوئے اس نے پھر اسے دہائی دی مگر سائرہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"ماں بہت پریشان ہے زائر! ہم دونوں کے لیے کئی بار میرے سامنے تیری اور میری شادی کی بات کر چکی ہے میرے لیے نہ سہی ان کی خوشی کے لیے ہی سہی مجھے اپنا نام دے دے۔ تیرے علاوہ میں نے اور کسی سے شادی نہیں کرنی اب اگر ایسا ہوا تو تیری قسم زائر! میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔"

"کوئی بات نہیں میں بھی تو مر گیا تھا تم بھی مر جاؤ گی تو کیا ہوگا۔" اس کی جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہوئے بغیر اس نے اپنا تکیہ اور لحاف اٹھایا اور وہ چھت پر چلا آیا پیچھے وہ تلملا کر رہ گئی۔

اگلی صبح وہ اٹھا تو سائرہ ہینڈ پمپ کے پیچھے بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی وہ دست روی سے بچ کر سیڑھیاں اتر تا اپنی ماں کے پاس آ بیٹھا۔

"ابا کی طبیعت اب کیسی ہے اماں؟"

"کیسی ہو سکتی ہے؟ جوان اکلوتا پتر وہ گھڑی پاس بیٹھ کر حال دریافت کر پوچھے تو کیسی طبیعت ہوگی باپ کی؟" اماں شاید اس کی طرف سے بھری بیٹھی تھیں تبھی اس کے بیٹھتے ہی کوسنے دینے شروع کر دیے وہ رخ پھیر کر رہ گیا۔

"مجھ سے ابا کا حال دیکھا نہیں جاتا اماں! اسی لیے نہیں بیٹھتا ان کے پاس۔"

"کیوں ان کے حال کو کیا ہوا ہے اللہ معاف کرے کوڑھ تو نہیں لگا نہیں جو تجھے پاس بیٹھ کر گھن آتی ہے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا اماں۔" اماں کے جلال نے اسے اچھا خاصا پریشان کر دیا تھا تبھی وہ بول اٹھیں۔

"بس رہن دے، نے اچھی طرح سمجھتی ہوں تیرے مطلب کو پانچ سال ہو گئے فقیر بنا پھرتا ہے ایک بار بھی کبھی میرا اور اپنے ابا کا خیال آیا تجھے؟ پندرہ پندرہ دن اپنی شکل نہیں دکھاتا کوئی مرتا ہے تو مر جائے تیری بلا سے۔" وہ اچھی خاصی دکھی تھیں زائر جھنجلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"سب کے ساتھ آپ بھی دعا کریں اماں کہ میں مر جاؤں ویسے بھی میرا اس دنیا میں کوئی کام نہیں ہے۔" اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا البتہ اماں کا ہاتھ دل پر ہی رہ گیا جب کہ سائرہ نل کے پیچھے بیٹھی سن سی رہ گئی تھی۔ کیا چل رہا تھا زائر کے دل و دماغ میں جو وہ ذات کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی سے بھی اتنا بیزار ہو گیا تھا۔ وہ محض سوچ کر رہ گئی۔

دن بھر کھیتوں میں پسینہ بہانے کے بعد ڈھلتی شام کے وقت جب وہ گھر واپسی کا قصد کر رہا تھا اس کا گھر لوٹ کر ثانیہ عباس کے ساتھ ہوا تھا بارش اچانک شروع ہوئی تھی شدید برساتی موسم میں قطعی نامناسب کپڑے پہنے وہ اسی شخص کے ساتھ کہیں سے آ رہی تھی جو اسے زہر لگتا تھا۔ ثانیہ عباس کی ٹائٹ جینز پر سلیولیس شرٹ بارش میں بھیگ کر اس کے جسم کے ساتھ چپک گئی تھی اور اب اس کے جسمانی خد و خال خوب واضح کر رہی تھی۔ زائر کے بدن میں جیسے آگ سی کر دوڑنے لگا تھا وہ اس سے الگ ہو کر رہ سکتا مگر اسے یوں اپنی عزت سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا تبھی برقی رو کی طرح تیزی سے اس کی طرف لپکا اور اس سے پہلے کہ ثانیہ اسے کچھ کہتی اس نے ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر دے مارا۔

ثانیہ عباس کے ساتھ ساتھ اشعر حسین بھی اس کی اس حرکت پر ششدر رہ گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ غرایا تھا مگر زائر نے اسے نہیں دیکھا وہ صرف ثانیہ کو دیکھ رہا تھا۔

"بہت بہتر ہوگا تمہارے لیے ثانیہ عباس اگر تم اپنی حدود میں رہو کیونکہ میں نے تم سے کنارہ کشی کی ہے سر عام گاؤں کی گلیوں میں عزت رولنے کی اجازت نہیں دی۔"

"جسٹ شٹ اپ یو ایڈیٹ میں! تم ہوتے کون ہو مجھ پر ہاتھ اٹھانے والے؟ کیا اوقات ہے تمہاری میرے سامنے صرف ایک نوکر.....؟" بپھرے ہوئے لہجے میں جس سے اس نے اپنے اور اس کے مابین رشتے سے نگاہ چرائی تو دنگ رہ گیا تھا۔

کیا واقعی اب وہ صرف اس لڑکی کا نوکر رہ گیا تھا؟

"خبردار آج کے بعد اگر کبھی میرے سامنے آئے تو...... میں نوکروں کو ان کی اوقات سے بڑھ کر چھوٹ دینے کی قائل نہیں ہوں۔" انگلی اٹھا کر اسے وارن کرتی وہ کوئی اور ہی ثانیہ عباس لگ رہی تھی۔ زائر کے جسم کا سارا خون آنکھوں میں سمٹ آیا، کیا کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا اس وقت وہ اس سے مگر زبان جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔

دنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جو غلطی کرتے ہیں مگر پھر اپنی غلطی کا احساس ہونے پر اس سے توبہ کر لیتے ہیں دوسرے وہ ہوتے ہیں جو غلطی کر کے مان لیتے ہیں مگر توبہ نہیں کرتے اور تیسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو غلطی کر کے مانتے بھی نہیں اور اگر انہیں ان کی غلطی کا احساس دلایا جائے تو الٹا وہ آپ پر چڑھ دوڑتے ہیں، ایسے لوگوں کا ساتھ بے شک زندگی کو بہت کٹھن بنا دیتا ہے، زائر ملک کی نگاہ میں ثانیہ عباس کا شمار بھی ان تیسری قسم کے لوگوں میں ہوتا تھا۔ بارش میں مزید شدت آ گئی تھی مگر وہ اب بھی وہیں کھڑا تھا۔

وہ چتر چناراں دے......

ساڈا دکھ کن کن کے روندے، پتھر پہاڑاں دے

جوگی بابا کی آواز ایک مرتبہ پھر پوری شدت سے اس کے اندر گونجی تھی۔ اگلے روز چوہدرانی کے بلاوے پر شام کے وقت وہ حویلی آیا تھا۔ ثانیہ عباس اس وقت گاؤں میں نہیں تھی۔

"جی چوہدرانی آپ نے بلایا؟"

"ہاں زائر! آ بیٹھ۔" وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔

زائر چپ چاپ موڑھا کھینچ کر ان کے قریب بیٹھ گیا۔

"خیریت؟"

"خیریت کہاں ہے زائر! سالوں بعد پوتی کا چہرہ دیکھنا نصیب ہوا سوچا تھا اب وہ آ گئی ہے تو خود ہی حویلی کا نظام سنبھالے گی مگر...... میری تو قسمت ہی خراب ہے۔"

"کیوں اب کیا ہوا؟" چوہدرانی کے الفاظ پر اس کا دل پوری شدت سے دھڑکا تھا۔

"ہونا کیا ہے پتر! ثانیہ نے گاؤں چھوڑ کر شہر میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے، وہ جو لڑکا آیا ہوا ہے ناں اشعر حسین اسی نے دماغ خراب کیا ہوگا اس کا ورنہ وہ اس بڑھاپے میں بوڑھی دادی کو اکیلا چھوڑ کر جانے والی نہیں تھی۔" چوہدرانی کی پریشانی پل میں اس کی پریشانی میں ڈھل گئی تھی تاہم اس نے خود پر ضبط قائم رکھا۔

"آپ اکیلی تو نہیں ہیں چوہدرانی! پہلے بھی تو اتنا عرصہ یہ گاؤں والے ہی آپ کے سنگے بن کر رہے ہیں، اب بھی اگر وہ آپ کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو کیا ہوا ہم سب ہیں ناں یہاں آپ کے ساتھ۔"

"اللہ عمر لمبی کرے ان لوگوں کی میرے گاؤں کو ہر نظر بد سے محفوظ رکھے...... آمین۔" ان کے چہرے کی اداسی اور لہجے کا ملال بدستور قائم تھا تبھی وہ بولا تھا۔

"اشعر حسین سے کیا تعلق ہے ثانیہ بی بی کا؟"

"ارے تعلق کیا ہونا ہے پتر! بس جب سے ثانیہ کو طلاق ہوئی ہے خواہ مخواہ ہمدرد بنا پھرتا ہے اس کا۔"

"طلاق......؟" اس پر تو جیسے بجلیاں آ گری تھیں۔

"ہاں...... اپنی پسند سے شادی کی تھی ثانیہ نے اسی لیے یہ داغ برداشت کرنا پڑا۔"

"کب ہوئی اسے طلاق؟" زائر کا دل جیسے بند ہو رہا تھا۔

"پانچ سال پہلے...... جب اس نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا تبھی اس کے شوہر نے اسے طلاق کے پیپرز بجھوا دیے تھے۔" ایک کے بعد ایک چوہدرانی کے انکشافات نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔

"بہت ٹوٹی ہے ثانیہ اسی کے غم میں کنیز بھی دنیا سے چلی گئی بچے ہیں تو وہ باپ کی شکل دیکھنے کو ترس رہے ہیں مگر وہ بندہ خدا جانے کہاں ہے۔" بنا زائر کے اندر سر اٹھاتے طوفانوں کی خبر رکھے چوہدرانی اس پر اپنا دکھ عیاں کر رہی تھیں زائر کو لگا جیسے اس کا وجود پتھر ہو کر رہ گیا ہو۔

کیا وہ لڑکی صرف اپنی خوشیوں کے لیے اپنے گھر والوں کو اتنا بڑا دھوکہ دے سکتی تھی؟ صرف اس سے چھٹکارے کے لیے کیا وہ اس حد تک بھی گر سکتی تھی؟ اتنا بڑا جھوٹ وہ بھی اپنے قریبی رشتوں سے؟ اسے لگا جیسے اس کا سر درد سے پھٹ جائے گا تبھی چوہدرانی سے معذرت کر کے فوراً سے پیشتر وہ اٹھ کھڑا ہوا مگر ابھی اس کے قدم حویلی کے گیٹ کے پار بھی نہ ہوئے تھے کہ کسی کی صدا نے جیسے اس کے قدموں کو زمین کے ساتھ باندھ کر رکھ دیا۔

❁ ❁ ❁

وصال موسم گزر گیا تو خیال بن کر ملا کریں گے
بچھڑ گئے تو کبھی کبھی ماہ وصال بن کر ملا کریں گے
کتاب عہد وفا کے اک اک ورق پر اپنی خبر ملے گی
ہم اہل الفت محبتوں کی مثال بن کر ملا کریں گے
ہزار لمحوں کی ہو مسافت دلوں کی دھڑکن سنائی دے گی
گزرتے لمحوں کی ہر صدا میں دھمال بن کر ملا کریں گے
ابھی تو لمحوں کی دوریوں پر بھٹک رہے ہیں مگر کبھی جو
فلک کی گردش میں آ گئے تو ہلال بن کر ملا کریں گے

سارے کمرے میں آگ بھڑک رہی تھی اور ہانیہ نیم بے ہوشی کی حالت میں اٹیچ باتھ کے دروازے پر کھڑی بری طرح سے چلاتے ہوئے سب کو پکار رہی تھی۔

"ہانیہ......" اچانک اسے میکال کی پکار سنائی دی، تین تین سیڑھیاں اکٹھی پھلانگ کر اوپر آنے کے بعد وہ پاگلوں کی طرح اسے پکار رہا تھا۔ ہانیہ کی چیخوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"ہانیہ......"

اب وہ چلا رہا تھا تبھی ہانیہ نے دیکھا تھا آگ کے بھڑکتے شعلوں کی پروا کیے وہ کھڑکی سے کمرے میں کودا تھا کیونکہ سامنے دروازے کی چوکھٹ مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں آ چکی تھی اور وہاں سے کمرے میں داخل ہونا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ کھڑکی سے کمرے میں کودنے کے باوجود آگ نے میکال کی پینٹ کے پائنچے کو چھو لیا تھا مگر اسے اپنی پروا ہی کب تھی وہ تو ہانیہ کو بچانے کے لیے پاگل ہو رہا تھا باہر جاذب جو اس کے پیچھے ہی لپکا تھا آگ پر مسلسل پانی ڈال کر اسے بجھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا پھر جس وقت میکال نے اٹیچ باتھ کے دروازے پر کھڑی ہانیہ کو اپنے حصار میں لیا وہ مکمل طور پر ہوش و حواس سے بیگانی ہو کر اس کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔ رات جس وقت وہ ہوش میں آئی تو اس کا ہاتھ میکال کے ہاتھ میں تھا ہانیہ نے دانستہ آنکھیں کھولنے سے احتراز کیا تبھی میکال نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس کا ایک ہاتھ ہانیہ کے بالوں کو سہلا رہا تھا وہ دم سادھے پڑی رہی تاہم اس کا دل اس لمحے بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"میں تمہارے لیے مر سکتا ہوں ہانیہ! تمہیں دکھی بھی کر سکتا ہوں مگر خدا جانتا ہے تمہیں ہمیشہ کے لیے کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔" بھرائے لہجے میں اس پر جھک کر کہتے ہوئے وہ جیسے حیران ہی تو کر گیا تھا۔ اگلے دو روز تک سب اس کے ارد گرد تھے مگر وہ نہیں تھا۔

ہانیہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کا دل ایک دم سے بے کل کیوں ہو گیا تھا۔ اس کی متلاشی نگاہیں ہر آہٹ پر اسے ہی کیوں دیکھنا چاہتی تھیں یہ جذبہ بیدار ہو رہا تھا کہ اس کی ٹانگ جلی ہے اور پاؤں بھی متاثر ہوا ہے۔ شاید اسی لیے وہ اسے نظر بھی نہیں آ رہا تھا جو بھی تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ اس کے اندر کی دنیا اچانک ہی بدل گئی تھی۔

دو روز بعد ساریہ کی سے جاذب کی رخصتی ہوئی اور اسی روز ہانیہ نے اسے دیکھا تھا ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ ٹانگ کے زخم سے نڈھال وہ بات بات پر مسکرانے کی ناکام کوشش کرتا اسے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔

تقریب کے اختتام تک بنا اپنے زخم کی پروا کیے نا صرف اس نے تمام امور سنبھالے تھے بلکہ مہمانوں کو بھی بھرپور کمپنی دی تھی۔ ہانیہ اداس کی وجہ بے وجہ اسے دیکھتی رہی۔ رات گئے وہ کمرے میں آیا تو ہانیہ کو اس کا زخم دیکھنے کا موقع ملا وہ چپکے سے اس کے کمرے میں چلی آئی اس کی بائیں ٹانگ کی پنڈلی شدید جل گئی تھی زخم اتنا بڑا تھا کہ دیکھتے ہی ہانیہ کا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔

میکال نیند میں تھا اسی لیے اسے ہانیہ کی آمد کا پتہ نہ چل سکا۔ اس نے تو اب تک محسوس بھی نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے مگر وہ زخم ہانیہ سے چھپے نہیں رہ سکے تھے۔

میکال کا وجود زخموں کے درد کی وجہ سے بخار کی لپیٹ میں تھا مگر اس نے بہت ہی ضبط سے یہ درد برداشت کیے رکھا تھا وہ اس کے قدموں کے قریب بیٹھی بے آواز روتی رہی باہر بارش شروع ہو گئی تھی مگر آج ہانیہ کو بارش میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کی ذہن کی اسکرین پر صرف وہی لمحات چل رہے تھے جن میں میکال نے اس پر اپنی محبتیں نچھاور کی تھیں۔ بے شک وہ شخص اس قابل تھا کہ اسے چاہا جاتا۔

صبح اس کی آنکھ کھلنے سے قبل ہی وہ کمرے سے نکل آئی تھی، ساریہ جاذب کی ہو کر بہت خوش تھی اور شاید جاذب بھی...... وہ ساریہ کو زبردستی کمرے میں رہنے کی تلقین کرنے کے بعد اکیلی ہی کچن میں چلی آئی۔ مہمان رات میں ہی چلے گئے تھے جب کہ گھر والوں میں سے ابھی کسی کی بھی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ اس نے آٹا گوندھ کر سائیڈ پر رکھا اور چائے کا پانی چڑھا دیا، پانی ابھی ابل ہی رہا تھا کہ اچانک میکال نے خاموشی سے پیچھے آ کر اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

"السلام علیکم! صبح بخیر۔" اس کی آواز میں اب بھی خمار تھا، ہانیہ کا دل بہت تیزی سے دھڑک اٹھا۔

"آ...... آپ......"

"ہوں۔" اپنی تھوڑی ہانیہ کے کندھے پر ٹکاتے ہوئے اس نے آہستہ سے آنکھیں موند لی تھیں۔ ہانیہ کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ میکال کی اس قربت نے واقعی اسے کنفیوز کر کے رکھ دیا تھا۔

"اتنی جلدی کیوں بیدار ہو گئے آپ کے زخم۔"

"زخم بھی تو تم نے ہی دیے ہیں ہانیہ! جیسے مریض خود چل کر ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے ویسے ہی میں اٹھ کر تمہارے پاس آ گیا ہوں۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے اس نے پھر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ہانیہ کا دل یکدم بے قابو ہوا۔

"آپ نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری جان بچائی میں آپ کی بہت ممنون ہوں مگر...... آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا

دیکھیے آپ کی ٹانگ کتنی متاثر ہوئی ہے زخم اگر بگڑ گیا تو مسئلہ ہوجائے گا۔"

"ہوں یہ تو ہے لیکن اگر ڈاکٹر مہربانی کرے اور مریض کی خطائیں معاف کرکے اس کے ساتھ رہے تو زخم ٹھیک ہوسکتا ہے۔" وہ اسے ستا رہا تھا ہانیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔ تبھی ملازمہ وہاں چلی آئی تھی میکال آہٹ پاکر فوراً پیچھے ہٹا تھا۔

"بیگم صاحب! آپ آرام کرلیں میں کرلیتی ہوں۔" ملازمہ سامنے کا منظر دیکھ کر نظریں چرانے پر مجبور ہوگئی تھی میکال کان کھجاتے ہوئے کچن سے نکل گیا۔

اسی روز دوپہر کے کھانے میں اس نے کرنل صاحب سے ہانیہ کی گھر واپسی کا مطالبہ کردیا تھا انہیں بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ ہانیہ کی خاموشی نے بھی انہیں نیم رضامندی کا اشارہ دیا تھا تبھی شام کے کھانے کے بعد انہوں نے ہانیہ کو اس کے سنگ رخصت کردیا۔ راستے میں میکال اسے اپنی انگلینڈ کی مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہا گاڑی گھر کے سامنے رکی تو سب سے پہلے نہال نے ہی ان کا استقبال کیا تھا۔

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ہانیہ کو دیکھتے ہی وہ مسکرایا تھا مگر ہانیہ نے ناراضی سے منہ پھیرلیا۔

"اسے کیا ہوا؟" بنا میکال کی پروا کیے وہ فوراً اس کے پیچھے لپکا اور اسے لاؤنج میں بازو سے جا پکڑا۔

"کچھ نہیں ہوا چھوڑو مجھے۔"

"کیوں چھوڑوں مجھے پتا ہے تم مجھ سے ناراض ہو کیونکہ میں تمہارے بھائی کی شادی میں شریک نہیں ہوسکا ہے ناں؟"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تم سے ناراض ہونے کی۔" درشتی سے اس کا بازو اپنے ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی تھی میکال خاموش سا وہیں صوفے پر ٹک گیا ہمیشہ کی طرح اسے نہال کا ہانیہ کو تنگ کرنا پسند نہیں آیا تھا مگر نہال بنا اس کی ناراضی کی پروا کیے اب بھی ہانیہ کی راہ روکے کھڑا تھا۔

"میری بات تو سن لو یار! پھر ناراض ہوجانا۔"

"مجھے کوئی بات نہیں سننی۔"

"ہانیہ پلیز......" ہانیہ کے رخ پھیرنے پر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آئی تھی مگر ہانیہ نے نہیں دیکھی۔ وہ اس کی کوئی بھی وضاحت سنے بغیر اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ لاک کرچکی تھی۔ اگلی صبح ناشتے کی ٹیبل پر اس کی ملاقات مسز ابخند مسز حسن سے ہوئی تھی دونوں اس کے لوٹ آنے کے فیصلے پر بہت خوش تھے۔

نہال وہاں موجود نہیں تھا تاہم میکال نے پہلی بار ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتے سے پورا پورا انصاف کیا تھا تھوڑی دیر بعد حسن صاحب اور میکال آفس کے لیے اٹھ گئے تبھی اس نے مسز حسن سے پوچھا تھا۔

"نہال کہاں ہے آنٹی! ناشتا نہیں کیا اس نے۔"

"ہوں صبح جلدی آفس چلا گیا کہہ رہا تھا کوئی ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے بزنس کے سلسلے میں۔ سچ پوچھو تو میں نہال کو لے کر بہت پریشان ہوں ہانیہ!"

"کیوں خیریت؟" مسز حسن کے تفصیلی جواب نے اسے پریشان کردیا تھا۔

"یہ تو میں بھی نہیں جانتی کہ خیریت ہے یا نہیں مگر نہال نے واقعی مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ کئی کئی روز گھر سے باہر رہتا ہے تمہارے یہاں سے جانے کے بعد تو سمجھو چپ لگ گئی اس لڑکے کے ہونٹوں پر۔ کسی سے بات ہی نہیں کرتا اب بھی اتنا بیمار رہا ہے اسلام آباد دوست کے پاس گھر چلا ہے جو اس نے ہمیں ہوا بھی لگنے دی ہو وہ تو اس کے دوست کا فون آیا تھا اور اس نے بے خبری میں بتادیا تو پتا چلا ورنہ یہ لڑکا تو اسے بھی منع کرکے آیا تھا کہ کچھ نہیں بتانا گھر والوں کو۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"سچ کہہ رہی ہوں کوئی بات ہے جو اسے اندر ہی اندر پریشان کیے ہوئے ہے مگر وہ کسی کھول میں چھپالیتا ہے۔"

"میں بات کروں گی نہال سے۔" مسز حسن کی باتوں نے اسے پریشان کردیا تھا تبھی اس نے انہیں اطمینان دلایا۔ میکال دوپہر کے کھانے کے لیے گھر آیا تو ہانیہ نے اس کی فیورٹ ڈشز بنا رکھی تھیں کچن کی گرمی کے سبب اس کا برا حال ہو رہا تھا وہ خفا ہوگیا۔

"ہانی! میں نے منع کیا ہے ناں تمہیں کچن میں گھسنے سے دیکھو ذرا اپنا حال۔"

"کچھ نہیں ہوتا مجھے گھر کا کام کاج کرکے خوشی ملتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اپنا حال بھی تو دیکھو۔"

"حال بھی ٹھیک ہے آپ پریشان نہ ہوں جلدی سے کھانا کھا کر بتائیں کیسا بنا ہے؟"

"ٹھیک ہے میں فریش ہوکر آتا ہوں۔" نرمی سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا فریش ہوکر وہ کھانے کی ٹیبل پر آیا تو وہ کچھ شرمندہ تھی۔

"نہال تو کبھی آئے گا کھانے کے لیے پتا نہیں اس نے آفس میں بھی کچھ کھایا ہوگا کہ نہیں۔" میکال کا سالن کے ڈونگے کی طرف بڑھتا ہاتھ وہیں رک گیا۔

"کھالیا ہوگا یو ڈونٹ وری۔"

"مما بتا رہی تھیں وہ بیمار رہا ہے آپ نے بتایا کیوں نہیں مجھے۔"

"کیا بتاتا اس نے تو گھر والوں کو بھی خبر نہیں ہونے دی تھی۔" آپ ہی آپ اس کا لہجہ خشک ہوگیا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"سوری مجھے بہت ضروری کام یاد آگیا ہے میں چلتا ہوں شام میں کھاؤں گا۔" سپاٹ چہرے کے ساتھ نرمی سے کہتا وہ فوراً ڈائننگ ہال سے نکل گیا پیچھے ہانیہ اسے روکتی ہی رہ گئی تھی۔ رات میں نہال لیٹ گھر آیا تھا۔ میکال کا موڈ البتہ فریش تھا کھانا کھانے کے بعد فارغ ہوکر وہ بیڈ پر آیا تو ہانیہ اس کے پریس کیے ہوئے کپڑے ہینگ کررہی تھی۔ وہ کچھ دیر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا پھر بیڈ سے اٹھ کر اسے بھی ساتھ ہی کھینچ لیا۔

"میکال! کیا کررہے ہیں چھوڑیں ناں پلیز۔ مجھے بہت سے کام کرنے ہیں ابھی۔"

"کاموں کے لیے اس گھر میں بہت ملازم ہیں تمہیں میں گھر میں اپنے لیے لایا ہوں سمجھیں۔"

"مگر......"

"چھوڑو اگر مگر کو...... آؤ میں تمہیں سلاتا ہوں۔"

"کیسے؟"

"بازو پر سر رکھو پھر بتاتا ہوں۔" وہ شوخ ہو رہا تھا۔ ہانیہ نے چپ چاپ اس کے پہلو میں لیٹ کر اپنا سر اس کے بازو پر رکھ دیا۔

"ہانیہ" کچھ دیر بعد جونہی اس نے پلکیں موندیں میکال نے پکارا۔

"ہوں۔"

"تم نے مجھ سے کیوں چھپایا کہ میں پاپا بننے والا ہوں۔" اس کی آواز کسی سرگوشی سے بلند نہیں تھی۔ ہانیہ کا دل تیزی سے دھڑکا۔

"بتانے کا فائدہ بھی نہیں تھا۔"

"کیوں؟" وہ حیران ہوا تھا ہانیہ نے نظر چرالی۔

"کیونکہ یہ خبر سننے کے بعد ہوسکتا تھا کہ پھر آپ مجھ پر کوئی رحم کھا لیتے۔" لفظ نہیں تھے کوئی چابک تھا جو میکال کو اپنی پشت پر پڑتا ہوا محسوس ہوا۔ ستاروں سی روشن آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"تم نے اب تک اس بات کو دل سے لگا رکھا ہے۔"

"نہیں۔"

"نہیں تو پھر بار بار کوڑے کیوں مارتی ہو کتنی بار میں تم سے اپنے الفاظ کی معافی مانگ چکا ہوں کیسا دل ہے تمہارا جس میں ذرا سی معافی کی گنجائش بھی نہیں۔"

"میں نے آپ کو معاف کردیا ہے۔"

"کردیا ہے تو دوبارہ لفظوں کے چابک نہ مارنا پلیز...... وہ سب ایک غلط فہمی کا ردعمل تھا جو اب دور ہوگئی ہے اس لیے پلیز تم اپنا دل صاف کرلو میں نہیں چاہتا کہ ہماری خوب صورت ازدواجی زندگی کسی غلط فہمی کی بھینٹ چڑھ کر برباد ہوجائے۔" ہانیہ کا چہرہ ہاتھوں میں لیے وہ اس کے گال سہلا رہا تھا ہانیہ نے پھر پلکیں موند لیں۔

"کیا ہوا میکال حسن...... اگر آپ کی یہ وارفتگیاں عائشہ جی دیکھ لیں۔"

"دیکھ لے...... کسی پرائی لڑکی کے ناز تو نہیں اٹھا رہا اپنی بیوی سے محبت کررہا ہوں۔"

"پھر بھی گئے دنوں میں ہوسکتا ہے یہی الفاظ کبھی آپ نے عائشہ جی کے لیے بھی کہے ہوں۔"

"ہوں...... ہوسکتا ہے مگر لفظ کسی کی میل نہیں ہوتے ہانی! نہ کسی کی اترن ہوتے ہیں جو ایک بار استعمال کے بعد دوبارہ استعمال ہی نہ کیا جاسکیں۔"

"سچ کہا آپ نے لفظ کسی کی میل کسی کی اترن نہیں ہوتے مگر ایک جذبہ ضرور ہوتے ہیں جن کی تقسیم تکلیف دیتی ہے۔"

"مجھے نہیں دیتی! میں نے خود کو سمجھا لیا ہے کہ جو چیز میرے اختیار و نصیب میں نہیں میں اس کے لیے اگر ساری عمر بھی روتا رہوں تو کوئی فائدہ نہیں پھر کیوں نہ میں اس چیز کو قبول کرلوں جو میرے نصیب میں لکھ دی گئی ہے۔"

"اچھی سوچ ہے مگر مجھے آپ کی اسی بات نے متاثر کیا تھا کہ آپ عائشہ جی کے علاوہ اور کسی کا بھی تصور گناہ سمجھتے تھے میرے نزدیک محبت میں وحدانیت ہی اسے اس کی حقیقی منزل تک پہنچاتی ہے۔"

"ہوں...... مگر کچھ لوگ حالات و تقدیر کے سامنے بے بس ہوجاتے ہیں جیسے میں ہوگیا ہوں تمہاری بددعا کے سامنے۔" سنجیدگی سے کہتے کہتے وہ مسکرادیا۔ ہانیہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"سنا ہے آپ نے ماڈلنگ شروع کردی ہے۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرایا۔

"اصل میں میرا ایک دوست ہے کسی پرائیوٹ چینل کے لیے کام کرتا ہے اس کی شوٹنگ تھی انگلینڈ میں مگر مطلوبہ ماڈل عین ٹائم پر دھوکہ دے گیا تبھی مجبوراً مجھے قربانی کا بکرا بننا پڑا۔"

"اچھی ماڈلنگ کر لیتے ہیں آپ۔"

"نوازش صاحب۔" دبا کر مسکراتے ہوئے اس نے ہانیہ کو خود میں سمویا اور ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ سو گیا تو ہانیہ آہستہ سے خود کو اس کی گرفت سے نکالا اور بیڈ سے اتر آئی۔ مڑ کر ایک نظر اطمینان سے سوتے ہوئے میکال پر ڈالنے کے بعد اس نے اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند کیا اور سیڑھیاں اتر آئی۔

❁ ❁ ❁

"ٹک.....ٹک.....ٹک۔"

کمپیوٹر آف کر کے وہ ابھی سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ رات کے ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ اس وقت کس کو اس کی یاد آ سکتی تھی۔ اپنے آپ سے الجھتے ہوئے اس نے تیسری دستک کے جواب میں جھنجھلا کر دروازہ کھولا تھا۔

"ہانیہ.....تم.....؟" دروازے پر کھڑی ہانیہ کو دیکھ کر وہ حیران ہی تو رہ گیا تھا۔

"ہوں میں.....کیوں نہیں آ سکتی کیا؟"

"نہیں.....میں نے ایسا تو نہیں کہا۔"

"او کے چلو آؤ میرے ساتھ۔" بنا کوئی سوال جواب کیے اس نے بازو سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لیا۔

"ہانیہ کیا کر رہی ہو اتنی رات کو کسی کی آنکھ کھل گئی تو کیا سوچے گا۔"

"کچھ نہیں سوچے گا تم بیٹھو یہاں۔" اپنے پرانے انداز میں واپس لوٹتے ہوئے اس نے لاؤنج میں لا کر اسے اپنے مقابل صوفے پر دھکیلا۔

"سارا سارا دن تم گھر سے غائب رہتے ہو کھانے پینے پر بھی توجہ نہیں ہے مجھ سے تو ویسے ہی دشمنی ہوگئی ہے تمہاری آنٹی بتا رہی تھیں بیمار بھی رہے ہو تم شاید اسی لیے میرے بھائی کی شادی میں بھی شریک نہیں ہو سکے۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں نہال کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

"کیا کر رہا ہوں بیماری اب کسی سے پوچھ کر تو نہیں آتی۔" وہ مسکرایا تو ہانیہ چڑ گئی۔

"پتا ہے مجھے بیماری بتا کر نہیں آتی لیکن بیماری میں اگر انسان اپنوں کو اپنی تکلیف کا بتا دے تو میرے خیال میں اس کا ایمان متاثر نہیں ہوگا۔"

"کیا فائدہ یوں کسی کو پریشان کرنے کا تم تو ویسے بھی جنگ کی شہزادی بنی رہتی ہو کس کے پاس بیٹھ کر دکھ روؤں اپنا۔"

"دکھ.....اور تمہیں؟"

"کیوں؟ میں انسان نہیں؟ مجھے دکھ نہیں ہو سکتے؟"

"نہیں کیونکہ تم انسان ہونے کے ساتھ ساتھ خود بہت بڑی آفت ہو۔" اس بار ہانیہ کے الفاظ پر وہ کھل کر ہنسا تھا۔

"اور تم خود کیا ہو بندریا؟ ہر وقت بے چارے میرے بھائی کو پریشان کیے رکھتی ہو۔"

"نہال ہر وقت اپنے بھائی کی سائیڈ مت لیا کرو تمہارا بھائی اتنا بھی اچھا نہیں ہے۔"

"اتنا بھی اچھا نہ ہوتا تو تم پلٹ کر یہاں واپس کیوں آتیں۔" اب وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا ہانیہ نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر مکا رسید کیا۔

"وہ تو اس نے میری جان بچائی تھی اس لیے ترس آ گیا۔"

"آہم.....آہم.....دل کی بے ایمانی کو ترس کا نام نہ دو۔" وہ اس کا دوست تھا شاید اسی لیے اس کے دل کی بات جان گیا تھا ہانیہ نے بے ساختہ نظر چرائی تھی۔ جبھی وہ بولا۔

"تم بھیا کے ساتھ خوش ہو ناں ہانی؟"

"ہوں کوئی شک؟"

"نہیں کوئی شک نہیں۔" یونہی دل کی تسلی کے لیے پوچھ رہا تھا ورنہ تمہارے دل کا حال تو تمہاری آنکھوں سے دکھائی دے رہا ہے۔"

"جی نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں۔"

"ایسی ہی بات ہے۔" ہانیہ کے شرمانے پر بے ساختہ وہ مسکرایا۔

"ایک دوست اپنے دوست سے دل کی بات نہیں چھپا سکتا اور میں تو یہ بات کب سے جانتا ہوں کہ تم میکال بھیا سے پیار کرتی ہو۔"

"بس رہنے دو اتنے بڑے جادوگر بھی نہیں ہو تم۔"

"اتنا ہی بڑا جادوگر ہوں میں تمہیں خبر نہیں ہے۔"

"ہاں.....اچھا چھوڑو یہ بتاؤ آنٹی کو کیوں پریشان کر رہے ہو تم؟"

"کب پریشان کیا ہے یار بس وہ ماں ہیں تو ذرا زیادہ محسوس کرتی ہیں ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"کچھ بھی ہو مجھے تو لگتا ہے کسی لڑکی کا چکر ہے۔"

"ہاہا.....تم اور تمہاری سوچ۔"

"کیوں سچ نہیں ہے کھاؤ میرے سر کی قسم کہ ایسی بات نہیں ہے۔"
"ہانیہ تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔"
"میں شروع سے ہی پاگل ہوں تم مجھے چھوڑو اور بتاؤ جو میں پوچھ رہی ہوں۔"
"کیا بتاؤں؟"
"یہی کہ کون ہے وہ لڑکی۔"
"کیوں تاکہ تم جا کر اسے میری برائیاں بتا دو اور وہ بھاگ جائے۔"
"اس کا مطلب ہے میرا قیاس صحیح نکلا۔"
"تو اس میں تیر چلاتی ہو پاگل جو ٹھہری۔"
"چلو شکر ہے اس میں تیری سی مگر لگا تو نشانے پر ہے نا۔" اس بار وہ پھر مسکرا دیا۔
"چلو بتاؤ شاباش کون ہے وہ؟"
"کیوں بتاؤں؟ تم تو مجھ سے ناراض تھیں۔"
"اب ناراض نہیں ہوں پلیز بتاؤ۔"
"بتاؤں گا مگر ابھی نہیں ابھی تم اٹھو اور اپنے کمرے میں جاؤ یونہی کوئی جاگ گیا تو مسئلہ ہو جائے گا۔"
"نہال تم مجھ سے بھاگ کیوں رہے ہو؟"
"تم سے نہیں بھاگ سکتا میں پاگل! بے فکر رہو۔ چلو اب اٹھو شاباش۔"
اس بار اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر اسے اس کے بیڈ روم کے سامنے پہنچا کر واپس پلٹ گیا۔
ہانیہ بددل سی کمرے میں واپس آئی تو میکال نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اسے کبھی بھی یہ احساس دلانا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بیڈ سے اترتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور تب سے اب تک وہ جاگ کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تاہم دل کے اندر کہیں اعتبار کا ایک چراغ ضرور بجھ گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

"ہانیہ۔" وہ اپنی وارڈ روب سیٹ کر رہی تھی جب گھر کے اندر داخل ہوتے ہی نہال نے اسے پکارا۔ مسز حسن جو کچن میں تھیں فوراً باہر نکل آئیں۔
"ہر وقت ہانیہ...... ہانیہ کو کبھی اپنے ساتھ بھی وقت گزار لینے دیا کرو۔"
"اپنے ساتھ ہی وقت گزارتی ہے مما میں نے تو اس کی کمپنی میں بیٹھنا بہت کم کر دیا ہے۔"
"اچھی بات ہے۔ سارا کا فون آیا تھا گھر آنا چاہ رہی ہے۔ تمہیں اگر فرصت ہو تو اسے لے آؤ جا کر۔"
"میں نہیں جا سکتا مما سوری......"
"کیوں تم کیوں نہیں جا سکتے؟"
"بس دل نہیں چاہ رہا۔"
"سدھر جاؤ نہال چھوڑو وہ بچپنا تمہارے پاپا کو تم سے بڑی توقعات ہیں۔"
"پورا اتر تو رہا ہوں ان کی توقعات پر مما اور کیا کروں؟"
"دلچسپی لو گھر میں اور کاروبار میں بھی۔ سمیر (صبا کا بھائی) نے سارا کے لیے پرپوزل دیا ہے۔ تمہارے پاپا اس بات کو لے کر بہت خوش ہیں۔ صبا اور کمال بھی خوش ہیں صبا نے تو باقاعدہ تیاری بھی شروع کر دی ہے شادی کی۔"
"تو یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟"
"اس لیے کیونکہ تمہارے پاپا مائزہ کے ساتھ تمہارا رشتہ طے کرنا چاہ رہے ہیں۔"
"واٹ......" اسے جیسے شاک لگا تھا۔
"ہاں...... صبا اور کمال کی بھی یہی خواہش ہے بلکہ کمال بتا رہا تھا کہ خود صبا نے ہی اس خواہش کا اظہار کیا ہے سارا کو بھابی بنانے کے ساتھ ساتھ وہ تمہیں بھی اپنے بہنوئی کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے۔"
"مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔ کیا نہیں میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں کسی بھی قیمت پر مائزہ کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔" اس کے تو جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی تبھی میکال نے قدم وہاں رکھے تھے۔
"کیوں......؟" نہال چونکا اور اس نے بے ساختہ مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔
"کیونکہ میں اسے As a life patner پسند نہیں کرتا۔ میرے نزدیک سارا اور مائزہ میں کوئی فرق نہیں۔"
"یہ کوئی وجہ نہیں ہے۔"
"یہی وجہ ہے اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں۔" میکال سے نظریں چراتا وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔
"میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا آخر اس لڑکے کو ہو کیا گیا ہے ہر بات میں ضد کرنے لگا ہے۔" مسز حسن اب پریشانی سے میکال کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ کوٹ صوفے پر پھینکتے ہوئے خود بھی وہیں ٹک گیا۔
"آپ پریشان نہ ہوں ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"ان شاءاللہ...... تم سناؤ تمہارا ہنی مون ٹرپ فائنل ہو گیا؟"
"جی مما میں نے ٹکٹ کے لیے اپلائی کر دیا ہے۔ ان شاءاللہ

دو چار روز میں تیاری کر لیں گے۔"
"چلو اچھی بات ہے میں چاہتی ہوں تم اور ہانیہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سے سمجھ لو۔"
"ان شاءاللہ ایسا ہی ہوگا مما آپ فکر نہ کریں۔" وہ مسکرایا تو جواب میں مسز حسن نے اسے ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالیں۔
ٹھیک تین روز کے بعد وہ اور ہانیہ اپنے ہنی مون کے ٹرپ کے لیے مری پہنچ گئے اور یہی وہ لمحہ تھا جب دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے دل میں اپنے لیے محل تعمیر کیے تھے ہانیہ کی زندگی میں وہ واحد دور تھا جو اس نے بے حد انجوائے کیا تھا۔ میکال کے لیے وہ جیسے کانچ کی گڑیا تھی اور وہ اس کی ہر خوشی کا خیال رکھتا جیسے اس پر فرض تھا صبح آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے وہ ہانیہ کو دیکھتا۔ پھر جھک کر اس کی آنکھیں چومتا تب کہیں جا کر اس کی آنکھیں کھلتی تھیں۔ انہی دنوں میں اس نے جانا تھا کہ ہانیہ بھی اس سے بے پناہ محبت کرتی ہے اس شام وہ دونوں مال روڈ کی رونقیں دیکھنے کے لیے نکلے تھے مگر واپسی پر تیز بارش نے ان کے لیے مشکلات پیدا کر دی تھیں۔
ہانیہ تھکن سے چور ہوٹل میں اپنے کمرے میں واپس آئی تو رات کے دس بج رہے تھے۔ میکال نے اپنے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد فوراً اس کے کپڑے بھی تبدیل کروائے مگر ہانیہ کی حرارت کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میکال کو اس پر بے حد ترس آیا۔
"چلو تم لیٹو بستر میں۔"
اس کا ابھی مزید آؤٹنگ کا پروگرام تھا مگر ہانیہ کا حال دیکھنے کے بعد اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا وہ بستر میں گھسی تو میکال نے اچھی طرح سے کمبل اس کے اوپر سیٹ کر دیا مگر کافی دیر کے بعد بھی وہ کپکپا رہی تھی تب مجبوراً اسے بھی ساتھ لیٹنا پڑا کمبل میں گھس کر اپنے پاؤں سے اس کے پاؤں رگڑتے ہوئے اسے راحت پہنچانے کی کوشش کی تھی۔
"ہانیہ۔"
"جی۔"
"خوش ہو ناں؟"
"بہت۔"
"کوئی شکوہ کوئی شکایت؟"
"نہیں۔"
"اب تو چھوڑ کر نہیں جاؤ گی نا؟"
"سوچوں گی۔" شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے اس نے اسے چھیڑا تو جواب میں میکال نے اسے خود میں سمو لیا۔
"جان لے لوں گا اگر ایسا کچھ سوچا بھی تو۔"
"اور اگر آپ نے بے وفائی کی تو؟"
"تو تم میری جان لے لینا۔ دل تو پہلے ہی قبضے میں کیا ہوا ہے۔"
"غلط...... آپ کا دل تو عائشہ کے پاس ہے۔"
"نہیں ہانی! ایسی بات نہیں ہے یہ ٹھیک ہے کہ میں نے عائشہ سے محبت کی ہے مگر وہ محبت صرف ایک وقت کے لیے تھی وہ تھی تمہاری بددعا کے بعد اس محبت نے اپنا روپ بدل لیا۔ اب تو آنکھ کھلتے ہی تمہارا چہرہ نظر آتا ہے تو جان پر بن جاتی ہے یہی ڈر رہتا ہے کہ کہیں کسی بات پر ناراض ہو کر چھوڑ نہ جاؤ۔"
اس کے دونوں ہاتھ ہاتھوں میں لے کر وہ کہہ رہا تھا اور ہانیہ کے اندر جیسے سکون اترتا چلا جا رہا تھا۔
"سچ کہتا ہوں ہانیہ میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے جس لڑکی سے زبردستی نکاح پر میں نے حشر اٹھا دیا تھا اب اسی لڑکی میں مجھے عائشہ کا چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ سارے خواب جو میں نے اس لڑکی کی رفاقت سے جوڑ رکھے تھے ان خوابوں کی تعبیر تمہاری رفاقت دے رہی ہے۔ زندگی میں پہلی بار میں خود کو بہت پرفیکٹ محسوس کر رہا ہوں۔"
"اتنی بھی نہ چھوڑیں۔ میرے ہاتھ درد کرنے لگے ہیں پلیز چھوڑیے۔"
"تمہیں میرے جذبے جھوٹے لگ رہے ہیں۔" کہنی بیڈ پر ٹکاتے ہوئے اس نے ہانیہ کو گھور کر دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

❁ ❁ ❁

اگلے ہفتے ان کی مری سے واپسی ہوئی تھی۔ حسن صاحب اور مسز حسن نے سمیر کی خواہش پر اپنی بیٹی سارا کا رشتہ اس کے ساتھ طے کر دیا تھا تاہم نہال اب بھی اڑیل گھوڑے کی طرح اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ دونوں ہی بہت پریشان تھے۔ روز بروز اس کی صحت بھی گرتی جا رہی تھی ادھر مائزہ کا حال برا تھا پہلے میکال نے اسے ٹھکرا کر اس کی عزت نفس کو مجروح کیا تھا اور اب نہال اسے ٹھکرا کر اس کی بے عزتی کر رہا تھا گیلی لکڑی کی مانند وہ اندر ہی اندر سے سلگ اٹھی تھی تاہم زبان سے اس نے کچھ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا وہ اور سائرہ صرف ایک ہفتے کے لیے گھر آئی تھیں اور پھر چلی گئیں۔
زندگی پھر سے اپنے معمول پر آ گئی تھی ہانیہ کو ہر طرف صرف میکال ہی میکال دکھائی دیتا تھا وہ اس کے سارے کام اپنے ہاتھ سے کر کے خوشی محسوس کرتی تھی رات گئے تک دونوں جاگ کر اپنے ہونے والے بچے کے متعلق مختلف پلان بناتے رہتے۔ اکثر

آفس سے واپسی کے بعد وہ اسے گھمانے لے جاتا کبھی دونوں شاپنگ پر چلے جاتے۔ نہال کی ذات کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ چاہتا بھی تو زبردستی ہانیہ کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرواسکتا تھا اسی لیے اس نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کرلیا تھا۔

اگلے تین ماہ اسی طرح گزر گئے تھے۔ سارا اور مائرہ کے فائنل ایگزام بھی ہوچکے تھے لہٰذا وہ دونوں ہوسٹل سے گھر آگئیں۔ اس روز بارش ہورہی تھی۔ سنڈے کی چھٹی کے باعث میکال بھی گھر پر ہی تھا اور اپنے رت جگے کی نیند پوری کر رہا تھا بارش نے زور پکڑا تو ہانیہ کو جیسے ہوش آگیا۔ وہ فوراً کمرے میں آئی اور میکال کا کمبل کھینچ دیا۔

"میکال اٹھو۔"

"کیوں خیریت؟" وہ کسمسایا تھا ہانیہ نے اس کا بازو پکڑ کر زبردستی بیڈ پر بٹھادیا۔

"ہوں خیریت ہی ہے باہر دیکھو کتنی تیز بارش ہورہی ہے چلو مل کر نہاتے ہیں۔"

"نہیں تم نہاؤ میرا موڈ نہیں ہے۔"

"ایسی کی تیسی تمہارے موڈ کی اٹھو......"

اجنبیت کی ساری دیواریں گرچکی تھیں۔ میکال کو ناچار بستر چھوڑنا پڑا۔ سرسبز لان میں بارش اب زور پکڑ چکی تھی مگر وہ ہانیہ کے ساتھ بھیگتا رہا اور اپنے کمرے کے ٹیرس پر کھڑا نہال دیر تک ان دونوں کو بارش میں بھیگتے ہوئے دیکھتا رہا۔

❁......❁......❁

اگلی صبح ہانیہ کی آنکھ کھلی تو خاصی دیر ہوچکی تھی۔ میکال ابھی تک مزے سے بستر میں دبکا سو رہا تھا ہانیہ بال سمیٹ کر جونہی بیڈ سے اترنے لگی اس نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

"کہاں جارہی ہو؟"

"کچن میں ناشتہ دیکھو ذرا۔"

"کوئی ماروناشتہ تو مجھے نہیں چاہیے۔"

"میکال تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو؟"

"پاگل ہی ہوں۔"

"ابھی آنٹی آگئیں ناں تو سارا پاگل پن بھگادیں گی۔" زبردستی ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ بیڈ سے اتر آئی۔

"اچھا بات سنو۔"

اسے پکارتے ہوئے وہ خود بھی بیڈ سے اتر آیا تھا پھر وارڈ روب کھول کر اس میں سے گرے کلر کا شلوار سوٹ نکالا جو عائشہ نے اسے گفٹ کیا تھا اور اسے بے حد عزیز تھا تاہم اب تک اس نے وہ سوٹ استعمال نہیں کیا تھا۔

"یہ لو پلیز اسے ابھی پریس کردو بہت امپورٹنٹ میٹنگ ہے آج سمجھو پاپا کی نظر میں تمہارے شوہر نامدار کے سرخرو ہونے کا بہت سنہری چانس ہے۔ میں تب تک باتھ لے لوں۔"

پیار سے اس کا گال تھپتھپا کر کہتے ہوئے اس نے اپنا ڈریس اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا ہانیہ نے بال کیچر کرتے ہوئے استری کا سوئچ آن کردیا۔ جلدی جلدی ہاتھ چلاتے ہوئے ابھی اس نے شلوار پریس کی تھی کہ مائرہ دروازے پر دستک دے کر اندر چلی آئی۔

"ہانیہ بھابی آپ کو آنٹی بلارہی ہیں نادیہ آپی کا فون آیا ہے۔ ایمرجنسی ہے۔"

"اچھا میں یہ شرٹ پریس کرلوں پھر آتی ہوں۔"

"شرٹ آکر پریس کرلیجیے گا وہ ہولڈ پر ہیں۔"

رونے کے لہجے میں کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی تھی ہانیہ نے استری اسٹینڈ پر کھڑی کی اور کمرے سے نکل آئی۔ مائرہ نے جیسے ہی اسے کمرے سے نکلتے دیکھا لپک کر اندر گئی اور اسٹینڈ پر کھڑی استری اٹھا کر شرٹ پر رکھ دی۔ میکال باتھ لے کر نکلا تو شرٹ سے دھواں نکل رہا تھا۔ تبھی مائرہ بھی دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"او میرے خدایا...... یہ کیا ہوا ہانیہ بھابی کہاں ہیں؟" لپک کر شرٹ اٹھاتے ہوئے اس نے میکال کو دیکھا جو ساکت کھڑا تھا۔

"او ہو یاد آیا وہ تو نہال کو ناشتہ کروارہی ہیں۔ مگر یہ شرٹ تو پریس کرجاتیں۔" شرٹ میں ہوئے سوراخ کو تاسف بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے پھر میکال کو دیکھا تھا جس کا چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ ہورہا تھا۔ ہانیہ کمرے میں آئی تو مائرہ کے ہاتھ میں جلی ہوئی شرٹ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

"یہ...... یہ کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے جل گئی ہے شرٹ افسوس ہے بھابی عجلت میں آپ کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ استری اسٹینڈ پر ہی کھڑی کرجاتیں۔"

"میں نے تو اسٹینڈ پر ہی کھڑی کی تھی۔"

مائرہ کے ہاتھ سے شرٹ لیتے ہوئے اس نے پریشان نگاہوں سے میکال کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں اور چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ ہورہا تھا۔

"اٹس او کے میں کوئی دوسرا سوٹ پہن لوں گا۔ تم ٹینشن نہ لو۔"

نرمی سے ہانیہ کے گال تھپتھپاتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا تھا مائرہ جل بھن کر رہ گئی جبکہ ہانیہ کا شاک کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ میکال کی چپ اور ہانیہ کی شرمندگی ختم ہونے میں چند دن لگے تھے اس روز موسم پھر بے حد حسین تھا۔ سنڈے کی چھٹی کے باعث میکال دیر تک پڑا سوتا رہا۔ بارش شروع ہوئی

ہانیہ اسے اٹھانے کے لیے آ گئی مگر اس بار وہ ٹس سے مس نہ ہوا تب اسے زور کا مکا رسید کر کے وہ پیچھے ہٹ گئی۔ نہال لان میں بیٹھا تھا وہ اسی طرف چلی آئی۔ میکال کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اچھی خاصی ٹھنڈ تھی۔ وہ ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ مائرہ گرما گرم پکوڑے اور چٹنی لے کر کمرے میں چلی آئی۔

"یہ لیں میکال بھائی پکوڑے اتنا پیارا موسم ہو رہا ہے اور آپ سو رہے ہیں۔"

"پیارے موسم میں ہی سونے کا مزہ آتا ہے خیر، ہانیہ کہاں ہے؟"

"ہانیہ بھابی تو نیچے نہال بھائی کے ساتھ بارش انجوائے کر رہی ہیں۔"

ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا تھا کہ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

"مائنڈ مت کیجیے گا میکال بھائی مگر آپ نے ہانیہ بھابی کو کچھ زیادہ ہی آزادی دے رکھی ہے اب روز آدھی رات کو اٹھ کر جوان دیور کے کمرے میں جانے کیا تک بنتی ہے بھلا؟ ٹھیک ہے وہ نہال بھائی کی دوست ہیں مگر دوست ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ اسے شوہر کے برابر لے آئیں جبکہ آپ کو یہ بھی پتا ہو کہ آپ کا دیور آپ سے پیار کرتا ہے اور صرف آپ کی وجہ سے وہ کہیں اور شادی بھی نہیں کرتا۔"

"اسٹاپ اٹ مائرہ...... میں ہانیہ کے بارے میں ایسی فضول گوئی پسند نہیں کرتا۔" وہ تپا تھا مگر مائرہ باز نہیں آئی۔

"جانتی ہوں مگر میں آپ کی دشمن نہیں ہوں میکال بھائی جو بے پرکی اڑا کر آپ کا دماغ خراب کروں گی۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ آپ مجھے بہت عزیز ہیں۔ عائشہ جی کے بعد جس طرح سے آپ نے خود کو سنبھالا ہے میں جانتی ہوں اسی لیے میں نہیں چاہتی کہ دوبارہ کوئی آپ کو ویسی ہی چوٹ پہنچائے۔ میں ہانیہ بھابی اور نہال بھائی میں سے کسی پر بھی بہتان نہیں لگا رہی۔ مگر دو نامحرم رشتوں کے مابین تیسرا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے اگر آپ نے اس بات کو سیریس نہ لیا تو نقصان اٹھا سکتے ہیں۔"

وارننگ دیتے ہوئے وہ فوراً کمرے سے نکل گئی تھی۔ پیچھے میکال کے بدن میں جیسے کسی نے آگ بھر دی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بہت کچھ سہہ سکتے تھے مگر شیئر نہیں کر سکتے تبھی بیڈ سے اٹھ کر لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں آیا تھا۔ سامنے ہانیہ اور نہال ایک دوسرے کو تنگ کر رہے تھے۔ نہال نے ہانیہ کو پکڑ رکھا تھا جبکہ اس کے کپڑے اس کے جسم سے چپک کر اس کی نسوانیت کو خوب واضح کر رہے تھے۔ اگر وہ لڑکی اس کی محبت اور اعتماد سے فائدہ اٹھا رہی تھی تو بہت غلط کر رہی تھی۔ رات تک اس کا موڈ بگڑ چکا تھا۔ رات کا کھانا بھی اس نے بے دلی سے کھایا تھا۔ کھانے کے بعد وہ دوست کی طرف نکل گیا۔ موسم ہنوز خراب تھا ہانیہ اس کے خراب موڈ کو محسوس کرنے کے باوجود دیر تک جاگ کر اس کا انتظار کرتی رہی۔ ساڑھے بارہ کے قریب کہیں وہ گھر آیا تو وہ جاگ رہی تھی۔ کمرے میں آنے کے بعد وہ سیدھا واش روم میں گھس گیا۔ نہا کر فریش ہونے کے بعد بیڈ پہ آیا تو ہانیہ کو اپنا منتظر پایا۔

"کہاں گئے تھے...... وہ بھی اتنی رات کو اتنے خراب موسم میں؟"

"دوست کی طرف گیا تھا ایمرجنسی کال آ گئی تھی۔"

"خیریت؟"

"ہوں ایک کمرشل تیار کر رہا ہے مجھے کہہ رہا تھا ماڈلنگ کے لیے۔"

"پھر......؟"

"کچھ نہیں میں نے کہہ دیا سوچ کر بتاؤں گا۔" تروخے لہجے میں کہنے کے بعد وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ ہانیہ بھچکی رہ گئی۔

"میکال آپ۔"

"سو جاؤ ہانیہ پلیز...... میرے سر میں درد ہو رہا ہے میں اس وقت گپ نہیں لگا سکتا۔" اس بار اس کے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔

وہ چپ چاپ لائٹ آف کر کے لیٹ گئی۔

اگلے روز اس کی آنکھ کھلنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر فریش ہو چکا تھا ہانیہ کی آنکھ کھٹکے کی آواز پر کھلی۔ دیکھا تو سامنے وہ ڈریسنگ کے آگے کھڑا آفس کے لیے تیار ہو رہا تھا وہ لپک کر قریب آئی۔

"آج اتنی جلدی بیدار ہو گئے مجھے جگایا بھی نہیں۔"

"ضرورت نہیں تھی۔"

"کیوں پتا ہے نا روز میں آپ کی ہیلپ کرتی ہوں تیار ہونے میں۔" وہ ناراض ہوئی تھی مگر وہ چپ رہا۔

"یہ لیں آج آپ نے یہ والی ٹائی لگانی ہے۔ میں منتخب کر کے لائی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے...... میں لے لوں گا۔"

"میکال۔" ٹھٹک کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ اس کے سامنے آ گئی۔

"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"

"نہیں۔"

"نہیں تو ٹھیک سے بات کیوں نہیں کر رہے؟"

"کیا بات کروں...... ہوں؟" وہ پھر چڑا تو ہانیہ کی آنکھیں

بھیگ گئیں۔

"میں جانتی ہوں آپ مجھ سے ناراض ہیں مگر میں یہ نہیں جانتی کہ آپ کیوں ناراض ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھے معاف کر دیں پلیز۔"

"ہانیہ جب ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں تو کیوں تم بے کار میں اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہی ہو؟"

"گولی ماریں وقت کو...... مجھے نہیں پتا بس...... میرے ساتھ موڈ ٹھیک کریں...... میں آپ کی ناراضی برداشت نہیں کر سکتی۔" پلکوں سے آنسو ٹپکاتے وہ میکال کے سینے سے سر ٹکا گئی تھی۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔

"پاگل تو نہیں ہو تم؟"

"پاگل ہی ہوں۔" بھرائے لہجے میں اس نے کہا اور میکال کی ساری ناراضی جیسے اڑن چھو ہو گئی۔ اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے وہ سب کچھ بھول گیا تھا آنے والے دنوں میں پھر کئی بار چھوٹی چھوٹی باتوں پر دونوں کا جھگڑا ہو جاتا اور پھر مان جاتے تھے۔ نہال کی صحت گرتی جا رہی تھی مگر سب ہی جیسے اس سے غافل بیٹھے تھے۔

اس روز مائرہ کچن میں ہانیہ کے ساتھ مدد کروا رہی تھی مسز حسن مارکیٹ گئے ہوئے تھے۔ تبھی میدان صاف پا کر اس نے ... کرنا مناسب سمجھا تھا۔

"ہانیہ بھابی کیا آپ نے ابھی تک میکال بھائی کو دل سے معاف نہیں کیا؟"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں...... کیوں؟"

"مجھے ایسا لگا ہے جیسے آپ دونوں کے درمیان کچھ اختلاف ہے پھر میکال بھائی کی سرگرمیاں بھی کچھ اچھی نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟" دل کے نیچے چٹکی ہو کر رکتی وہ ٹھٹکی۔

"مطلب میری فرینڈ بتا رہی تھی وہ آج کل ایک ماڈل علیزہ کو بہت ٹائم دے رہے ہیں۔ اکثر آفس سے اٹھ کر اسے گھمانے اور شاپنگ کروانے لے جاتے ہیں کبھی کبھار وہ آفس میں چلی آتی ہے میری فرینڈ چونکہ میکال بھائی کے آفس میں کام کرتی ہے اس لیے اس کی گہری نظر ہوتی ہے ہر سرگرمی پر آپ کو بھی اپنے شوہر پر نظر رکھنی چاہیے۔ مرد اس قابل نہیں ہوتے کہ ان پر اندھا یقین کیا جا سکے۔"

"ٹھیک کہتی ہو تم مگر میکال ایسے نہیں ہیں مجھے ان کی مصروفیات کا بھی پتا ہے اور علیزہ کا بھی...... تم ٹینشن نہ لو۔"

تھکی تھکی انداز میں کہتے ہوئے اس نے مائرہ کو تو مایوس کر دیا تھا مگر اس کے اپنے اندر بے چینی بڑھ گئی تھی۔ میکال اس رات بہت دیر سے گھر واپس آیا تھا۔ ہانیہ رخ موڑے بے نیازی سے سوئی رہی۔ اگلے روز مائرہ کے اصرار پر مائرہ کے ساتھ ہی وہ مارکیٹ آئی تھی اور اتفاق سے جس ریسٹوران میں وہ کھانے کے لیے آئی میکال ماڈل علیزہ کے ساتھ وہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ مائرہ نے اس کی توجہ اس کی طرف مبذول کروائی تھی۔ ہانیہ کو لگا جیسے اس کے

قدم من من کے ہو گئے ہوں۔ صبح اس نے کہا تھا کہ آج سارا دن وہ بہت مصروف رہے گا۔ سر کھجانے کا بھی ٹائم نہیں ہوگا مگر وہ مصروفیات کیا تھیں یہ اسے اب پتا لگا تھا۔
اس رات پھر میکال کی گھر واپسی بہت لیٹ ہوئی تھی۔ ہانیہ کا دل جل کر راکھ ہو رہا تھا۔ اسے نہ نیند آ رہی تھی نہ قرار۔ میکال بھی چپ چاپ سو گیا تھا۔ اسے جیسے ہانیہ کے جلدی سو جانے سے کوئی فرق ہی نہیں پڑ رہا تھا۔ صبح بھی اٹھتے ہی آفس بھاگنے کی کرتا تھا۔ جانے وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ سوچ سوچ کر ہانیہ کی شریانیں جیسے پھٹنے لگی تھیں۔ اگلے روز میکال کے آفس جانے کے بعد وہ نہال کے کمرے میں آ گئی تھی۔ مقصد اس کی لائبریری سے اپنی پسند کی کچھ بہترین کتابیں لینا تھا اور وہ یہی کر رہی تھی کہ جب کتابوں کی ریک کے درمیان ایک کتاب میں اس کی نظر کچھ ٹیسٹ کاغذات پر جا پڑی۔ فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے کتاب سے وہ کاغذات باہر نکالے تھے جن کے اوپر بڑے حروف میں "شوکت خانم میموریل اسپتال" کا نام درج تھا۔ اس کے ہاتھ جیسے کپکپا اٹھے۔ تیزی سے نظریں نچلے حروف پر دوڑائیں تو وجود جیسے ہوا میں معلق ہوتا گیا۔ بروقت وہ اگر قریب پڑی کرسی کو تھام نہ لیتی تو اس کا گر جانا یقینی تھا۔

❀...❀...❀

"پاپا.....!"
زائر حویلی کی دہلیز پار کر رہا تھا جب اس کی ننھی کلی کی صدا نے اس کے قدم جیسے زمین سے باندھ کر رکھ دیے۔ قطعی شاکڈ انداز میں وہ پلٹا تھا۔ جب وہ ننھی کلی دوڑتے ہوئے اس کے کشادہ سینے سے آ لگی۔ زائر کو لگا جیسے وہ پتھر کا ہو کر رہ گیا ہو۔
"آپ میرے پاپا ہیں نا؟" اگلے ہی پل وہ اس کے سینے سے سر اٹھائے پوچھ رہی تھی۔
زائر کا سر آپ ہی آپ اثبات میں ہل گیا۔ جبکہ اس کی آنکھوں کے گوشے بھی نم ہو گئے تھے بچی اس کے اقرار پر بے حد خوش ہوئی تھی پھر بنا کچھ کہے دوڑ کر اپنے بھائی کو بھی بلا لائی۔
"چاند دیکھو ہمارے پاپا مل گئے۔ میں نے کہا تھا نا یہی ہمارے پاپا ہیں۔" خوشی سے بے حال وہ اپنے بھائی کو بتا رہی تھی مگر وہ بچہ گم صم زائر کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے قریب آنے سے ہچکچا رہا تھا۔ تب زائر نے ہاتھ بڑھا کر دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس کا دل اس لمحے جیسے پھٹنے کو تیار تھا۔
"آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں ہی آپ کا پاپا ہوں گڑیا؟" بچوں کو خوب چومنے کے بعد جب اس کا دل معمول پہ آیا تو اس نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔ جواباً وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔
"اس روز جب چاند درخت سے گرا تھا اور اسے چوٹ لگی تھی تو آپ ہی اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تھے۔ جبکہ مما نے آپ کو ڈانٹا بھی تھا بعد میں اشعر انکل نے مما سے آپ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے انکل کو بتا دیا کہ آپ ہی ہمارے پاپا ہیں۔ مما کو اپنے غصے میں یاد نہیں رہا کہ میں بھی پاس ہی کھڑی ہوں ورنہ شاید وہ یہ بات کبھی نہ کرتیں۔ مما اور انکل بھی اچھے نہیں ہیں پاپا۔ وہ ہمیں آپ سے دور کرنا چاہتی ہیں۔" بچی نے ساری بات صاف صاف بتا دی تھی۔
زائر کا دل سینے میں مچل اٹھا۔
"نہیں.....اب مما ایسا کبھی نہیں کر سکے گی گڑیا.....اللہ کے سوا اب دنیا کی کوئی طاقت آپ کو آپ کے پاپا سے دور نہیں کر سکتی۔ چلو میرے ساتھ۔"
"کہاں؟"
"پاپا کے گھر..... جہاں آپ کو بہت زیادہ پیار کرنے والی آپ کی دادو ہیں۔ دادا ہیں اور بھی بہت لوگ ہیں۔"
"اور مما؟"
"مما کو ابھی ہم کچھ نہیں بتائیں گے۔" تائیدی انداز میں اس نے بچوں کی طرف دیکھا تھا۔
اس کی بیٹی نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ تاہم اس کا بیٹا اب بھی خاموش تھا۔
"کیا ہوا چاند..... کیا تم پاپا کے ساتھ جانا نہیں چاہتے؟"
"نہیں..... میں مما کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔"
"تو ٹھیک ہے پھر میں پاپا کے ساتھ جا رہی ہوں تم رہو یہیں ماما کے ساتھ جن کے پاس ہمارے ساتھ گزارنے کے لیے تھوڑا سا ٹائم بھی نہیں ہے۔" گڑیا اس کی پوری پوری سائیڈ لے رہی تھی۔ چاند تھوڑی دیر کی کشمکش کے بعد راضی ہو گیا۔
ثانیہ اشعر حسین کے ساتھ شہر سے واپس لوٹی تو تھکن سے برا حال تھا۔ خود اشعر بھی بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ تبھی فریش ہو کر سونے چلا گیا۔ ثانیہ فریش ہو کر آئی تو چوہدرانی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ وہیں ان کے قریب بیٹھ گئی۔
"بچوں نے زیادہ تنگ تو نہیں کیا آپ کو؟" چوہدرانی کے سلام پھیرنے پر اس نے پوچھا تھا۔
"نہیں..... آج تو دونوں کمرے سے ہی نہیں نکلے۔"
"اچھی بات ہے..... میں خود بھی سارے راستے یہ دعائیں کرتی آئی تھی کہ وہ اپنے کمرے سے نہ نکلیں۔" چہرے پہ مسکان سجائے اس نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔
"گھر مل گیا شہر میں؟"

"جی دادو بہت اچھا گھر مل گیا ہے۔ آفس بھی قریب ہے اور بچوں کا اسکول بھی اب بچوں کے ساتھ مجھے اور اشعر کو بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا آنے جانے میں۔"
"چلو اچھی بات ہے ویسے اشعر میاں کے کیا ارادے ہیں؟ میرا مطلب ہے بنا نکاح کے وہ تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں کیسے رہے گا؟"
"اوہ کم آن دادو..... جس ملک سے میں آئی ہوں وہاں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ویسے بھی میں اور اشعر بہت جلد نکاح کرنے والے ہیں۔" تنک کر کہتی وہ فوراً اٹھ گئی تھی۔
کچن میں کھانا تیار رکھا تھا۔ کھانے کی ٹرے اٹھا کر وہ بچوں کے کمرے میں آئی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ ثانیہ کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔
"چاند..... گڑیا....." بدحواس ہو کر وہ واش روم کی طرف بھاگی مگر..... وہاں نہیں تھے۔ ثانیہ کو لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔
"کیا ہوا ثانیہ؟" چوہدرانی اس کی پکار پر کمرے میں جاتے جاتے رک گئی تھیں۔ ثانیہ لپک کر ان کے قریب آ گئی۔
"دادو چاند اور گڑیا کمرے میں نہیں ہیں۔" اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
"کیا..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ بھی پریشان ہو گئی تھیں تبھی لپک کر بچوں کے کمرے کی طرف گئیں مگر واقعی وہ دونوں کمرے میں نہیں تھے۔
"کہاں جا سکتے ہیں یہ دونوں؟"
"میں جانتی ہوں وہ کہاں گئے ہوں گے۔" سلگتی نگاہوں سے سوچتے ہوئے وہ مڑی اور پھر شال لے کر پیچھے چلی آئی۔
"کہاں جا رہی ہو اس وقت؟"
"ابھی آتی ہوں دادو..... آپ پریشان نہ ہوں۔"
کہتی وہ فوراً حویلی سے نکل گئی تھی۔ گاڑی پاس تھی زائر کی حویلی تک پہنچنے میں اسے زیادہ ٹائم نہیں لگا تھا۔
بچوں کے ساتھ کھلے آسمان کے چھت پر لیٹنا نہیں کہانی ... دونوں بچے یہاں آ کر بے حد خوش تھے۔ کہانی سنتے سنتے ... آنکھ لگ گئی زائر کو پتا ہی نہیں چلا۔ دستک کی آواز ... پھر آہستہ سے اپنا بازو چاند کے سر کے نیچے سے نکالتے ... سیڑھیاں اتر آیا۔
"... دروازے کی کنڈی کو ہاتھ لگاتے ہوئے اس نے پوچھا ... سمجھا تھا۔
"دروازہ کھولو۔" باہر سے دھاڑتی ہوئی آواز بلاشک وشبہ ثانیہ عباس کی ہی تھی۔

❀...❀...❀

پلٹ کر دیکھنا چاہا ہوں
تو نفرت سے ادھر جاتاں
دنوں کی راکھ پر راتوں کی شکستہ ہتھیلی پر
ہوا کے ناچتے گرداب کی تہوں میں کہیں
بجھا ہوا کوئی لمحہ کسی چراغ کی طرح
کہ میں بھی زندہ ہوں اپنے ہجر دل کی طرح
اجاڑ دل کہ جہاں آج بھی تمہارے بغیر
ہر ایک رات بکھر آئی آرزو کی مہک
ہر ایک صبح کھلتی ہے کہیں زخم زخم
اجاڑ دل کہ جہاں آج بھی تمہارے بغیر
ہر ایک پل میری آنکھوں میں دھل کے ڈھلتا ہے
سلگتی رات کی تپش سے بدن پگھلتا ہے
اجاڑ دل کہ جہاں ڈوبتا ہوا سورج
ہر ایک شام جدائی کے نام کرتا ہے
پلٹ کے دیکھنا چاہا ہوں تو نفرتوں سے ادھر
بس ایک نام درخشاں ہے ستارے کی مانند
وہ نام حسن پہ مکمل سا لگتا مجھے
نظر پڑے تو سمجھنا کہ تم ہو یاد مجھے

تین دن وہ اس ایک میٹر کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں قید بنا کچھ کھائے پیئے پڑی سسکتی رہی تھی۔ کبھی انسانوں کی چیخوں کبھی کتوں کے بھونکنے کی آوازوں اور کبھی ٹارچر کی ہولناک آوازوں نے ہر پل اس کا چین برباد کیے رکھا تھا۔ تین دن کے بعد اسے ایک میٹر کی اس چھوٹی سی تنگ و تاریک کوٹھڑی سے باہر نکالا گیا تھا۔ آنکھوں پر بندھی پٹی کے ساتھ وہ ایک بڑے سے صاف ستھرے ہال میں لائی گئی تھی جہاں اس کے ساتھ ایک اور مسلمان عورت بھی تھی۔ اس کے ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے۔ کئی فوجی اہلکار اسلحہ تانے ان کے ارد گرد کھڑے تھے۔ ان دونوں کو بندھے ہاتھوں کے ساتھ ایک دوسرے کے پہلو میں بٹھا دیا گیا تھا۔ تبھی اس نے پہلی بار "زیاد عبدالہادی" کو دیکھا تھا۔
بلیک یونیفارم میں ملبوس زرد رنگت اور نقوش کے ساتھ وہ شخص نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت تھا۔ ان دونوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ فوجی افسران کے پوچھے جانے والے تمام سوالوں کے جواب روانی سے دیں گی۔ اگر انہوں نے کسی قسم کے جھوٹ یا لڑکھڑاہٹ کا مظاہرہ کیا تو فوراً ان کے وجود میں آہنی گولیاں اتار

دی جائیں گی۔ حورعین کا سارا بدن جیسے برف میں تبدیل ہوگیا۔

وہ شہادت کی موت کی متمنی تھی مگر اس نے کبھی بھی یہ نہیں چاہا تھا کہ وہ غیر مسلموں کے ہاتھوں مرے۔ موت کے بعد اپنی لاش کی بے حرمتی کا تصور اس کے رونگٹے کھڑے کردیتا تھا۔ تبھی وہ بے چین ہوئی تھی۔ اس کے برابر بیٹھی لڑکی خاصی بے خوف دکھائی دے رہی تھی۔ اسی سے سوالات کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔

"بتاؤ کس دہشت گرد تنظیم سے تعلق ہے تمہارا؟"

"کسی سے نہیں سوائے اللہ اور اس کے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔" بہت ٹھہر کر مدھم لہجے میں اس نے جواب دیا تھا مگر اس کا جواب مکمل ہوتے ہی ایک گولی اس کے پیٹ میں اتار دی گئی۔ وہ گرا دی گئی جبکہ حورعین عبدالسمیع کی چیخ نکل گئی تھی کیا یہی سب اس کے ساتھ بھی ہونے والا تھا؟

"بتاؤ...... کس تنظیم کے لیے کام کرتی ہو تم؟" ایک مرتبہ پھر دھاڑ کر پوچھا گیا تھا اور ایک مرتبہ پھر نورانی چہرے والی اس پاکیزہ سی لڑکی نے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ بہت ہی تحمل سے جواب دیا تھا۔

"اللہ کے لیے۔"

"وحشت۔" جواب مکمل ہوتے ہی ایک اور گولی اس کے وجود میں داغ دی گئی۔ حورعین کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلی اور وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی۔ اگلے روز شام میں اسے ہوش آیا تو وہ بدتر حال میں زمین پر بے ہوش پڑی تھی۔ چھوٹے سے کمرے میں جلتی مدھم سی لائٹ نے اس کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ وہ ابھی اٹھنے کی کوشش کررہی تھی جب ایاد اس کمرے میں چلا آیا۔ شراب کے نشے میں دھت وہ شرٹ کے بٹن کھول رہا تھا اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو......؟"

پنجوں کے بل اس کے سامنے زمین پر بیٹھتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔ نشے سے سرخ ہوتی آنکھوں میں ناچتی ہوس صاف دکھائی دے رہی تھی۔ حورعین کا دل دھڑکنے لگا ایک پل میں اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ مضبوطی سے دوپٹا پکڑتے ہوئے وہ کونے میں سمٹنے لگی تھی۔ ایاد نے آگے بڑھ کر اس کا دوپٹا نوچ لیا۔

"کیا چھپا رہی ہو ہوں...... خریدے ہوئے جسم ہیں یہ ہمارے۔ یہاں جتنی بھی عورتیں ہیں سب کے پیٹ ہم نے اپنی اولادوں سے بھر رکھے ہیں۔ سنا تم نے......؟" وہ ہنسنے کے بعد اس کے بال نوچتے وہ چلایا تھا۔

حورعین چیخ اٹھی۔

"بھی کرسکتے ہو تم...... بے بس مجبور انسان پر سوائے قہر ڈھانے کے اور آتا بھی کیا ہے تمہیں؟"

"چٹاخ۔" اس کی جرأت پر اگلے ہی پل ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا گیا تھا۔

"بے بس...... مجبور......؟ کس بات کی مجبوری کیسی بے بسی۔ منافق ہوگئے ہو تم لوگ خود ایک دوسرے کے دشمن ہو تم امریکی ظالم نہیں ہیں۔ مگر تم لوگوں کے کرتوت ہمیں تم پر خدائی کرنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ چند ٹکوں کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہو تم کچھ بھی۔ کوئی ایمان نہیں تمہارے اندر انتہا پسند متعصب لوگ ہو تم۔ صرف اپنا مفاد چاہنے والے۔" پے در پے تھپڑوں سے اس کا چہرہ سرخ کرتے وہ اس پر چلا رہا تھا۔

"یہی انجام ہونا چاہیے تمہارا بلکہ اس سے بھی بدتر ہمت ہے تو بلاؤ کسی غم خوار کو کہ وہ تمہاری مدد کرے۔ پکارو اپنے خدا کو کہ وہ تمہیں ہمارے چنگل سے نکال لے۔" نشے کی شدت نے اس کی مت مار رکھی تھی۔

حورعین کی چیخیں بلند ہوتی گئیں۔

"اللہ۔"

قطعی بے بسی کے عالم میں سر اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے اس نے اپنے اللہ کو پکارا تھا۔ ایاد کو بے حد لطف آیا۔

"کم آن...... اور پکارو...... کہو اپنے خدا سے کہ وہ تمہاری مدد کرے بھیجے ہم پر عذاب اور نکال لے تم لوگوں کو یہاں سے چلو شاباش پکارو۔"

جیب سے تیز دھاری چاقو نکال کر حورعین کے بازو پر بڑا سا کٹ لگاتے ہوئے وہ مزید ہنسا تھا۔ حورعین کی جان جیسے لبوں پر آگئی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

تیرے فراق کے لمحے شمار کرتے ہوئے
بکھر چلے ہیں تیرا انتظار کرتے ہوئے
تجھے خبر ہی نہیں ہے کہ کوئی ٹوٹ گیا
محبتوں کو بہت پائیدار کرتے ہوئے

کہانیاں اب بدل گئی ہیں
نہ اب وہ آنکھیں کہ جن میں خوابوں کے سارے موسم
گلاب موسم بنے ہوئے تھے
نہ اب وہ شامیں کہ جن میں تیری حسین باتیں
رفیق لگتی تھیں ذہن و دل کو
وہ سارے موسم بدل گئے ہیں
نہ وصل کا کوئی خواب باقی' نہ اب وہ حرف سخن رہا ہے
کہانیاں اب بدل گئی ہیں
تمہارے جانے کے بعد یوں بھی
جو خواب آنکھوں میں چاہتوں کا یقین بن کر ٹھہر گئے تھے
وہ خواب سارے بکھر گئے ہیں
ملال دل میں اتر گئے ہیں
نہ زندگی ہے نہ زندگی میں وصال موسم کی چاہ کوئی
نہ شاعری ہے نہ شاعری میں جو دکھ ہے
اس سے پناہ کوئی
جو سچ تھا اب جھوٹ ہو گیا ہے
جو دن میں سورج بنا ہوا تھا
وہ شب کی تاریک وادیوں میں ہی کھو گیا ہے
کہانیاں اب بدل گئی ہیں

بازو پر لگے کٹ نے حورعین کو تڑپا کر رکھ دیا تھا مگر اس نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

ایاد عبدالحادی اسے تکلیف پہنچانے کے بعد اب ہنس رہا تھا' یوں جیسے اس کے زخموں سے لطف اٹھا رہا ہو۔

"ہاہاہا...... بہت ترس آ رہا ہے مجھے تم پر' چنگی جتنی لڑکی ہو اور عزائم دیکھو امریکہ کے خلاف آواز اٹھانا چاہتی تھیں' ہوں...... کسے دکھانا چاہتی ہو ہماری اصلیت؟ چند کتابیں لکھ کر' اخبارات نکال کر تم نے سمجھ لیا کہ تم ساری دنیا کو ہمارے خلاف کھڑا کر دو گی' کس کو کھڑا کرو گی ہمارے خلاف' مسلم دنیا کو؟ جو ہمارے ابرو کے اشارے پر کچھ بھی کر سکتی ہے' کچھ بھی...... ہم جب چاہیں جس ملک سے چاہیں ڈالروں میں خرید سکتے ہیں تمہیں اور تمہارے ایمان کو...... کہاں چلا جاتا ہے اس وقت تمہارا خدا...... بولو......" وہ ہنس رہا تھا اور حورعین کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں' تبھی اس نے ہاتھ بڑھا کر حورعین کا دوپٹہ کھینچ ڈالا۔

"پکارو اپنے خدا کو کہ تمہیں میرے ہاتھوں سے بچا لے' کہو اپنے غیور مسلمان بھائیوں کو کہ میرا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیں۔" وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا' حورعین کے اندر جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا' وہ بولی تو اس کے لہجے میں جیسے کسی شیر کی دھاڑ تھی' سارا خوف کہیں جا سویا تھا۔

"بزدل ہو تم...... ہم پر تشدد کر کے اذیت دے کر قتل کرنے کے سوا تم اور کر بھی کیا سکتے ہو؟ ہمارے مردوں کی داڑھیاں مونڈ کر انہیں تشدد کا نشانہ بنا کر مار دینے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے تمہیں' مگر ہمارے نزدیک یہ عبرت نہیں بلکہ سعادت و خوش بختی کی موت ہے۔ ہمارا دین ایسی موت کو شہادت کا نام دیتا ہے' ایک مومن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہی یہی ہے کہ اسے شہادت کی موت نصیب ہو' میرا خدا ایسے ہی اپنے بندوں کو آزمائش کی بھٹیوں میں جلا کر کندن بناتا ہے اور انہیں منافقین سے علیحدہ فرما دیتا ہے۔ ہم مصائب سے ٹوٹنے والے نہیں' یہ تمہاری مذہبی روایات کہتی ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دی جانے لگی تو ان کے جانثار ساتھی عین موقع پر انہیں چھوڑ کر فرار ہو گئے' پڑھو اپنی تاریخ کی کتابیں اور دیکھو کہ جب ارض فلسطین پر صلاح الدین ایوبی نے تمہارے بڑوں کو عبرت ناک شکست دی تو تمہارے بڑوں میں سے ایک نے اپنی بہن صلاح الدین ایوبی کے بھائی ملک العادل کو بطور رشوت پیش کر کے مسیحی دنیا کے لیے جان کی امان طلب کی۔ تم ہماری نہیں اپنی فکر کرو ہم اگر تمہارے ہاتھوں مارے گئے تو شہید' زندہ رہے تو غازی...... تم سوچو تمہارا کیا بنے گا۔" لہو رنگ آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں نے ایاد عبدالحادی کو ٹھٹکا دیا تھا۔

"مت اتنا گھمنڈ کرو اپنے ڈالروں پر کیونکہ تمہارے ڈالروں کے عوض اپنی جنت کا سودا کرنے والے مسلمان تو ہو سکتے ہیں مگر اللہ کے بندے نہیں' وہ ہم نہیں ہیں جنہیں تم اپنے ڈالر کی کشش سے خرید سکو' سنا تم نے؟" وہ دھاڑی تھی' تبھی ایاد کا بھاری تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔

"مارو اور مارو...... کتنا ظلم کرو گے' کتنی نسلیں برباد کرو گے مسلمانوں کی' طاقت کے بل بوتے پر کب تک ہماری بے بسی کو کچلو گے تم......؟ تم نہیں جانتے مگر میں جانتی ہوں کہ حاکم اعلیٰ صرف اللہ ہے' وہ چاہے تو سمندر کا سینہ کھول کر ایک پل میں تم سب کو غرقاب کر دے' اللہ کی طاقت کے سامنے تمہاری طاقت مری ہوئی چیونٹی کے پر کے برابر بھی نہیں۔ یہ ظلم و بربریت ہمیں ہمارے ایمان سے پھیر نہیں سکتی' وہ اور لوگ ہیں جن کے ایمان کا سودا تم اپنے ڈالروں سے کرتے ہو' بظاہر مسلمان لیکن ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں' خود اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بدنصیب لوگ ہیں' یہ پرلے درجے کے بدنصیب' جو یہ بھی جانتے ہیں کہ دنیا کی زندگی عارضی ہے' اس عارضی زندگی میں چند سو' چند ہزار ڈالر لے کر تمہاری وفاداری کا دم بھرنے کے بعد اپنے ہی کلمہ گو بھائیوں کو تمہارے سپرد کر کے وہ صرف خسارے کا سودا کر رہے ہیں مگر تم جانتے ہو کہ تمہارے نزدیک ان کی حیثیت' ان کا مقام کیا ہے۔ ہڈی کھانے والے کتے سے بڑھ کر اہمیت نہیں دیتے تم انہیں' شراب کے نشے میں سر عام گالیاں نکالتے ہو مگر وہ ہم نہیں ہیں۔ ہم وہ ہیں جو صحرا کی تپتی ریت میں کھڑے کنٹینرز میں آگ برساتے سورج تلے محبوس' ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر شہادت کی موت کو گلے لگا لیتے ہیں مگر اپنا سر تمہارے سامنے نہیں جھکاتے۔ میں چاہوں تو انہیں پکار سکتی ہوں کیونکہ ان میں اب بھی کوئی صلاح الدین ایوبی' کوئی محمد بن قاسم اور کوئی طارق ابن زیاد ہے' بہت قوت اور طاقت ہے اب بھی ان کے زخمی بازوؤں میں' مگر میں انہیں نہیں پکاروں گی کیونکہ دنیا کے پل صراط پر اپنے زخم زخم وجود کے ساتھ وہ اسلام کے محاذ پر کھڑے اللہ کے دشمنوں سے لڑ رہے ہیں' اس محاذ پر زیادہ ضرورت ہے ان کی' ہماری عزتوں اور جانوں کا خدا محافظ ہے۔" بولتے بولتے اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔

ایاد عبدالحادی کے اندر جیسے آگ بھڑک اٹھی۔ یہ کیسا آئینہ تھا جو وہ اسے دکھا رہی تھی' یہ کیسا طمانچہ تھا جو وہ دھان پان سی لڑکی اتنی بہادری سے اس کے منہ پر رسید کر رہی تھی' مارے غیض و غضب کے وہ سلگ اٹھا تھا' اس رات اس نے حورعین عبدالسمیع پر اتنا تشدد کیا تھا کہ کئی گھنٹوں تک وہ بیرک اس کی چیخوں سے گونجتی رہی تھی۔ اگلے دو دن بعد اسے گوانتانامو بے منتقل کروا کر وہ خود قندھار آ گیا تھا۔ جلتی تپتی' ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان' جہاں قبائلی شمالی اتحاد والوں نے ڈالرز کے عوض انہیں اپنی مکمل جانثاری کا یقین دلاتے ہوئے عرب اور مسلم دنیا کے تقریباً تیس ہزار طالبان کو مذاکرات کا دھوکہ دے کر ان کے چنگل میں پھنسا دیا تھا' اپنے قائدین کے حکم پر ہتھیار پھینک کر خود کو امریکی افواج کے حوالے کرنے والے ان تیس ہزار طالبان میں سے چند عرب طالبان کو شک تھا کہ ان کو مذاکرات کا ڈرامہ رچا کر محفوظ راستہ دینے کا وعدہ کرنے والے ان کے اپنے ضرور ان کے ساتھ دھوکہ کریں گے شاید اسی لیے انہوں نے چھوٹے پسٹل اپنے پاس چھپا لیے تھے پھر جس وقت ان کی بکتر بند گاڑیاں امریکی افواج کے سامنے رکیں اور انہیں ان کے سامنے زمین پر ہاتھ باندھ کر گھٹنوں کے بل بٹھایا گیا' عرب مجاہد خاموش نہ رہ سکے اور اعلان جنگ کر دیا مگر وہاں اس وقت طاقت اور جذبے کے ساتھ ساتھ اسلحہ کی بھی شدید ضرورت تھی جسے وہ اپنے قائدین کے حکم پر امن کے قیام کے لیے پیچھے چھوڑ آئے تھے مگر ہمیشہ کی طرح ایک مرتبہ پھر ان کے ساتھ دھوکہ ہوا تھا۔

ایاد جانتا تھا کہ یہ وہ طالبان نہیں ہیں جنہوں نے اپنے ایمان گروی رکھ کر' معصوم بے گناہ لوگوں کو خودکش حملوں اور بم دھماکوں میں لقمہ اجل بنا کر شہید کرنا اپنا نصیب العین بنا رکھا ہے۔ طالبان کا نام بدنام کر کے جو ملکوں کے امن اور شہریوں کی جان و مال کے لیے عذاب بنے ہوئے تھے وہ جانتا تھا کہ بظاہر طالبان کہلوانے والے ان دہشت گردوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا نہ ہی ہو سکتا تھا کیونکہ جو طالبان ان کے ساتھ لڑ رہے تھے ان کی لڑائی کا صرف ایک ہی مقصد تھا' اسلام کا دفاع......

اسلامی شریعت اور نظام کا قیام اللہ اور اللہ کے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی انہیں غرض نہیں تھی کہ دنیا انہیں کیا سمجھتی ہے انہیں کیا' کوئی اور ان کے نام کو استعمال کرکے انہیں بدنام کررہا ہے یا نہیں۔ انہیں اگر دھن تھی تو صرف یہی کہ اسلام کا دفاع کیسے کرنا ہے' اس مذہب کا دفاع جو ساری دنیا کے لیے امن بھلائی اور رحمت کا مذہب تھا' جس کی تعلیمات سے فائدہ اٹھا کر خود اہل کتاب نہ صرف دوسرے خلائی سیاروں تک جا پہنچے تھے بلکہ سمندر کی گہرائیوں کا بھی پتا چلا لیا تھا اور وہ انہی سینوں کو گولیوں سے داغنا چاہتے تھے جن میں ایسی علم و حکمت والی کتاب محفوظ تھی کیونکہ دنیا میں اسلام کا بول بالا اور بالادستی انہیں کسی بھی قیمت پر قبول نہیں تھی۔

ادھر گوانتا موبے جیل میں حورعین نے انسانیت کا بدترین روپ دیکھا' بنا کسی قصور اور جرم کے اس کی عزت کی چادر کو داغ دار کیا گیا' کئی کئی گھنٹے اس کے ہاتھ اوپر باندھ کر اس پر تشدد کیا گیا' بنا عورت ہونے کا لحاظ کیے اس کے منہ پر کئی بار پیشاب کیا گیا' ایک پل سے بھی پہلے مرجانے کی شدید خواہش کے باوجود اسے زندہ رہنے پر مجبور کیا گیا تھا اور یہیں اس نے سر جاوید ہمدانی کو دیکھا تھا تحفتاً امریکی فوج کو ملا وہ شخص جو قوم کا معمار تھا' ان صلیب کے پرستاروں کے ہاتھوں کیسے ہر شب بدترین ظلم کی بھینٹ چڑھ رہا تھا' کیا نہیں دیکھا تھا اس نے وہاں مگر سب کچھ دیکھ کر اور جان کر بھی اس کے لبوں پر قفل پڑ گئے تھے۔

گوانتا موبے میں اسے وہ تیسری رات تھی جب اسے پتا چلا کہ اس رات دوران تشدد ایک اور پاکستانی کی موت ہوگئی تھی اور وہ پاکستانی کوئی اور نہیں سر جاوید ہمدانی تھے جن کے دل میں اپنی گمراہ قوم کے لیے ویسا ہی درد تھا جیسا اقبال کے دل میں تھا بس فرق صرف یہ تھا کہ وہ انگریز دورِ حکومت میں بھی اپنے جذبات پر سر کا خطاب پا گئے اور وہ ایک مسلم ملک میں ایٹمی پاور کے حامل ملک میں پوری آزادی اور خودمختاری کے باوجود سب سے پہلے پاکستان کے نعرے کی بھینٹ چڑھ گئے۔ سر جاوید ہمدانی کے قتل کے بعد وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی تھی تبھی صرف تین ماہ کے بعد اسے وہاں سے دوبارہ کیوبا منتقل کردیا تھا۔ کیوبا سے عراق اور عراق سے پھر افغانستان...... اس دوران اس کی عزت کی چادر کو کئی بار تار تار کیا گیا تھا' وہاں کتنی ہی مسلمان عورتیں تھیں جو شدت سے موت کی تمنا کرتی تھیں۔ اپنا سر دیواروں سے مار مار کر خود کو لہولہان کرلیتی تھیں مگر مخملی بستروں پر سوئے ذمہ داروں کو بُرا خواب تک نہیں آتا تھا۔

"کیا تاریخ میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ وقت کے سالاروں کا یہ جرم معاف کردیتی؟"

وہ دسمبر کی نہایت سرد رات تھی جب اسے شبرغان کے اس چھوٹے سے تاریک سیل سے نکال کر ایک نسبتاً بہتر اور آرام دہ کمرے میں شفٹ کردیا گیا۔ اب تک نہ اس کا جرم دنیا کے سامنے لایا گیا تھا نہ کیس' سینکڑوں بے گناہوں کی طرح وہ بھی رُل رہی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" تیز روشنی میں اس پر ٹھنڈا یخ پانی ڈال کر اسے ہوش میں لایا گیا تھا مگر وہ آنکھیں کھل جانے کے باوجود سب کو یوں ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی جیسے سمجھنے کی کوشش کررہی ہو کہ وہ اس کے ساتھ کیا کررہے ہیں؟

تبھی ایک مرتبہ پھر ایاد عبدالحادی اس کی نظروں کے سامنے آیا تھا' ہوش و حواس کھو جانے کے باوجود وہ فوراً اسے پہچان گئی تھی اس کے ساتھی مختلف طریقوں سے اسے ٹارچر کررہے تھے مگر وہ اف بھی نہیں کررہی تھی' تاہم جس وقت ان لوگوں نے اسے بے لباس کرنے کی کوشش کی اس نے چلانا شروع کردیا ساتھ ہی لپک کر ایاد کا ہاتھ تھام لیا' یوں جیسے وہ اس کا خیر خواہ ہو۔

ایاد کے لیے اس کی یہ حرکت کسی شاک سے کم نہیں تھی تاہم اس نے اپنے ساتھیوں کو اسے اس کے حال پر چھوڑنے کا کہہ دیا تھا۔ دسمبر کی یخ بستہ رات میں برف جیسے فرش پر سکڑ کر بیٹھی وہ بہت خوف زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایاد کا دل جیسے کسی نے جکڑ لیا۔ وہ اٹھا اور اس کے مقابل جا بیٹھا تھا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے پر آئے بال پیچھے کیے۔

"تو تم نہیں مانو گی کہ تمہارا طالبان کی کسی تنظیم کے ساتھ تعلق ہے...... ہوں؟" اکڑوں بیٹھا وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ حورعین چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔

"طالبان صرف امریکہ کے لیے نہیں بلکہ تم لوگوں کے لیے بھی خطرہ ہیں' کیوں نہیں سمجھتی ہو تم؟" وہ اسے پیار سے منا رہا تھا مگر وہ اب بھی خاموش نگاہوں سے چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی' اس کی چپ کا قفل نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ تبھی ایاد نے سر جھکایا تھا پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"Leave it" اگلے دو ماہ حورعین پر زیادہ تشدد نہیں کیا گیا مگر اس کی آنکھوں نے اب بھی بربریت کے ہزاروں واقعات دیکھے تھے اس کی ذہنی حالت بہت بدتر تھی۔ پورے دو ماہ بعد اس رات پھر وہ اس کے سیل میں آیا تھا' حورعین تین دن کی بھوکی تیز بخار میں جل رہی تھی وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ پہلی بار حورعین کو اس کی آنکھوں میں ہوس کی جگہ نرمی نظر آئی' اس کے چہرے پر عجیب سا نور اور اپنائیت تھی۔ کتنی ہی دیر اس کے مقابل بیٹھ کر چپ چاپ اسے دیکھنے کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گال چھوا اور پھر رو پڑا تھا' کتنی ہی دیر وہ اس کے سامنے بیٹھا بچوں کی طرح روتا رہا تھا۔ حورعین اچنبھے سے اس کی طرف دیکھتی رہی بھلا وہ کیوں رو رہا تھا؟ مگر ایک مرتبہ پھر وہ بنا کچھ کہے چلا گیا تھا۔

آنے والے دنوں میں اس نے سنا کہ مجاہد طالبان نے اتحادی فوج کے اہم دستوں میں گھس کر بڑی کامیابی حاصل کی پھر کچھ ہی روز بعد اسے بگرام جیل سے کچھ قیدیوں کے فرار کی خبر بھی سننے کو ملی اور پھر ایک رات جب اس کی طبیعت بے حد خراب تھی وہ ایک مرتبہ پھر اس کے سیل میں چلا آیا تھا۔ حورعین شور مچانا چاہتی تھی مگر اس نے مضبوطی سے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر جما دیا۔

"کوئی شور مت کرنا' ابھی یہاں سے نکلو پلیز۔" اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی' حورعین ہراساں ہوگئی وہ اسے لے کر سیل سے نکل گیا۔ فوج کا حصہ ہونے کے باعث اسے تمام خفیہ راستوں کا بھی پتا تھا' جہاں سے قیدی غائب کیے جاتے تھے حورعین نا چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ بھاگتی رہی۔ بڑی کامیابی اور مہارت سے اسے اس عقوبت خانے سے نکال کر جس وقت وہ باہر آیا تھا' فوج کے دیگر افسران کو شک ہوگیا تھا اور فوراً خطرے کا ہنگامی سائرن بج اٹھا تب اس نے حورعین کا ہاتھ تھام کر جنگل کا رخ کرلیا' بھاگتے بھاگتے حورعین کی ہمت جواب دے گئی تھی' اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی تبھی اس نے مزید بھاگنے سے انکار کردیا تھا۔

ایاد نے ایک نظر اس کے حال پر ڈالی پھر اسے اٹھا کر قریبی گھنے درختوں کے جھنڈ میں لے آیا وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی ادھر اتحادی افواج میں جیسے کھلبلی مچ گئی تھی' مشکوک تو ان کی نظر میں وہ پہلے ہی ہوچکا تھا پچھلے کتنے دنوں سے اس پر نظر رکھی جارہی تھی اور اب جب کہ اسے غداری کے جرم میں گرفتار کیا جانا تھا' وہ حورعین کو لے کر فرار ہوگیا تھا۔ اس نے حورعین سے کہا تھا کہ "پکارو اپنے خدا کو اور کہو اسے کہ وہ تمہیں میرے قہر سے بچائے۔"

پتا نہیں حورعین نے اس پاک ذات کو اس وقت پکارا تھا یا نہیں مگر وہ اس کے دل میں آ گیا تھا۔ حورعین کی باتوں نے اس کے اندر غصے کے ساتھ ساتھ عجیب سی بے چینی بھی بھر دی تھی۔ نتیجتاً اس نے مسلمان قیدیوں پر اپنے مظالم اور زیادہ کردیے تھے مگر یہ بے چینی تھی کہ کم ہونے کی بجائے اور بڑھتی جارہی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ دیواروں سے سر ٹکرائے آخر وہ ایسی کیا چیز تھی کہ جس نے محصور قیدیوں کو ہر آسائش ہر عیش و آرام سے بیگانہ کرکے' کافروں کے ہاتھوں نہایت اذیت ناک موت خوشی خوشی قبول کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ کیا چیز تھی جو ان لوگوں کو ظلم و

جبر کے سامنے جھکنے نہیں دے رہی تھی وہ کیا تھا جس کے لیے وہ جفاکش ساری عیش و آرام دولت کو ٹھوکر مار کر سر پر کفن باندھے اپنے سے تین گنا بڑی طاقت سے لڑنے کو تیار ہوگئے تھے۔ یہ اگر بہادری تھی تو کس نے انہیں ودیعت کی تھی؟ اگر یہ بے خوفی تھی تو کیونکر پیدا ہوئی تھی؟ جان تو کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے کو سب سے پیاری ہوتی ہے پھر انہیں اپنی جانیں پیاری کیوں نہیں تھیں؟ سلگتی ریت اور تپتے پہاڑوں میں ایسا کیا تھا جو انہیں سر جھکانے سے روکتا تھا وہ کیا چیز تھی جس نے مسلمانوں کے بلال رضی اللہ عنہ کو تپتی ریت پر دہکتے کوئلوں سے اپنی کھال اتروا کر بھی ''اللہ ایک ہے اللہ ایک ہے'' کہنے سے باز نہیں رکھا۔

یہودی اور عیسائی نہایت بے رحمی سے اگر مٹانا چاہتے تھے تو صرف اسلام اور مسلمانوں کو آخر کیوں؟ بھاری رقوم خرچ کرکے اگر خریدا جارہا تھا تو صرف محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے غلاموں کو آخر کیوں؟ مضحکہ خیز خاکے بنا کر اگر کسی قوم کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی جارہی تھی تو صرف مسلمانوں کو' آخر کیوں؟ دنیا کے ہر ملک ہر حصے میں اگر قتل عام کرکے نسل کشی کی جارہی تھی تو صرف مسلمانوں کی آخر کیوں؟ اگر مسلمان متعصب' تنگ نظر' دہشت گرد' انتہا پسند اور دنیا کے امن کے لیے خطرہ تھے تو پھر وہ مسلمان کون تھے جن کی پشت پناہی خود یہودی ادارے کررہے تھے؟ وہ کون مسلمان تھے جو چہرے پر داڑھیاں رکھ کر' اسلامی نام رکھ کر سچے مسلمانوں کی صفوں میں منافقت سے گھس کر' یہودی اداروں کی پناہ میں خود مسلمانوں کو تباہ کررہے تھے۔ ملک کے عام معصوم شہریوں کا خون پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ جن کے شر کو دیکھتے ہوئے دوسرے مذاہب کے لوگ مجبوراً اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کرنے پر مجبور ہوگئے تھے' جن کے ایمان کی قیمت محض چند ڈالر تھی......

ایک طرف وہ مسلمان تھے جن کے ایمان کی قیمت محض چند ڈالر تھی اور ایک طرف وہ مسلمان تھے جنہوں نے بڑے بڑے محل اربوں کی آسائشات کو ٹھوکر مار کر سنگلاخ پہاڑوں کو اپنا مسکن بنالیا تھا آخر وہ کیسے مسلمان تھے جنہوں نے کربلا کی سر زمین پر آگ برساتے سورج تلے بنا ہتھیاروں کے اپنے دشمن سے جنگ لڑی اور بالآخر بھوک و پیاس کی شدت سے نڈھال ایک ایک کرکے جام شہادت نوش کرلیا مگر باطل کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

مسلمانوں کے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو خدا کے محبوب تھے' جن کی لیے ساری کائنات تخلیق کی گئی درخت تک جن کو سجدہ کرتے تھے جنہیں ان کے مخالف قبائل نے دولت کے انبار لگانے' حکمرانی کرنے' حسین سے حسین عورت بطور تحفہ پیش کرنے کی پیشکش کرڈالی تھی مگر وہ ہر چیز کو ٹھوکر مار کر پورے تین سال اپنے خاندان اور گھر والوں کے ساتھ شعب ابی طالب کی تنگ گھاٹی میں محصور فاقے کرتے رہے' کیوں؟ یہ سب سوچتے اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔

انہی دنوں اتحادی فوج نے ایک نیا کھیل شروع کیا' ہر طرح کی آسائش' اسلحہ اور طاقت ہونے کے باوجود سنگلاخ پہاڑوں کے بیٹے پوری طرح سے ان کے قابو نہیں آرہے تھے جب کہ وہ افغانستان کے بچے بچے کو کچل کر مار دینے کے لیے بے چین تھے' ان کا ٹارگٹ نہ طالبان تھے نہ دہشت گرد۔ ٹارگٹ اگر کوئی تھا تو صرف اسلام وہ جانتے تھے ان سنگلاخ پہاڑوں کے مکینوں کو ابدی نیند سلانے سے پہلے اگر انہوں نے تیل پر قبضہ کرنے کے لیے عراق پر حملہ کیا تو ان کی شامت آجائے گی' اسی لیے ضروری تھا کہ جن مجاہدوں پر NotForSale کا لیبل لگا تھا انہیں بے دردی سے تڑپا تڑپا کر مار دیا جائے تاکہ ان کے خلاف کوئی مزاحمت نہ ہوسکے اور اس مقصد کے لیے جن ممالک نے ان سے اتحاد کیا وہ سب کے سب اسلام کے مخالف تھے مسلمانوں کے دشمن تھے' تبھی وہاں ڈالر کی جنگ شروع ہوئی تھی۔

ہٹلر نے آتشیں اور الیکٹرانک بھٹیوں میں زندہ انسانوں کو جلا کر راکھ کردینے کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کیا تھا وہ لوگ بھی عرب مجاہدین' طالبان اور ان کے حمایتیوں کو ایسی ہی بھٹیوں میں جلا کر راکھ کردینا چاہتے تھے۔ رائفلوں' گنوں سے مجاہدین کو مارنا اور صفحۂ ہستی سے مٹا دینا' بے حد مشکل اور دیر پا تھا' تبھی وہ تین ہزار مجاہد جنہیں دھوکے سے محصور کرکے ان کے ساتھ ظلم اور جنگ کی گئی تھی جو نہتے بھی ان کے سامنے سر جھکانے کی بجائے ان سے لڑ رہے تھے بڑی مشکل سے انہیں پکڑنے کے بعد پانی میں کرنٹ چھوڑ کر لوہے کے بڑے بڑے کنٹینرز میں محبوس کردیا گیا تھا۔ چالیس پچاس افراد کی گنجائش والے کنٹینرز میں پانچ سو افراد کو محبوس کرکے وہ کنٹینرز صحرا کی تپتی ریت میں چلا دیئے گئے تھے یہ سب ایاد نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

آتشیں و الیکٹرانک بھٹیوں میں تو قیدی لمحوں میں جل کر راکھ ہوجاتے تھے مگر ان کنٹینرز میں قید مجاہد' ماہی بے آب اور مرغ بسمل کی طرح تڑپتے۔ جب اوپر سے سورج آگ برساتا اور نیچے سے صحرا کی گرم ریت شعلے اگلتی تو لوہے کا کنٹینرز جہنم بن جاتا اور ان میں محبوس قیدیوں کے چیخنے' تڑپنے' آہ و بکا کرنے اور اپنا سر آہنی چادروں سے مارنے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ دل لرزا دینے والی قرآنی آیات کا ورد کرنے والی آوازوں پر جہاں اس کے ساتھی دل چسپی سے ہنستے' قہقہے لگاتے تھے وہیں وہ جیسے پتھر ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کیا چیز تھی جو اس عالم میں بھی قرآن کو بھولنے نہیں دے رہی تھی' بہت اچانک اس کے دل و دماغ پر حملہ ہوا تھا اور اس نے بے بسی سے ہتھیار پھینک دیئے' جنت کے بدلے دنیا کا سودا کرلینے والے بدنصیب کس قدر خسارے میں تھے کاش وہ جان پاتے۔

کئی روز کی اندرونی جنگ کے بعد بالآخر وہ ہار گیا تبھی اللہ نے جیسے اس کے دل و دماغ کو کھول دیا' بے شک وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ وہ مسلمان تھا اس کی رگوں میں اسلامی خون تھا تو کیسے یہ خون جوش نہ مارتا۔ کتنی ہی راتیں اس نے اپنی حیوانیت پر رو رو کر اللہ سے معافی مانگتے ہوئے گزاری تھیں پھر اس نے جاب چھوڑ کر علی اعلان مجاہدین کے ساتھ شامل ہونے کی بجائے فوج میں رہ کر سینکڑوں بے گناہ قید مسلمانوں کی چپ چاپ مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا مگر اس کا یہ منصوبہ زیادہ دنوں تک خفیہ نہ رہ سکا۔ مسلمان قیدیوں کے ساتھ اس کے نرم برتاؤ نے دیگر افسران کو چوکنا کردیا تھا اور جب اسے لگا کہ اسے گرفتار کرلیا جائے گا وہ حور عین کو لے کر وہاں سے فرار ہوگیا۔

اتحادی فوج کتے کی طرح اس کی بو سونگھتی پھر رہی تھی مگر وہ اس لڑکی کے ساتھ تھا جس کے لفظوں نے اس کے اندر انسانیت کی روح پھونکی تھی۔ درختوں کے جس جھنڈ میں وہ خود کو اور حور عین کو چھپائے بیٹھا تھا کہ اچانک حور عین کی نظر درخت سے لٹکتے ایک کالے سانپ پر جا پڑی سانپ کو دیکھتے ہی وہ چیخنے والی تھی مگر اس سے پہلے ہی ایاد نے اس کے منہ پر اپنا بھاری ہاتھ جما کر اسے خود میں بھینچ لیا اور دوسرے ہاتھ سے سانپ کو پکڑ کر پوری قوت سے دور پھینک دیا۔ حور عین کے دل کی تیز دھڑکنیں اسے اپنے اندر اترتی محسوس ہورہی تھیں۔ مجاہدین اس سے رابطے کے لیے بے قرار تھے مگر وہ پہلے اس لڑکی کو کسی محفوظ مقام تک پہنچانا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ بے قصور ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے دختر مشرق' پاکستان کی بیٹی عافیہ صدیقی معصوم اور بے گناہ تھی۔ ان کا جرم اگر تھا تو صرف پاکستانی ہونا...... ایک ایسے ملک کا شہری ہونا جو مقروض تھا' ان کا جرم دکھی انسانیت سے ہمدردی تھی۔

مسلسل بھاگنے کی وجہ سے اس کی طبیعت مزید خراب ہوگئی تھی' ادھر اتحادی فوج کے افسر پورے جنگل میں آگ کی طرح پھیل چکے تھے۔ حور عین کے کراہنے کی آواز مسئلہ پیدا کرسکتی تھی تبھی اس نے مسلسل اس کے منہ پر ہاتھ رکھے رکھا تھا۔ آنے والی رات اس کے لیے مزید پریشانیاں لے کر آئی تھی خوفناک جھاڑیوں میں ایک نوجوان غیر محرم لڑکی کے ساتھ چھپے رہنا اس کی غیرت کو گوارہ نہیں تھا' دوسری طرف حور عین کو اس کے حال پر چھوڑ دینا اس کے اندر کی جاگی ہوئی انسانیت کو گوارہ نہیں تھا' ایک طرف غیرت تھی تو دوسری طرف انسانیت...... بہت دیر کشمکش میں رہنے کے بعد بالآخر وہ اس کا مسیحا بن گیا تھا۔

اگلے ایک ہفتہ تک اس کی مجاہدین تک رسائی نہیں ہوسکی تھی نہ ہی اتحادی فوج کی اس تک رسائی ممکن ہوسکی تاہم اس ہفتے میں جس طرح اس نے حور عین کا خیال رکھا وہ اس سے بہت متاثر ہوگئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی اعصابی حالت بھی بہتر ہونے لگی' شدید خطرے کے باوجود جس طرح سے وہ اس کے لیے جنگل میں کھانے پینے کا اہتمام کرتا تھا حور عین کے دل میں اس کی عزت بہت بڑھ گئی تھی۔

اس روز وہاں بہت بارش ہوئی تھی۔ ایاد ہر روز وہاں سے نکلنے کا محفوظ راستہ تلاش کرتا تھا مگر تاحال اسے کامیابی نصیب نہ ہوسکی تھی۔ حور عین کا لباس بہت نحیف ہوچکا تھا' ایک دو جگہ سے پھٹ کر جسم دکھائی دینے لگا تھا مگر وہ ہمہ وقت دوپٹے کو نماز کی صورت سر پر لپیٹے رکھتی۔ گھنے درخت تلے اپنے آپ کو چھپائے بیٹھی وہ ایاد کو دیکھ رہی تھی جب وہ بولا۔

''میں جانتا ہوں ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں' کسی بھی وقت دشمن فوج کا کوئی کارندہ یہاں تک پہنچ سکتا ہے مگر میں اپنی ذات کے لیے بالکل بھی خوف زدہ نہیں ہوں مجھے اگر کوئی پریشانی ہے تو صرف آپ کی...... میں نہیں چاہتا حق اور باطل کی اس جنگ میں آپ کو اپنی جان کی قربانی پیش کرنی پڑے' آپ کے الفاظ مشعل کی مانند ہیں جن سے آپ کو تاریک ذہنوں میں شعور کی روشنی پھیلانے کا کام لینا ہے' نوآموز نسل کو صحیح اور غلط کی پہچان کروانے کا کام لینا ہے' اقبال کی طرح ناساعد حالات اور زمانے سے جنگ کرنی ہے' فکر و آگہی کی جنگ...... میں جانتا

ہوں آپ مجھے اچھا انسان نہیں سمجھتیں میں اچھا انسان ہوں بھی نہیں' جس قبیلے سے میرا تعلق ہے وہاں کی جو تعلیمات اور رسومات ہیں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں باوجود اس کے کہ ہم فخریہ مسلمان کہلاتے ہیں' میری ماں عیسائی عورت تھی مگر میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے آنسو دیکھے ہیں' جب تک وہ زندہ رہی شاید اس نے اسلام کی گہرائی کو سمجھ لیا تھا مگر میرا باپ' جو خود کو فخریہ مسلمان کہلاتا تھا جس کی رگوں میں پیدائشی طور پر مسلمان خون تھا شاید وہ کبھی اسلام اور مسلمانوں کے لیے نہیں رویا ہوگا کیونکہ اس کے پاس شعور نہیں تھا قیمتی چیز بناء کسی جدوجہد اور قربانی کے پلیٹ میں رکھ کر مل جائے تو شاید اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ میرے باپ اور اس کے قبیلے کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا' اسلام کی عظمت اس کی حرمت کی قیمت چند ٹکوں میں وصول کرکے وہ سمجھتے تھے کہ بڑے فائدے کا سودا کرلیا مگر انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ فائدے کی اس گہری کھائی کے پیچھے کتنا بڑا نقصان منہ کھولے ان کے گرنے کا منتظر کھڑا ہے۔ انہیں یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی کہ دنیا بھر میں بڑی طاقتیں' ہزاروں مذاہب کے ہوتے ہوئے اگر کسی مذہب کی قیمت لگانے کی سرتوڑ کوشش کرتی تھیں تو وہ مذہب صرف اسلام تھا۔ بھٹکے ہوؤں کی نظر میں سرخروئی کے لیے کیا کیا نہیں کیا' میرے آباؤ اجداد نے۔ سوچتا ہوں تو خون رگوں میں ٹھوکریں مارتا ہے شاید اسی وجہ سے میں اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کرتا تھا مگر بہت دیر کے بعد مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ بھٹکے ہوؤں کے پیرو تو خود اسلام کے دھتکارے ہوئے ہیں' وہ مذہب جو ساری کائنات کے لیے امن وسلامتی' روشن خیالی' انصاف اور بقاء و نجات کا مذہب ہے' بہت دیر بعد مجھے اس چیز کی سمجھ آئی کہ اگر میں اسلام اور مسلمانوں سے بے زار ہوں تو اس میں اسلام اور مسلمانوں کا قصور نہیں' میرا قصور ہے' میرا نقصان ہے اللہ کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون اسے اپنا رب تسلیم کرتا ہے کون نہیں مگر بندے کو اس بات سے فرق پڑتا ہے کہ ساری کائنات کا اکیلا خالق اسے اپنا بندہ تسلیم کرتا ہے کہ نہیں کیونکہ اللہ کو پاکر کبھی کسی نے کچھ نہیں کھویا اور اللہ کو کھو کر کبھی کسی نے کچھ نہیں پایا۔" ایاد عبد الحادی کی خوب صورت آنکھوں کے گوشے نم ہوچکے تھے۔

حورعین یک ٹک اسے دیکھے گئی' وہ شخص اس سے اپنا آپ شیئر کررہا تھا۔ برستے آسمان تلے وہ کشمیری سیب جیسے اس شخص کے ساتھ بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی اور وہ شخص نا چاہتے ہوئے بھی اس کے دل میں اترتا جارہا تھا۔ پچھلے گزرے ایک ہفتے میں اس کی رفاقت نے حورعین کو جیسے جینا سکھادیا تھا۔ وہ اپنے ہر زخم ہر تکلیف کی راحت کے لیے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی' کئی بار ننگے پاؤں ہونے کی وجہ سے اس کے پاؤں میں کانٹا چبھا تھا اور ایاد عبدالحادی نے ہر بار وہ کانٹا بہت نرمی اور پیار سے اس کا پاؤں اپنی گود میں رکھ کر نکالا تھا۔

رات میں وہ سوتی تو وہ بہت دیر جاگ کر اس کا پہرہ دیتا' کبھی وہ اس کے سامنے بیٹھی ہوتی اور اس کا آنچل سرک جاتا تو وہ فوراً اپنی نگاہ پھیر لیتا چونکہ اس کی رگوں میں قبائلی خون تھا اسی لیے اس کی غیرت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ حورعین عبدالسمیع کو پتا ہی نہ چلا کہ وہ قبائلی کب اس کی روح تک رسائی حاصل کرگیا۔

اگلے روز بھی بارش کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ حورعین کی آنکھ کھلی تو ایاد وہاں نہیں تھا پچھلے ایک ہفتے میں اس شخص نے ہر طرح کے خطرے اور مشکل کے باوجود ایک وقت کی نماز بھی قضاء نہیں کی تھی مگر وہ وقت نماز کا نہیں تھا' فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونج رہی تھی اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ دوپٹہ اچھی طرح لپیٹ کر فوراً سے پیشتر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی تبھی اس نے ایاد کو اپنی طرف آتے دیکھا تھا وہ زخمی تھا اس کے بازو پر گولی لگی تھی۔ حورعین نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"چلو...... اتحادی فوج نے یہ جگہ دیکھ لی ہے' مجھے خطرہ ہے میرے ساتھ وہ تمہیں بھی نقصان پہنچانے سے باز نہیں رہیں گے۔" تیزی سے بہتے خون کے باوجود وہ اس کی جان اور عزت کے لیے فکرمند ہورہا تھا' یہی وہ غیرت اور انسانیت تھی جس کے لیے ابوغریب' بگرام اور دیگر عقوبت خانوں میں قید مسلمان دختران صدائیں دے رہی تھیں۔

اتحادی فوج کے افسران ان کے سر پر آپہنچے تھے اور اب اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے' حورعین چیخ اٹھی۔ ایاد بہت بری طرح سے زخمی ہوچکا تھا مگر اس کے باوجود بنا کسی زخم کی پروا کیے وہ اسے بچا رہا تھا۔ اندھا دھند بھاگتے ہوئے وہ اسے کسی مقام پر پہنچانا چاہتا تھا شاید اس کا مجاہدین سے رابطہ ہوگیا تھا مگر اسے اس کی مہلت نہیں ملی تھی' ٹڈیوں کی طرح چھائے فوجی اہلکاروں نے ان دونوں کے گرد حصار تنگ کرکے انہیں گرفتار کرلیا تھا۔ اگلی رات انہیں اعلیٰ افسران کے حضور پیش کردیا گیا۔

وہ شخص جو اسی فوج کا حصہ ہوکر مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑتا تھا' اب وہی شخص اپنے انہی ساتھیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوکر درد کا اصل مزہ چکھنے جا رہا تھا' وہ لوگ جن کے ساتھ بیٹھ کر شراب کے نشے میں مست ہوتے ہوئے وہ بے کس مسلمان قیدیوں کی بے بسی اور تکالیف پر ہنستا تھا۔ اب وہی لوگ اس کی جان کے دشمن بنے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ حورعین جس کوٹھری میں قید تھی' زخموں سے چور ایاد اسی کوٹھری کے سامنے والی کوٹھری میں بند کراہ رہا تھا' باہر مجاہدین اور اتحادی فوج کے درمیان جیسے آگ لگ گئی تھی۔ رات تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ ایاد زخموں سے چور نڈھال پڑا تھا' جب کچھ افسران حورعین کی کوٹھری میں گھس آئے اور اس کی بے حرمتی شروع کردی۔ وہ چلا رہی تھی اور ادھر ایاد بیدار ہوکر بناء اپنے زخموں کی پروا کیے' پنجرے میں بند شیر کی طرح مچل رہا تھا' اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ سلاخیں توڑ کر جیل کو توڑ پھوڑ دیتا' تبھی وہ افسران حورعین کو چھوڑ کر اس کی طرف آئے اور پھر حورعین کی آنکھوں نے جیسے قیامت بپا ہوتے دیکھی تھی۔

ایاد کے ننگے وجود پر تیز دھار چاقو سے کٹ لگا کر وہ لوگ ان زخموں پر گرم گرم پگھلی ہوئی موم ڈال رہے تھے مگر ایاد کے لبوں سے کوئی چیخ نہیں نکلی تھی' بری طرح تڑپتے ہوئے وہ اپنا ضبط آزما رہا تھا۔

حورعین سلاخیں پکڑ کر چیختی رہی اور ان انسانی درندوں کی درندگی کا نظارہ کرتی رہی' اگلے پندرہ روز تک یہی سلسلہ جاری رہا تھا' ہر روز مسلسل کئی گھنٹے ایاد پر تشدد کیا جاتا تھا یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو جاتا' سولہویں روز اس کی موت کے پروانے پر دستخط کردیے گئے۔

بہت مختصر عرصے میں اس پر غداری کا کیس چلا اور بالآخر عدالت نے اسے پھانسی کی سزا سنادی' حورعین کو لگا جیسے وہ زندہ جلادی گئی ہو۔ اس روز پھر بہت بارش برسی تھی۔ کھلے آسمان تلے ٹپکتی بوندوں کو اپنے صحرا تن پر جیسے محسوس کرنے کے باوجود اسے خود پر پتھر ہونے کا گماں ہو رہا تھا' بڑے سے میدان میں چاروں طرف اتحادی فوج کے کارندے تھے اور شدید زخمی حالت میں جان بوجھ کر اسے وہاں لایا گیا تھا تاکہ ایاد عبدالہادی کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

اس ایاد عبدالہادی کا جس نے کفر کا راستہ چھوڑ کر ہدایت کی منزل تک رسائی حاصل کی تھی جس کا کوئی ذاتی دشمن نہیں تھا مگر سوائے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے' وہ مجاہد جو باطل کے سامنے سر جھکانے سے منکر ہوگیا تھا۔ حورعین نے دیکھا وہ بازوؤں اور پشت پر گہرے زخموں کے باوجود خود اپنے پاؤں پر چل کر تختہ دار تک جا رہا تھا' اس کے ہاتھ پیچھے بندھے تھے مگر اس کی چال میں بالکل بھی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔

حورعین کے لیے اپنے قدموں پر کھڑے رہنا دشوار ہو رہا تھا' اس کی آنکھیں شدید ذہنی دباؤ سے بند ہوئی جا رہی تھیں' تبھی ایاد نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ کیا نہیں تھا اس وقت اس کی آنکھوں میں؟

حورعین نے حلق پھاڑ کر چیخنا چاہا مگر اس کی چیخ اس کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ ایاد بڑی مشکل سے اس سے نظر ہٹا کر تختہ دار کی طرف بڑھا تھا' اس کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں تھی' وہاں کھڑے افسران نے جس وقت اس کے منہ پر کپڑا اڑانے کی کوشش کی اس نے سر ہلا کر منع کردیا۔ اس کے ذہن میں اس وقت حورعین کا تلخ لہجہ گونج رہا تھا۔

"بزدل ہو تم...... ہمیں قتل کرنے یا ہمیں اذیت دے کر ہم پر تشدد کرنے کے سوا تم اور کر بھی کیا سکتے ہو؟ مگر ہمارے نزدیک یہ عبرت نہیں ہے بلکہ سعادت ہے خوش بختی کی موت ہے' ہمارا دین ایسی موت کو خوش بختی اور شہادت کا نام دیتا ہے' ایک مومن مسلمان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہی یہی ہے کہ اسے شہادت کی موت نصیب ہو' میرا خدا ایسے ہی اپنے بندوں کو آزمائش کی بھٹیوں میں جلا کر کندن بناتا ہے اور انہیں اپنے منافق بندوں سے علیحدہ فرما دیتا ہے۔ ہم مصائب سے ٹوٹنے والے نہیں ہیں' وہ ہم نہیں ہیں جنہیں تم اپنے ڈالر کی کشش سے خرید سکو۔"

"اللہ......" اس کے دل نے بے ساختہ اللہ کو پکارا تھا۔

ایاد کے وجدان میں وہ چلا رہی تھی اور ادھر پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں فٹ کردیا گیا تھا' جان کے بدلے جنت کا سودا مہنگا نہیں تھا' اس وقت اسکے دل میں صرف ایک ہی حسرت تھی۔ کاش وہ مجاہدین کی مدد کرسکتا' کچھ عرصہ ان کا ساتھ دے سکتا۔ مسلمانوں کے خون کی بہتی ہوئی ندیوں کا حساب لے سکتا' مگر...... شاید اللہ رب العزت کو اس کی اتنی ہی زندگی منظور تھی۔ حورعین کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

پھندا ایاد عبدالہادی کے خوب صورت گلے میں فٹ کرنے کے بعد تختہ کھینچ دیا گیا تھا۔ حورعین کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہوگئی۔ پورے ڈیڑھ ماہ بعد وہ دوبارہ ہوش کی دنیا میں واپس آئی تھی۔ مختصر کومہ کے بعد ہوش کی دنیا میں واپسی اس کے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوئی تھی۔ ایاد کی شہادت کے بعد مجاہدین نے وہاں حملہ کردیا تھا اور انہیں اس میں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی تھی۔

حورعین بھی اب انہی کے قبضے میں تھی۔ ایاد کی لاش پاکستان بھجوادی گئی تھی۔ حورعین کے کومہ سے باہر آنے کے بعد اسے بھی پاکستان بھجوادیا گیا مگر زندگی میں اب رہ ہی کیا گیا تھا۔

سر درد سا الجھا لہجہ
کھوئی آنکھیں ٹھنڈے ہاتھ
بے رنگ چہرا بداخلاق
دیکھو تم بن کون ہوں میں؟

گھٹنوں میں سر دیے چپ چاپ وہ روتی رہی تھی اور لمحہ بہ لمحہ برستی بارش اس کے صحرا جیسے تن پر برستی اس کے اندر دہکتی آگ کو اور ہوا دیتی رہی۔

❁......❁......❁

نہال کی میڈیکل رپورٹس اس کی آنکھوں کے سامنے تھیں اور وہ جیسے گھومتے ہوئے سر کے ساتھ کرسی کا سہارا لیے نیچے زمین پر جھکتی چلی جا رہی تھی۔

کتنا ہی وقت بیت گیا تھا' رو رو کر اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں' ہر لمحہ خوش باش نظر آنے والا وہ کھلنڈرا سا شخص اپنے اندر کتنے طوفان چھپائے ہوئے تھا' ہانیہ کے لیے وہاں سے اٹھنا گویا موت کے مترادف ہوگیا۔

میکال آفس سے آیا تو مائرہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

"السلام علیکم!" سرسری سی ایک نظر اس پر ڈالتا وہ وہیں صوفے پر ٹک گیا تھا۔

"وعلیکم السلام! آج جلدی آگئے میکال بھائی؟"

"ہوں...... طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی' باقی لوگ کہاں ہیں؟"

"باقی لوگ...... آنٹی اور سارا تو بتول خالہ (رشتے دار) کے ہاں گئی ہوئی ہیں انہوں نے بلوایا تھا اور باقی رہ گئیں ہانیہ بھابی تو وہ صبح آپ کے گھر سے نکلنے کے بعد ہی نہال کے کمرے میں گھس گئی تھیں' ابھی تک وہیں ہیں۔"

"واٹ......؟" مائرہ کی اطلاع پر اسے جیسے جھٹکا لگا تھا' عین اسی پل مرے مرے قدموں کو گھسیٹتی وہ نہال کے کمرے سے نکلی تھی اور پھر بنا ادھر ادھر نگاہ ڈالے ناک کی سیدھ میں چلتی سیدھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ میکال کو لگا جیسے کسی نے اس کا دل کچل ڈالا ہو۔ وہ کمرے میں آیا تو ہانیہ اندھیرا کیے اوندھے منہ پڑی تھی' یوں جیسے بے حد تھک گئی ہو' اس کے اندر سو طرح کے وسوسے سر اٹھانے لگے' شک کے ناگ نے ڈس ڈس کر جیسے اس کا سارا وجود زہریلا کر ڈالا تھا۔

ہانیہ سو رہی تھی اور وہ پوری رات اس کے پہلو میں بیٹھا جاگ کر سگریٹ پھونکتا رہا تھا۔ اگلی صبح ہانیہ تیز بخار میں جل رہی تھی۔ میکال کی آنکھ اس کے کراہنے کی آواز سے کھلی تھی اور جس وقت اس نے اس کے سرخ گالوں پر ہاتھ رکھا گویا اس کی جان پر بن گئی' ساری کدورتیں' غلط فہمیاں پل بھر میں ذہن سے نکل گئی تھیں۔

"ہانیہ......" اس پر جھک کر اپنائیت سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اس نے پکارا تھا' جب غنودگی کے عالم میں بہت مدھم لہجے میں ہانیہ کے لبوں نے جنبش کی تھی۔

"نہال......" میکال شاکڈ رہ گیا تھا۔ غنودگی میں بھی ہانیہ کا نہال کو پکارنا اسے پتھر ہی تو کرگیا تھا' اس لمحے وہ سیدھا ہوا تھا اور سر بیڈ کی پشت گاہ سے ٹکا کے زور سے آنکھیں میچ لیں' اسے لگا جیسے کسی نے ڈھیر سارا کوڑا کرکٹ اس کے اوپر اچھال دیا ہو۔

محبت کی نارسائی جیسے اس کے مقدر کا حصہ بن گئی ہو۔ چپ چاپ کتنی ہی دیر تک اپنے آنسو ضبط کرنے کے بعد وہ اٹھا تھا اور واش روم میں گھس گیا تھا' ٹھنڈے پانی سے اچھی طرح شاور لینے کے بعد بھی اندر لگی آگ میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ خاموشی سے آفس کے لیے تیار ہونے کے بعد وہ ایک سرسری سی نظر ہانیہ پر ڈالتا کمرے سے نکل آیا تھا۔

رات کو جس وقت اس کی گھر واپسی ہوئی سب لاؤنج میں بیٹھے اسے لتاڑنے کو تیار بیٹھے تھے۔

"السلام علیکم!" تھکے تھکے سے انداز میں اپنا کوٹ سائیڈ صوفے پر رکھتے ہوئے اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا تھا مگر جواب صرف حسن صاحب نے دیا۔

"وعلیکم السلام! بڑی جلدی آگئے آج آفس سے؟" وہ طنزاً کہہ رہے تھے' میکال انہیں دیکھنے لگا۔

"سوری کچھ ضروری کام آپڑا اس لیے دیر ہوگئی۔"

"تمہارے ضروری کاموں کی خبر ہے مجھے' اس لیے بہتر ہوگا

اگر تم اپنے ضروری کاموں کی حد محدود کردو۔"

"میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"بہت اچھی طرح سمجھ رہے ہو تم جو میں کہنا چاہ رہا ہوں' بزنس کی آڑ میں جو مصروفیات تم نے آج کل پالی ہوئی ہیں میں ان سے بے خبر نہیں ہوں۔" تقریباً دھاڑتے ہوئے انہوں نے اس پر واضح کیا تھا۔ میکال نے فوراً ہانیہ کی طرف دیکھا وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی تاہم میکال کے دیکھنے پر اس نے اپنی نظر چرالی' وہ سمجھا اسی نے حسن صاحب اور دیگر گھر والوں سے اس کی شکایت کی ہے جب کہ ایسا نہیں تھا یہ سارا ہنگامہ تو مائرہ کا پیدا کیا ہوا تھا جس نے آج اپنی فرینڈز کے ساتھ ہوٹلنگ کے دوران پھر اسے علیزہ نامی ماڈل کے ساتھ ہوٹل میں دیکھا تھا اور واپسی پر بناء ہانیہ کی طبیعت کی پروا کیے' نہال کی موجودگی میں مرچ مسالہ لگا کر سب کو یہ بات بتائی اور یہ بھی واضح کیا کہ ہانیہ اس بات سے باخبر ہے اور یہ سب بہت دنوں سے چل رہا ہے' اس لمحے اس سے زیادہ ہانیہ کا ہمدرد اور کوئی نہیں تھا۔

"کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟" اسے بھی غصہ آیا تھا' حسن صاحب نے ایک نظر ہانیہ کی طرف دیکھا پھر بولے۔

"یہی کہ جو تمہاری ذمہ داریاں ہیں ان پر اپنا وقت صرف کرو' جن باتوں میں سوائے رسوائی کے اور کچھ نہیں انہیں چھوڑ دو۔"

"میں ایسا کچھ نہیں کررہا جس سے میری یا میرے گھر والوں کی رسوائی ہو' جہاں تک ذمہ داریوں کی بات ہے تو وہ میں ہر ممکن حد تک نبھا رہا ہوں' نہ بھی نبھاؤں تو یہاں اس گھر میں بہت لوگ ہیں میری ذمہ داریاں نبھالے والے۔" چبا چبا کر کہتے ہوئے ایک زہر خند نگاہ نہال پر ڈال کر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مسز حسن سر تھام کر بیٹھ گئیں جب کہ مائرہ کے لبوں پر نہایت آسودہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔

❁......❁......❁
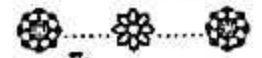
ہانیہ کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی۔ میکال ٹی وی دیکھ رہا تھا' وہ اس کے آفس کے لیے کپڑے پریس کرنے بیٹھ گئی' تبھی وہ اٹھا اور اس کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے کپڑے اس کے ہاتھ سے چھین لیے تھے۔ وہ ہکا بکا سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے آرام کرو' ویسے بھی آج کے بعد تمہیں میرے کسی کام کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں؟" اس کے تپے تپے سے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے وہ جیسے ٹوٹی تھی۔

"کیونکہ میں کہہ رہا ہوں اس لیے۔" اس بار چبا چبا کر کہتے ہوئے اس نے خاصے غصے اور حقارت سے اس کی طرف دیکھا تھا اور پلٹ کر دوبارہ ٹی وی دیکھنے میں مشغول ہوگیا تھا۔ ہانیہ چپ چاپ کمرے سے نکل آئی وہ شخص غلطی ہوکر بھی شرمندہ ہونے کی بجائے الٹا اسی پر غصہ کررہا تھا آپ ہی آپ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

باہر خاصی سرد ہوا چل رہی تھی وہ کمرے سے نکل کر باہر سیڑھیوں پر آ بیٹھی' نہال کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ بھی جاگ رہا ہے مگر......

ہانیہ کے اندر اس وقت اس کے سامنے جانے کی ہمت نہیں تھی۔ کتنا سناٹا پھیلا ہوا تھا اس کے اندر...... مگر اس سناٹے کی حقیقت کا ادراک کسے تھا۔

نہال جو اس کے بچپن کا ساتھی اور دوست تھا اس کے ہر دکھ اور سکھ کا راز داں تھا' ڈاکٹری رپورٹس کے مطابق کتنی تیزی سے موت کی طرف بڑھ رہا تھا مگر گھر میں کسی کو اس کی خبر ہی نہیں تھی اسے بھی نہ ہوتی اگر اس روز وہ کتابیں لینے کے لیے اس کے کمرے میں نہ جاتی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے مگر اس گھر میں اسے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ نہال کے غم کے سامنے میکال کا غم بہت ہلکا پڑ رہا تھا اور وہ سمجھ رہا تھا وہ اس سے بے وفائی کررہی ہے۔

اگلی صبح میکال کے منع کرنے کے باوجود اس نے اس کے کئی سوٹ پریس کرکے ہینگ کردیے تھے۔ میکال پھر بنا ناشتا کیے آفس کے لیے نکل گیا۔ چند دن اسی کشمکش کی نذر ہوگئے تھے نہ اسے سکون تھا نہ میکال کو...... ہانیہ کا دل چاہا وہ میکال کو ساری حقیقت بتادے مگر اس نے اپنی مصروفیات بہت بڑھالی تھیں' صبح ٹائم سے پہلے آفس کے لیے نکل جانا اور رات کو لیٹ نائٹ گھر واپس آنا اب اس کا معمول بن گیا تھا مگر ہانیہ کو پروا نہیں تھی' وہ بس اپنا درد شیئر کرنا چاہتی تھی۔ نہال حسن کو لے کر جو طوفان اس کے اندر اودھم مچائے ہوئے تھے ان طوفانوں کا اظہار کرنا چاہتی تھی مگر اس کی قسمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

اس روز پھر جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ وہ نہال حسن کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ نہال کل ہی شہر سے باہر گیا تھا' بظاہر بزنس میٹنگ کے لیے مگر ہانیہ جانتی تھی کہ وہ اپنے چیک اپ کے لیے گیا تھا۔ اس کا کمرا بھی اسی کی طرح نفیس تھا وہ وہاں بیٹھ کر دیر تک روتی رہی' بیڈ کے سامنے ہی رائٹنگ ٹیبل تھی اور اسی پر وہ کتابیں دھری تھیں جو اسے پسند تھیں۔ وہ بیڈ سے اٹھ کر وہاں آ بیٹھی' کتابوں کے ایک سائیڈ پر نہال کی ڈائری رکھی تھی۔ ہانیہ نے دل کے ہاتھوں متجسس ہوکر وہ ڈائری اٹھائی اور کپکپاتے ہاتھوں سے اس کے اوراق پلٹنے لگی۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

موتیوں جیسی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا یہ قطعہ اس کی توجہ کا محور بن گیا تھا مگر اس کے بعد اگلے بہت سے صفحات خالی تھے وہ ڈائری بند کرنے لگی تھی جب اچانک اس کی نظر اس صفحے پر پڑی جس پر لکھا تھا۔

"زندگی میں کبھی کسی نے خود کو قبر میں اترتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا مگر میں نے دیکھا ہے' زندہ ہوتے ہوئے میں نے خود اپنا بین ہوتے اپنے کانوں سے سنا ہے' خود اپنی لاش کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر پھرا ہوں' اپنی حسرتوں اور تمناؤں کو چھپ چھپ کر سسکیاں بھرتے دیکھا ہے' مجھے اندازہ ہی نہیں تھا زندگی میں صرف کسی ایک شخص کے نہ ہونے سے سانسیں اتنی بوجھ بن جاتی ہیں' قطعی اندازہ نہیں تھا مجھے کہ صرف ایک ہانیہ صفدر کو کھو دینے کے بعد میری زندگی میں کچھ بھی نہیں رہے گا' کچھ بھی نہیں......"

ایک پہاڑ اس پر چند روز پہلے ٹوٹا تھا اور ایک پہاڑ اب اس لمحے ٹوٹ کر گررہا تھا' وہ شاکڈ بیٹھی رہ گئی۔ کپکپاتے ہاتھوں میں مزید صفحات پلٹنے کی سکت نہیں تھی۔

منہ پر ہاتھ رکھے اس نے بے ساختہ اپنی چیخ کا گلا گھونٹا تھا تبھی دروازے پر آہٹ ہوئی تھی' اس نے پلٹ کر دیکھا نہال دہلیز پر کھڑا تھا' تھکن زدہ چہرے پر غم و غصے کی سرخی تھی۔ وہ آنسو صاف کیے بغیر آہستہ سے کھڑی ہوئی تھی۔

"تم یہاں کیا کررہی ہو؟" تھکے تھکے قدم اٹھاتا وہ عین اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا' ہانیہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ ڈائری اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی' نہال کی نظر اس کے چہرے سے پھسلتی ہوئی ڈائری پر آ کر رک گئی۔

پل میں اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوئے تھے عقاب کی طرح جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے ڈائری چھینتے ہوئے کچھ دیر وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر اچانک ایک زوردار طمانچہ اس کے بائیں گال پر رسید کردیا۔

"میری غیر موجودگی میں' میرے کمرے میں آنے کی ہمت کیسے ہوئی تمہیں؟" شدید برہم ہوکر حلق کے بل وہ چلایا تھا' لاؤنج میں بیٹھی سارہ اور مائرہ دوڑ کر وہاں چلی آئیں جب کہ ہانیہ لڑکھڑا کر بیڈ کی پٹی پر ہاتھ ٹکا کر بمشکل سنبھلی۔

"دفع ہوجاؤ یہاں سے اور دوبارہ کبھی میری غیر موجودگی میں یہاں قدم مت رکھنا۔" اس کا بس نہ چلتا تھا وہ ہانیہ کو شوٹ کر ڈالتا۔

وہ راز جو اب تک اس نے خود اپنے آپ سے بھی چھپا کر رکھا تھا' کیسے افشاء ہوگیا تھا۔ افشاء بھی اس ہستی کے ہاتھوں کہ جس سے اس نے اپنا سایہ تک چھپا کر رکھا تھا' مائرہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ میکال کی آفس سے واپسی کے بعد اس نے پھر اسے گھیر لیا تھا۔

"میکال بھائی ایک بات کہوں ناراض تو نہیں ہوں گے؟"

"نہیں...... کہو۔" جوتے اتارتے اتارتے رک کر وہ اسے دیکھنے لگا۔ مائرہ اطراف میں نگاہ ڈالتی وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

"وہ...... میکال بھائی مجھے آپ سے یہ کہنا تھا کہ آپ ہانیہ بھابی پر تھوڑی سختی کریں روز آپ کے آفس جانے کے بعد وہ نہال بھائی کے کمرے میں گھس جاتی ہیں اور سارا دن وہیں رہتی ہیں' آج نہال بھائی نے انہیں دیکھ لیا اور بہت غصہ کیا' تھپڑ بھی مارا۔ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اب تم میرے بھائی کی عزت ہو یوں دن میں سر عام نہ گھس آیا کرو کمرے میں' کتنی بری بات ہے کیا اثر پڑتا ہوگا مجھ پر اور سارا پر' آپ سوچ سکتے ہیں۔" ایک اور طمانچہ...... میکال کے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئیں۔

"ٹھیک ہے میں کروں گا ہانیہ سے بات' آئندہ احتیاط کرے گی وہ۔" کہنے کے ساتھ ہی اٹھ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اندر ہانیہ بیڈ پر اوندھے منہ پڑی رو رہی تھی' وہ واش روم میں گھس گیا تقریباً پچیس منٹ کے بعد فریش ہوکر وہ کمرے میں واپس آیا تو ہانیہ کی گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز نے اسے مزید تپا دیا۔

"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ' کیوں رو رہی ہو؟" اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے اس نے غصہ دکھایا تھا' جواب میں ہانیہ سب کچھ بھلاتے ہوئے تڑپ کر اس کے سینے سے لپٹ گئی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس کا غصہ ہانیہ کی اس حالت پر قدرے کم ہوا تھا مگر وہ روتی رہی۔

''میں جانتا ہوں تمہیں نہال نے دکھی کیا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم دونوں کے درمیان کچھ بھی غلط نہیں ہے مگر پھر بھی تمہارا ہر وقت اس کے اردگرد منڈلاتے رہنا مجھے پسند نہیں ہے' روز میرے آفس جانے کے بعد تم اس کے کمرے میں گھس جاتی ہو کیوں؟'' کندھوں سے پکڑ کر اسے اپنے مقابل کیا تھا مگر ہانیہ بناء کوئی جواب دیئے پھر اس کے سینے پر سر رکھ کر پلکیں موند گئیں' اس کا سر دن بھر رونے کی وجہ سے اس وقت جیسے پھٹ رہا تھا۔ میکال نے اسے زیادہ چھیڑنا مناسب نہ سمجھا' یقیناً وہ دن بھر سے بھوکی بھی تھی نرمی سے اسے خود سے علیحدہ کرنے کے بعد وہ نیچے کچن میں آیا اور کھانا نکال کر اوپر کمرے میں لے آیا۔

''ہانیہ...... چلو اٹھو کھانا کھاؤ۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس کے کہنے پر بمشکل بیڈ پر بیٹھی تھی۔ میکال نے ٹرے سائیڈ پر رکھ دی۔

''کیوں بھوک نہیں ہے' کیا ہوگیا ہے ایسا جس نے تمہاری بھوک ختم کردی ہے؟''

''پتا نہیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز برت رہی تھی' میکال نے اسے بھی اس کا جرم گردانا۔

''کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ہمارے درمیان فاصلے بڑھتے جارہے ہیں۔''

''آئی ڈونٹ کیئر۔'' بیزار کن لہجے میں کہتی وہ فوراً بیڈ سے اٹھ کر ٹیرس پر چلی آئی تھی' نیچے لان کے ایک کونے میں ذرا سی روشنی کیے نہال بیٹھا تھا۔ اس کے آنسو پھر روانی سے بہنے لگے' ذہن کے پردے پر اچانک کچھ مناظر جھلملائے تھے۔

''اے کیا ہوا؟ جان لے لوں گا تمہاری اگر مجھ پر ایسی پابندی لگائی تو یا سیلی ناراض ہوئیں۔'' اس کے تنگ کرنے پر جب وہ ناراض ہوئی تھی تو کیسے اس کی جان پر بن گئی تھی۔

آنکھوں کے گوشوں میں جھلکتی نمی نے سچ مچ اسے حیران کردیا تھا مگر...... اس وقت وہ کہاں جانتی تھی کہ وہ نہال حسن کے لیے کیا ہے؟ رات گزرتی جارہی تھی مگر وہ گزرے لمحوں کا احساس کیے بناء وہیں کھڑی رہی۔ نہال اب لان سے اٹھ گیا تھا' وہ بھی بے قراری کمرے میں واپس پلٹ آئی' میکال کمرے میں نہیں تھا۔ فضا میں خنکی تھی کہ بڑھتی جارہی تھی' دونوں بازو آپس میں لپیٹتے ہوئے وہ بیڈ پر آ بیٹھی۔

زندگی نے کتنا عجیب کھیل کھیلا تھا اس کے ساتھ جس شخص نے اسے ٹوٹ کے چاہا تھا وہ خود ٹوٹ گیا تھا مگر اس نے اپنی چاہت کبھی اس پر عیاں نہیں کی تھی اور وہ شخص جسے تقدیر نے اس کا ہم سفر بنادیا تھا' جس کی محبت اس کی رگ رگ میں اتاردی تھی اسے شاید اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق ہی نہیں پڑ رہا تھا کیوں ہوا تھا اس کے ساتھ ایسا؟

جب وہ میکال حسن کے ساتھ زندگی کی شروعات کرنا ہی نہیں چاہتی تھی تو اسے زبردستی اس پر مجبور کردیا تھا اور اب جب کہ وہ اس کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتی تھی تو نہال حسن کی محبت اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ یوں ہی روتے روتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی' اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو میکال آفس کے لیے تیار ہورہا تھا۔ ہانیہ کو خبر ہی نہیں تھی کہ وہ بھی ساری رات جاگتا رہا تھا' اس کی شریانیں بھی پھٹ رہی تھیں' آنکھوں کے گوشوں میں پڑے سرخ ڈورے اس کے اضطراب کی کہانی سنا رہے تھے۔ وہ اٹھی اور میکال کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی تھی۔

''سوری میکال! رات میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں نے آپ سے بُرا برتاؤ کیا' پلیز مجھے معاف کردیں۔''

''اٹس اوکے۔'' بناء اس پر نگاہ ڈالے اس نے ٹائی کی ناٹ کو سیدھا کیا تھا تبھی وہ اس کے سامنے آئی تھی۔

''میکال مجھے آپ سے کچھ شیئر کرنا ہے' نہال کو لے کر کچھ بتانا ہے آپ کو؟'' وہ مضطرب تھی میکال کی پیشانی کی سلوٹوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔

''ہم کبھی میں آفس سے لیٹ ہورہا ہوں' واپسی پر بات کریں گے۔''

''ناشتا کرکے جایئے گا' میں ابھی لاتی ہوں۔''

''نہیں اس وقت ضرورت نہیں ہے' میں پہلے ہی بہت لیٹ ہورہا ہوں' خدا حافظ۔'' اس وقت وہ اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا تبھی فوراً کمرے سے نکل گیا۔ ہانیہ پریشان سی کمرے سے نکل کر نیچے چلی آئی' سارہ اور مائرہ کچن میں ناشتا بنارہی تھیں جب کہ آسیہ بیگم ابھی کمرے سے ہی نہیں نکلی تھیں' وہ فریش ہوکر لان میں چلی آئی۔ نہال پودوں کے ساتھ مصروف تھا اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔

''آج آفس نہیں گئے تم؟''

''نہیں۔'' چونک کر پلٹتے ہوئے اسے دیکھنے کے بعد بہت

روکھے لہجے میں اس نے جواب دیا تھا' وہ پاس آ بیٹھی۔

"کیوں؟"

"دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"نہال تم مجھ سے ٹھیک سے بات کیوں نہیں کررہے ہو کیوں بھاگ رہے ہو مجھ سے؟ میں جانتی ہوں تمہارے دل میں میرے لیے کیا ہے' مگر جانتے ہوئے بھی میں کچھ کر نہیں سکتی کیونکہ میں میکال کی بیوی ہوں' پیار کرتی ہوں اس سے بے حد بے تحاشا میرا کیا قصور ہے کہ تم مجھ سے بات بھی نہ کرو' اتنے اچھے دوست ہو کہ اپنی ہر بات ہر راز مجھ سے الگ کرلو' بولو......"

اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے وہ جذباتی ہوئی تھی۔

"کیا قصور ہے میرا اگر میری شادی زبردستی میکال حسن سے ہوگئی مگر اب نہ وہ میری شکل دیکھنے کا روادار ہے نہ تم' کیوں؟" اچانک اس کا لہجہ بھرآ گیا تھا' نہال نے کھریہ سائیڈ پر پھینک کر ہاتھ جھاڑ لیے۔

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں ہانیہ! بس میں چاہتا ہوں تم ہمیشہ خوش رہو' میری وجہ سے تمہاری خوشیوں کو کبھی گہن نہ لگے۔"

"تمہاری وجہ سے میری خوشیوں کو گہن کیوں لگے گا نہال! تم تو میرے سچے خیر خواہ ہو' تم نے تو ہمیشہ میری خوشیاں کی دعا کی ہے پھر یہ سوچ بھی کیسے لیا تم نے کہ تمہاری وجہ سے میری خوشیوں کو گہن لگ سکتا ہے۔"

"بس...... خیر سوری اس روز مجھے تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔"

"صرف سوری......؟"

"نہیں ہاتھ بھی جوڑوں گا' کان بھی پکڑوں گا اور تمہیں تمہاری پسند کے اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا بھی کھلاؤں گا۔"

"ہوں' یہ ہوئی نا بات......" مسکرا کر اس کے کندھے پر مکا رسید کرتے ہوئے وہ جیسے ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔

اس روز اس نے نہال کے ساتھ ناشتا کیا تھا' وہ اسے زیادہ سے زیادہ خوش رکھنا چاہتی تھی تاکہ موت کو اس سے دور رکھ سکے اور اس مقصد کے لیے خواہ سارا گھر ہی اس کے خلاف کیوں نہ ہوجاتا' وہ باز آنے والی نہیں تھی۔

دوپہر سے کچھ پہلے نہال اپنے ایک دوست سے ملنے نکل گیا تو وہ بھی گاڑی لے کر میکال کے آفس چلی آئی' مقصد اس کی ناراضگی دور کرکے اسے سرپرائز دینا تھا' اگلے میں منٹ میں وہ اس کے آفس میں تھی' ریسپشنسٹ کو اس نے اطلاع دینے سے منع کردیا تھا' قطعی فریش موڈ میں ہلکے سے میکال کے روم کا دروازہ ناک کرکے اگلے ہی پل جونہی وہ اندر داخل ہوئی گویا ساری چھت کا ملبہ اس کے سر پر آپڑا۔

پھٹی پھٹی نگاہوں سے وہ سامنے بڑے سے صوفے پر لیٹی اس بے ہودہ لڑکی اور اس پر جھکے میکال حسن کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

"ہانیہ تم......؟" دروازے پر ہلکی سی ناک پر سنبھل کر کھڑے ہوتے ہوئے میکال نے جونہی دہلیز پر ساکت کھڑی ہانیہ کو دیکھا۔ ششدر رہ گیا مگر اس میں تو ہلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ پتھر کی مورت بنی وہ اندر سے جیسے کرچی کرچی ہوگئی تھی۔

کچھ ہی لمحوں میں نظر کے سامنے کا سارا منظر جیسے دھندلا گیا۔ اس سے پہلے کہ میکال اس کے قریب آتا وہ پلٹی اور ہوا کی رفتار سے چلتی ہوئی آفس کی عمارت سے نکل گئی۔ میکال پیچھے اسے پکارتا رہ گیا تھا۔ رات اس کی واپسی خاصی لیٹ ہوئی تھی۔ ہانیہ لان کی سیڑھیوں پر دونوں بازو لپیٹے نہال کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ گاڑی سے نکل کر ان کے قریب آیا کچھ دیر رکا پھر بنا کچھ کہے اندر لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ ہانیہ کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

"تم نے مجھ سے کیوں چھپایا نہال کہ تم مجھ سے پیار کرتے ہو؟" اس کی آواز بھاری ہورہی تھی۔

"بتانے کا فائدہ بھی کیا تھا جب تک مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی تم میکال بھیا کی زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔"

"تم جانتے ہو میں اس شادی کے لیے ذہنی اور دلی طور پر تیار نہیں تھی۔ تم چاہتے تو یہ شادی رکوا سکتے تھے۔"

"نہیں رکوا سکتا تھا کیونکہ پاپا اور مما ذہنی طور پر تمہیں میکال بھیا کے لیے پسند کرچکے تھے۔"

"ٹھیک' جو ہوگیا سو ہوگیا مگر اب تمہیں شادی کرلینی چاہیے۔"

"ہوں' کرلوں گا۔ مگر ابھی میری کچھ مجبوریاں ہیں ابھی نہیں کرسکتا۔"

"کیسی مجبوریاں؟" وہ سب جانتی تھی مگر پھر بھی اس کا امتحان لے رہی تھی۔

"ہیں کچھ مسائل تمہیں نہیں بتا سکتا۔ بس تم میرے لیے دعا کیا کرو۔"

"کرتی ہوں مگر تم اب بہت کچھ چھپانے لگے ہو' دس از ناٹ فیئر۔"

"تم سے کچھ نہیں چھپا سکتا ہانیہ! چلو اب اٹھو۔ میکال بھائی تمہارا انتظار کررہے ہوں گے۔" اس کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

ہانیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بیٹھ جاؤ نہال پلیز۔ میرا دل ابھی اندر جانے کو نہیں چاہ رہا۔"

"کیوں؟ کیا میکال بھائی سے جھگڑا ہوگیا ہے؟"

"نہیں اس سے جھگڑا کیوں ہوگا؟ بس میرا دل تمہاری وجہ سے بوجھل ہے۔"

"میری وجہ سے دل کو بوجھل رکھنا چھوڑ دو ہانیہ۔ ہم بس اچھے دوست ہیں۔ ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے۔ چلو اٹھو اب اس سے پہلے کہ وہ ناراض ہوجائیں۔" اس بار اس نے جھک کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے زبردستی اسے اٹھا دیا تھا۔

ہانیہ کمرے میں آئی تو میکال فریش ہوکر بیڈ پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی جگہ لیٹ گئی۔ اگلے روز موسم اچھا تھا۔ نہال کا اچانک لانگ ڈرائیو کا پروگرام بن گیا۔ سارا اور مائرہ اپنی دوست کے گھر گئی تھیں۔ وہ زبردستی ہانیہ کو کھینچ کر لے گیا۔ مسز حسن نے بھی اس کی فیور کی تھی۔ بہت دنوں کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کی کمپنی میں موسم کو انجوائے کررہے تھے۔ بادلوں سے ڈھکے آسمان نے دن کی روشنی کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ وہ لوگ مختصر ڈرائیو کے بعد ہوٹل سے کھانا کھا کر نکلے تو مغرب سے عشاء ہوگئی تھی۔ ساتھ ہی ہلکی بارش کی شدت میں بھی اب اضافہ ہوگیا تھا۔ ہانیہ پریشان ہوگئی۔

"دیکھا میں نے کہا تھا ناں یہ بارش نہیں رکنے والی مگر تم بھی نہال! بالکل اپنے بھائی پر گئے ہو' اپنی بات منوا کر ہی دم لیتے ہو۔"

"کوئی بات نہیں بارش کا کیا ہے' ابھی رک جائے گی۔ نہ بھی رکی تو ہم نے کون سا پیدل گھر جانا ہے۔"

"تم سے کچھ بعید نہیں پیدل بھی لے جاسکتے ہو۔"

"ہوں' بالکل بجا فرمایا آپ نے۔" گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔ ہانیہ نے جواباً اس کے کندھے پر زور کا مکا رسید کیا۔

"ترسو گی ہانیہ ڈیئر' نہال حسن کے ساتھ ان بارشوں کے حسن کو محسوس کرنے کے لیے ترسو گی بھی۔" ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اب وہ اسے تنگ کررہا تھا۔ ہانیہ نے لب بھینچ لیے۔

"مارکیٹ سے کچھ چاہیے تمہیں؟"

"نہیں' بس اب گھر چلو پلیز۔"

"مجھے ایک دو چیزوں کی ارجنٹ ضرورت تھی وہ لے لوں پھر چلتے ہیں گھر۔" ٹرن لیتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ہانیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی نظریں کھڑکی کے اس پار بھیگتے ہوئے موسم کے باعث بھیگی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

"تم میکال بھیا کے ساتھ خوش تو ہو نا ہانیہ۔"

"ہوں۔"

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میرا خیال تھا وہ ڈائری پڑھنے کے بعد تم بہت ڈسٹرب ہوجاؤ گی شاید مجھ سے نفرت بھی کرنے لگو۔

اسی لیے اتنا ناراض ہوا تھا میں تم پر۔"

"ہوں میرے بارے میں تمہاری سوچ بالکل پرفیکٹ ہے۔ میں یقیناً یہی کرتی اگر تم......!" فوراً سے پیشتر اس نے اپنی زبان کو بریک لگایا تھا۔

نہال چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"اگر تم کیا......؟"

"اگر تم میرے بہت اچھے دوست نہ ہوتے تو۔" بروقت اسے مناسب جملہ مل گیا تھا۔

نہال نے مسکرا کر سر جھٹک دیا تبھی ہانیہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا تھا۔

"گاڑی روکو نہال پلیز۔"

"خیریت؟" فوراً سے پیشتر اس کے حکم پر عمل درآمد کرتے ہوئے اس نے گاڑی روکی تھی۔ ہانیہ کی نظریں کھڑکی کے اس پار کے منظر پر جم گئیں۔ نہال نے اس کی نظروں کی تقلید کی اور پھر جیسے وہ بھی ششدر رہ گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر میکال ایک نیم عریاں لڑکی کو بانہوں میں لیے سڑک کنارے ایک شٹر کے نیچے کھڑا تھا۔ سردی کی شدت سے لڑکی اس کے اندر سمٹی جا رہی تھی۔ شاید وہ لوگ پیدل واک پر نکلے تھے نہال کو لگا جیسے وہ سانس بھی نہیں لے سکے گا۔

"چلو نہال پلیز۔" دو منٹ کے بعد ہی ہانیہ نے اپنی نظر اس منظر سے ہٹالی۔

"نہیں، تم دیکھو میں اس شخص کے ساتھ کرتا کیا ہوں۔" غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے اس نے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولا تھا جب ہانیہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"نہیں، ابھی سڑک پر تماشہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ گھر چل کر بات کریں گے۔"

"ہانیہ تم۔"

"پلیز نہال، پلیز۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ہانیہ کی آنکھوں کے آنسو اور لبوں کی التجا نے اسے بے بس کر ڈالا۔ غصے سے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔

"کون ہے یہ لڑکی؟"

"پتا نہیں، کوئی ماڈل ہے شاید۔"

"تم جانتی ہو اسے؟"

"نہیں۔"

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو ہانیہ؟"

"نہیں نہال میں چاہوں بھی تو تم سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔" رخ پھیرتے ہوئے اس نے آنسو پونچھے تھے۔ نہال گاڑی کو مین ہائی وے پر لے آیا۔ یہی وہ روڈ تھا جہاں میکال کی گاڑی خراب ہوئی تھی اور اسے اس کے ساتھ اس خطرناک اور بدبودار کمرے میں رات گزارنی پڑی تھی۔ بارش کی تیزی اور شدت نے مزید زور پکڑ لیا۔ جب ہی اچانک گاڑی کا انجن بند ہوا تھا۔

"مائی گاڈ اسے بھی ابھی بند ہونا تھا۔" جھنجلاتے ہوئے نہال نے سارا غصہ اسٹیرنگ وہیل پر نکالا۔ ہانیہ کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ بے ساختہ اسے میکال کے الفاظ یاد آئے تھے۔

"روڈ سنسان اور خطرناک ہے خدا نہ کرے ابھی ہمیں یہاں کھڑے دیکھ کر کوئی اسلحہ لے کر آ گیا تو کیا کریں گے۔ سنا ہے آئے روز اس روڈ پر بہت وارداتیں ہوتی ہیں۔" نہال گاڑی سے نکل کر انجن چیک کر رہا تھا۔ وہ پریشان سی مختلف قرآنی آیات کا ورد کرتی رہی۔ جانے کیوں اس کا دل اس لمحے بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"سوری ہانیہ! انجن کام نہیں کر رہا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں کسی دوسری سواری کی تلاش کرنی پڑے گی۔"

"اتنے خراب موسم میں دوسری سواری کہاں سے ملے گی؟"

"مل جائے گی میں دیکھتا ہوں تم ٹینشن نہ لو پلیز۔" وہ پورا پور بارش میں بھیگ چکا تھا۔ وہ پریشان سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ تقریباً دس منٹ بعد ایک کاران کے قریب رکی تھی۔

"ہیلو کوئی مسئلہ ہے کیا؟" دو خوبرو اور اچھے گھر کے نظر آنے والے لڑکے کھڑکی سے سر نکال کر ان سے پوچھ رہے تھے نہال نے ہانیہ سے نظر ہٹا کر ان کی جانب توجہ مبذول کی۔

"ہوں گاڑی کا انجن خراب ہو گیا ہے۔"

"اوہ، یہ بہت سنسان اور خطرناک روڈ ہے۔ آپ چاہیں تو اپنی گاڑی لاک کر کے یہیں چھوڑ دیں ہم آپ کو ڈراپ کر دیتے ہیں۔" بارش طوفانی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ نہال کو مجبوراً ہانیہ کی وجہ سے ان کی آفر قبول کرنی پڑی اور یہ اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ بظاہر اچھے گھرانے کے نظر آنے والے وہ لڑکے پیشہ ور ڈاکو تھے جنہوں نے کچھ ہی دور لے جا کر گاڑی روک دی تھی۔ جہاں ان کے مزید ساتھی پہلے سے موجود تھے۔ نہال کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ تقدیر اس کے ساتھ ایسا عجیب و غریب کھیل بھی کھیل سکتی ہے۔ ان لوگوں نے بظاہر معزز شہری بن کر انہیں مدد کے بہانے لوٹ لیا تھا۔

نہال کی پیشانی سے پسٹل ٹکا کر انہوں نے اس کا پرس' گاڑی کی چابی' موبائل' گھڑی سب ہتھیا لیا تھا اور اب ان کی نظر ہانیہ پر تھی۔ تبھی نہال کا ان لوگوں سے جھگڑا ہوا تھا اور یہ جھگڑا اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ انہوں نے نہال پر فائر کھول دیا۔ ہانیہ چیخ چیخ کر مدد کے لیے پکارتی رہی۔

اسی دوران وہ لوگ نہال کو سڑک پر پھینک کر فرار ہوگئے۔ نہال کو پیٹ میں گولی لگی تھی اس کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ہانیہ کے حواس گم ہو رہے تھے۔ اس کی پکار پر کافی دیر بعد کچھ لوگ نہال کو اٹھا کر اسپتال لے جا رہے تھے وہ گم صم سی ساتھ بیٹھ گئی۔

صبح کے تقریباً ساڑھے چار دس بجے نہال کو ہوش آیا تھا۔ رات دو بجے اسے آپریشن کے لیے لے جایا گیا۔ جو لوگ اس کے ساتھ تھے وہی سب خرچہ اور دیکھ بھال کر رہے تھے۔ ہانیہ تو جیسے بت بنی بیٹھی تھی ایک بار بھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ اسے گھر میں کسی کو فون کر کے اطلاع دینی چاہیے۔ پتھر کی مورت بنی وہ بس روئے چلی جا رہی تھی۔ نہال تکلیف کی پروا کیے بغیر اسے تسلی دیتا رہا۔ اگلے روز شام میں ان کی گھر واپسی ہوئی تھی۔ سب لوگ از حد متفکر لاؤنج میں بیٹھے تھے جیسے ہی ان کی نظر ہانیہ اور نہال پر پڑی گویا ان سب میں ایک برقی رو دوڑ گئی۔

"ہانیہ' نہال...... کہاں تھے تم؟" مسز حسن سب سے پہلے ان کی طرف لپکی تھیں۔ ہانیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ نہال کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے انہیں اپنے ساتھ پیش آنے والا سانحہ من و عن سنا دیا۔ سب اس کی روداد سن کر ساکت بیٹھے تھے۔ جب میکال بول اٹھا۔

"ہوگئی تمہاری فرضی کہانی مکمل؟" اس کی آنکھوں سے جیسے آگ نکل رہی تھی۔ ہانیہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"فرضی کہانی نہیں سنا رہی ہوں میں جو حقیقت ہے وہی بتا رہی ہوں۔"

"جسٹ شٹ اپ۔" حلق کے بل چلا کر دھاڑتے ہوئے اس نے اپنی ساری قوت صرف کر دی تھی۔

"سب کو دھوکا دے سکتے ہو تم لوگ مگر مجھے نہیں' سمجھی تم۔"

"میکال! ہوش کے ناخن لو کیا ہوگیا ہے تمہیں؟" حسن صاحب نے اسے ڈپٹنا چاہا تھا مگر وہ اس وقت اپنے آپے میں نہیں تھا۔

"پاگل ہوگیا ہوں میں کیونکہ جس لڑکی کو اپنی عزت بنا کر اپنا نام دے کر میں اس گھر میں لایا تھا وہ ایک بے حیا بد کردار لڑکی ہے ڈھول جھونک رہی ہے آپ سب کی آنکھوں میں پارسا بن کر۔ بہت ضبط اور برداشت سے کام لے لیا میں نے اب اور نہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"سچ کہہ رہا ہوں میں' یہ داشتہ ایک وقت میں دو بھائیوں کے جذبات سے کھیل رہی ہے۔ میں نے خود کئی بار ان دونوں کو نازیبا حالت میں دیکھا ہے۔ میری غیر موجودگی میں سارا سارا دن یہ نہال کے کمرے میں گھسی رہتی ہے۔ اب بھی یہ لوگ عیاشی کر کے آ رہے ہیں۔ ہم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بے وقوف بنا رہے ہیں' ہمیں مگر میں بے وقوف نہیں ہوں نا ہی آپ لوگوں کی طرح میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے کہ گھر میں جو مرضی ہوتا رہے اور مجھے پتا ہی نہ چلے۔"

"بکواس بند کرو میکال! ہانیہ اور نہال ایسے نہیں ہیں۔"

"ایسے ہی ہیں اس سے بھی زیادہ گرے ہوئے اور مکروہ ہیں میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی لڑکی پر اور ایسی رفاقت پر آج کے بعد یہ بد کردار میری طرف سے فارغ ہے۔ آپ لوگوں کو اگر یقین نہیں آتا تو یہ بھی سن لیں ان دونوں کے راز و نیاز اور کرتوت۔" غصے کی شدت نے اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت مفلوج کر دی تھی۔ تبھی شائستگی اور تہذیب کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ ہانیہ کو لگا جیسے اس کی سانس سینے میں ہی اٹک گئی ہو۔ میکال کے الفاظ پتھروں سے کم نہیں تھے۔ نہال کا دل چاہا کاش زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

حسن صاحب اور باقی لوگ اب میکال کی موبائل کے ریکارڈنگ سن رہے تھے۔ وہ ریکارڈنگ جو مائرہ نے اسے مہیا کی تھی۔

"تم نے مجھ سے کیوں چھپایا نہال کہ تم مجھ سے پیار کرتے تھے۔"

"بتانے کا فائدہ بھی کیا تھا جب تک مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی تم میکال بھیا کی زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔"

"تم جانتے ہو میں اس شادی کے لیے ذہنی اور دلی طور پر تیار نہیں تھی۔ تم چاہتے تو یہ شادی رکوا سکتے تھے۔"

"نہیں رکوا سکتا تھا کیونکہ پاپا اور مما ذہنی طور پر تمہیں میکال بھیا کے لیے پسند کر چکے تھے۔"

"چلو ٹھیک ہے جو ہوگیا سو ہوگیا مگر اب تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔"

"ہوں' کر لوں گا مگر ابھی میری کچھ مجبوریاں ہیں ابھی نہیں کر سکتا۔"

"کیسی مجبوریاں؟"

"ہیں کچھ تمہیں نہیں بتا سکتا۔ بس تم میرے لیے دعا کیا کرو۔"

"کرتی ہوں' مگر تم اب بہت کچھ چھپانے لگے ہو' ڈس از ناٹ فیئر۔"

"تم سے کچھ نہیں چھپا سکتا ہانیہ۔ چلو اب اٹھو میکال بھائی انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"بیٹھ جاؤ نہال میرا دل ابھی اندر جانے کو نہیں چاہ رہا۔"

"کیوں کیا نہال بھائی سے جھگڑا ہوگیا ہے۔"

"نہیں اس سے جھگڑا کیوں ہوگا۔ بس میرا دل تمہاری وجہ سے بوجھل ہے۔"

وہ گفتگو جو ان کے درمیان اس روز شام ہوئی تھی مائرہ نے ریکارڈ کر لی تھی۔ لاؤنج میں بیٹھے سب افراد کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ نہال نے ایک نظر مائرہ کی طرف دیکھا اور پلکیں موند لیں۔ بدن پر لگے زخموں سے زیادہ اندر کے زخم تکلیف دینے لگے۔ وہ خود کو ہانیہ کا مجرم سمجھنے لگا۔ اتنی سی سکت بھی نہیں رہی تھی اس میں کہ وہ میکال کے لگائے ہوئے گھٹیا ترین الزام پر اس کا گریبان ہی پکڑ سکتا۔ دوسری طرف ہانیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سب کے سامنے ساری حقیقت کھول کر رکھ دے میکال کی بھی اور نہال کی بھی...... مگر...... اس نے ایسا نہیں کیا تھا بنا کوئی صفائی پیش کیے وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اگلے روز بخار سے تپتے وجود کے ساتھ وہ مسز حسن کو بتا کر ان کے روکنے کے باوجود اپنے میکے چلی آئی تھی۔ تقریباً ایک ماہ تک اس کی طبیعت ہی نہ سنبھل سکی۔ بچے کی گروتھ بھی متاثر ہو رہی تھی۔ جاذب اور ہادیہ اس کے لیے بہت پریشان تھے مگر اس نے ان کی پریشانی کی پروا کیے بغیر میکال کو خلع کے لیے نوٹس بھجوا دیا تھا۔ صفدر صاحب کو معاملے کی خبر ہوئی تو وہ دل کے دورے کا شکار ہوگئے۔ ساتھ ہی فالج کا ایسا زبردست اٹیک ہوا کہ بستر سے بندھ کر رہ گئے تھے۔ نہال کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ حسن صاحب اور ان کی بیگم ہونا تے تھے اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔

تقریباً دو ماہ کے بعد اس نے پیارے سے صحت مند بیٹے کو جنم دیا تھا اور یہیں تک اس کی دوستی فارحہ سے ہوئی تھی شادی کے بعد ہادیہ کی گھریلو مصروفیات نے اسے فارحہ کے قریب ہونے کا موقع دیا تھا۔ فارحہ اس کے سرال کے قریب رہتی تھی اور اپنی ساس کے علاج کے سلسلے میں اسی اسپتال میں آتی تھی جہاں بچے کی ڈیلیوری کے سلسلے میں وہ ایڈمٹ ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ دونوں کی دوستی گہری ہوتی گئی تھی۔ جس روز اس نے بچے کو جنم دیا تھا اسی روز اسے میکال کی طرف سے طلاق نامہ موصول ہوگیا تھا۔ مگر ہادیہ نے اسے چھپا لیا۔ جس روز اس کے بیٹے کی پہلی سالگرہ تھی اسی روز اس نے فارحہ کو ہادیہ سے کہتے ہوئے سنا تھا۔

"تمہیں پتا ہے ہادیہ میکال نے دوسری شادی کر لی ہے۔"

"وہاٹ؟" جہاں اس کے اعتبار کو شدید دھچکا لگا تھا وہیں ہادیہ بھی چونک اٹھی تھی۔

"ہاں' کل گھوم رہا تھا اپنی بیوی کے ساتھ مارکیٹ میں' حسن انکل اور ان کی مسز نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس کی بیوی شوبز سے وابستہ ہے۔ شاید اسی لیے اس نے آسانی سے ہانیہ کو طلاق دے دی۔ بہر حال تم ہانیہ کو مت بتانا وہ ابھی کوئی صدمہ افورڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔"

"ہوں۔"

ہادیہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ہانیہ کو لگا جیسے اس کا وجود پتھر کا ہوگیا ہو۔ اس کی ذات کی شاندار عمارت لمحوں میں زمین بوس ہوگئی ہو۔ کیسی حقیقت تھی یہ' جس نے اسے اندھیروں میں دھکیل دیا تھا۔ یوں کہ اس میں ہلنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ پلٹی تھی اور دھڑام سے زمین پر آ پڑی تھی۔ فارحہ اور ہادیہ اس کے گرنے کی آواز پر تیزی سے اس کی طرف لپکی تھیں مگر تب تک وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو چکی تھی۔ تقریباً پندرہ دن کے بعد اس کی حالت نارمل ہوئی تھی اور وہ اتنا روئی تھی کہ خود آنسوؤں کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔ بہت مشکل سے سنبھالا تھا اس نے خود کو' ادھر میکال کی بے چینی تھی کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ علیزہ کے ساتھ رہ کر بھی ہانیہ اس سے دور نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے آواز دیتا تھا مگر ہر بار اس کے منہ سے ہانیہ نکلتا تھا۔ ہر حالت میں وہی اس کے اعصاب پر سوار رہتی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی نشہ نہیں کیا تھا مگر اب وہ چین سموکر بن کر رہ گیا تھا۔ بات بات پر علیزے کے ساتھ اس کا جھگڑا ہو جاتا اور نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی۔

عائشہ ذھان بھی اپنے شوہر کے ساتھ دیار غیر میں شفٹ ہو چکی تھی۔ ان دنوں وہ اسلام آباد میں تھا جب ایک چھوٹے سے روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر اسے اسپتال جانا پڑا اور یہیں اس نے نہال کو دیکھا تھا۔ بے حد لاغر اور کمزور وہ بری طرح کھانس

رہا تھا۔ میکال کا دل چاہا وہ اس کی جان لے لے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اسپتال سے نکل گیا تھا۔ تقریباً ایک ہفتے بعد چیک اپ کے لیے وہ دوبارہ اسی اسپتال میں آیا تھا اور تب وہیں اسے نہال حسن کی بیماری کے بارے میں پتا چلا تھا۔ اس کا آدھے سے زیادہ جگر کٹ کر حلق کے راستے باہر نکل چکا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق اس کے پاس بہت کم زندگی کے دن رہ گئے تھے۔ وہاں اس اسپتال میں نہال کا دوست بہت اچھا اور قابل ڈاکٹر تھا اور نہال اپنی بیماری اور علاج سے متعلق اسی سے سب کچھ ڈسکس کرتا تھا۔ میکال کو لگا جیسے اس کی سماعتیں کام کرنا چھوڑ گئی ہوں۔ اس شخص سے اسے لاکھ عداوتیں سہی مگر وہ اس کا بھائی تھا۔ بے حد محبوب اور لاڈلا بھائی۔ اس روز وہ نہایت غائب دماغی اسپتال سے نکل آیا تھا۔

اگلے تین چار روز تک وہ خود کو سنبھال ہی نہ سکا۔ تین چار روز کے بعد اس نے نہال سے متعلق انکوائری کی تو پتا چلا کہ وہ تو پچھلے ایک سال سے بیماری کی لپیٹ میں تھا۔ شاید بھی ہانیہ اس سے بہت کلوز تھی۔ اگر وہ اس کی بیماری کے بارے میں جانتی تھی تو یہ بات اس نے اس سے کیوں چھپائی؟ الجھن سی الجھن تھی۔

علیزے کی شوبز کی مصروفیات بہت بڑھ چکی تھیں۔ اب وہ اکثر پوری پوری رات گھر سے غائب رہتی ماڈلنگ کے ساتھ ساتھ بڑی اسکرین پر آفرز نے اسے ہواؤں میں اڑنے پر مجبور کردیا تھا۔ ڈھیر ساری دولت اور شہرت کے لیے اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا یہاں تک کہ اپنی نسوانیت بھی بڑے بڑے ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز کے ساتھ اس کے روابط اب محض اسٹوڈیو اور شوٹنگ تک محدود نہیں رہے تھے۔ گھر تک پہنچ گئے تھے۔ میکال کی غیر موجودگی میں نا چاہتے ہوئے بھی اسے انڈسٹری کے بڑے مگرمچھوں کی خوشی کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔

میکال اس روز شدید ڈپریشن کا شکار گھر آیا تو وہ شوٹنگ کے لیے نکل رہی تھی۔ وہ چڑ گیا۔

"کہاں جارہی ہو؟"

"اسٹوڈیو ایک نیا پروجیکٹ شروع کیا ہے دعا کرنا اس میں بھی کامیابی میرے قدم چومے۔"

"جسٹ شٹ اپ کہیں نہیں جارہی ہو تم اس وقت بھی۔"

"کیا مطلب؟" میکال کے غصے وہ حیرانی سے پلٹی تھی۔

"کوئی مطلب نہیں سوائے اس کے کہ آج کے بعد تم کسی شوٹنگ پر نہیں جاؤں گی کوئی کمرشل کوئی فلم نہیں کروگی۔"

"کیوں؟ کیوں نہیں کروں گی؟" اس کے تو جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میکال نے سر جھٹک دیا۔

"مجھے پسند نہیں ہے اس لیے۔"

"مائی فٹ تمہاری پسند ناپسند کے لیے میں اپنی زندگی داؤ نہیں لگا سکتی۔ بڑی مشکل سے یہ مقام حاصل کیا ہے میں نے اب کہیں جا کر خوشی ملنے لگی ہے تو تم چاہتے ہو میں اسے ٹھوکر ... دوں؟ کبھی نہیں......!"

"مارنی پڑے گی تمہیں ٹھوکر کیونکہ تمہارے لیے میں ... اپنا سب کچھ کھویا ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟ میں نے تو نہیں کہا تھا تمہیں سب کچھ کھونے کے لیے ویسے بھی تم کنگلے ہو اب میں بھی تمہاری طرح گھر بیٹھ گئی تو کھائیں گے کہاں سے۔"

"فاقے کرلیں گے مگر میں مزید بے حیائی برداشت نہیں کروں گا۔"

"واہ تمہاری دسترس میں آ گئی تو بے حیا ہوگئی آپ بھول رہے ہیں مسٹر میکال کہ آپ سے شادی سے پہلے بھی میں ایسی ہی بے حیا تھی۔ یہی میرا پروفیشن اور مصروفیات تھیں تو پھر کیوں اپنایا اس بے حیا کو کیوں اپنی زندگی میں شامل کیا۔ رہتے ... پاکباز جنتی بیوی کے ساتھ۔ جو تمہارے نکاح میں ہوتے ہوئے بھی تمہارے بھائی کے ساتھ سر عام گھر سے اڑاتی پھرتی تھی۔"

"چٹاخ۔" اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی میکال کے زور دار تھپڑ نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔

"جان لے لوں گا میں تمہاری اگر تم نے ایک بھی لفظ ہانیہ کے خلاف کہا تو۔"

"بڑی محبت جاگ رہی ہے آج اس کی مگر کان کھول کر سن لو میکال! تم زور وجبر سے مجھے اس گھر کی چار دیواری میں قید نہیں رکھ سکتے، سمجھے۔" چنگھاڑ کر کہتے وہ وہاں سے فوراً نکل گئی تھی پیچھے میکال بیڈ پر گر کر پلکیں موند گیا۔ جانے کیوں آج اس کا دل بہت زیادہ رونے کو چاہ رہا تھا۔ شدید تھکن کے باوجود اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور آوارہ گردی کے لیے نکل گیا تھا۔ رات گئے گھر واپسی ہوئی تو طبیعت خاصی بحال ہوچکی تھی۔ اگلے دن بنا ناشتا کیے وہ جاب کے لیے نکل گیا۔ شام ڈھلے گھر واپسی ہوئی تو علیزے گھر پر تھی اور فون پر کسی کے ساتھ بات کررہی تھی۔ اس کے لبوں سے اپنا نام سن کر وہ ٹھیر پر رک گیا۔

"میں اب اس شخص کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتی ریان ...

درد سر بن گیا ہے اسی لیے میں نے سوچ لیا ہے اب مزید اس شخص کے ساتھ ایک پل بھی نہیں رہنا میں نے۔"

"نہیں...... نہیں ابھی جان سے مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں طلاق کا مطالبہ کررہی ہوں نہ مانا تو پھر دیکھ لیں گے۔ میں نے سوچا تھا امیر آسامی ہے فائدہ اٹھاؤں گی۔ مجھے کیا پتا تھا فقیر ہوکر میرے گلے پڑ جائے گا۔ خیر اتنا تو تم بھی جانتے ہو اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے میں کچھ بھی کرسکتی ہوں۔" میکال کی آمد سے بے خبر وہ اپنی ہی دھن میں لگی ہوئی تھی۔

وہ خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔ واقعی اس کی قسمت میں کسی عورت کی محبت اور وفا نہیں تھی۔ تھکن سے بے حال بنا کپڑے تبدیل کیے وہ بیڈ پر ڈھے گیا تھا۔ سر کی شریانیں درد سے پھٹنے کو تیار تھیں۔ کچھ پل کسلمندی سے پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تبھی اس کی نظر سامنے ٹیبل پر پڑی تھی۔ وہاں کچھ خطوط آئے پڑے تھے۔ اس نے جاب کے سلسلے میں کئی کمپنیز میں اپلائی کررکھا تھا۔ شاید وہیں سے کوئی جواب آیا تھا۔ تبھی سست روی سے اٹھ کر وہ رائٹنگ ٹیبل کے قریب آیا تھا۔ وہاں مختلف کمپنیز کے خطوط کے ساتھ ایک سادہ خط بھی تھا۔ میکال نے وہ خط اٹھالیا۔ بھیجنے والے نے پشت پر اپنا نام پتا تحریر نہیں کیا تھا۔ تبھی اس نے فوراً سے پیشتر اسے چاک کیا تھا اور کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ سامنے شفاف صفحے پر ٹوٹی پھوٹی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔

"میں نہیں جانتی کہ میرا یہ خط پڑھنے کے بعد آپ مجھے معاف کریں گے یا نہیں مگر میں اتنا ضرور کہنا چاہوں گی میں نے بڑی مشکل سے آپ تک رسائی حاصل کی ہے۔ کاش آپ جان سکتے ہیں کہ میں کتنی تکلیف میں ہوں۔ ضمیر کے بوجھ نے مجھے نڈھال کررکھا ہے۔ مجھ جیسے لوگ کبھی بھی معافی کے قابل نہیں ہوتے۔ چاہے ساری عمر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روتے رہیں۔ ہنستی بستی زندگیوں کو چلتی پھرتی لاشوں میں بدل دینے والے اسی قابل ہوتے ہیں کہ خود بھی ساری عمر تماشا ہی بنے رہیں۔ میں آپ کی گناہ گار ہوں۔ میں نے آپ کی زندگی کے ساتھ کھلواڑ کیا ہے۔ صرف اس لیے کیونکہ آپ کے گھر والوں نے ہانیہ کے مقابل مجھے نظر انداز کیا تھا اور اب نہال نے ہانیہ کی وجہ سے مجھے ٹھکرا دیا۔ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے ٹھکرائے جانے کا یہ احساس، کاش میں آپ کو اپنے دل پر پڑے آبلے دکھا سکتی۔ میرا ٹارگٹ آپ نہیں تھے۔ ہانیہ تھی مجھے اس سے نفرت ہوگئی تھی۔ اسی نفرت نے مجھے اس کی زندگی برباد کرنے پر مجبور کیا۔ وہ آپ سے پیار کرتی تھی۔ اعتبار کرتی تھی یہ مجھے پہلے سے پتا تھا۔ مگر نہال کی طرف اس کا جھکاؤ شدید کیوں ہوا یہ ابھی تین روز پہلے پتا چلا ہے۔ نہال کی میڈیکل رپورٹس پڑھنے کے بعد آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ میرا کیا حال ہے۔ نہال جو زندگی کی آخری سیڑھی پر کھڑا موت کو گلے لگا رہا ہے۔ میں نے ہانیہ کی نفرت میں اسے بھی اپنے گھٹیا مقصد کے لیے کیچڑ میں گرادیا۔ وہ جو زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے اسے میں نے صرف اپنے دل کی تسکین کے لیے سب کی نظروں سے گرادیا۔ اس نے تو میرا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔ کبھی غلط نگاہ سے دیکھا بھی نہیں۔ ہمیشہ پیار اور اپنائیت دی مگر میں نے بدلے میں اسی موت کے مسافر کو سولی پر ٹانک دیا۔ آپ بتائیے کیا میں معافی کے قابل ہوں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ گھر جو ہم سب کا مسکن تھا آکر دیکھیے کیسے کھنڈر بن کر رہ گیا ہے۔ سارہ ہر وقت روتی رہتی ہے آنٹی دل کی مریضہ ہوگئی ہیں۔ میں نے آپ کے اور نہال کے یہاں سے جانے کے بعد کبھی انہیں مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ انکل کو دیکھیں گے تو وہ بھی صدیوں کے بیمار اور بوڑھے نظر آئیں گے۔ صرف میری وجہ سے کتنی زندگیاں برباد ہوگئیں، کاش مجھے پہلے ہی اس کا احساس ہوجاتا۔ یہ بے سکونی یہ اضطراب مجھے مار ڈالے گا خدا کے واسطے مجھے معاف کردیں پلیز۔"

خط کیا تھا کوئی بم تھا جو میکال کے سر پر پھٹا تھا۔ کپکپاتے ہاتھوں میں لرزتے کاغذ کی وہ چند سطریں جیسے اس کی ہستی کو ہلا گئی تھیں۔ اتنا بڑا دھوکہ وہ بھی اس کے ساتھ پل میں اس کا جسم پسینے سے بھیگ گیا۔

"نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا...... تم ایسا نہیں کرسکتیں مائرہ...... تم میرے ساتھ ایسا نہیں کرسکتیں۔" شدید بے یقینی کا شکار ضبط کھوتے ہوئے وہ جیسے چلا اٹھا تھا۔ علیزے لپک کر کمرے میں چلی آئی۔

"کیا ہوا؟" اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑی تھیں۔ میکال نے اسے یوں دیکھا جیسے جانتا ہی نہ ہو۔

"کون ہو تم؟"

"میکال...... تم پاگل تو نہیں ہوگئے؟" اس کے سوال پر قدرے خوف زدہ ہوتے ہوئے وہ پیچھے ہٹی تھی تبھی وہ ایک جھٹکے سے اسے سائیڈ پر ہٹاتے ہوئے خود گھر سے باہر نکل گیا۔

❀......❀......❀

ہانیہ کا بیٹا اب پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ اس روز وہ اسے لے

کر مارکیٹ آئی تھی کیونکہ وہ پچھلے کئی دنوں سے کھلونوں کے لیے ضد کررہا تھا۔ وہ ابھی شاپنگ مال میں تھی کہ جب اچانک اس کی نظر کچھ ہی فاصلے پر کھڑے نہال حسن پر پڑی اور وہیں ٹھہر گئی۔

موسم آج بھی ابر آلود تھا۔ کسی بھی لمحے موسلا دھار بارش شروع ہوسکتی تھی۔ ہانیہ نے بیٹے کی انگلی پکڑی اور جلدی سے ایک شاپ میں گھس گئی۔ وہ ابھی کھلونے پسند کررہی تھی جب نہال بھی وہیں چلا آیا۔

"ہانیہ......!" بہت اپنائیت اور محبت کے ساتھ اس نے اسے پکارا تھا۔ ہانیہ کو نا چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

"نہال تم؟"

"ہوں، بہت دنوں کے بعد آج مارکیٹ کا رخ کیا تھا گمان بھی نہیں تھا کہ تم مل جاؤ گی۔" وہ بے حد کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ اتنا کہ ہانیہ کو اس سے خوف محسوس ہونے لگا۔

"مما یہ کون ہیں؟" اس کا بیٹا اب اس کا پلو پکڑے اس سے پوچھ رہا تھا۔ نہال نے اسے [illegible] اٹھالیا۔

"آپ کا چاچو ہوں میری جان پہچانا نہیں۔" کہنے کے ساتھ دو تین بوسے بھی لے لیے تھے۔ ہانیہ کی نظریں بس اس کے چہرے پر ٹکی رہیں۔

"کہاں چلے گئے تھے تم؟"

"بتاتا ہوں، چلو میرے ساتھ۔" اس کے بیٹے کو بانہوں میں اٹھائے وہ شاپ سے باہر نکل گیا تھا ہانیہ ڈبڈبائی آنکھوں سے چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑی۔

"موسم خراب ہے لگتا ہے کسی بھی پل موسلا دھار بارش شروع ہوجائے گی۔ ایسے موسم میں گھر سے کم نکلا کرو ہانیہ۔ یہ بارشیں کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتیں۔" گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ اسے نصیحت کرنا نہیں بھولا تھا۔

ہانیہ کے لب اب بھی چپ کے قفل سے جکڑے رہے۔ تقریباً پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ اسے اپنے فلیٹ میں لے آیا تھا ہانیہ نے ایک نظر فلیٹ کی حالت زار کو دیکھا اور پھر سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

"بیٹھو یہاں، میں تمہارے لیے اور چھٹکو کے لیے کولڈ ڈرنک لاتا ہوں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تمہیں نہیں ہوگی چھٹکو کو ہے۔"

وہ اب بھی مسکرا رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں جیسے سنسان صحرا بسے تھے۔ تین گلاسوں میں کولڈ ڈرنک ڈال کر وہ اس کے مقابل آ بیٹھا تو ہانیہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"انکل اور آنٹی کیسے ہیں سنا ہے سارہ اور مائرہ کی شادی ہو رہی ہے۔"

"ہوں سارہ کی شادی ہورہی ہے مائرہ کے بھائی سے مگر مائرہ کی شادی فی الحال کچھ وقت کے لیے ملتوی کردی گئی ہے۔"

"کیوں؟" اسے حیرانی ہوئی نہال نے رخ پھیر لیا۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈپریشن کے دورے پڑتے ہیں شادی کا نام لو تو چیخنے لگتی ہے۔"

"یہ تو مکافات عمل ہے جو جیسا عمل کرتا ہے اس کا ویسا ہی صلہ پاتا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتی مگر مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہے کہ اس نے میرے اور میکال کے راستے ہی جدا کروادیے۔"

"ہاں! مجھے اطلاع ملی تھی تمہاری اور میکال کی ڈائیورس کی بہت ہرٹ ہوا تھا میں۔ اسی لیے تمہارا سامنا بھی نہ کرسکا۔ مجھے اب بھی یہی احساس بے چین رکھتا ہے ہانیہ کہ میں تمہاری خوشیوں کا قاتل ہوں۔ نہ میں تمہیں چاہتا نہ تمہیں اس راز کا پتا لگتا نہ اس روز ہم اس ٹاپک پر بات کرتے نہ وہ ریکارڈ کرکے میکال بھیا اور دیگر لوگوں کو سناتی۔"

"نہیں تمہارا قصور نہیں تھا یہ...... سب میرا قصور تھا جو میں کسی کو سمجھ ہی نہ سکی۔ ورنہ جس طرح سے مائرہ نے میری زندگی برباد کی میں اسے کبھی یہ موقع نہ دیتی غلط اعتبار کیا میں نے وہ بھی غلط لوگوں پر۔" اس کا آنسو ٹوٹ کر اس کے پاؤں پر گرا تھا۔ نہال کی آنکھیں بھی بھرا گئیں۔

"یہاں کیوں رہتے ہو تمہیں زیادہ کیئر کی ضرورت ہے نہال!" فوراً سے پیشتر آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ نہال چونک اٹھا۔

"کیوں؟"

"طبیعت جو ٹھیک نہیں رہتی آئے روز بیمار ہوئے رہتے ہو۔" وہ اس کا ایک راز افشا کرچکی تھی اب دوسرا نہیں کرنا چاہتی تھی نہال نے اطمینان کی سانس لی۔

"ہوں گھر پر اب کیا رکھا ہے ہانیہ! جو تھوڑا بہت فرصت کا ٹائم ملتا ہے وہ یہیں......!" ابھی وہ بات مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ اچانک کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ بہت کوشش کی اس نے ہانیہ کے سامنے خود کو سنبھالنے کی مگر نہ سنبھال سکا۔ کھانسی کا حملہ جو شروع ہوا تو پھر رکنے کا نام ہی نہ لیا یہاں تک کہ جگر کٹ کٹ کر منہ کے بل باہر آنا شروع ہوگیا۔ ہانیہ جو پتھرائی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی ایک دم سے چیخ اٹھی۔

"نہال......" ہانیہ کو لگا جیسے اس کے لیے زمین آسمان ایک ہوگیا ہو۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ وہ چیخ رہی تھی اور نہال کو سنبھالنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کے بچے نے بھی اس کو دیکھ کر رونا شروع کردیا تھا۔ ہانیہ ایک طرف اسے چپ کروا رہی تھی دوسری طرف نہال کو سنبھال رہی تھی۔ اگلے پینتالیس منٹ میں اس کی کال پر جاذب وہاں موجود تھا۔ وہ رات ہانیہ صفدر کے لیے جیسے قیامت کی رات تھی۔ جاذب نے کرنل حسن صاحب کو بھی کال کرکے بلالیا تھا۔ انہیں جیسے ہی بیٹے کی بیماری کے بارے میں پتا چلا گویا زمین ان کے پیروں تلے سے کھسک گئی۔ جھکے ہوئے کندھے جیسے ایک دم سے ٹوٹ گئے تھے۔

نہال جب تک بے ہوش رہا ان کے آنسو وقفے وقفے سے موتیوں کی طرح گرتے رہے۔ انہی کے اصرار پر جاذب انہیں نہال کے ڈاکٹر کے پاس لایا تھا اور ڈاکٹر انہیں بتا رہا تھا کہ۔

"مجھے بہت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے مسٹر حسن کہ آپ کے بیٹے کے پاس زیادہ دن نہیں ہیں۔ اس لیے آپ ہر ممکن طور پر اسے پریشانیوں سے دور رکھیں اگر وہ ہنسی خوشی جیے گا تو ہوسکتا ہے چھ ماہ یا ایک سال تک زندہ رہ سکے ورنہ موت کا عقاب تو کسی بھی وقت اسے اپنے پنجوں میں جکڑ سکتا ہے۔" لفظ نہیں تھے برچھیاں تھیں جو حسن صاحب کو اپنے سینے میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ جہاں کے تہاں بیٹھے رہ گئے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب کیا آپ بتا سکتے ہیں نہال کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" جاذب نے ہمت کرکے پوچھا تھا۔ ڈاکٹر نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔

"کیا مسٹر نہال نے آپ کو نہیں بتایا کہ انہیں کیا بیماری ہے؟"

"نہیں۔" دکھ کی شدت سے نڈھال وہ صرف سر ہلا سکا تھا۔

"او...... مسٹر نہال جگر کے کینسر میں مبتلا ہیں۔ پچھلے دو سال سے ان کا علاج چل رہا ہے مگر بیماری اب آخری اسٹیج پر پہنچ چکی ہے لہٰذا ہم چاہتے ہوئے بھی ان کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔" ٹوٹے ہوئے کندھوں پر پھر آسمان آ کے گرا تھا۔ حسن صاحب میں ہلنے کی بھی سکت نہ رہی۔ ادھر نہال ہوش میں آیا تو ہانیہ اس کے قریب بیٹھی چپ چاپ رو رہی تھی۔

"ہانیہ" اس پر نظر پڑتے ہی اس نے اسے پکار لیا تھا۔ ہانیہ

کا دل چاہا وہ بلک بلک کر رو دے۔

"نہال.....نہال مجھ پر ایک احسان کرو گے؟"

"ہانیہ۔"

"پلیز نہال مجھ سے وعدہ کرو تم میری خواہش پوری کرو گے۔" وہ بچوں کی طرح مچل رہی تھی۔ نہال نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر ٹکا دیں۔

"کیسی خواہش؟"

"پہلے تم وعدہ کرو کہ پوری کرو گے' پلیز۔"

"ٹھیک ہے کردوں گا پوری اب بتاؤ۔" اس کی آنکھیں اب بھی دمک رہی تھیں۔ ہانیہ نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔

"پکا؟"

"ہوں.....پکا۔"

"اب مکرنا نہیں۔"

"نہیں مکروں گا بابا تم بتاؤ تو سہی۔"

"بتادوں گی' مگر ابھی نہیں۔" وہ ایک دم سے ہلکی پھلکی دکھائی دے رہی تھی۔ نہال اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"کب سدھرو گی تم ہانیہ؟"

"اب تو سدھرنا ہی ہے نہال! نہ بھی سدھری تو دنیا والے سدھار دیں گے۔" بھرائے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں نہال نے اذیت سے آنکھیں بند کرلیں۔

اگلے روز حسن صاحب اسے گھر لے آئے تھے۔ آسیہ بیگم نے جب اس کا حال دیکھا تو کلیجہ تھام کر رہ گئیں۔ مائرہ کے آنسو تو کسی پل رکتے ہی نہیں تھے۔ سارہ بھی اپنے محبوب بھائی کے حال پر بات بے بات رو پڑتی تھی۔

اس روز وہ سو رہا تھا جب مائرہ اس کے کمرے میں چلی آئی۔ مسز حسن گھر پر نہیں تھیں اور سارہ فون پر اپنی کسی دوست کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ تبھی قطعی اضطرحال کے ساتھ ہلکے سے دروازہ وپش کرتے ہوئے وہ اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

نہال گہری نیند میں بے خبر سکون سے سو رہا تھا۔ وہ بیڈ پر اس کے قدموں کے قریب آبیٹھی۔ ٹپ ٹپ اس کے آنسو نہال کے پیروں پر گر رہے تھے مگر گہری نیند میں ہونے کے سبب اسے گرتے ہوئے ان آنسوؤں کا احساس نہیں ہوسکا تھا۔

اگلے ہی پل وہ اٹھی اور چپ چاپ اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ جانے ضمیر نامی اس برزخ میں برے پچھتاوے کے ساتھ ابھی اور کتنے دن تک اسے یونہی جلتے رہنا تھا۔

❁ ❁ ❁

دروازے پر زوردار دستک جاری تھی۔ زائر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا بیرونی دروازے تک آیا تھا۔

"کون؟" دروازے کی کنڈی کو ہاتھ لگاتے ہوئے اس نے پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔

"دروازہ کھولو۔" باہر سے دھاڑتی ہوئی آواز بلاشبہ ثانیہ عباس کی ہی تھی۔ زائر نے فوراً سے پیشتر دروازہ کھول دیا۔

"تم.....اور یہاں.....وہ بھی اس وقت.....؟"

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے میرے بچوں کو بلاؤ میں انہیں لینے آئی ہوں۔" اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ زائر نے ایک نظر مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس کی ماں ثانیہ کی چنگھاڑ پر کسی بھی وقت کمرے سے باہر آکر سارا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ تبھی اس نے باہر نکل کر سرعت سے دروازہ بند کیا پھر ثانیہ کو بازو سے پکڑ کر گاڑی کے قریب لایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ ثانیہ اس کی حرکت پر ہکابکا رہ گئی تھی۔ کچھ دور فصلوں کے قریب جا کر اس نے گاڑی روک دی۔

"یہاں کیوں لائے ہو؟"

"اس لیے تاکہ تم جی بھر کر چنگھاڑ سکو۔"

"جسٹ شٹ اپ۔"

"یو شٹ اپ اگر میں اپنی شرافت کی وجہ سے تمہاری بدتمیزی برداشت کرلیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھ پر خدا بن جاؤ بہت اچھی طرح سے جانتی ہو تم کہ میں عورتوں کا اس طرح سے چیخنا چلانا پسند نہیں کرتا ویسے بھی تم سے لے کر نہیں کھاتا میں جو تمہاری ہر طرح کی بات برداشت کروں۔ اگر حویلی کا کام کرتا ہوں تو صرف چوہدرانی کی وجہ سے ان کی محبت اور اپنائیت کی وجہ سے ورنہ تم جیسوں کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھنا پسند نہیں کرتا میں۔"

"بکواس بند کرو' میں یہاں تمہاری ٹرٹر سننے نہیں آئی۔ اپنے بچوں کو لینے آئی ہوں۔"

"تمہارے بچے میرے پاس نہیں ہیں۔ اس لیے اب تم یہاں سے جاسکتی ہو اور ہاں دوبارہ اس طرح رات کے اندھیرے میں میرے گھر کے دروازے پر آنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں رات کے اندھیرے میں اس طرح دہلیز پھلانگ کر آنے والی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتا۔" قدرے سنجیدہ لہجے میں کہنے کے بعد گاڑی سے نکل گیا تھا۔ ثانیہ بلبلا کر رہ گئی۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری پسند ناپسند۔" اس کا بس نہ چلتا

وہ اسے کچا چبا ڈالتی۔ زائر نے اپنے پیچھے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

"میرے بچوں سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے اس لیے ان کے لیے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تم گزارو اپنی زندگی جس طرح سے بھی گزار سکتی ہو۔ میں اپنے بچوں کی خود بہترین پرورش کر سکتا ہوں۔"

"جسٹ شٹ اپ۔ تم مجھ سے میرے بچے نہیں چھین سکتے..... سنا تم نے۔" وہ چیخی تھی۔ زائر پلٹتے پلٹتے کھڑکی پر جھک آیا۔

"میں کون ہوتا ہوں تم سے کچھ چھیننے والا چھیننے کا فن تمہیں صرف تمہیں آتا ہے کبھی خود کو مجھ سے چھین لیتی ہو تو کبھی بچوں کو مگر اس بار میں تمہیں کچھ بھی چھیننے نہیں دوں گا۔ میرے بچے میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ تم زبردستی انہیں مجھ سے دور نہیں رکھ سکتی۔ ہاں چاہو تو کسی بھی عدالت سے رجوع کر سکتی ہو۔ بہرحال اب گھر جاؤ چوہدرانی تمہارے لیے پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

"مائی فٹ، تم ایک گھٹیا انسان ہو زائر ملک اور ہمیشہ یہ ثابت کیا ہے تم نے۔ اسی لیے میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ بے حد نفرت، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میرے بچوں کو مجھ سے دور کر کے تم مجھے توڑ دو گے تو یہ تمہاری بھول ہے ضروری نہیں ہے کہ ہر بار تم ہی فاتح ٹھہرو رکھو اپنے بچوں کو اپنے پاس۔ ثانیہ عباس اتنی عام لڑکی نہیں ہے جتنی تم نے اسے سمجھ لیا ہے۔" لہو رنگ آنکھوں میں تیرتی غصے کی سرخی غضب کی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ زائر کچھ کہتا وہ تیزی سے گاڑی بھگا لے گئی زائر گھر واپس پلٹا تو سائرہ سیڑھیوں پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"مل آئے ثانیہ عباس سے؟" اس کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ وہ دروازے کی کنڈی لگاتے ہوئے چونک اٹھا۔

"میں کسی سے ملنے نہیں گیا وہ خود یہاں آئی تھی اپنے بچوں کو لینے۔" نہ چاہتے ہوئے اسے وضاحت دینی پڑی۔ سائرہ نے اس کا بازو تھام لیا۔

"جان کیوں نہیں چھڑا لیتے تم اس بلا سے۔ وہ تمہارے قابل نہیں ہے زائر۔"

"وہ میرے قابل ہے یا نہیں اس کی پروا کرنے کی ضرورت تمہیں نہیں، سمجھی..... جاؤ جا کر آرام کرو۔" درشتی سے بازو چھڑواتے ہوئے اس نے ڈپٹا تھا وہ کلس کر رہ گئی۔

"کیوں ضرورت نہیں ہے مجھے کان کھول کر سن لو زائر۔ میں اب پھر سے تمہیں اس چڑیل کے لیے زندگی برباد کرنے نہیں دوں گی۔"

"دیکھا جائے گا۔" بے پروائی سے کہتے ہوئے وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

ثانیہ حویلی واپس آئی تو اس کا چہرا ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ چوہدرانی کے ساتھ ساتھ اشعر بھی اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔

"کہاں چلی گئی تھیں؟"

"کہیں نہیں۔" اسے نظر انداز کرتی وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ چوہدرانی تسبیح کے دانے پھیرتی اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ اگلے روز ناشتے کی ٹیبل پر انہوں نے ثانیہ سے پوچھا تھا۔

"بچے کہاں ہیں کچھ پتا چلا؟"

"جی وہ اپنے باپ کے پاس ہیں آپ پریشان نہ ہوں۔" بے پروائی سے بریڈ پر جیم لگاتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔ وہ ہکا بکا رہ گئیں۔

"ان کا باپ کب آیا یہاں؟"

"میری غیر موجودگی میں آیا تھا آپ کو پتا نہیں چلا۔"

"میرے خدا..... اب کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ہوگا میرے بچے ہیں وہ میرے ساتھ کی عادت پڑی ہوئی ہے انہیں زیادہ دن اس شخص کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔" اندر کی دنیا درہم برہم ہونے کے باوجود وہ بہت اطمینان سے جواب دے رہی تھی۔ اشعر خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ شہر کے لیے نکل رہے تھے ثانیہ نے اچانک گاڑی رکوائی تھی۔

"اشعر......"

"ہوں......"

"کیا تم اسی ہفتے میں مجھ سے شادی کر سکتے ہو؟"

"وہاٹ، یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"اشعر پلیز، میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ اشعر بے ساختہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"ہاں کیوں نہیں..... تم کہو تو ابھی کر لیتے ہیں۔"

"تھینکس۔" اس کی طرف سے مثبت جواب پا کر بے ساختہ اس نے سکون کی سانس بھری تھی۔ اشعر نے ایک پیاری بھری نظر اس پر ڈالنے کے بعد گاڑی آگے بڑھا دی۔

(آخری قسط اگلے ماہ ان شاء اللہ)

جھیل، کنارہ، کنکر
نازیہ کنول نازی

یادوں کے یہ جگنو مری آنکھوں میں نظر بند
دیکھ مرے آنسو مری آنکھوں میں نظر بند
چہرے کا وہ اِک پھول ہے اب تک تر و تازہ
اب تک ہے وہ خوشبو مری آنکھوں میں نظر بند

شام غم مجھ کو ایسی اداسی نہ دے
کہ مرے حوصلے کی فصیلوں کے اندر کسی یاد کا کوئی پنچھی گرے
اور دل کی جو سنسان ویران سی ایک بستی ہے اس میں
دفن ہونے والے ہر اک درد کی آنکھ پھر سے کھلے
شام غم مجھ کو ایسی اداسی نہ دے
کہ مرے صبر کی دھجیوں کا تماشہ سر بزم لوگوں میں بنتا پھرے
کہ مرے آنکھ کے کانچ سے آنسوؤں کا جو لاوا بہے
شہر کے لوگ اس پر کئی جھوٹے افسانوں کی بنیاد رکھتے پھریں
شام غم مجھ کو ایسی اداسی نہ دے
کہ مرے ہونٹوں پر کھلنے والی جو پھیکی سی مسکان ہے
دیکھ کر اس کو محفل میں حاسد میرے
اپنی مرضی کا عنوان دیتے پھریں
لاکھ قصے بنیں داستانیں جنیں
شام غم مجھ کو ایسی اداسی نہ دے
کہ مرے شہر میں دیکھ کر میرا چہرہ کبھی یہ کہیں
تم خزاں رت کی دل کش سی تصویر ہو
کون رانجھا ہے وہ جس کی تم ہیر ہو
تم یقیناً کسی بہت مجھے ہوئے نامور سے مصنف کی تحریر ہو
شام غم مجھ کو ایسی اداسی نہ دے
کہ مجھے دیکھ کر سالوں صدیوں تلک
ان ہواؤں کے آنچل بھی نم ہی رہیں
بعد مدت کے جب بھی کسی عشق کی داستاں رقم ہو
درد کا اس میں پہلا حوالہ میری جان ہم ہی رہیں
شام غم مجھ کو ایسی اداسی نہ دے

نہال کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی آدھی رات کے وقت اپنے کمرے سے نکل کر وہ لاؤنج میں چلا آیا حسن صاحب جاگ رہے تھے انہیں جیسے ہی کچھ محسوس ہوا فوراً لپک کر لاؤنج میں آئے سامنے دیکھا تو نہال درد سے بے حال دوہرا ہو رہا تھا ان کے ہاتھ پیر پھول گئے جلدی سے ملازم کو اٹھا کر گاڑی نکالنے کے لیے کہا اور خود نہال کو سہارا دے کر باہر لے آئے۔

تین جوان بیٹوں کا باپ ہونے کے باوجود اس وقت وہ کتنے بے بس تھے میکال کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کمال کو فوری سیٹ نہیں ملی تھی' مسز حسن جو بخار میں تپ رہی تھیں وہ بھی اٹھ کر باہر آگئیں' نہال کو درد سے تڑپتے دیکھ کر ان کے آنسو بہے چلے جا رہے تھے۔

آدھی رات کے وقت دونوں میاں بیوی نہال کو لے کر ہسپتال پہنچے تھے سارا اور مائرہ کی آنکھ بھی کھل چکی تھی۔ سارا نے جلدی سے ہانیہ کو کال کی' میکال سے ڈائیوورس کے بعد بھی اس کا تعلق ہانیہ سے نہیں ٹوٹا تھا۔ مائرہ نے جو گھٹیا حرکتیں کی تھیں وہ سب جان گئی تھی مگر اس نے کسی کو بھی اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔

سارا کی کال پر ہانیہ فوراً ہسپتال پہنچی تھی اور اب حسن صاحب اور آسیہ بیگم کو نہال کے پاس چھوڑ کر وہی بھاگ دوڑ کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں جازب بھی پہنچ گیا تھا وہ ہانیہ کو ڈانٹنا چاہتا تھا کہ اس نے اسے نہال کے بارے میں انفارم کیوں نہ کیا مگر اس کی پریشانی دیکھ کر خاموش ہی رہا حسن صاحب کی آنکھیں احساس تشکر اور شرمندگی سے بھیگ چکی تھیں۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی ٹریٹمنٹ کے بعد نہال پرسکون ہو کر سو گیا تھا اس کے منہ پر آکسیجن لگی تھی' ہانیہ دونوں ہاتھوں کو دعا کی صورت اٹھائے جانے کیا کیا پڑھتی رہی۔ صبح کے چار بجے تھے جب جازب نے اسے گھر چل کر آرام کرنے کے لیے کہا تھا جواب میں وہ صاف انکار کر گئی۔ "نہیں' میں ٹھیک ہوں تم پلیز انکل اور آنٹی کو لے جاؤ' آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پھر

گھر میں سارا اور مائرہ بھی اکیلی اور پریشان ہوں گی۔ انکل کی حالت تو تم دیکھ ہی رہے ہو پلیز کسی بھی طرح سے انہیں راضی کرکے گھر لے جاؤ۔" اس کی بات میں وزن تھا جازب سر ہلا کر پلٹ گیا اور دونوں کو بمشکل منا کر حسن منزل لے جانے کی بجائے اپنے ہی گھر لے آیا۔ صفدر صاحب جاگ رہے تھے ہادیہ بھی لاؤنج میں بیٹھی تھی' دونوں کو ان دونوں کا خیال رکھنے کی ہدایت کرتا پھر گھر سے نکل آیا' تھوڑی ہی دیر میں اس کی گاڑی حسن منزل کے سامنے رکی تھی۔

سارا اور مائرہ کو فوری تیاری کا کہہ کر وہ انہیں بھی اپنے ساتھ ہی گھر لے آیا تھا۔ ہادیہ نے زبردستی آسیہ بیگم کو سلا کر بخار کی ٹیبلٹ دے دی اس کے بعد وہ اور جازب حسن صاحب کو تسلی دیتے رہے اُدھر تقریباً ساڑھے چھ بجے کے قریب نہال کو ہوش آیا تھا۔

"ہانیہ......"

آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے اس نے اسے پکارا تھا جو کرسی پر بیٹھی سر ایک طرف گرائے شدید تھکن میں سو گئی تھی نہال کو اس پر بے حد پیار آیا وہ لڑکی واقعی اس قابل تھی کہ اسے ٹوٹ کر چاہا جاتا۔

"ہانیہ......!" ایک مرتبہ پھر اس نے اسے پکارا تھا اور اس بار وہ فوراً بیدار ہو گئی تھی۔

"نہال...... اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" کچی نیند سے جاگی آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی' نہال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب ٹھیک ہے تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"تمہاری نگرانی۔" اس کے پاس بیٹھتے ہوئے وہ مسکرائی تھی' نہال بھی مسکرا دیا۔

"کس بات کی نگرانی' کہیں تمہیں سوتے پا کر راہِ عدم کا مسافر نہ بن جاؤں۔"

"جسٹ شٹ اپ نہال کے۔" وہ سخت تنگ کر رہا تھا اور وہ تنگ ہو گئی تھی نہال کو حقیقت کرنی پڑی' اس کا چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔

"تم کے سوری تو را مچھلی نہ بن جایا کرو۔"

"نہال! تمہیں یاد ہے تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا میری ایک خواہش پوری کرنے کا۔" فوراً ہی وہ نارمل ہو گئی تھی' نہال نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہوں' یاد ہے بولو۔"

"کیا بات ہے تم پوری کرو گے؟"

"تمہیں کوئی شک ہے؟"

"ہوں۔"

"ایسی کون سی فرمائش ہے جس کے لیے تم اتنی پزل ہو رہی ہو۔" اب کے وہ مشکوک ہوا تھا' ہانیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھ سے شادی کرو گے نہال؟"

"واٹ......؟" اسے جیسے جھٹکا لگا تھا۔

"ہوں...... مجھ سے شادی کر لو پلیز۔" دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ لے کر اس نے بمشکل اپنے آنسو چھپائے تھے نہال نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہانیہ؟" اس کا دل اس لمحے بہت تیزی سے دھڑکا تھا۔

"کیوں؟ اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے' ہم بچپن کے دوست ہیں' تم مجھ سے پیار کرتے ہو' مجھے طلاق ہوئے ایک سال ہو چکا ہے پھر کیا مسئلہ ہے؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کیا مسئلہ ہے۔"

"جانتی ہوں' تبھی کہہ رہی ہوں پلیز نہال پلیز۔"

"نہیں ہانیہ! میں اپنی خوشی کے لیے تمہاری زندگی سولی پر نہیں لٹکا سکتا ویسے بھی میکال بھائی نے جو گھٹیا الزام میری اور تمہاری ذات پر لگایا ہے میں اسے کبھی سچ ثابت نہیں ہونے دوں گا۔"

"بھاڑ میں جائے میکال اور اس کی سوچ' تم مجھ سے صرف میری بات کرو۔"

"تمہاری بات کروں تب بھی اس خواہش میں سوائے حماقت اور ہمدردی کے کچھ نہیں ہے۔"

"مجھے کوئی ہمدردی نہیں تم سے' بس میں چاہتی ہوں ہمیشہ تمہارا نام میرے نام کے ساتھ جڑا رہے' پلیز نہال تم وعدہ کر چکے ہو مجھے مایوس مت کرو پلیز۔"

"ہانیہ میں چند دن کا مہمان ہوں' کچھ نہیں پتا کب زندگی کا چراغ گل ہو جائے' تھوڑے سے دنوں کے لیے میں کیوں تمہیں کڑی آزمائش میں ڈال دوں؟"

"میری زندگی کی کیا گارنٹی ہے' ہو سکتا ہے میں تم سے پہلے مر جاؤں۔" اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو اور کچھ نہیں۔" نہال نے بے ساختہ نگاہیں چرائی تھیں۔

"پاگل ہی سمجھ لو تمہارے لیے تو ہر حال میں پاگل ہی ہوں ناں؟"

وہ رو رہی تھی نہال وہ مضطرب ہو کر رہ گیا وہ کبھی بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اس کی فرمائش پوری کرنا بھی اتنا آسان نہیں تھا تبھی اس نے چپ سادھ لی تھی مگر ہانیہ چپ سادھنے والی نہیں تھی اس نے جازب' ہانیہ' فارحہ سب کو اپنی خواہش سے مطلع کردیا تھا تبھی نہال کی طرح سب ہی اس کی خواہش پر بھونچکاں رہ گئے تھے مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

❁ ❁ ❁

تقریباً ایک ماہ کے بعد اس کی ضد پر نہال نے اس کے ساتھ نکاح کرلیا تھا میکال اس دوران دوبار حسن منزل آیا مگر دونوں بار حسن صاحب نے اس کی کوئی بھی بات سنے بغیر اسے گھر سے نکلوادیا تھا۔ وہ چاہتا تو انہیں مائرہ کی سازش کے بارے میں بتاسکتا تھا مگر وہ اس کے لیے بالکل سگی بہنوں کی طرح تھی تبھی اس نے اسے سب کی نظروں سے گرانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ سارا کی شادی بھی نہال کے ساتھ ہی ہوگئی تھی کمال اور حنا کو نہال کی بیماری اور مائرہ کی سازش کا پتا خود مائرہ سے لگا تھا وہ حنا کو سامنے پاکر بُری طرح روتے ہوئے اسے سب کچھ بتاگئی تھی حنا تو جیسے پتھر کی بن گئی تھی جب کہ کمرے کی دہلیز پر کھڑے کمال کو لگا جیسے کسی نے اس کے جسم سے روح کھینچ لی ہو وہ تو ہانیہ اور میکال کی طلاق کو لے کر اپ سیٹ تھا پیچھے یہ قیامت کب اور کیسے آگئی تھی۔ نہال تو اس کے لیے بچوں کی طرح تھا پھر وہ اتنی جلدی زندگی سے دور کیسے جاسکتا تھا؟ حنا کی نظر اس پر پڑی تھی ساتھ ہی مائرہ کی' مائرہ اسے دیکھ کر فوراً کمرے سے نکل گئی جب کہ حنا کے چہرے کا رنگ ایک دم سے اڑ گیا۔ کمال پتھر بنا بیڈ پر آ بیٹھا حنا بھی ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"میرا دل نہیں مان رہا کمال! ایسی بات نہیں ہوسکتی ایسی بات ہوتی تو پاپا ضرور ہمیں انفارم کرتے۔"

"پاپا نے بلایا تھا پاکستان مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ اتنی بڑی بات ہوگی۔" نم آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بھرآ گیا تھا پھر اس سے پہلے کہ حنا کچھ کہتی وہ اٹھ کر حسن صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میکال کے بارے میں اسے پتا لگا تھا کہ وہ چند روز قبل ہی اپنی بیوی کو لے کر دیار غیر شفٹ ہوگیا تھا۔

❁ ❁ ❁

نہال کمرے میں آیا تو ہانیہ ننھی چنکو کے ساتھ کھیل رہی تھی وہ دروازہ بند کرکے مسکراتے ہوئے ان کے قریب آ بیٹھا۔

"یہ کیا ہو جاتا ہے تمہیں؟ شرمیلا پن تو نام کو بھی نہیں ہے تم میں۔"

"تو...... اب تم سے کیا شرمانا بچپن کے دوست ہو میرے کوئی ایک کروڑ اسی لاکھ پچاس ہزار بار منہ دیکھ چکے ہو پھر اب وہی منہ چھپا کر کیا جیب خالی کروانی تمہاری؟" اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا چنکو بھی بہت خوش تھا۔ سجے سنورے روپ میں ہانیہ اس کا ایمان لوٹ رہی تھی وہ اس کے سامنے بیٹھا اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا اگلی صبح وہ بے حد فریش تھا۔

ہانیہ اس کا ایسے خیال رکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی کانچ کا کھلونا ہو چنکو کے لیے بھی وہی سب کچھ بن گیا تھا اگلے ایک ہفتے میں اس کی صحت دیکھنے لائق تھی درد کی شدت میں بھی حیرت انگیز طور پر کمی آگئی تھی۔ ہانیہ اسے اپنے ہاتھوں سے ناشتا کرواتی' دوپہر اور شام کا کھانا کھلاتی' اس کے کپڑے پریس کرتی اس کے سر میں تیل کی مالش کرتی' جب تک کمرے میں ہوتی کوئی نہ کوئی شگفتہ بات کرکے اسے ہنساتی رہتی جواب میں نہال نے بھی اس کو اتنی عزت اور محبت دی کہ بار بار اس کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ دونوں ہر روز شام کے بعد سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے اکثر مسٹر اینڈ مسز حسن بھی ان کے ہمراہ ہوتے کمال اور حنا کی کمپنی بھی مل جاتی نہال کو خوش دیکھ کر ہی مائرہ نے شادی کے لیے حامی بھری تھی اور بالآخر اسے سادگی سے رخصت کردیا گیا۔

مسٹر اینڈ مسز حسن ہانیہ کے بہت مشکور تھے اس کے ننھے فرشتے نے گھر میں رونق بکھیر دی تھی نہال کو لگتا جیسے وہ اسی کا بیٹا ہو جس طرح سے وہ اس کے ساتھ اٹیچ تھا اسے پیار کرتا تھا اسے وہ میکال کا بیٹا لگتا ہی نہیں تھا تتلی کی طرح سارے گھر میں دوڑتا پھرتا وہ سب کے دلوں کی دھڑکن بن گیا تھا۔ نہال کو اگر وقت بھی وہ نظر نہ آتا تو اس کا دل گھبرانے لگتا تھا۔ اس کے ننھے منے لبوں کی پیاری پیاری باتیں اس کے لیے کسی دوا سے کم نہیں تھیں۔ میکال کے بارے میں مسز حسن نے اسے بتایا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ دبئی چلا گیا تھا۔

میکال نے طلیزے سے معذرت کرلی تھی یہ کہہ کر کہ وہ اس کے شوق اور پروفیشن کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا طلیزے خوش ہوگئی تھی شاید اسی لیے وہ اس کی باتوں میں آکر یہیں آنے کے لیے مان گئی تھی۔

میکال کے یہاں بہت سے لوگوں سے بہت اچھے تعلقات تھے جب اس نے خود کو پیش کیا اچھی صحت تجربہ سے کمپنی کو بہت سے کلائنٹ کراکے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر کاروبار سیٹ کیا پھر خود بھی شوبز کی فیلڈ میں آگیا اس کی کوشش تھی کہ وہ خود کو اتنا مصروف کرلے کہ پاکستان اور ہانیہ منصور حسن کی کوئی بھی یاد اس کے دل کو پریشان نہ کرسکے۔

یہیں آکر اس نے دوبارہ سگریٹ اور شراب کا معمول شروع کیا تھا طلیزے یہاں اجنبی تھی اسے کوئی نہیں جانتا تھا میکال نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسے یورپ لے جاکر وہاں کی انڈسٹری پر متعارف کروائے گا مگر اس نے اپنا وعدہ اب تک پورا نہیں کیا تھا وہ جیسے گھر میں قید ہوکر رہ گئی تھی۔

اس قید نے ہی اکتا کر اسے میکال کی غیر موجودگی میں وہاں کے مقامی لوگوں سے تعلقات بنانے پر مجبور کیا تھا اور یہی وہ مقام تھا جہاں میکال نے اس سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔

❁ ❁ ❁

اس روز وہ جلدی گھر آگیا تھا طلیزے گھر پر نہیں تھی وہ شاکڈ ہی تو رہ گیا تھا تقریباً تین گھنٹے کے بعد وہ گھر واپس آئی تھی وہ بھی ایسی حالت میں کہ ہوش سمیت کچھ بھی ٹھکانے پر نہیں تھا اور تبھی میکال کے اعصاب پر بجلیاں گری تھیں' یہ ٹھیک ان عورتوں میں سے تھی جو اپنی جائز ناجائز خواہشات کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتی ہیں۔

گھر آتے ہی وہ کمرے میں گھس کر سوگئی تھی جب کہ میکال ششدر سا کافی کا کپ ہاتھ میں لیے سیڑھیوں پر کھڑا رہ گیا تھا اس کی زندگی میں تین عورتیں آئی تھیں اور وہ تینوں میں سے کسی ایک کو بھی نہ سمجھ سکا تھا نہ سنبھال سکا تھا۔ صبح ناشتے کی میز پر اس کی آنکھیں خوب سرخ تھیں۔

"گڈ مارننگ۔" طلیزے نے اپنے مخصوص انداز میں اس کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے اسے وش کیا تھا میکال کی گرفت کافی کے مگ پر سخت ہوگئی۔

"گڈ مارننگ۔"

"کیا ہوا کچھ سست سے لگ رہے ہو رات میں سوئے نہیں کیا؟" اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے سرسری سی ایک نظر میکال کے چہرے پر ڈال کر بریڈ پلیٹ سے اٹھالیا تھا۔

"نہیں سو گیا تھا سرِ شام ہی۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکی تھی میکال مسکرادیا۔

"کچھ نہیں تم سناؤ کیا مصروفیات ہیں آج کل؟"

"کیا مصروفیات ہوسکتی ہیں سارے دن گھر میں قید رہتی ہوں نہ کسی کو جانتی ہوں یہاں نہ تم کہیں گھمانے پھرانے لے جاتے ہو قسم سے میں تو سخت پچھتا رہی ہوں یہاں آکر۔"

"ہوں۔" اس کی شکایت پر پُرسوچ انداز میں اس نے سر ہلایا تھا۔

"ایک خوش خبری ہے تمہارے لیے۔"

"کیا؟"

"میں پاکستان جارہا ہوں۔"

"واقعی...... اور میں؟"

"تم ابھی نہیں جاسکتیں کیونکہ تمہارے لیے یہاں میں نے ایک بہت بڑے فلم میکر سے بات کی ہے اسے تمہارے کمرشلز بھی دکھائے ہیں تمہارا کام بہت پسند آیا ہے اسے کل لے کر جانا تھا تمہیں اس کے پاس مگر نہایت ایمرجنسی میں پاکستان جانا پڑ رہا ہے بہرحال تم ایک بہادر لڑکی ہو میرا خیال ہے میرے بغیر یہاں تمہیں زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔"

"ہوں ٹھیک ہے واپس کب تک آؤ گے؟"

"جلدی آجاؤں گا ان شاء اللہ۔" اس نے پوچھنے کی زحمت بھی نہ کی تھی کہ وہ پاکستان کیوں جارہا ہے بالکل ویسے ہی جیسے میکال نے اس سے اس کے بدلے ہوئے لہجے پر بھی استفسار نہیں کیا تھا شاید ان دونوں کو ہی اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اگلے روز جب طلیزے اسے ائیرپورٹ پر چھوڑنے آئی تھی اس نے اسے جیب سے ایک لفافہ نکال کر دیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" الٹ پلٹ کر لفافے کو دیکھتے ہوئے وہ حیران ہوئی تھی جبھی وہ بولا تھا۔

"تحفہ ہے تمہارے لیے وہ بھی سرپرائز' مگر اسے گھر جاکر کھولنا پلیز۔"

"تو کیا ہے اس میں؟"

"کچھ تو ہے خود دیکھ لینا اب میں چلتا ہوں اللہ حافظ۔" سرخ آنکھوں میں نمی سی لیے وہ پلٹ گیا تھا طلیزے حیران پریشان سی وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی جانے کیوں اس لمحے اس کا دل اسے کچھ غلط ہونے کا احساس دلا رہا تھا مگر وہ اسے جھٹک کر آزادی کے نشے میں سرشار بے نیازی سے گھر واپس چلی آئی۔

دن بھر موج مستی کے بعد رات جب وہ سونے کے لیے

لیکن تو اسے میکال کا دیا ہوا تحفہ یاد آیا، تبھی اس نے متجسس سی ہو کر وہ لفافہ اٹھا کر کھولا تھا اور پھر جیسے ساکت سی تو رہ گئی تھی۔

طلاق نامے کے ساتھ سفید شفاف کاغذ پر کندہ الفاظ اسے پتھر ہی تو کر گئے تھے لکھا تھا۔

"میں جانتا ہوں اس وقت تمہارے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم جیسی خود سر لڑکیوں کی منہ زور خواہشات پانی کے ریلے کی طرح ہوتی ہیں جن پر کبھی بند نہیں باندھا جا سکتا اسی لیے میں نے تمہیں چپ چاپ چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ میں نے پاکستان میں ہی کر لیا تھا مگر...... میں تمہیں پاکستان میں آزاد کرنا نہیں چاہتا تھا تمہاری وجہ سے میں نے اپنے گھر والوں کو کھویا ہے اپنی ہانیہ کو کھویا ہے جس ہانیہ کو جواب بھی لہو بن کر میری رگوں میں جسم و جاں میں دوڑتی ہے۔ بہت اذیت ناک ہوتا ہے کھونے کا یہ احساس مگر تم اس احساس سے واقف نہیں ہو کیونکہ تمہاری مجھ سے وابستگی تمہاری محبت نہیں مجبوری تھی تمہارا قصور نہیں ہے شاید میرے ہاتھوں کی لکیروں میں ہی کسی عورت کی محبت اور وفا نہیں ہے بہر حال بے وفائی کی سزا بھی تو ہونی چاہیے ناں وہ عورت جو میری غیرت کو جوتے کی نوک پر رکھ کر میری موت کا پلان بنا رہی تھی اسی عورت کو میں ساری عمر کی تنہائی سونپ آیا ہوں تمہارا ویزا اور پاسپورٹ میں نے جلا دیا ہے اب تمہیں وہیں رہنا ہے اپنی من پسند دنیا میں۔ وہ دنیا جو پردے کی حرمت اور اہمیت سے ناواقف ہے وہ دنیا جہاں حیا کے انمول زیور کی کوئی قدر نہیں تم اپنی سب سے قیمتی متاع تو گنوا ہی چکی ہو علیزے! پھر میں تم پر ترس کھاؤں بھی تو کیوں کر...... بے وفائی کی سزا تو ملنی چاہیے پھر چاہے وہ میکال حسن ہو یا علیزہ کیا فرق پڑتا ہے ناں؟" الفاظ ختم ہو چکے تھے مگر علیزہ کو لگا جیسے ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کی بینائی بھی ختم ہو چکی ہو وہ محل جہاں اس وقت وہ بیٹھی تھی محل نہیں تھا کنواں تھا وہ کنواں جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے ڈوبنے کے لیے کھودا تھا لمبے شریر بچے کی طرح آگے دوڑتے جا رہے تھے اور وہ ساکت بیٹھی نیچے دھنستی جا رہی تھی۔

❁.....❁.....❁

نہال کو سمندر بے حد پسند تھا۔

ہانیہ روز ضد کر کے اسے ساحل سمندر پر لے آتی اس روز بھی خوب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور وہ ضد کر کے اسے ساحل سمندر پر لے آئی تھی نہال نے بڑی بڑی کی پاکٹس میں ہاتھ پھنسائے بڑی دیر تک تو اس کھڑا سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کو دیکھتا رہا۔

"تم نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے ہانیہ!" اس کے پہلو میں کھڑی وہ بھی سمندر کی شوریدہ لہروں کو بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی جب نہال نے کہا تو وہ چونک گئی۔

"کیسا ظلم؟"

مگر نہال نے جیسے اس کا سوال سنا ہی نہیں اس کی نظریں ہنوز سمندر کی وسعتوں پر تھیں۔

"بہت سکون سے مر رہا تھا میں کہیں کوئی زنجیر نہیں تھی پاؤں میں مگر اب...... سچ کہہ رہا ہوں ہانیہ! میرا مرنے کو دل نہیں چاہ رہا دل لگ گیا ہے زندگی سے تمہارے لیے ممّا کے لیے چھٹکو کے لیے میں تم سب کے لیے جینا چاہتا ہوں۔" اس کی آنکھوں کے گوشے نم تھے ہانیہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے نہال کہ تم نہیں جی سکو گے تمہیں معجزات پر یقین نہیں ہوگا مگر مجھے بے تحاشا اپنے رب کی رحمت اور اپنی پرخلوص دعاؤں پر یقین ہے۔ ڈاکٹرز کوئی خدا نہیں ہیں کہ ان کے کہنے سے تم مر جاؤ گے تم جیو گے نہال! میں مانگوں گی اللہ سے تمہاری زندگی تم دیکھ لینا کچھ بھی نہیں ہوگا یونہی دیکھتے دیکھتے دن گزر جائیں گے اور ایک روز ہمارا چھٹکو تمہارے قد سے بھی بڑا ہوگا پھر ہم اس کی شادی کریں گے اس کی بیوی آئے گی ہماری خدمت کرے گی اور ہم دونوں اپنے کمرے میں بیٹھ کر اس کی چغلیاں کیا کریں گے۔" وہ اسے بہلا رہی تھی نہال تو رہی پتھر پر بیٹھ گیا اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

"کاش کوئی مجھ سے میری ساری دولت لے لے مگر بدلے میں مجھے اتنی زندگی دے دے کہ میں تمہارے ساتھ وہ دن دیکھ سکوں ہانیہ!" نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے وہ اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا جب ہانیہ نے کٹتے دل کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تمہیں کچھ نہیں ہوگا نہال! دیکھ لینا تم پلیز موت کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو نہال دنیا میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو معجزانہ طور پر موت کے منہ سے نکل کر زندگی کی طرف واپس پلٹ آتے ہیں تم بھی پلٹ آؤ گے دیکھ لینا۔" بھرائے لہجے میں کہتی جانے وہ اسے تسلی دے رہی تھی یا خود کو۔ نہال خاموش

بیٹھا رہتا رہا۔

"میں اکثر سوچتا ہوں ہانیہ! مائرہ نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ شاید وہ بھی مجھ سے ایسی ہی محبت کرتی ہو جیسی میں تم سے کرتا ہوں یا پھر جیسی تم میکال بھیا سے کرتی ہو ہے ناں؟"

"نہیں...... میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں نہال! صرف تم سے۔" تڑپ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے کلیئر کیا تھا نہال نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"تمہیں پتا ہے ہانیہ! میں نے مائرہ کو معاف کر دیا ہے تم بھی اسے معاف کر دینا پلیز۔" نم نم سی آنکھوں سے ہانیہ کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ہانیہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرتی رہی۔

وہ شام بے حد اداس شام تھی۔ اس شام نہال بہت دیر تک سمندر کنارے بیٹھا چپ چاپ بیٹھا رہا تھا۔

رات بھی دیر تک بارش ہوتی رہی وہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکا تھا۔

"نہال!" ہانیہ خود بھی جاگ رہی تھی۔

"ہوں؟"

"نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"ہوں۔"

"مجھے بھی نہیں آ رہی کیا کروں؟"

"کچھ نہیں...... آؤ میں سلاتا ہوں۔" فوراً سے پیشتر اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے اس نے ہانیہ کو اپنی بانہوں میں چھپا لیا تھا اور پھر اس کے بعد نیند کب اور کیسے آئی ہانیہ کو پتا ہی نہ چل سکا۔ اس رات پہلی بار وہ بہت سکون سے سوئی تھی کہ صبح فجر کی نماز بھی نہ پڑھ سکی۔

***

اگلے روز چھٹکو کی تیسری سالگرہ تھی۔

نہال کا سارا دن بے حد مصروف گزرا ہلکے ہلکے بخار کے باوجود سالگرہ کی تمام تر شاپنگ اور اہتمام اس نے خود کیا تھا ہانیہ منع کرتی رہ گئی مگر وہ نہ مانا۔ شاپنگ کے بعد گھر کی سجاوٹ بھی اس نے خود ہی کی تھی۔ سارا اور مائرہ دونوں آئی ہوئی تھیں گھر میں خوب رونق لگ گئی تھی صرف نہال کی خوشی کے لیے ہانیہ نے کئی قسم کی ڈشز بھی تیار کرلی تھیں اس وقت بھی وہ آٹا گوندھ رہی تھی جب وہ کچن میں چلا آیا پسینے سے بے حال ہاتھ میں چھوٹی ہتھوڑی اور کئی غبارے پکڑے ہوئے۔

"ہانیہ...... ایک گلاس پانی ملے گا؟"

"نہیں۔" پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے وہ مسکرائی تھی نہال قریب چلا آیا۔

"کیوں؟"

"دیکھ نہیں رہے آٹا گوندھ رہی ہوں۔"

"اوہ...... یہ تو اچھی بات ہے مطلب کچھ بھی کرلوں تم روک نہیں سکتیں۔" ہتھوڑی سائیڈ پر رکھ کر اس نے مڑ کے ہانیہ کے گرد اپنے بازو پھیلا دیئے تھے وہ مسکرادی۔

"بندے بن جاؤ نہال! ابھی کوئی آ گیا ناں تو پتا لگ جائے گا۔"

"ڈونٹ وری! میں دروازہ بند کر آتا ہوں۔" بہت دنوں کے بعد وہ شرارتی موڈ میں لوٹا تھا۔ ہانیہ نے آٹے سے بھرے ہاتھ اس کے گالوں پر رگڑ دیئے۔

"لو ہانیہ! تمہارے بالوں میں کاکروچ۔" اس کا کہنا تھا اور ہانیہ کا چلانا تھا وہ ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا تھا کیونکہ اگلے ہی پل سب لوگ کچن میں موجود تھے۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ممّا! ہانیہ کے بالوں میں کاکروچ تھا میں نے بتایا تو چیخ اٹھی۔" وہ اب بھی ہنس رہا تھا جب کہ ہانیہ کا منہ دیکھنے والا تھا مسز حسن کی آنکھیں بھر آئیں۔

"بہت شریر ہو نہال! اپنی حرکتوں سے باز آ جا۔"

"ہاہاہا...... سچ میں بہت ہی اسٹوپڈ اور ڈرپوک لڑکی ہے یہ ہانیہ۔" زیادہ ہنسنے سے اس کی طبیعت خراب ہو سکتی تھی تبھی سارا اسے کھینچ کر کچن سے باہر لے گئی تھی اسی کے ساتھ باقی سب لوگ بھی نکل گئے۔ ہانیہ کو لگا جیسے اب وہ کبھی کوئی کام نہیں کر سکے گی۔

اس رات نہال کی آنکھ کھلی تو ہانیہ کمرے میں نہیں تھی اسٹڈی روم کا زیرو بلب جل رہا تھا اور وہ وہیں جائے نماز پر بیٹھی رو رو کر بے حال ہو رہی تھی' یہ صرف اس دن کی بات نہیں تھی مسز حسن اور ہانیہ کا روز کا معمول تھا۔ روز دونوں تہجد کے لیے اٹھتی تھیں اور پھر صبح فجر تک اللہ رب العزت کے حضور رو رو کر نہال کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کرتیں مگر نہال کو خبر نہیں تھی جتنی شدت سے ہانیہ رو رہی تھی اس کا دل پھٹ رہا تھا مگر وہ بے بس تھا اس کی زندگی اس کے اختیار میں نہیں تھی۔

"دیوار سے ٹیک لگائے وہ خود بھی بے آواز رو رہا تھا۔"

***

اگلے دن حسن صاحب کے اصرار پر ان کا مری کا پروگرام بن گیا تھا۔

مری میں ہوتی سنو فال نہال کو بے حد پسند تھی اکثر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اسی موسم میں وہاں آتا تھا۔ ہانیہ سارے سفر میں اس کی گود میں سر رکھے مزے سے سوتی رہی تھی جب کہ چھٹکو نے بول بول کر اس کا سر کھا لیا تھا۔ بات بات پر جب وہ نہال کا منہ چومتا اسے بے حد اچھا لگتا۔ نہال نے ہانیہ کے ساتھ اسے بھی مری کا چپہ چپہ گھما ڈالا تھا۔ برف کے گولے بنا بنا کر وہ ان دونوں پر پھینکتا اور ہانیہ اس پر نہال کی سنگت میں وہ دن اس نے بے حد انجوائے کیے تھے گو قدم قدم پر اسے نہال کی طبیعت بگڑنے کا اندیشہ رہا تھا مگر وہ تو یوں چاق و چوبند تھا جیسے زندگی میں کبھی بیمار پڑا ہی نہ ہو۔ پورے ایک ہفتے بعد وہ مری سے واپس لوٹے تھے سردیاں ہانیہ کے لیے ہمیشہ وبالِ جان رہی تھیں مگر اس بار اس نے سردیوں کو بے حد انجوائے کیا تھا نہال اس کے ساتھ مل کر کچن میں سارے کام کرواتا تھا وہ تھک جاتی تو اس کا سر اور کندھے دباتا۔ ان دونوں کے درمیان کبھی میکال کو لے کر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

وہ شاپنگ اور آؤٹنگ کا دلدادہ تھا ہانیہ اس کی فضول خرچی سے تنگ تھی تاہم نہال کی ہمراہی میں گزرتے ہر لمحے میں اس نے جانا تھا کہ زندگی کتنی خوب صورت ہے۔

***

اس روز اس کی سالگرہ تھی۔

ہانیہ کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی تاہم نہال دیر تک پڑا سوتا رہا ہانیہ نے دو تین بار کمرے میں آ کر اسے آوازیں دیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو مجبوراً اسے پانی کی بوتل نکال کر اس پر الٹانی پڑی تب کہیں جا کر اسے آنکھیں کھولنی پڑی تھیں۔

"اٹھ جائیں جناب! ٹائم کے گیارہ بج گئے ہیں۔"

"تو......؟"

"تو یہ کہ آج آپ کی سالگرہ ہے اٹھ کر تیاری کریں۔"

"تو کیا سالگرہ والوں میں ہی تیاری کروں؟" تکیہ برابر کر کے کشن کے پیچھے سیٹ کرتے ہوئے اس نے ہانیہ کو دیکھا تھا وہ مسکرادی۔

"نہیں تو آپ کیوں کریں گے تیاری میں ہوں ناں۔"

"تو پھر بتاؤ آج کیا آپ کر رہی ہو؟"

"ہوں...... تمہاری سالگرہ ہے ناں اب سال میں کم از کم ایک دن احترام تو تمہارا حق بنتا ہے چلو شاباش شاباش ہاتھ لو وہ پہر ڈھلتے ہی مہمان آنا شروع ہو جائیں گے اوپر سے موسم بھی خوب بے ساتی ہو رہا ہے۔"

"نہیں آج ہم نے کسی کو انوائٹ نہیں کرنا' یہ سالگرہ میں صرف تمہارے اور چھٹکو کے ساتھ منانا چاہتا ہوں ہانیہ! زیست کی آخری سالگرہ' کیا پتا اگلے سال یہ دن تمہاری زندگی میں کتنے آنسو لے کر آئے۔"

اچانک اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے ہانیہ جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی وہ جتنی بھی کوشش کرتی اس حقیقت سے فرار ممکن نہیں تھا۔ پہلی بار نہال حسن نے اس کے آنسو نہیں پونچھے وہ خود بھی رو رہا تھا اور اسے بھی رلا رہا تھا۔

ہانیہ نے فون کر کے سب کو آنے کے لیے منع کر دیا عصر کے بعد وہ دونوں (ہانیہ اور چھٹکو) نہال کے بے حد اصرار اور ضد پر شاپنگ کے لیے نکل آئے نہال نے ہانیہ کو اپنی پسند کے کئی سوٹ اور جیولری خرید کر دی' اسے اپنی پسند کی ڈھیر ساری چوڑیاں دلائیں۔ جوتے لے کر دیئے چھٹکو کے لیے ڈھیر سارے کھلونے خریدے مہنگے سے مہنگے ریڈی میڈ سوٹ اور جوتے لیے اس کا بس نہ چلتا تھا کہ اس روز وہ اپنا سارا اکاؤنٹ خالی کر دیتا۔

ہانیہ اس سے اچھی خاصی ناراض ہو گئی تھی مگر اس نے پروا نہیں کی مارکیٹ سے واپسی کے بعد وہ ہانیہ کے گھر چلے آئے تھے کچھ دیر وہاں بیٹھ کر چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ گھر چلے آئے گھر آتے ہی اس نے ہانیہ کو تیار ہونے کا آرڈر دیا تھا۔

اسی کی پسند پر ہانیہ نے بلیک شیفون کی ساڑھی زیب تن کی تھی اسی کی فرمائش پر خوب میک اپ کیا تھا اسی نے جھک کر ہانیہ کو ہائی ہیل کی سینڈل پہنائی تھی' خود اس نے سفید شلوار سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔

سالگرہ کی ساری ارینجمنٹ اس نے ہوٹل میں کر رکھی تھی مگر ہانیہ کے لیے سرپرائز تھا۔ چھٹکو کو آیا بیگم کے سپرد کر کے وہ ہانیہ کو ہوٹل لے آیا تھا۔ ریسپشن پر مختصر بات چیت کے بعد جب اس نے مطلوبہ کمرے کے سامنے پہنچ کر اس کا لاک کھولا اور پھر ہانیہ نے پہلا قدم دھرا ان دونوں پر ڈھیر سارے پھولوں کی برسات ہوئی تھی' ہانیہ کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔

باہر بارش کا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا تھا یوں لگتا تھا جیسے

آج کے بعد بارش کو کبھی برسنا ہی نہیں۔ کمرے کے وسط میں چھوٹی سی میز پر ایک نہایت خوب صورت کیک مختلف تازہ پھولوں اور کینڈلز کے ساتھ اچھی طرح سجا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ حیران ہی تو رہ گئی تھی۔

کتنے دل کش رنگ تھے زندگی کے جن سے نہال حسن نے اسے متعارف کروایا تھا اسے یاد تھا بچپن میں اگر کبھی کسی کے ساتھ اس کی لڑائی ہو جاتی تھی تو جب تک نہال اس کا بدلا نہ لے لیتا چین سے نہیں بیٹھتا تھا کبھی بھولے سے بخار چڑھ جاتا تو اس کی جان پر بن جاتی تھی۔

وہ اس کی شدتوں سے بخوبی واقف تھی اس کی تالیوں کی گونج میں نہال نے کیک کاٹا تھا بے شک ہانیہ کے لیے وہ ایک طلسمی رات تھی۔

باہر برستی بارش میں مزید شدت آگئی تھی۔ نہال ہانیہ کو ساتھ لیے گلاس ونڈو کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"پتا نہیں کیوں مگر مجھے ایسا لگتا ہے ہانیہ! جیسے بارش کا میرے ساتھ بہت گہرا رشتہ ہے جس رات میں پیدا ہوا اس رات مما بتاتی ہیں کہ بہت بارش ہوئی تھی جس روز میری تم سے دوستی ہوئی اس روز بھی بارش نے سارے علاقے کو بھگو رکھا تھا جس روز تمہاری شادی ہوئی اس رات بھی بہت بارش ہوئی تھی میرے اندر بھی اور باہر بھی...... جس روز مجھے اپنی بیماری کا پتا چلا اس روز بھی دو دن سے بارش ہو رہی تھی اور آج...... آج بھی دیکھو کتنی بارش ہو رہی ہے۔" وہ خود کو جتنا خوش ظاہر کر رہا تھا اندر سے اتنا ہی اداس تھا ہانیہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"بارشوں کی تاریخ سے کون واقف ہے مگر پھر بھی نہال! کون ہوگا دنیا میں جس کا بارش کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا جسے بارش اچھی نہیں لگتی ہوگی وہ شعر نہیں سنا تم نے......

بارش کی بنیاد میں جانے کس کے کتنے آنسو ہیں
صدیوں پہلے شاید کوئی صدیوں بیٹھ کے رویا ہے

"ہوں سنا ہے اور ہمیشہ مجھے اس شعر نے گہری سوچ عطا کی ہے۔"

"رات کافی ہوگئی ہے نہال! اب سو جاؤ۔" ہانیہ کی نظر اچانک وال کلاک کی طرف اٹھی تھی نہال بدستور گلاس ونڈو کے اس پار کھڑا دیکھتا رہا۔

"بارش میں مجھے نیند نہیں آتی ہانیہ! بالکل بھی نہیں۔"

"جھوٹ! مجھ سے ناراضگی کے دنوں میں تو تم سکون سے سو جاتے تھے۔"

"نہال سوجاتا تھا سکون سے یا پھر صرف تمہیں شو کرواتا تھا۔"

"تو ہو آج پتا چلا تم کتنے بڑے جھوٹے ہو۔" ہلکا سا مکا نہال کے بازو پر رسید کرتے ہوئے وہ مسکرائی تھی نہال بھی مسکرا دیا۔

"ایک بات پوچھوں ہانیہ؟"

"ہوں پوچھو۔"

"ناراض تو نہیں؟"

"نہیں۔" ہانیہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں وہ سڑک کے اس پار دیکھتا رہا۔

"جس روز تمہیں میری بیماری کے بارے میں پتا چلا تھا کیا فیلنگز تھیں تمہاری؟"

"پتا نہیں نہال! فیلنگز تو دھڑکتے دل والوں کی ہوتی ہیں، میرا تو دل ہی رک گیا تھا مجھے لگا میں بھری دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں کوئی بھی نہیں ہے میرے پاس، میرا وجود جیسے ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا تھا۔"

"اور جس روز تمہیں پتا چلا کہ میں اس دنیا میں نہیں رہا اس روز......؟" وہ اس کے ضبط کا امتحان لے رہا تھا۔ ہانیہ کے حلق میں غم کی شدت سے کانٹے اگ آئے آنسوؤں کا ریلا جو جاری ہوا تو پھر بہتا ہی چلا گیا نہال نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر کھینچ کر بانہوں میں بھر لیا۔

"محبت کو اتنا سر نہیں چڑھاتے ہانی! اس طرح کھا جاتی ہے یہ انسان کا۔" اپنی ٹھوڑی اس کے سر پر ٹکاتے ہوئے وہ اسے نصیحت کر رہا تھا وہ چپ چاپ روتی رہی۔

"تمہیں پتا ہے نا ہانی! میں کبھی تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا اچھا سوری وعدہ کرتا ہوں میں کبھی تمہیں دوبارہ اس ٹاپک پر کچھ نہیں کہوں گا پلیز چپ کرو پلیز۔" خود اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا وہ ہانیہ کے آنسو دیکھ سکتا تھا مگر ہانیہ اس کے آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"تمہیں نیند نہیں آرہی ہے نا ہانیہ؟"

"ہوں۔" اس کے سینے میں منہ چھپائے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ نہال نے فوراً پردے گرا دیے۔

"تو آؤ چلو میں سلاتا ہوں۔" وہ چپ چاپ بیڈ پر اس کے پہلو میں لیٹ کر بازو پر سر رکھ کر سو گئی۔

❀ ❀ ❀

آدھی رات کا پہر تھا۔

ہانیہ کی آنکھ کھلی تو نہال بستر پر نہیں تھا اور اس کا دل اتنی شدت سے دھڑکے جا رہا تھا کہ وہ خود بھی گھبرا اٹھی تھی دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر وہ اٹھی تھی سب سے پہلے واش روم چیک کیا مگر وہ وہاں نہیں تھا تب دھڑکتے دل کے ساتھ پریشان سی وہ کمرے سے باہر آئی تھی جہاں سامنے ہی لابی میں وہ موجود تھا۔ بیچ میں اچانک اٹھنے والے درد نے اس کی جان پر بنا رکھی تھی اور وہ صرف اس کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے اکیلا کمرے سے باہر چلا آیا تھا۔ ہانیہ کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

"نہال۔" تیر کی سی تیزی سے وہ اس کی طرف بھاگی تھی نہال کا سارا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔

"نہال...... نہال تم ٹھیک ہو نا؟"

وہ تڑپ ہی تو اٹھی تھی مگر وہ بول نہیں پا رہا تھا ہانیہ کو لگا جیسے اس کا دل رک جائے گا۔ بڑی مشکل سے وہ اسے کمرے میں واپس لائی تھی اگلے ہی پل کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے حسن صاحب کو کال کردی تھی۔ جس وقت وہ نہال کو لے کر ہوسپٹل پہنچی تھی حسن صاحب بھی پہنچ گئے تھے نہال کی سانس قابو میں نہیں آرہی تھی۔ بارش کی وجہ سے ڈرائیو میں بھی مشکل ہو رہی تھی سارے سفر میں نہال کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہا تھا اور وہ گاہے بگاہے اس کا ہاتھ یوں شدت سے دبا رہا تھا جیسے اس سے درد برداشت نہ ہو رہا ہو۔

ہسپتال پہنچتے ہی اسے ایمرجنسی روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا حسن صاحب نم آنکھوں سے اسے تسلی دیتے رہے۔ مسز حسن بھی ساتھ ہی چلی آئی تھیں فقط چند لمحوں میں وقت نے انہیں کتنا کمزور اور بوڑھا کر دیا تھا وہ بے آواز روتی رہیں۔

کتنے آنسو تھے جو انمول موتیوں کی طرح ٹوٹ کر بکھر رہے تھے کتنی دعائیں تھیں جو اس نے رو رو کر بے آواز دل ہی دل میں مانگی تھیں۔ نہال کی حالت تسلی بخش نہیں تھی اسے اسپیشل ٹریٹمنٹ کے تحت آئی سی یو میں شفٹ کیا گیا تھا ہانیہ ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں کے ساتھ کھڑی دیکھتی رہی۔ نہال آکسیجن کے تحت سانس لے رہا تھا۔ مسز حسن نم آنکھوں سے مختلف قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اس پر پھونک رہی تھیں۔

"پتا نہیں کیوں مگر مجھے ایسا لگتا ہے ہانیہ! جیسے بارش کا میرے ساتھ بہت گہرا رشتہ ہے جس رات میں پیدا ہوا تھا اس رات مما بتاتی ہیں بہت بارش ہوئی تھی جس روز میری تم سے دوستی ہوئی تھی اس روز بھی بہت بارش ہوئی تھی پھر جس روز تمہاری شادی ہوئی (میکال کے ساتھ) اس رات بھی بہت بارش ہوئی تھی میرے اندر اور باہر بھی اور...... جس روز مجھے اپنی بیماری کا پتا چلا اس روز بھی دو دن سے بارش ہو رہی تھی اور آج...... آج بھی دیکھو کتنی بارش ہو رہی ہے۔" اس کا لہجہ اس کی سماعتوں میں گونجا تھا اور وہ شیشے سے ماتھا ٹکاتے ہوئے سسک پڑی تھی۔ کہیں دور مسجد میں فجر کی اذان بھی ہو گئی تھی۔

لمحے گیلی ریت کی مانند ہاتھ سے پھسلتے جا رہے تھے دعاؤں کی شدت بڑھتی رہی۔ چوبیس گھنٹے زندگی اور موت کی جنگ لڑنے کے بعد بالآخر فرشتے کے اس پار نہال حسن نے زندگی ہار دی تھی۔ ڈاکٹرز ان سے معذرت کرتے تسلی کے دو بول تھما کر آگے بڑھ چکا تھا۔ ہانیہ کو لگا جیسے اس کا وجود بلاسٹ ہو گیا ہو بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟

نہال حسن اسے یوں چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا؟ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ
بس ایک موتی سی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر
ستارۂ شام بن کے آیا برنگ خواب سحر گیا وہ
خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں مرے تو دل میں اتر گیا وہ
نہ اب وہ یادوں کا چڑھتا دریا نہ فرصتوں کی اداس برکھا
یوں ہی ذرا سی کسک ہے دل میں جو زخم گہرا تھا بھر گیا وہ
کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی بدل چلا رنگ آسماں بھی
جو رات بھاری تھی کٹ گئی وہ جو دن کڑا تھا گزر گیا وہ
شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہم سفر تھا مثال گرد سفر گیا وہ
وہ میکدے کو جگانے والا وہ سب کی نیندیں اڑانے والا
یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی "گھر" گیا وہ
وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ

وہ شخص جس تاریخ کو دنیا میں آیا تھا اسی تاریخ کو دنیا سے رخصت بھی ہو گیا مگر آنسو پتھر کیسے ہوتے ہیں یہ کوئی ہانیہ صفدر سے پوچھتا ہنستی بستی آبادیوں میں جیسے طوفان اچانک تباہی مچا کر چلے جاتے ہیں بالکل ویسے ہی ہانیہ صفدر کا دل بھی تباہی

کی جینٹ چڑھ گیا تھا۔

پھر تین دن اس کا سکتہ نہیں ٹوٹا تھا۔ گہری ابدی نیند سوئے نہال حسن اس کے سامنے لیٹا تھا اور وہ ٹکر ٹکر ساکت نگاہوں سے اسے دیکھے جارہی تھی اس کا بیٹا نہال کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے گالوں کو چوم رہا تھا‘ اسے مجبور کررہا تھا کہ وہ اٹھ کر اس کے ساتھ کھیلنے یا بائیک پر باہر لے کر جائے اور نہال کے ٹس سے مس نہ ہونے پر اس نے زور زور سے رونا شروع کردیا تھا۔ کتنی عادتیں بگاڑ دی تھیں نہال نے اس کی۔

مسز حسن بار بار بے ہوش ہورہی تھیں‘ سارا اور مائرہ کا بھی کوئی حال نہیں تھا جب کہ حسن صاحب کمال حسن کے گلے لگے بچوں کی طرح بلک رہے تھے۔ ہانیہ اکیلی سارے معاملات سنبھالتی پھر رہی تھی۔ ہادیہ اور جازب اس کے پاس تھے مگر وہ تو اکیلی ہوگئی تھی۔ حسن منزل کے در و دیوار ایک مرتبہ پھر اسے راس نہیں آئے تھے۔

میکال جنازے کے وقت یہاں پہنچا تھا وہ بھی ایسے حال میں جیسے صدیوں کا سفر پیدل طے کرکے آیا ہو۔ گھر میں جمع ہوئے لوگ اور آنکھوں کے سامنے پڑی نہال حسن کی میت نے جیسے من کے اندر ہی توڑ کر رکھ دیا تھا اسے۔ وہ بکھرا سا لاؤنج کی دہلیز پر کھڑا رہ گیا تھا‘ کتنے پہاڑ تھے جو اس پر گرے تھے؟

کتنی قیامتیں تھیں جو اس وقت اس پر ٹوٹی تھیں

جنازہ اٹھایا جاچکا تھا‘ گھر میں کہرام بپا تھا اور وہ خالی خالی نگاہوں سے سب دیکھتا گیا۔ کتنی جلدی تھی نہال حسن کو جانے کی کہ اس نے اسے معاف کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا وہ رویا تو پھر جیسے حسن منزل کے در و دیوار لرز گئے تھے۔

نہال حسن کی آخری آرام گاہ تک حسن صاحب نے اسے کندھا دیا تھا اور کیسے دیا تھا یہ صرف وہی جانتے تھے۔

❁...❁...❁

نہال کی موت کو وہ دوسرا دن تھا جب میکال نے چنکو کو دیکھا تھا نہال کی تصویر اٹھائے وہ اسے پیار کررہا تھا۔ وہ شاکڈ سا اسے دیکھتا رہ گیا بے شک وہ ہو بہو اسی کی تصویر تھا۔

ہانیہ بار بار ہوش میں آتی تھی اور پھر بے ہوش ہوجاتی تھی۔ اس کی حالت کے پیش نظر ہی ہادیہ دو تین روز کے لیے یہاں ٹھہر گئی تھی۔ وقت ایک مرتبہ پھر پر لگا کر اڑنے لگا تھا مگر ہانیہ کی طبیعت نہیں سنبھلی تھی‘ وہ صرف چنکو سے باتیں کرتی تھی اسے ایک منٹ کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے دور نہیں کرتی تھی‘ تھوڑی دیر بھی وہ نظر نہ آتا تو پاگلوں کی طرح اسے سارے گھر میں ڈھونڈتی پھرتی۔ میکال جب جب اسے دیکھتا ڈسٹرب ہوکر رہ جاتا تھا۔ ایک عجیب سا قفل تھا جو ہانیہ صفدر کے لبوں پر لگ چکا تھا‘ کبھی لان کی دھوپ میں اکیلی بیٹھی آپ ہی آپ مسکرائے جاتی اور کبھی چاندنی رات میں بالکونی میں کھڑی بنا کسی بات کے ہی رو پڑتی تھی۔

میکال کی وجہ سے اس نے کمرے سے نکلنا بھی تقریباً چھوڑ دیا تھا‘ کئی کئی دن اسے نہ منہ دھونے کا خیال رہتا نہ کپڑے تبدیل کرنے کا۔ ان دنوں اسے لوگوں سے وحشت ہوتی تھی جہاں آوازیں سنتی اٹھ کر چلی جاتی یا چیخنے لگتی۔ ایک بار اس کے کمرے میں ٹیلی ویژن چل رہا تھا اور چنکو نے آواز تیز کررکھی تھی تبھی اس نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر اسکرین پر دے مارا اس کی اسی حالت کے پیش نظر میکال نے چنکو کو اسکول میں داخل کروادیا تھا۔ نہال کے بعد وہ ہانیہ سے زیادہ میکال کے قریب ہوگیا تھا کیونکہ وہ اس کی ساری فرمائشیں پوری کرتا تھا اس کے خوب ناز اٹھاتا تھا۔

اس روز بھی اسکول سے آنے کے بعد وہ ہانیہ کے ساتھ اس کے کمرے میں سورہا تھا جب میکال کی آواز کانوں میں پڑتے ہی چپکے سے اٹھ کر اس کے کمرے میں آگیا۔ ہانیہ اسے مزے مزے کی کہانیاں سنا کر سلاتی تھی اسے ہوم ورک کرواتی تھی مگر میکال اسے مختلف سی ڈیز میں مزے مزے کے کارٹون لگا کر دکھاتا‘ مختلف گیمز لگا کر اسے اپنے ساتھ کھلاتا تھا اکثر وہ اسے نہال کی قبر پر بھی ساتھ لے جاتا تھا۔

اس وقت بھی وہ اسے کارٹون لگا کر دکھا رہا تھا جب وہ ڈھونڈتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

”سنی...... سنی......“ پاگلوں کی طرح وہ اسے پکار رہی تھی‘ جب چنکو سہم کر میکال کی ٹانگوں میں چھپ گیا۔

”مما میں یہاں نہیں ہوں۔“ میکال کی ٹانگوں میں چھپے چھپے اس نے معصوم سے لہجے میں کہا تھا وہ مسکرا کر رہ گیا ہانیہ جو سامنے سے گزر رہی تھی چونک کر اندر چلی آئی۔

”چنکو....“ اس نے اتنے غصے سے پکارا تھا کہ وہ فوراً میکال کی ٹانگوں سے نکل کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

”سوری مما!“

”سوری کے بچے! ایک دفعہ کی بات سمجھ نہیں آتی تمہیں‘

"کیوں آئے ہو یہاں۔" میکال کے سامنے ہی وہ تھپڑ اس نے چھکو کے گال پر دے مارے تھے، جبھی وہ تڑپا تھا۔

"آئی ایم سوری ہانیہ، معذرت، چھکو کی طرف سے، ابھی بچہ ہے۔"

"جسٹ شٹ اپ۔" چھکو کا بازو کھینچتے ہوئے اس نے حقارت سے اسے جھڑکا تھا۔

بعد میں اس گھر کے بھی مکینوں کے ساتھ اس کا رویہ بہت تلخ ہو گیا تھا کیونکہ ان سب نے میکال کو معاف کر دیا تھا۔ اس رات وہ چھکو کے لیے دودھ لینے کچن میں آئی تھی، جب کچن سے نکلتے میکال حسن کے ساتھ اس کا ٹکراؤ ہو گیا وہ پانی لینے آیا تھا اور اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ہانیہ سے ٹکرا جائے گا۔

"سوری۔" سرسری سی نظر اس پر ڈالتے ہوئے وہ اس کی سائیڈ سے نکل گیا تھا، ہانیہ تنفر سے سر جھٹک کر رہ گئی۔

کچھ روز پھر خاموشی کی نذر ہو گئے تھے اس کی عدت ختم ہونے میں ابھی کچھ دن رہتے تھے اور اس نے سوچ لیا تھا عدت ختم ہونے کے بعد وہ وہاں ایک پل کے لیے بھی نہیں رہے گی۔ حسن صاحب اور مسز حسن کی خواہش تھی کہ ہانیہ اور میکال پھر سے مل جائیں مگر ہانیہ کے رویے اور حالات کے پیش نظر ان کے لیے اپنی خواہش کو زبان دینا مشکل لگ رہا تھا ادھر صفدر صاحب کے علاج کے لیے جاذب انہیں انگلینڈ لے کر گیا تو پھر وہیں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا۔ ہانیہ نے انہیں روکنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

***

حسن منزل میں اتری ویرانیوں اور مسز حسن کی حالت کے پیش نظر حسن صاحب نے بھی پاکستان سے کوچ کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میکال بزنس سمیٹ رہا تھا جب کہ کمال اور صبا پچھلے ہفتے ہی واپس جا چکے تھے۔ حسن صاحب نے ہانیہ سے بھی بات کی تھی اور اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ کسی صورت پاکستان سے جانا نہیں چاہتی تھی لہٰذا اس نے انہیں صاف انکار کر دیا تھا۔ بمشکل عدت کے دن پورے کر کے وہ چھکو کے ساتھ اپنے آبائی گھر چلی آئی تھی جس پر میکال پیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا۔

حسن صاحب اور ان کی فیملی کے انگلینڈ شفٹ ہونے کے بعد ایک روز وہ پلان کے تحت اس کے بیٹے کو اسکول سے ساتھ لے گیا اور بعد میں کال کے ذریعے ہانیہ کو مطلع کر دیا کہ جس طرح وہ اپنے بیٹے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح وہ بھی اپنے بیٹے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا لہٰذا اسی لیے وہ اسے اپنے پاس لے جا رہا ہے تاکہ اس کی بہترین پرورش کر سکے۔ اس نے ہانیہ پر چوٹ کی تھی کہ وہ اس کے بیٹے کو کچھ نہیں دے سکتی سوائے محرومیوں کے لہٰذا اس کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ نہال کی یادوں کو سینے سے لگا کر جیتی رہے۔

ہانیہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ اتنا برا سلوک بھی کر سکتا ہے، جبھی وہ چیخ چیخ کر روئی تھی مگر وہاں اس کے آنسو دیکھنے والا کون تھا؟ فارحہ کو ساری بات کا پتا چلا تو وہ بھاگ آئی تھی بعد میں اسی نے اس کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ اور ایک بہترین جاب کا بندوبست کیا تھا، یہی نہیں بلکہ ہانیہ کی تنہائی دور کرنے کے لیے اس نے اپنی بیٹی بھی کچھ عرصے کو دی تھی۔ انہی دنوں اسے صفدر صاحب کی رحلت کی خبر ملی تھی اور وہ تقریباً دو ماہ انگلینڈ رہ کر آئی تھی۔ مسز اینڈ مسٹر رحیم بھی اکثر و بیشتر ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ہانیہ نے یہی سنا تھا کہ میکال اس کے بیٹے کو لے کر اپنی بیوی کے ساتھ فرانس جا بسا تھا۔ اسی لیے رفتہ رفتہ وہ اس غم سے نکل آئی تھی مگر نہال کے ساتھ ساتھ یہ غم بھی پھانس بن کر اس کے دل میں چبھ گیا تھا۔ گو اس نے رشتوں سے صبر کرنا سیکھ لیا تھا مگر پھر بھی دل تھا کہ بھری دنیا میں کہیں لگتا ہی نہیں تھا۔

***

ٹپ ٹپ ٹپ......

رات ست روی سے بیتتی جا رہی تھی اور اس کے آنسو بہتے نہال حسن کی تصویر پر گرتے جا رہے تھے۔ کون تھا اللہ کے سوا جو آج اس کے آنسو دیکھتا اور اس کے درد کو محسوس کرتا۔ اس کی زندگی مکمل طور پر اس نظم کی ترجمان ہو کر رہ گئی تھی۔

اب تو خواہش ہے یہ دعا یا طلب
سانس لینے کی حسرت میں مر جائیں ہم
اب تو خواہش ہے یوں زندگی چلے
جس میں جگنو کی مانند بکھر جائیں ہم
اب تو خواہش ہے یہ دیوانوں کا غم
لگی ٹھوکر لگائے کہ جی نہ سکیں
لگی الجھنیں یہ سینے میں سانسیں کہ بس
ہم تو دیوانا چاہیں تو پی نہ سکیں
کوئی ہمدم ملا نہ راحت ملے
ایک پل کا سہارا نہ چاہت ملے
اب تو خواہش ہے یہ
دشت ہی دشت ہو مجھے پاؤں چلیں
ہم ہر بزم شمع کی مانند جلیں
جس کو چاہیں وہ ہم سے مکرنے پائیں کبھی
چھوڑ جائیں یوں چپ چاپ جو دنیا کو ہم
دل کی یہ چاہت بھی تو ہم نہ آئیں کبھی
اب تو خواہش ہے یہ
کوئی صحرا، کوئی بیابان ہو
جس میں سالوں تلک تیری قید ہو
اپنے خالق و مالک سے میں نے جو کی
بے وفائی وہاں پر وہ ادا ہو
اب تو خواہش ہے یہ کہ سزا وہ ملے
روئے جاؤں تو چپ نہ کرائے کوئی
وہ جنگل میں یا پھر کسی دشت میں
ہاتھ پکڑے میرا چھوڑ آئے کوئی
اب تو خواہش ہے یہ!

***

حورعین اور عزیر کا نکاح ہو گیا تھا۔

کاسنی رنگ کی کرتی میں دلہن بنی وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی جیسے بھرا ہوا کوئی مسافر کسی جھیل کنارے پلکیں موندے خاموش بیٹھا ہو، خود عزیر بھی چپ چپ سا تھا البتہ دادی اور عمیر بہت خوش تھے۔ منیر کی تو جیسے لاٹری نکل آئی تھی، ماں کے بعد پہلی بار کسی عورت نے اس پر توجہ دی تھی۔

سارا گھر مہمانوں سے بھرا تھا، ثانیہ اور اس کی دادی بھی آ گئی تھیں البتہ اس کے بچے اس کے ساتھ نہیں تھے۔ تقریب کے اختتام کے بعد دادی کے حکم پر ثانیہ نے اپنی کلوز فرینڈ سے جو بہت اچھی گائناکولوجسٹ تھی، حورعین کا چیک اپ کروایا تھا۔ کمرے میں اس وقت حورعین، ثانیہ اور اس ڈاکٹر کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، اچھی طرح چیک اپ کے بعد لیڈی ڈاکٹر عائلہ نے اس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔

"ٹھیک ہے کہ مس حورعین کہ آپ کنواری نہیں ہیں، مگر......"

"میری آج ہی شادی ہوئی ہے۔" ڈاکٹر کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ شروع ہو گئی تھی۔

"میرے اور عزیر صاحب کے درمیان اس سے پہلے کچھ نہیں تھا، بس مجھے چھت کی ضرورت تھی، اسی ضرورت کے تحت جھوٹ بول کر یہاں رہ رہی تھی۔"

"آئی سی...... تو یہ بات آپ نے چھوٹی دادو کو کیوں نہیں بتائی؟" ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ ثانیہ بھی حیران رہ گئی تھی، حورعین نے سر جھکا لیا۔

"انہیں کیسے بتا سکتی تھی اگر انہیں بتا دیتی تو وہ مجھے کبھی اپنے گھر میں نہ رہنے دیتیں۔"

"تو اب میں ان سے کیا کہوں؟ وہ تو پوتا کھلانے کے لیے بے چین ہیں۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

وہ ذہنی طور پر پریشان لگ رہی تھی۔ ثانیہ نے ایک نظر اس کے سجے سنورے روپ پر ڈالی پھر اپنی دوست کے ساتھ اسے آرام کی تلقین کرتی کمرے سے باہر نکل گئی کمرے میں تنہائی میسر آتے ہی حورعین کے آنسو تیزی سے بہہ نکلے تھے۔

اسے یاد آ رہا تھا ابو عبدالہادی کی شہادت کے بعد مجاہدین نے باحفاظت اسے علی اصغر اس کے گھر پہنچا دیا تھا، بے حد مغموم سی وہ گھر میں داخل ہوئی تو وہاں جیسے الو بول رہے تھے۔ وہ چپ چاپ لاؤنج میں دھرے صوفے پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ تقریباً بارہ بجے کے قریب اس کی سوتیلی ماں بے حد مختصر لباس میں اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ حورعین پر نظر پڑتے ہی اس کے اندر جیسے کرنٹ دوڑ گیا تھا۔

"تم......؟" کسی چیل کی مانند وہ حورعین پر جھپٹی تھی، حورعین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں، اس کا چہرہ اس وقت بے حد ستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"ساری دنیا کی خاک چھان کر منہ کالا کر کے پھر یہیں چلی آئیں، کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے، میں نے کوٹھا نہیں کھول رکھا یہاں، دفع ہو جاؤ جہاں سے آئی ہو۔" وہ تو سمجھی تھی کہ حورعین کہیں مر کھپ گئی ہوگی اور یوں اس کی تمام جائیداد اب اس کی ہو گئی مگر اسے ایک مرتبہ پھر زندہ دیکھ کر وہ تو حیران ہی رہ گئی تھی۔ اس کی نفرت اور غصہ فطری تھا، حورعین رو پڑی۔

"میری بات سنیں پلیز، میں کہیں منہ کالا کر کے نہیں آ رہی ہوں، میں تو...... میں تو دکھوں کا سمندر پار کر کے آئی ہوں، مگرمچھوں کے جنگل سے ہو کر آئی ہوں۔"

"جہاں سے بھی آئی ہو میری طرف سے جہنم میں جاؤ اب اس گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔" بنا اس کی روداد سنے اس کی سوتیلی ماں نے ملازم سے کہہ کر زبردستی اسے گھر سے باہر نکلوا دیا تھا، وہ ساری رات برستی بارش میں گھر کے باہر

بیٹھی روتی رہی۔

اگلے دن وہ اپنے فیملی وکیل کے پاس چلی گئی حورعین کی پراپرٹی ملکیت کے تمام کاغذات انہی کے پاس تھے وہ نہ صرف ان کے فیملی وکیل تھے بلکہ اس کے پاپا کے بہت اچھے دوست بھی تھے۔ حورعین کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے تھے انہی کی مدد اور دھمکیوں سے حورعین کو اپنے گھر میں دوبارہ جگہ ملی تھی۔

اس کی سوتیلی ماں دوسری شادی کر چکی تھی اور اب حورعین کی تمام جائیداد پر قبضہ کیے اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ پورے عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ وکیل صاحب کی اپنی فیملی کچھ ہی عرصہ قبل باہر شفٹ ہوئی تھی اور وہ بھی ریٹائرمنٹ کے بعد باہر شفٹنگ کی تیاری کر رہے تھے۔

جب تک وہ پاکستان میں رہے حورعین کو کوئی مسئلہ نہیں ہوا لیکن جیسے ہی باہر روانگی سے قبل وہ حورعین کو ملنے آئے اور اس کی سوتیلی ماں کو اس کا خیال رکھنے کی ہدایت کی وہ عورت پھر سے ناگن بن گئی وکیل صاحب کی باہر روانگی کے بعد حورعین کے لیے جیسے نفرتوں اور مظالم کے پہاڑ کھڑے کر دیے گئے۔ کئی بار اس کی سوتیلی ماں اور اس کے شوہر نے قتل کرانے کا ارادہ کیا اور اس روز جب اس کی سوتیلی ماں اپنی کسی دوست کے گھر گئی ہوئی تھی اس کے شوہر نے موقع پا کر اسے دبوچ لیا ایک قیامت اس پر پہلے ٹوٹی تھی اور ایک قیامت کا سامنا اسے اب تھا۔

اس روز جس طرح سے وہ اپنی عزت اور اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگی تھی اور قبرستان پہنچی تھی۔ قبرستان سے اس نے مسجد کا رخ کیا تھا اور مسجد سے عذیر کے گھر کا جہاں وہ اپنی کلاس فیلو کے ساتھ ایک مرتبہ پہلے بھی آ چکی تھی۔

سر درد سے پھٹ رہا تھا جب کہ جسم شدید بخار میں جل رہا تھا وہ جھوٹی اور فریبی نہیں تھی مگر عزت کے خوف نے اسے جھوٹ بول کر گھر میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ عذیر نے اس کی سوتیلی ماں اور اس کے شوہر پر ناجائز قبضے کا پرچہ کروا رکھا تھا مگر ابھی تک اس کیس کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔

❁ ❁ ❁

رات کافی ہو گئی تھی۔ عذیر کمرے میں آیا تو حورعین سو چکی تھی تاہم آنسوؤں کے نشان اس کے گالوں پر ثبت تھے۔ زبیر آج بھی ضد کر کے اسی کے ساتھ سو رہا تھا۔ اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا مگر مٹا مٹا سا میک اپ اب بھی اس کے حسین چہرے کو چار چاند لگا رہا تھا وہ سرسری سی ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد خود بھی کپڑے تبدیل کر کے بیڈ پر آ گیا تھا۔ سلمیٰ کو اس شادی کی خبر ہوئی تو اس نے فوراً ہی چپ چاپ راستہ تبدیل کر لیا۔ شاید وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ آنے والے دنوں میں حورعین کی ذمہ داریاں مزید بڑھ گئی تھیں۔ عذیر کے تقریباً سارے کام اس نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔

اس کی وارڈ روب دھلے دھلائے کپڑوں سے ہر وقت بھری رہتی تھی جوتے روز پالش کیے ملتے ناشتا وقت سے پہلے تیار کیا ملتا۔ کمرا ہر وقت نفاست سے سیٹ کیا صاف ستھرا ملتا موزے ٹائی بنیان ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ملتی اسے لگا وہ جیسے کسی جنت میں آ گیا ہو۔

میر عمیر زبیر کے ٹھاٹھ بھی دیکھنے والے تھے سب کی ذمہ داریاں حورعین نے اپنے سر لے لی تھیں رات گئے تک وہ کچن اور گھر کے کاموں سے فارغ نہیں ہوتی تھی۔ زبیر کے لیے جیسے اس نے سگی ماں کا درجہ لے لیا تھا۔ وہ اس کے بغیر پل کر پانی بھی نہیں پیتا تھا اسکول سے آنے کے بعد رات سونے تک اس کے پلو سے بندھا رہتا تھوڑی دیر کے لیے بھی وہ نظر نہ آتی تو رو رو کر سارا گھر سر پہ اٹھا لیتا تھا حورعین خود بھی اس کی بہت عادی ہو گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

اس روز سنڈے تھا۔ عذیر دیر تک بستر میں پڑے رہنے کے بعد اٹھ کر کمرے سے باہر آیا تو حورعین سارے گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی۔ ساتھ ہی اس نے کپڑے دھونے والی مشین بھی لگا رکھی تھی زبیر اور عمیر ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھے جنہیں ناشتا کروانے کا کام بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا وہ حیران ہی تو رہ گیا تھا وہ لڑکی تھی یا کوئی مشین؟

ایک مدت کے بعد اس مکان کو گھر بننا نصیب ہوا تھا جبکہ سلمیٰ خود کو اس طرح سے ایڈجسٹ کر سکتی تھی شاید کبھی نہیں۔ دادی ماں ہر طرح سے مطمئن ہو کر گاؤں چلی گئی تھیں تاہم ان کی غیر موجودگی میں بھی اس نے اپنی ذمہ داریوں سے نگاہ نہیں چرائی تھی۔ عذیر فریش ہونے کے بعد خود بھی ڈائننگ ٹیبل کی طرف آ گیا تھا۔

"ناشتا لاؤں آپ کے لیے؟"

"ہوں۔" ایک نظر حورعین پر ڈالنے کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔

"عذیر بھائی ایک بات کہوں؟" عمیر جو ناشتے سے فارغ

ہوچکا تھا نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔
"ہوں کہو......" سرسری نظر اخبار پر ڈالتے ہوئے عذیر نے اس کی طرف دیکھا تھا۔
"عذیر بیٹا! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ سلمیٰ بھابی کی جگہ ہمیشہ کے لیے حور بھابی ہی اس گھر میں رہیں۔" اس کے الفاظ نے عذیر کا دل دھڑکا دیا تھا' حورعین جو ناشتے کی ٹرے لارہی تھی خود بھی ٹھٹک گئی۔
"سچ کہہ رہا ہوں عذیر بیٹا! اس گھر کو صرف حورعین بھابی کی ضرورت ہے' ان کی جگہ کبھی بھی کوئی دوسری لڑکی یہ گھر نہیں سنبھال سکتی۔"
بنا عذیر اور حورعین کی طرف دیکھے وہ اپنے دل کی بات کہہ رہا تھا' حورعین نے لب بھینچ لیے۔ عذیر کا ناشتا خاموشی سے ٹیبل پر رکھنے کے بعد وہ واپس پلٹ گئی تھی۔ شام میں زبیر نے آئس کریم کے لیے ضد کرلی عذیر چونکہ فارغ ہی تھا لہٰذا اس نے بھی کو ساتھ چلنے کی آفر کردی۔ حورعین دن بھر کے کاموں سے بے حد تھکی ہوئی تھی لہٰذا اس نے ساتھ چلنے سے معذرت کرلی مگر زبیر کہاں اس کی معذرت کو قبول کرنے والا تھا' مجبوراً اسے تھکن کے باوجود تیار ہونا پڑا۔ پورے راستے عمیر اور نمیر نے وہ شرارتیں کیں کہ سب کا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا' حورعین بھی مسکراتی رہی تھی۔
آئس کریم اور رات کے کھانے کے بعد وہ لوگ شاپنگ کے لیے نکل آئے تھے۔ نمیر اور عمیر اپنی اپنی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے جب کہ وہ زبیر کے لیے پاگل ہوئی جارہی تھی۔ عذیر سب کو ان کے حال پر چھوڑ کر سیل فون پر مصروف تھا' تھکن سے چور جس وقت وہ لوگ گھر واپس آئے رات کے ایک بجے کا ٹائم ہو رہا تھا مگر حورعین یہاں بھی اپنے فرائض نہیں بھولی تھی۔ سب کو دودھ کے گلاس دینے کے بعد وہ فارغ ہوکر کمرے میں آئی تو زبیر سوچکا تھا تاہم عذیر کو نیند نہیں آئی تھی تو وہ جاگ رہا تھا۔
"بہت دن ہوئے آپ قبرستان نہیں گئیں؟"
ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی وہ چوڑیاں اتار رہی تھی' جب اس نے کروٹ کے بل لیٹے لیٹے دائیں بازو کی ہتھیلی پر سر ٹکاتے ہوئے پوچھا۔ حورعین کے اندر ایک سناٹا سا اتر گیا۔
"جی...... وقت نہیں ملا۔"
"وقت......؟ میں نے دیکھا ہے قبرستان جانے کے معاملے میں آپ نے کبھی وقت کی پروا نہیں کی۔" اسے حیرت ہوئی تھی وہ نڈھال سی وہیں بیٹھ گئی۔
"پہلے میں اور اب میں بہت فرق ہے۔"
"نہیں حورعین! میں نے اپنا نام ضرور دیا ہے آپ کو مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ میری پابند ہوگئی ہیں یا میں نے آپ کو خرید لیا ہے آپ اب بھی آزاد ہیں پلیز خود پر ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ لاد کر شرمندہ مت کیا کریں۔" وہ بہت اپنائیت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا' حورعین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
"اور ہاں مجھے آپ کو ایک خوش خبری بھی سنانی تھی' کورٹ نے آپ کے حق میں فیصلہ دے کر آپ کی اسٹیپ مدر اور ان کے شوہر کو سزا سنادی ہے اب آپ اپنے فادر کی تمام جائیداد کی بلاشرکت غیرے مالک ہیں' کوئی بھی شخص اب آپ کو نہ تو آپ کے گھر سے نکال سکتا ہے نہ آپ کا کاروبار چھین سکتا ہے' کچھ لوگ ہیں جو وہاں آپ کی کمپنی میں ٹھیک نہیں ہیں۔ میں آپ کو کنفرم کردوں گا تب آپ ان کو ہٹا دیجیے گا۔"
خبر کیا تھی کوئی امرت تھا جو حورعین کی سماعتوں میں انڈیلا گیا' بے یقینی سی وہ بیڈ پر اس کے پاس چلی آئی تھی۔
"آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟"
"ہوں بالکل سچ۔" اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔ حورعین کے آنسوؤں میں شدت آ گئی تھی۔
"مم...... میں ابھی آئی۔"
تھکن کا احساس ایک پل میں اڑن چھو ہوگیا تھا' عذیر اس کی کانچ سی آنکھوں میں چھلکتے آنسو دیکھتا رہ گیا۔ اگلے بیس پچیس منٹ تک وہ نماز میں اللہ رب العزت کے حضور شکرانے کے نوافل ادا کرتی روتی رہی تھی یہاں تک کہ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ نوافل سے فارغ ہوکر سرخ چہرے کے ساتھ وہ دوبارہ کمرے میں واپس آئی تو عذیر بیڈ پر کچھ چیزیں بکھیرے بیٹھا تھا' وہ حیران ہی تو رہ گئی تھی۔
"یہ سب کیا ہے؟"
"آپ کی شاپنگ۔"
"مگر آپ نے یہ کب کی؟" حیران حیران سی وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی تھی۔ عذیر نے اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"جب آپ زبیر کے لیے مختلف چیزیں خریدنے میں مصروف تھیں تبھی میں بھی آپ کے لیے یہ سب خرید رہا تھا اور میں ہی کیا عمیر اور نمیر نے بھی آپ کے لیے بہت سی چیزیں خریدی ہیں وہ بھی اپنے جمع کیے ہوئے پیسوں سے آپ سوچ

بھی نہیں سکتیں حورعین! یہاں گھر کے کتنوں کے دلوں میں آپ کے لیے کتنا پیار ہے۔" جتنی اپنائیت سے وہ کہہ رہا تھا اتنی ہی تیزی سے حورعین کی آنکھیں چھلکی تھیں۔
"میں آپ لوگوں کی اتنی محبت اور اپنائیت کے قابل نہیں ہوں۔" مسلسل رونے سے اس کا لہجہ بھاری ہورہا تھا' عذیر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
"کون کتنی محبت اور اپنائیت کے قابل ہے یہ تو خدا ہی جانتا ہے مگر حقیقت یہی ہے حورعین! یہ گھر آپ جیسی عورت کے لیے ترس رہا تھا۔ عذیر کا سب کے ساتھ جھگڑا ہوتا تھا' کبھی کھانا اچھا نہ بننے پر' کبھی کپڑے صاف نہ دھلنے پر' کبھی ناشتا ٹائم پر نہ ملنے پر اور زبیر وہ تو لگتا تھا ماما کے بعد جیسے دنیا میں رہ رہا ہی نہیں' ہر وقت سہما رہتا تھا عجیب احساس محرومی کا شکار ہوکر رہ گیا تھا۔ اسکول میں دوستوں سے ان کی ماؤں کے لاڈ پیار کا سن کر اور بھی ٹوٹ پھوٹ جاتا تھا مگر آپ کے اس گھر میں آنے کے بعد یوں لگتا ہے جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو' سلمیٰ شاید یہ سب کبھی نہ کرپاتی۔"
وہ اس کی صلاحیتوں اور خدمات کا اعتراف کررہا تھا' حورعین سر جھکائے چپ چاپ سنتی رہی۔

❁ ❁ ❁

اس رات بہت بارش ہوئی تھی۔ عذیر صبح کی نماز کے لیے اٹھا تو حورعین گھر پر نہیں تھی' کچن' باتھ روم کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ جان گیا کہ وہ قبرستان گئی ہے اک یہی تو جگہ تھی جو اس کے دل سے لگی تھی تاہم سر جھٹک کر وہ واش روم میں گھس گیا تھا' آیا تو حورعین گھر پر تھی اور اس کا وجود تیز بخار کی لپیٹ میں تھا' بخار کی شدت سے وہ بھی سرخ ہورہا تھا' عمیر نے اسے ناشتا بنانے سے روک دیا۔ وہ کمرے میں آئی تو عذیر آفس کے لیے نکل رہا تھا۔
"السلام علیکم۔" عذیر پر نگاہ پڑتے ہی اس نے سلام کیا تھا' عذیر کے ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہاتھ وہیں رک گئے۔
"وعلیکم السلام! کہاں تھیں آپ؟" بہت سرسری انداز میں اس نے پوچھا تھا مگر حورعین کو اچھا نہیں لگا۔
"کچن میں تھی ناشتا بنارہی تھی' کیوں؟"
"نہیں کچھ نہیں' ویسے ہی پوچھ رہا تھا آج ناشتا آفس میں ہی کروں گا جلدی پہنچنا ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"
اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دیتے ہوئے اس نے اس کے سرخ چہرے پر توجہ دی تھی' حورعین بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔
"جی...... ٹھیک ہے۔" اس کے چہرے کی تمازت اور لہجے کے گریز کو اس وقت اس نے اس کے قبرستان سے ہوکر آنے کے احساسات سے منسوب کیا تھا' تبھی جلدی سے بیگ اٹھالیا۔
"چلیں ٹھیک ہے اب میں چلتا ہوں اپنا خیال رکھیے گا۔"
"جی ضرور۔"
عذیر کی ہدایت پر وہ صرف سر ہلا سکی تھی تاہم اس کے کمرے سے نکلنے کے بعد دروازہ لاک کرکے وہ اتنا روئی تھی کہ آنکھوں کے سوتے خشک پڑ گئے تھے۔
شام میں ہلکے ہلکے بخار کے باوجود اس نے خود کھانا بنایا تھا کیونکہ صبح کسی نے بھی ٹھیک سے ناشتا نہیں کیا تھا' دوپہر میں بھی نمیر کے ہاتھ کا بنا سالن کسی نے پسند نہیں کیا سب بھوکے اور پریشان تھے نمیر نے مشین لگا رکھی تھی جب کہ عمیر کچن صاف کررہا تھا۔ ساتھ ہی زبیر کو ہوم ورک بھی کروا رہا تھا۔ وہ کچن میں آئی تو سب کی جان میں جان آئی تاہم اس کی خرابیٔ طبیعت کے باعث عمیر نے اسے کچن سے نکالنے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہ مانی' تبھی وہ اس کی مدد کروا رہا تھا' چکن کڑاہی کے ساتھ چکن بریانی' سلاد اور رائتہ بنا کر اس نے ٹیبل پر لگایا پھر چائے بنائی' سب کھانا کھا کر اور اس کی بے حد تعریف کرکے اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے تو وہ زبیر کو سلانے چلی آئی' دماغ جیسے فریز ہوکر رہ گیا تھا' نمیر اور عمیر کی گفٹ کی چیزیں سامنے ہی میز پر پڑی تھیں اس کی پلکیں پھر بھیگنے لگیں۔
بارش ابھی بھی ہورہی تھی۔ عذیر تقریباً گیارہ بجے کے قریب آفس سے واپس آیا تو اچھا خاصا بھیگ چکا تھا۔ حورعین ابھی زبیر کو سلا کر فارغ ہوئی تھی' عذیر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا' کھانا بے حد لذیذ بنا تھا اور کچھ اسے بھوک بھی بہت لگی تھی' سو چپ چاپ رغبت سے کھاتا رہا' اپنی ماں کے بعد پہلی بار اسے کسی عورت کے ہاتھ کا بنا کھانا پسند آیا تھا سو آج کل وہ ہوٹلز کو نظر انداز کرکے زیادہ تر گھر پر ہی کھانا کھانے کو ترجیح دیتا تھا۔
حورعین اس کے کھانے سے فارغ ہونے تک گرما گرم چائے کا کپ بنا کر لے آئی' اس کی آنکھیں اس وقت بے حد سرخ ہورہی تھیں' عذیر نے پہلا سپ لیا تھا جب وہ اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے بولی۔
"آپ نے وعدہ کیا تھا اگر میری پراپرٹی والا مسئلہ حل ہوگیا تو میں واپس اپنے گھر جاسکتی ہوں۔"

"ہوں۔" بے اختیار چونک کر عذیر نے اسے دیکھا تھا۔

"میں کل صبح ہی اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔" سپاٹ چہرے کے ساتھ فیصلہ سنانے میں اس نے ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی تھی۔ عذیر ہکا بکا سا اس کا منہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"کیوں...... میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔ ہمارے درمیان بھی ڈیل طے ہوئی تھی اور میں نہیں سمجھتی کہ آپ اپنی زبان سے مکر سکتے ہیں۔"

"لیکن کوئی بات نہیں ہے مگر آپ اکیلی وہاں اتنے بڑے گھر میں کیسے رہیں گی؟"

"رہ لوں گی مجھے عادت ہے اکیلے رہنے کی آپ پریشان نہ ہوں۔"

"وہ ٹھیک ہے مگر دادی یہاں کے آنے کا انتظار تو کرلیں وہ کیا سوچیں گی کہ آپ کیوں چلی گئیں۔"

"یہ آپ کا مسئلہ ہے کہ آپ انہیں کیسے مطمئن کرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ اور آپ کے گھر والے میرے وجود کے عادی ہو جائیں اتنے عادی کہ پھر میرے بغیر رہ ہی نہ سکیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کی منزل نہیں ہوں۔ آپ کا راستہ کوئی اور ہے اور میرا راستہ کوئی اور ہم دونوں ہی دو علیحدہ علیحدہ راستوں کے مسافر ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ابھی سے اپنی منزل کا تعین کرلیں۔"

اس کے لہجے میں برف جیسی ٹھنڈک تھی۔ عذیر کے لبوں کو جیسے قفل لگ گیا۔ کیا وہ لڑکی واقعی اتنی بے حس اور بے نیاز تھی کہ اسے ان سب کی محبتیں نظر ہی نہیں آ رہی تھیں؟ کیا واقعی وہ اتنی خود غرض تھی کہ مطلب نکلتے ہی اس گھر سے کوچ کر لینے کی ٹھان لی تھی؟ کیا مٹی کے اس ڈھیر سے اس کا عشق اتنا ہی شدید تھا کہ اس سے نکاح کو بھی فراموش کر گئی تھی اس کا دماغ اس لمحے جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔

اس رات وہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکا تھا۔ کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا تھا سر میں اتنا درد تھا کہ کسی کروٹ قرار نہیں آ رہا تھا کتنی مشکل سے اس کا گھر سیٹ ہوا تھا اور اب سب کچھ پھر بکھرنے جا رہا تھا۔

بیڈ کے دوسرے کنارے پر لیٹی حورعین بھی جاگ رہی تھی مگر اس کا رت جگا عذیر پر عیاں نہیں تھا۔ صبح فجر کی نماز کے بعد وہ سویا تھا۔ دوبارہ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب آنکھ کھلی تو حورعین کمرے میں نہیں تھی وہ سمجھا وہ پھر قبرستان گئی ہوگی۔ تبھی بے دلی سا واش روم میں گھس گیا اندر کہیں اسے خود پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ کیوں اسے قبرستان جانے کی اجازت دی۔ باتھ سے فارغ ہو کر کمرے سے باہر آیا تو سامنے ہی ڈائننگ ٹیبل کے قریب حورعین اس کی طرف پیٹھ کیے کھڑی تھی اور عمیر اس سے کہہ رہا تھا۔

"آپ جانتی ہیں آپی ہم سب آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ زبیر تو آپ کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ پھر آپ ہمیں چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہیں اگر آپ ہم میں سے کسی سے ناراض ہیں تو میں سب کی طرف سے معافی مانگتا ہوں پلیز۔"

"وہ تو تم مانگو گے عمیر کیونکہ مفت کے غلاموں کو کون ہاتھ سے جانے دیتا ہے ویسے بھی اب میں کروڑوں کی جائیداد کی مالک ہوں۔ لہٰذا محبت نہ بھی ہوئی تب بھی شو تو کرنی پڑے گی نا! اب بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی خواہش کس کی نہیں ہوتی۔" لفظ نہیں تھے کوئی چابک تھے جو عذیر اور عمیر دونوں کو اپنی کمر پر پڑتا ہوا محسوس ہوا تھا صد شکر کہ ابھی باقی لوگ بیدار نہیں ہوئے تھے ورنہ نجانے ان کے دلوں پر کیا بیتتی؟ کیا واقعی اس لڑکی کے پاس ان کی محبت اور خلوص کی یہی قدر تھی؟ دکھ کی شدت سے اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے تاہم خود پر ضبط کرتے ہوئے وہ آگے بڑھا تھا اور حورعین کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

"آپ اپنی تیاری کرلیں میں آفس جانے سے پہلے آپ کو آپ کے گھر ڈراپ کردیتا ہوں۔" حورعین کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ پیچھے کھڑا ہوگا تبھی شاید وہ چونکی تھی۔

"جی ٹھیک ہے۔" آزردہ سی سر ہلا کر وہ کمرے میں گھس گئی تھی۔ عذیر عمیر کے دھواں دھواں سے چہرے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد آگے بڑھ گیا۔ حورعین کمرے میں آئی تھی سارا سامان یونہی بکھرا پڑا تھا۔ اس نے بیگ میں زیور اور عمیر کے تحفے ڈالے سارا کمرا سمیٹا اور چادر لے کر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل آئی صد شکر کہ ابھی زبیر بیدار نہیں ہوا تھا۔

آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ
دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے
اور کل کی خبر کسے معلوم؟
اب نہ دہرا فسانہ ہائے الم
اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو
فکر فردا اتار دے دل سے

عمر رفتہ پہ اشکبار نہ ہو
عہد غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں مت پوچھ
آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ

عذیر اسے اس کے گھر کے سامنے اتار کر باہر سے ہی چلا گیا تھا۔ حورعین نے خود بھی اسے اندر آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ وہ بالکل چپ اور ساکت تھی بے جان ہاتھوں سے مین گیٹ کا لاک کھول کر جس وقت وہ اندر داخل ہوئی اس کے پاؤں من من کے بھاری ہو رہے تھے سارے گھر پر جیسے سکتہ چھایا تھا۔ پورے گھر میں بے حد سخت تنہائی اس کا طبل بجائے جا رہی تھی۔

وہ سارے گھر پر سرسری سی ایک نظر ڈالنے کے بعد لاؤنج میں صوفے پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ آنسو تھے کہ بنا رکے بہتے چلے جا رہے تھے۔ جانے زبیر نے اٹھنے کے بعد کیا ہنگامہ کیا ہوگا؟ جانے دادی ماں اور عمیر نے اس کے یوں چپ چاپ چلے جانے پر کیا رائے قائم کی ہوگی؟ سوچیں تھیں کہ ناگ بن کر ڈس رہی تھیں۔

بہت دن لگے تھے اسے خود کو سنبھالنے میں اور وہ سنبھل گئی تھی مگر...... عذیر کے گھر کی یادیں ہزار کوشش کے باوجود اس کے دل و دماغ سے نکلنے کو تیار ہی نہ ہوتی تھیں۔ بار بار زبیر کا چہرہ نگاہوں کے حصار میں آتا اور نین کٹورے چھلک پڑتے عذیر نے اس کے اس گھر میں آنے کے اگلے ہی دن ایک کل وقتی ملازمہ کا بندوبست کرکے اسے وہاں بھجوا دیا تھا۔ حورعین نے آفس جوائن کیا تو پیچھے کی تسلی ہو گئی۔

تسکین نامی وہ لڑکی بہت اچھی اور صاف ستھری اور قابل بھروسہ لڑکی تھی۔ عذیر کے احسانات کے بنڈل میں ایک اور احسان کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جب سے حورعین اس کے گھر سے آئی تھی جیسے خانہ جنگی کا سا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ سب اس سے ناراض تھے کہ اس نے حورعین کو کیوں جانے دیا۔ فی الوقت عمیر نے اس کا بھرم رکھ لیا تھا کہ یہ کہہ کر حورعین کی فیملی میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے لہٰذا ان لوگوں نے ایمرجنسی میں بلوا لیا۔ مگر سب اپنی اپنی جگہ بے حد پریشان تھے۔ سب کی عادتیں بگڑ چکی تھیں۔ لہٰذا دوبارہ سے اسی روٹین پر آنا سب کے لیے ہی بے حد مشکل تھا۔

دادی ماں گاؤں سے واپس آئیں تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ زبیر تیز بخار میں پھنک رہا تھا عمیر نے مشین لگا رکھی تھی مگر اس کی جھنجلاہٹ اور غصہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ نمیر پیاز کاٹ رہا تھا مگر ساتھ ہی اس کی نمیر اور عمیر سے تو تو میں میں بھی چل رہی تھی۔ عمیر البتہ چپ تھا چپ چاپ بیٹھا ٹی وی دیکھتے ہوئے وہ جیسے سب کے اشتعال کو ہوا دے رہا تھا۔ وہ ہکا بکا ہی تو رہ گئی تھیں۔ عذیر رات گئے آفس سے واپس آیا تو بے حد تھکا ہوا تھا۔ ابھی اس نے جوتے بھی نہیں اتارے تھے کہ دادی ماں اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

"عذیر۔"

"ارے دادو آپ آپ کب آئیں؟"

"مجھے چھوڑ...... تو یہ بتا حورعین کب واپس آ رہی ہے؟" اس کے چونک کر اٹھنے پر انہوں نے فوراً دو ٹوک لہجے میں پوچھا تھا۔ عذیر بے ساختہ نظر چرا گیا۔

"پتا نہیں دادو میرا رابطہ نہیں ہو رہا ہے اس سے۔"

"یہ کیا بات ہوئی ارے بیوی ہے وہ تمہاری تمہیں رابطے میں رہنا چاہیے اس کے ساتھ دیکھو ذرا سارا گھر کیسے الٹ پلٹ ہوا پڑا ہے۔ ایسی بھی کیا ایمرجنسی ہو گئی تھی کہ دادی کے آنے کا انتظار بھی نہ کیا تم نے۔ ادھر زبیر کو دیکھو اس کے لیے رو رو کر بخار چڑھا لیا ہے اس نے اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔"

"میں بات کروں گا دادو آپ پریشان نہ ہوں۔"

"کیسے پریشان نہ ہوں سارا گھر میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ کہیں کوئی چیز بھی ٹھکانے پر نہیں مل رہی آج بھی نمیر کا جھگڑا ہو گیا تھا عمیر سے گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے وہ اسی کے لیے ابھی تک دل ہول رہا ہے۔ پتا نہیں کہاں گیا ہوگا وہ۔" دادو نے اتنی رات گئے تک جاگنے کی وضاحت کردی تھی۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"کہیں نہیں گیا ہوگا دادو یہیں ہوگا اپنے کسی دوست کے پاس آپ جانتی تو ہیں اسے پلیز پریشان مت ہوں آ جائے گا کل صبح۔" پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کرنے کے ساتھ ہی دادی ماں کو تسلی دیتا وہ زبیر کے کمرے کی طرف چلا آیا تھا۔ جہاں وہ تیز بخار میں مدہوش صرف حورعین کو پکارے جا رہا تھا۔

پھول سا چہرہ کملا کر زرد پڑ گیا تھا۔ عذیر کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا بھلا اس معصوم کا کیا قصور تھا کہ اسے ایسی سزا دی جاتی؟ ایک مرتبہ پھر حورعین کا چہرہ اس کے تصور میں آیا اور اس نے بیزاری سے سر جھٹک دیا۔ وہ لڑکی اس قابل بھی نہیں تھی کہ اسے تصور میں بھی یاد کیا جاتا۔ سوچا ہی جاتا کتنی آسانی

سے وہ اسے اور اس کے گھر والوں کو بے وقوف بنا کر نہاں سے کوچ کر گئی تھی۔ کتنی آسانی سے اس نے اس کی شرافت اور اس کے گھر والوں کے بے لوث پیار کو لالچ کا نام دے دیا تھا۔

وہ جب جب بھی اس کے الفاظ کے بارے میں سوچتا تھا اس کا سر پھٹنے لگ جاتا۔ کتنی چالاک لڑکی تھی کہ سارے گھر کو اپنا عادی بنا کر چپکے سے چھوڑ گئی تھی اس کا بس نہ چلتا تھا وہ اس کے سامنے آئے اور اسے خوب کھری کھری سنا کر دل کی بھڑاس نکال لے۔

کچھ ایسی طرح کے جذبات عمیر کے بھی تھے جسے وہ بے حد عزیز ہو گئی تھی۔ صرف اس کے بھرم کے لیے اس نے ابھی تک گھر کے کسی فرد کو اس کی حقیقت نہیں بتائی تھی۔ صرف اس کے تحفظ کے لیے اس نے عذیر کو طلاق دینے سے روک رکھا تھا۔ ورنہ زبیر کا حال دیکھنے کے بعد وہ اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

سمیر اور نمیر چونکہ حقیقت سے بے خبر تھے لہٰذا وہ اسے خوب یاد کر رہے تھے۔ عذیر آفس سے تھکا ہوا آتا تو گھر میں صرف اسی کا تذکرہ چل رہا ہوتا تھا۔ دادو کے پاس بھی سوائے اس کی تعریفوں کے اور کچھ کہنے کے لیے نہیں تھا۔ وہ بےزار سا ہو کر اٹھ جاتا۔ اس وقت بھی وہ زبیر پر جانے کیا کیا پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ وہ انہیں آرام کی تلقین کرتا زبیر کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔

رات بھر ٹھنڈی پٹیاں کرنے کے باعث اگلے روز زبیر کی طبیعت کچھ بہتر تھی [illegible] مطمئن سا آفس چلا آیا تھا۔

☆......☆☆......☆

سمیر نے اس شام کھانا باہر سے منگوایا تھا۔ نمیر اور عمیر نے اس سے معذرت کر لی تھی وجہ صرف زبیر کی طبیعت اور عذیر کی اذیت تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ تینوں ٹی وی لاؤنج میں آئے تو کوئی سیاسی پروگرام چل رہا تھا تبھی عمیر نے پوچھا تھا۔

"یار تم لوگوں کو کیا لگتا ہے۔ یہ ہمارے نیوز چینل واقعی پاکستانی ہیں؟"

"ہاں بظاہر ..... عملاً نہیں۔" عمیر نے فوراً سے پیشتر جواب دیا۔

"کیوں اب کیا کر دیا ہے چارے چینل والوں نے؟" سمیر فریج سے کینو نکال لایا تھا وہی چھیل رہا تھا۔ عمیر نے بھی ایک کینو اٹھا لیا۔

"اب سے کیا سر ہو رہے آپ کی؟"

"میرا مطلب ہے جتنی ان کو اوپر سے اجازت ملی ہے اتنا تو دکھاتے ہی ہیں۔"

"کیا دکھاتے ہیں؟ یہ کہ فلاں سیاست دان کو فلاں سے کیسے لڑ لیا۔ فلاں کی کیسے سپورٹ کی اور فلاں کو کیسے زمین چٹا دی یا پھر یہ کہ وینا ملک نے انڈیا میں کیا کیا شاہ رخ کی نئی فلم کون سی آئی ہے مادھوری کی کیا مصروفیات ہیں۔ امریکا پاکستان کا کتنا خیر اخواہ اور سچا دوست ہے۔ افغانستان اور دنیا بھر کے کتنے بڑے دہشت گرد ہیں جو دنیا کے امن کے لیے خطرہ ہیں یا پھر یہ دکھاتے ہیں کہ ہمارے ملک کی سرحدوں کے اندر ڈرون سے مرنے والے سب لوگ کتنے برے تھے۔ کتنے بڑے دہشت گرد تھے۔" عمیر اچھا خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہا مگر یہ سچ ہے کہ ماضی کے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ہمارے میڈیا نے بھی ساری دنیا میں ہمارا سر شرم سے جھکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کتنی ایسی حقیقتیں ہیں جو منظر عام پر آنی ضروری ہیں مگر ...... پس پردہ جانے کون سی ایسی مجبوریاں ہیں جس نے ان کے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔" جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بے حد رنجیدہ بھی تھا۔ نمیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"صحیح کہہ رہے ہو اسی لیے میں نے تو ٹی وی دیکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے کسی بھی ملک کی معاشرت میں اس کے میڈیا کا کردار بہت اہم ہوتا ہے مگر افسوس یہ سعادت ہمیں نصیب نہیں جبکہ دوسری طرف ہمارے پڑوسی ملک کے میڈیا کو دیکھ لو خبروں کے ذریعے یہ ساری دنیا سے جنگ کر رہے ہوتے ہیں۔ مجال ہے جو معمولی سی نفع نقصان کی خبر بھی ان کی نظر سے چوک جائے۔ مگر یہاں ساری مسلم دنیا میں پاکستان سمیت آگ لگی ہوئی ہے اور ہمیں پھر بھی شاہ رخ اور مادھوری کی فکر ستائے جا رہی ہے۔"

"بس یار جہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو وہاں شور مچانے سے بھی کچھ حاصل نہیں تم سناؤ وہ مصری صدر کا معاملہ کچھ حل ہوا کہ نہیں؟"

"کیسے حل ہو سکتا ہے کس نے کرنا ہے حل۔" سمیر کے پوچھنے پر عمیر نے تیکھے تیوروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"وہ صدر مرسی ہے بشار الاسد نہیں جو ملکی عوام کی خون کی

نمایاں بھی بہادے تو کوئی اس پر انگلی اٹھانے والا نہیں۔ عظیم سے عظیم تر صحابہ کی بے حرمتی کروا کر ان کے مبارک مزاروں سے مبارک اجسام نکلوا کر غائب کروادے تو کوئی پوچھنے والا نہیں سنی مسلمانوں کو چن چن کر ان کے گھروں کے اندر ہی جلا کر بھسم کردے تو کوئی مسلمان حکمران اسے اف نہیں کہہ سکتا۔ ابھی رات ہی دیکھ رہا تھا میں اس کی بدبخت افواج نے مجاہدین پر فاسفورس بم برسا کر انہیں شہید کرکے حضرت خالد بن ولیدؓ کے مزار مبارک کا بیشتر حصہ جلا کر شہید کردیا۔ اس سے پہلے حضرت حجر بن عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار مبارک کو شہید کرکے ان کے جسم مبارک کو قبر سے نکال کر جانے کہاں منتقل کردیا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کا شہید مزار اور چہرہ مبارک دیکھا ہے فیس بک پر...... جبکہ صدر مرسی اللہ اور اس کے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیروکار ہے۔ اس کا جرم وہ بیان ہے جو اس نے اقوام متحدہ میں کانفرنس کے دوران مسلمانوں کے حق میں دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ہم صرف اسی کی عزت کریں گے جو ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و حرمت کا خیال رکھے گا ان کی شان میں گستاخی کرنے والوں سے ہماری کھلی جنگ ہے۔ اس کا دوسرا جرم یہ تھا کہ اس نے مصری سرحدیں دہشت گردی کی شکار فلسطینی ریاست کے لیے کھول دی تھیں۔ بنگلہ دیش کی طرح بھارت کے حکم پر ان کے لہولہان اجسام پکڑ کر دوبارہ اسرائیلی فوج کے سپرد نہیں کیے۔ جس طرح بنگلہ دیش کی افواج نے برما کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ کیا۔ اسی لیے تو ایک سال بعد ہی بھاری اکثریت سے کامیابی کے باوجود فوج ان کے اقتدار پر قابض ہوگئی۔"

"ہوں سنا ہے فوج کے کچھ بڑے بڑے مگرمچھوں کے اثاثے بھی بے نقاب کرکے وہ پیسے ملکی معیشت کے لیے وقف کیے تھے مرسی صاحب نے۔"

"ہوں شاید یہ وجہ بھی تھی بہرحال امریکا اور اسرائیل کی تو چاندی ہوگئی ہے۔ چن چن کر آپس میں لڑوا لڑوا کر مسلمانوں کو بے موت مروائے جارہے ہیں۔"

"ہوں اور پھر بھی یہ خواہش ہے ان کی کہ کہیں کوئی بغاوت سر نہ اٹھائے ان کے خلاف۔ مسلمانوں کے بچے بچے کو مروا کر ہمارے صحابہ کی بے حرمتی کرکے ہماری عورتوں کی عزتیں پامال کرکے یہ چاہتے ہیں کہ ہم ان سے نفرت کا اظہار بھی نہ کریں۔ کیسی مضحکہ خیز خواہش ہے ان کی۔"

"صحیح کہہ رہے ہو یار جو حاکم اپنے ملک کے شہریوں کو جان اور مال کا تحفظ ہی نہ دے سکے اس کی حکمرانی سے بہتر ہے بندہ کسی جنگل میں جا کر رہ لے۔" نمیر نے کہا تھا اور سمیر نے اس کی تائید میں سر ہلا کر دوسرا کینو اٹھالیا تھا۔

"میں تو کہتا ہوں منتخب حکومت کو ایسا قانون بنانا چاہیے کہ فوج اقتدار میں آ ہی نہ سکے۔"

"اچھا اور اگر جمہوری منتخب حکومت خود ہی اچھی نہ ہو پھر......؟"

"پھر بھی جمہوریت کی ایک دن کی زندگی فوج کی سو سالہ حکومت سے بہتر ہے۔" سمیر کے پھر پر اس نے مزاحیہ انداز میں اپنا موقف پیش کیا تھا۔

"یار سچ پوچھو تو میرا دل شام اور مصر کے حالات پر بہت دکھی ہے۔ اسلام پسندوں کی حکومت کو ووٹ سے قبول نہ کرکے مسلمانوں کو تلوار اٹھانے پر مجبور کردیا جاتا ہے اور پھر انہیں دہشت گرد کا خطاب بھی دے دیا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جب اہل شام ہلاک ہوجائیں گے تو میری امت میں خیر نہ رہے گی۔ اب تم بتاؤ مسلمان کریں تو کیا کریں؟ جن بچوں کے باپ بے قصور ان کی آنکھوں کے سامنے شہید ہو رہے ہیں۔ جن کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو سرعام بےآبرو کیا جارہا ہے۔ جن کے گھر تباہ کیے جارہے ہیں کیا یہ کل کو ہتھیار نہیں اٹھائیں گے؟ اگر ایک بلڈنگ میں چند مرنے والے افراد کا بدلہ لاکھوں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پاؤں تلے کچل کر لیا جارہا ہے تو کل کو یہ لوگ کیسے اپنے پیاروں کی موت پر خاموش بیٹھ جائیں گے۔ رشتوں کی آگ تو ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔" سمیر کے چینل تبدیل کرنے پر عمیر نے بے حد عجیب سے انداز میں کہا تھا۔

"چپ کرو عمیر! تم نے سنا نہیں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کسی نے سن لیا نا تو ایک گھنٹے سے پہلے تم پر طالبان کے کسی گروہ کا ساتھی ہونے کا الزام لگا کر ملک بدر کردیں گے۔" اس بار نمیر نے عمیر کی طرف جھکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ سمیر کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"کردیں میں نہیں ڈرتا ان دنیاوی خداؤں سے" میرے یار! میں صرف میرے رب کی ذات سے ڈرتا ہوں اور میں صرف اس کی طاقت کو مانتا ہوں۔ بے شک اس کی طاقت کے سامنے یہ دنیا کے پہاڑ بھی چیونٹی کے برابر نہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کیسے میرا رب

مصر کی بات میں کھوتا ہے اور چلتے پھرتے لوگ بلند عمارتوں سمیت اس میں غرق ہوجاتے ہیں۔ زمین کا سینہ پھٹتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے چند گھنٹوں میں ہزاروں لوگ اس کی پناہ میں سما جاتے ہیں یوں کہ جیسے کبھی دنیا میں آئے ہی نہیں تھے۔ بے شک ہر ظالم کے سامنے اس کے ظلم پر آواز اٹھانا ایمان کی نشانی ہے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے اور تم میں سے جو ظلم ہوتا دیکھے اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے ہاتھ سے نہ روک سکے تو زبان سے روکے۔ زبان سے بھی نہ روک سکے تو کم از کم اپنے دل میں ضرور برا جانے مگر یہ کمزور ترین ایمان کی نشانی ہے۔"

"ہوں بے شک۔" سمیر نے تائید میں سر ہلایا تھا۔ تبھی اسکرین پر نیوز میں نمیر کی نظر صدر مشرف پر جا پڑی۔

"لو بھئی آگئے آپ کے لیڈر صاحب اسکرین پر۔" کینو کی پھانک منہ میں ڈالتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔ جواب میں سمیر نے گھور کر اسے دیکھا۔

"یار تم لوگوں کو خوامخواہ اس شریف انسان پر تنقید کرنے کی عادت ہوگئی ہے۔ بس ورنہ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ شخص اتنا برا لیڈر بھی نہیں تھا۔"

"اچھا کون سی کسر تھی جو ابھی رہ گئی تھی؟" نمیر نے کینو سائیڈ پر رکھ کر ریموٹ اٹھالیا۔ تبھی سمیر بولا تھا۔

"جسٹ شٹ اپ یار! تم لوگوں کو پتا نہیں ہے اس شخص نے پاکستان کے لیے کیسے کیسے جرأت مندانہ فیصلے کیے تھے۔ نائن الیون کے بعد جس وقت امریکا نے پاکستان کو دھمکی دی تھی کہ یا راستہ دو یا جنگ کرو اس وقت اسلام آباد پر کتنی گھبراہٹ طاری تھی۔ کیا تھا اس وقت پاکستان کے پاس۔ میزائل ٹیکنالوجی تک اپ ٹو ڈیٹ نہیں تھی۔ نیوکلیئر ہتھیاروں کے لیے کوئی ڈلیوری سسٹم نہیں تھا۔ اگر صرف جنگی جہازوں کی بات کی جائے تو پاکستان کے پاس صرف سات سو یا آٹھ سو جنگی جہاز تھے جبکہ اس کے اتحادیوں کے پاس تقریباً تیس ہزار کے قریب جنگی جہاز تھے۔ جو ایف سولہ کے لڑاکا طیارے ہم نے خریدے تھے وہ بھی امریکا کی نظر میں کافی پرانے ہوچکے تھے۔ ہماری فوج جتنی بھی بہادر کیوں نہ ہو وہ زمین پر کیا کرسکتی؟ زیادہ سے زیادہ ہم ان کے کچھ جنگی جہاز مار گراتے اور بس تم لوگوں کو کیا پتا اس وقت کیا صورتحال تھی روس اور چین شدت سے چاہتے تھے کہ امریکا افغانستان کی دلدل میں اترے اسی لیے پہلی بار اس معاملے میں چین پاکستان سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ انڈیا اور اسرائیل مسلسل امریکا کو پاکستان پر حملے کی دعوت دے رہے تھے۔ بلکہ انڈیا نے تو اس معاملے میں اپنے مکمل تعاون کا یقین بھی دلایا تھا پاکستان پر اس وقت ایک ایسی جنگ مسلط کی جارہی تھی۔ جس میں کروڑوں پاکستانیوں کی اموات یقینی تھی۔"

"واہ...... یعنی ہم نے اپنی جانیں بچانے کے لیے اپنے معصوم افغانی بھائیوں کے سر تحفتاً پیش کردیے واہ......!"

"فضول بکواس مت کرو نمیر افغانستان کے پاس اس وقت کھونے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ پورے افغانستان میں آٹے کی ایک مل بھی نہیں تھی کل چھ جنگی ہیلی کاپٹر تھے جو اس وقت افغانستان کا کل اثاثہ تھے۔ مگر ان کو اڑنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ دوسری طرف پاکستان ایک آبادی والا ایٹمی ملک تھا۔ جس کے پاس نیوکلیئر ہتھیار ہیں بہت سی صنعتیں ہیں ایک طاقت ور بہادر فوج ہے مگر وہ جنگ میزائل کی جنگ تھی وہاں 1965ء والے حالات نہیں تھے اگر ہم اس وقت کوئی بھی جذباتی فیصلہ کرتے تو پاکستان اور افغانستان دونوں کو نقصان اٹھانا پڑتا کیونکہ اڈے انہوں نے پھر بھی پاکستان کے بجائے افغانستان میں ہی بنانے تھے اور وہیں بیٹھ کر وہ لوگ اہم تنصیبات کو نشانہ بناتے انہوں نے سب سے پہلے نیوکلیئر پلانٹس، موٹر ویز، صنعتیں اور فوجی اڈے تباہ کرنے تھے۔ اس کے بعد ہمیں بھارت کے لیے تر نوالا بنا کر اس کے سپرد کردیتے۔ اگر ایسا ہوجاتا تو سوچو آج افغانستان میں امریکا کی جو چیخیں مجاہدین نکلوا رہے ہیں وہ کیسے نکلتیں؟ جنرل صاحب نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مشکل فیصلہ کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ماضی میں ہمارے دانش مند بزرگوں نے کیے بظاہر وہ دشمن کی شرائط کے مطابق ہوتے تھے مگر بعد میں ان کا نتیجہ فتوحات کی صورت میں نکلتا تھا۔ اس وقت اگر پاکستان اپنی فوجی طاقت ایک جذباتی فیصلے کی نذر کردیتا تو آج افغانستان میں کوئی جہاد نہ ہوتا نہ ہی پاکستان اس قابل رہتا کہ اکیلے انڈیا سے ہی نپٹ سکے۔ تم لوگ نہ مانو مگر یہ حقیقت ہے کہ امریکا کی کمر مشرف نے توڑی ہے۔ اس کے دانش مندانہ فیصلے نے توڑی ہے تم دیکھو جب پاکستان نے امریکا کو راستہ دیا تو اس کے ساتھ ہی طالبان کے کئی سرکردہ لیڈر منظر عام سے غائب ہوگئے بمع اسامہ بن لادن بعد میں وہی آرمی کی گود سے برآمد

ہوئے۔ ادھر امریکا نے افغانستان کے پہاڑوں سے سر ٹکرایا مگر بعد میں کچھ ہی عرصے کے بعد طالبان کی مزاحمت شروع ہوگئی اور اب صورتحال یہ ہے کہ اس صلیبی جنگ نے امریکا کی چیخیں نکلوا دی ہیں۔ جس کے نتیجے میں اس کے جنگی اخراجات اتنے بڑھ چکے ہیں کہ معیشت بیٹھنے لگی ہے۔ اس لیے اس نے بہت سی سہولیات اپنی عوام سے واپس لے لی ہیں جس کی وجہ سے کم از کم 26 ریاستیں اس سے الگ ہونے کی تیاری کررہی ہیں۔" سمیر اچھا خاصا جذباتی ہوگیا تھا عمیر مسکرا دیا۔

"ہوں جیسی کرنی ویسی بھرنی' مگر یہ غلط ہے کہ طالبان لیڈرز کو پاکستان نے کسی قسم کی کوئی سپورٹ فراہم کی تھی۔"

"چلو غلط سہی مگر یہ حقیقت ہے کہ امریکا کو راستہ دینے کے ساتھ ہی جنرل صاحب نے دنیا کی ہمہ جہت کی تیز ترین میزائل ڈیولپمنٹ شروع کی۔ امریکا کے افغانستان پر حملے کے فوراً بعد ہر دوسرے تیسرے دن پاکستان ایک نیا میزائل تجربہ کررہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن جنرل صاحب نے کہہ دیا کہ ہم انڈیا کے علاوہ بھی بہت سے ملکوں کو ہٹ کرسکتے ہیں۔ تم لوگوں کو نہیں پتا اس وقت امریکا میں کیسی تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی کہ پاکستان انڈیا کے علاوہ اور کن ملکوں کو ہٹ کرنے کی بات کررہا ہے۔ اسی وقت جنرل صاحب نے فرانس کے ساتھ مل کر آگسٹا آبدوز پراجیکٹ شروع کیا اور اس کی تکمیل کی یہ پراجیکٹ پاکستان کو سیکنڈ اسٹرائیک کیپبلٹی دیتا ہے۔ مطلب اس میں میزائل فٹ کیے جاسکتے ہیں۔ حالت جنگ میں اگر دشمن آپ پر حملے میں پہل کرکے خدانخواستہ آپ کی ساری زمینی تنصیبات تباہ کردے تو آپ دشمن پر سمندر سے حملہ کرسکتے ہیں۔ اگر آپ کا ایک بھی آبدوز سمندر میں پھر رہا ہو تو دشمن کبھی آپ پر حملے کی جرأت نہیں کرسکتا اور الحمدللہ ہمارے اس وقت تین آگسٹا آبدوز سمندروں میں راج کررہے ہیں۔"

"بے شک مگر محترم سمیر صاحب آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے عرض ہے کہ آگسٹا آبدوز پراجیکٹ کا منصوبہ بی بی صاحبہ کا تھا۔"

"ہوگا مگر تکمیل کس نے پہنچایا؟ تم دیکھو اس اس وقت ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر کتنا دباؤ تھا۔ ساری دنیا میں یہ ثابت ہوچکا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے ایران، لیبیا اور شمالی کوریا کو ایٹمی معلومات اور سامان دیا ہے مگر اس کے باوجود جنرل صاحب نے انہیں امریکا کے حوالے نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ آئی اے ای اے کی ڈاکٹر قدیر کے ساتھ ملاقات کی اپیل بھی مسترد کردی۔ امریکا یا آئی اے ای اے نے ڈاکٹر صاحب کو سزا نہیں دینی تھی بلکہ وہ ان سے اہم نوعیت کی معلومات حاصل کرتے جس سے پاکستان سمیت ایران اور شمالی کوریا کا ایٹمی پروگرام خطرے میں پڑ جاتا۔ جنرل صاحب نے ہی مشکل حالات میں اسرائیل کو بیلاسہ دیا تھا کہ پاکستان اسے تسلیم کرلے گا۔ جس پر وہ خوش تھا کیونکہ اگر اسرائیل پاکستان میں اپنا سفارت خانہ بنالیتا تو یہاں جاسوسی مچا دیتا مگر جیسے ہی حالات نرم ہوئے انہوں نے فوراً اسرائیل کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ جنرل صاحب نے ہی گوادر پروجیکٹ پر تیزی سے کام شروع کیا جو امریکا کی موت ہے۔ اس پروجیکٹ کی وجہ سے چین کو خلیجی ریاستوں تک امریکی دست برداری سے محفوظ راستا مل جائے گا۔ جنرل صاحب کے دور حکومت میں ہی پہلی بار ایران کے ساتھ ہمارے تعلقات ٹھیک ہوئے اور گیس پائپ لائن کا منصوبہ بنا جس پر انڈیا کو بھی تقریباً قائل کیا جاچکا تھا۔ اگر یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا تو یہ پاکستان کی بہت بڑی کامیابی ہوتی۔ کیونکہ بھارت کی تقریباً چالیس فیصد ضروریات اس سے پوری ہوتی تھیں۔ یوں اس کی ایک بڑی کمزوری ہمارے ہاتھ میں ہوتی جب وہ ادھر سے ہمارا پانی بند کرتا تب ہم ادھر سے اس کی گیس بند کردیتے۔ مگر افسوس بعد میں آنے والی جمہوری حکومت نے اپنے جھگڑوں میں پڑ کر نہ صرف یہ معاملہ کھٹائی میں ڈال دیا بلکہ امریکا اور عربوں کو خوش کرنے کے لیے یہ باب ہی ہمیشہ کے لیے بند کردیا۔"

"واہ سمیر صاحب واہ وکیل ہو تو کوئی آپ سا واہ......!"

سمیر کی لمبی چوڑی تقریر پر نمیر نے ہاتھ سے اس کا چہرہ چھو کر چومتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا تھا تبھی عمیر بولا۔

"گستاخی معاف سمیر بھائی' میں آپ کی کسی بات سے اختلاف نہیں کروں گا۔ بے شک آپ کی ساری باتیں صحیح ہیں مگر جیسے کفر کا کلمہ کبیرہ گناہ ہے اس طرح کانسٹی ٹیوشن کو توڑنا بھی گناہ ہے۔ جنرل صاحب نے امریکا کے ساتھ کیا کیا؟ یا کیا کرنا تھا یہ الگ بحث ہے مگر ان کے دور حکومت میں جس طرح سے مساجد پر حملے ہوئے وہ کوئی مسلمان نہیں بھول سکتا۔ اگر ہم کلمہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی حدود سے نکل کر دیکھیں تو آپ کی ساری باتیں ٹھیک ہیں لیکن اگر میں اس کلمے کی حدود میں رہ کر بات کروں تو آپ نے جو کچھ بھی کہا ہے سب غلط ہے۔

سب سے پہلا اور بڑا کبیرہ گناہ کہ ہم نے خود اپنے کندھے پیش کیے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو مارنے کے لیے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے اگر وہ لوگ کچھ نہ ہو کر بھی صرف اپنے زور بازو پر اس سپر طاقت کی مدد کے ساتھ امریکا کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں تو ہم کچھ نہ کچھ ہو کر بھی کیوں نہیں کرسکتے تھے؟ کیا جنگ واقعی صرف ہتھیاروں سے جیتی جاتی ہے؟ اگر ہاں تو پھر وہ کیا تھا جب اندلس کی سرزمین پر طارق بن زیاد صرف تین سو تیرہ سپاہی لے کر اترا تھا اور سامنے ہزاروں فوج اسلحے سے لیس کھڑی تھی۔ پھر بھی اس مرد مجاہد کا کہنا تھا کہ کشتیاں جلا دو' کشتیاں جلا دو اور ٹھیک ہے اگر آپ کی بات کو سچ مان بھی لیا جائے کہ اس وقت جنرل صاحب کا فیصلہ درست تھا تو کیا اس فیصلے کے بعد ہزاروں لاکھوں پاکستانی نہیں مرے؟ ٹڈیوں کی طرح ملک عزیز پر چھائی امریکی اور دیگر ممالک کی خفیہ ایجنسیوں نے لاکھوں پاکستانیوں کو خودکش حملوں اور دھماکوں میں نہیں مروایا؟ آپ کیا سمجھتے ہیں اگر ہمارا میڈیا ہر سانحے پر طالبان کی ذمہ داری کی مہر لگا کر دکھا رہا ہے تو وہی سچ ہو جاتا ہے۔ پچھلے چودہ سالوں میں وطن عزیز کی سرحدوں کے اندر کتنے معصوم اور بے گناہ لوگ ڈرون حملوں میں نہیں مرے؟ طاقتور بہادر فوج کے ہوتے ہوئے سرحدوں کے رکھوالوں کی آنکھوں کے سامنے دشمن ڈرون پھینک پھینک کر ملک کے عام معصوم شہریوں کو مار رہا ہے اور یہ مجبور بے بس تماشائی بنے صرف دیکھتے رہ جاتے ہیں میں مانتا ہوں امریکا جب افغانستان میں گھسا تھا تو وہاں کوئی دیوار چین نہیں تھی بلکہ ایک لمبی سرحد تھی جس پر کنٹرول مشکل تھا مگر...... اس طویل سرحد کے اس پار سنگلاخ پہاڑوں کے شیر ہوتے کیا کسی دیوار چین سے کم تھے؟ آپ شاید جانتے ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ امریکا کے افغانستان پر حملے کے وقت پاکستان کے تین ایئر بیس سے ستاون ہزار جنگی فلائٹس افغانستان پر بمباری کے لیے اڑی تھیں۔ ڈیلی بیس پر پچاس سے بھی ہزار لاجسٹک سپورٹ لے کر افغانستان جاتے رہے جو ڈاکومنٹڈ ہے۔ اسلام آباد کی سات مساجد سیکیورٹی رسک کی بنا پر گرائی گئیں جن میں ایک مسجد جامعہ حمزہ جو ساڑھے سات سو سال پرانی تھی۔ لال مسجد میں لاکھوں بے گناہ بچیاں اور بچیوں کو نہایت سنگدلی کے ساتھ قتل کیا گیا۔ ان پر سخت گرمی میں بم برسائے گئے گولیاں داغی گئیں زنجیرز اور تار ہی سے آپریشن کروایا گیا' کیوں؟ کیا قصور تھا ان معصوم جانوں کا یہی کہ وہ اپنے اسلامی جمہوریہ ملک میں اسلامی نظام اور اسلام کا نفاذ چاہتے تھے؟ جنرل صاحب کے دور حکومت میں سیکڑوں خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ امریکی دہشت گرد تنظیم بلیک واٹر کے دس ہزار لوگ پاکستان آئے۔ انہی کی وجہ سے بلوچستان میں خانہ جنگی ہوئی اور بلا عزآزادی کی تحریک چل پڑی۔ انہی نے مسجدوں کی جگہ امام بارگاہیں بنوائیں پاکستان میں عریانی اور فحاشی کو فروغ دے کر اخلاقی اقدار کا جنازہ نکالا عورت کو غیر ضروری آزادی دے کر زنا بالرضا کو جائز قرار دیا۔ جس نے حق اور شریعت کی بات کی اسے سرعام شہید کروادیا۔ انہی کے دور حکومت میں نا صرف ڈرون حملوں کا سلسلہ شروع ہوا بلکہ خودکش حملوں کی بنیاد بھی رکھی گئی بلوچوں کو علیحدگی کے قریب لا کھڑا کیا۔ کراچی کو ٹارگٹ کلنگ والوں کا اڈہ بنادیا۔ ملک کے اندر جاگیرداروں کو ایک ایک ضلع تحفے میں دیا گیا۔ ججز کو نظر بند کیا اور ملک کے منتخب وزیراعظم کو ملک بدر کیا۔ عوام کے بچے بچے کے دل میں آرمی کے لیے نفرت بھر دی۔ جمہوری لیڈر بے نظیر بھٹو اور اکبر بگٹی کی موت کا تاریخی تحفہ دیا۔ سی این جی مافیا کو سپورٹ کیا اور جہاں تک ایران کی بات ہے تو آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے بتادوں اپنے نو سالہ دور حکومت میں جنرل صاحب نے ایک بار بھی ایران کا دورہ نہیں کیا۔"

"عمیر ٹھیک کہہ رہا ہے اسی شخص کے دور حکومت میں وطن عزیز کی بہادر اور غیور بیٹی ڈاکٹر عافیہ صدیقی ڈالروں میں بیچی گئی۔ نا صرف عافیہ بلکہ مذہبی نقطہ نظر رکھنے والے سیکڑوں مسلمانوں کو ان کے گھروں سے دن دہاڑے اٹھالیا گیا۔ چند سکوں کے عوض ملکی شہریوں کی منڈی لگا کر انہیں امریکا کے ہاتھوں فروخت کردیا گیا۔ تمام تر قوانین کو پامال کرکے افغانستان کے سفیر کو امریکا کے حوالے کیا گیا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ان سب جرائم کے لیے کیا پاکستانی قوم کبھی انہیں معاف کرسکے گی؟" اس بار نمیر نے سوال اٹھایا تھا سمیر خاموش بیٹھا لب چبا رہا تھا۔

"آپ کو نہیں پتا سمیر بھائی' افغانستان میں اس وقت بھارت بھی سیکیورٹی کے نام پر اپنے پر پھیلا رہا ہے۔ 107 جاسوسی سینٹرز قائم کرچکا ہے۔ وہ وہاں جن میں اس کے قونصل خانے بھی شامل ہیں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ بھارت وہاں سیکیورٹی کے نام پر افغانستان کے طالبان اور پاکستان کے

طالبان کو آپس میں لڑانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ افغانستان اور پاکستان کے سرحدی علاقوں کے مابین کشیدگی پیدا کی جائے یوں وہ جنگ جو افغانستان میں لڑی جا رہی ہے وہ کھسکتی کھسکتی پاکستان کے قبائلی علاقوں تک آ جائے اور یوں پاکستان اور افغانستان ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جائیں۔ امریکا اور اس کے حامیوں کی خواہش ہے کہ آپ کا تباہ حال افغانستان کل کا برباد افغانستان ہو افغانستان اور پاکستان کو دنیا میں کہیں بھی ہمدردی نہ ملے۔ مگر میں آپ کو بتا رہا ہوں جب تک ملک کی سکیورٹی طالبان کو نہیں سونپی جائے گی طالبان کو افغانستان کا شہری تسلیم نہیں کیا جائے گا افغانستان میں امن و سکون بحال نہیں ہوگا۔ یہی صورت حال پاکستان کے لیے بھی بہت ضروری ہے کہ پاکستان کے قبائلی علاقے کے عوام کو اعتماد میں لیا جائے کیونکہ یہاں خطے کی بہت بڑی حقیقت ہے یہ ہمارے ملک کی طویل سرحدوں کے بلا تنخواہ محافظ ہیں۔ اب بھی اگر ہم نے حقائق کو سمجھنے میں دیر کی تو سانپ اپنا کام کر کے نکل جائے گا اور ہم بس لکیر پیٹتے رہ جائیں گے۔" سمیر گہری گہری سانس بھرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو یار رات بہت ہوگئی ہے اٹھو اب...... صبح مجھے اپنی جاب کے لیے انٹرویو دینے بھی جانا ہے۔" اسے نیند آ رہی تھی سمیر کے ساتھ ہی نیر اور عمیر بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ٹھیک ہے شب بخیر۔" ٹی وی آف کر کے تینوں اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اگلی صبح سمیر نے ذرا جلدی ناشتا بنایا تھا کیونکہ اسے اپنی جاب کے لیے انٹرویو دینے جانا تھا۔ عذیر نے اسے اپنی کمپنی میں کام کی آفر کی تھی مگر اس نے انکار کر دیا تھا لہٰذا اب وہ دوسری بڑی بڑی کمپنیوں میں اپلائی کر رہا تھا۔

صبح گھر سے نکلتے ہوئے اس نے سب سے اپنے لیے دعا کرنے کا بھی کہا تھا۔ انٹرویو کے لیے جس وقت اس کا نام پکارا گیا وہ بہت پُراعتماد تھا مگر انٹرویو پینل کے سامنے سیٹ سنبھالنے کے بعد جیسے ہی اس کی نظر سامنے بیٹھی حور عین عبدالسبحان پر پڑی وہ جیسے حیران رہ گیا۔ سمیر اور عذیر کے بقول تو وہ دیار غیر چلی گئی تھی پھر اس وقت وہاں اس کے سامنے کون بیٹھا تھا؟

"ہیلو مسز زبیری...... میرا خیال ہے میں غلط جگہ پر انٹرویو دینے آ گیا ہوں۔" کچھ ہی لمحوں کے بعد کرسی کھسکاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ حور عین سمیت اس کے دائیں بائیں بیٹھے

افسران اس کی حرکت پر حیران ہی تو رہ گئے تھے مگر وہ بنا کسی کی حیرانی کی پروا کیے اس پرشکوہ عمارت سے نکلتا چلا گیا تھا۔

☆......☆☆......☆

سنا ہے اس محبت میں بڑا نقصان ہوتا ہے
مہکتا جھومتا جیون اشکوں کے نام ہوتا ہے
سنا ہے چین کھو کر بھی
بہت برباد ہو کر بھی
یہ دل اک ضدی سا بچہ مگر سے شاد ہوتا ہے
محبت جو بھی کرتا ہے بہت بدنام ہوتا ہے
سنا ہے اس محبت میں کبھی بھی دل نہیں لگتا
بنا اس کے نگاہوں میں کوئی موسم نہیں جچتا
خفا جس سے محبت ہو وہ جیون بھر نہیں ہنستا
بہت انمول ہے یہ دل اجڑ کر پھر نہیں بستا!

موسم بے حد خوب صورت ہو رہا تھا۔

زائر بچوں کو کھیتوں کی سیر کروانے لے آیا۔ دونوں کی رگوں میں اپنے دیہاتی باپ کا خون تھا اسی لیے اپنی مٹی سے محبت ان کے خون میں رچی ہوئی تھی۔ جب سے وہ زائر کے ساتھ گاؤں آئے تھے بے حد خوش تھے۔ ان دو پھولوں کی وجہ سے اس کی ماں اور باپ کی زندگی میں بھی جیسے بہار آ گئی تھی۔

زائر کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی مگر ہر سال کی طرح اس کے برابر والے زمیندار کو پھر نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اپنی زمین بہت اچھے داموں پر زائر کے ہاتھ ہی فروخت کر دی تھی اور اب اللہ کے فضل سے اس پر پہلے سے بھی زیادہ دھن برس رہا تھا۔ دو سال پہلے اس نے گھر والوں سے چھپ کر شہر میں ایک کنال کا پلاٹ لیا تھا اور اب پچھلے دو سال سے وہاں گھر کی تعمیر ہو رہی تھی گھر کیا تھا خوابوں کا محل تھا زائر ملک کے لیے کروڑوں روپے لگ گئے تھے مگر ابھی تک اس کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی۔

کرم داد اسے خوش دیکھ کر بہت خوش تھا۔ مگر اس کے بچے اس سے زیادہ خوش تھے۔ کبھی ہلکی پڑتی پھوار میں وہ کبھی درختوں پر چڑھتے کبھی ٹیوب ویل کے پانی میں کود کر ایک دوسرے پر پانی ڈالتے۔ کبھی فصلوں میں چھپ کر آنکھ مچولی کھیلتے۔ کبھی اشتیاق سے کھڑے ہو کر گزرتے ہوئے دیکھتے۔ کبھی فصل کی چٹائی دیکھ کر خوش ہوتے پورا گاؤں ان بچوں سے نہ صرف پیار کرتا تھا بلکہ زائر کی وجہ سے ان کی عزت بھی کرتا تھا۔

زائر کی عزت و دولت اور شرافت ہی تھی کہ وہ ایک معمولی کسان سے آج اس گاؤں کا نہ صرف بڑا زمیندار بن گیا تھا بلکہ وہ چوہدری بھی نامور ہو رہا تھا۔ پچھلے دنوں بچوں کی سیر و تفریح کے لیے اس نے نئی موٹر سائیکل بھی لے لی تھی۔ مغرب کی اذان سے ذرا سے پہلے وہ گھر واپس آیا تو دونوں بچے تھکن سے بے حال تھے۔

سائرہ نے ہنڈیا چڑھائی تھی اور اب تنور پر روٹی لگا رہی تھی۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر بچوں کے ساتھ اماں کی چارپائی پر آ بیٹھا۔

"اماں کی طبیعت اب کیسی ہے اماں؟"

"اللہ سوہنے کا شکر ہے۔ اب تو بھلے چنگے ہیں تیرے اماں ابا۔ جو ننھے منے ڈاکٹروں نے علاج کیا ہے ان کا تو کیوں بھلے چنگے نہیں ہوں گے۔" اماں مسکرا رہی تھیں وہ خوش ہو گیا۔

"کچھ پتا ہے کل یہ تیرا لاڈلا اپنے دادا سے کیا کہہ رہا تھا۔" اماں کو اچانک چاند کی بات یاد آ گئی تھی۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" تولیے سے چہرہ پونچھ کر زائر نے پھر اماں کی طرف دیکھا۔

"کہہ رہا تھا دادا جی کبوتر پالتے ہیں چھت پر دونوں مل کر اڑایا کریں گے۔" بات مکمل کرنے کے ساتھ ہی وہ دوپٹا منہ پر رکھ کر ہنسنے لگی تھیں۔ زائر کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"معصوم اثرات بھی تو ہوتے ہیں نا اماں آپ کو یاد نہیں میں دن بھر چھت پر چڑھا سارا سارا دن کبوتر اڑایا کرتا تھا اور آپ ڈانٹتی رہ جاتی تھیں۔"

"ہاں یاد ہے سب یاد ہے ساری شرارتیں یاد ہیں تیری۔ مگر یہ چاند بھی کچھ کم شرارتی نہیں ہے تیرا۔" وہ مسکرا مسکرا کر اسے چاند کی شرارتیں بتا رہی تھیں۔ زائر نے چاند کو گود میں بھر لیا۔

"سن زائر۔" اچانک وہ سنجیدہ ہو گئی تھیں۔

"جی اماں۔" وہ بھی سنجیدگی سے ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"کچھ بات کرنی تھی تجھ سے۔"

"حکم کریں اماں۔" اس کا دل دھڑکا تھا مگر پھر بھی وہ ان کی طرف متوجہ تھا۔ اماں بھی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی تھیں۔

"کل رشتہ آیا تھا ایک سائرہ کے لیے۔ یہ ساتھ والے چند کے ماسٹر فضل الٰہی کا بیٹا ہے اسلم سلجھا ہوا شریف بچہ ہے گاؤں میں اپنی کریانے کی دکان بھی ہے اس کی۔ پھر اس کی ماں خود چل کر آئی تھی۔ بڑی پسند ہے سائرہ اسے [illegible]۔ کہتی ہے

ساری زندگی آپ کے پاس رہ کر آپ کی خدمت کروں گی اگر کہیں اور شادی کی بات کی تو کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔"

"تو...... آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟" ایک پل میں اس کا چہرہ متغیر ہوا تھا اماں نے نظریں پھیر لیں۔

"تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں اور کون ہے میرا اپنا تو ہے تجھے وہ تیرا جوگ لے کر بیٹھی ہے۔ میں اور تیرے ابا بھی چاہتے ہیں کہ وہ بس رہ جائے اسی گھر میں۔"

"مگر میں ایسا نہیں چاہتا اماں۔"

"کیوں نہیں چاہتا تجھے کیا مسئلہ ہے دولت کی ریل پیل ہے چھڑا چھانٹ ہے۔"

"گھر بسانے کے لیے صرف چھڑا چھانٹ ہونا ضروری نہیں ہے اماں نہ ہی دولت کی ریل پیل ضروری ہوتی ہے وہ اور دن تھے جب اسی سائرہ کو پانے کے لیے تیرے ترلے کیا کرتا تھا اب وہ دن نہیں رہے اماں نہ ہی وہ دل رہا ہے۔"

"پاگل نہ بن زائر گھر کی لڑکی ہے دیکھی بھالی ہے دیکھ نہیں رہا تو کیسے سارا گھر سنبھال رکھا ہے تیرا۔"

"نہ سنبھالے مجھے پروا نہیں ہے۔ میں بھی گھر کا لڑکا تھا۔ دیکھا بھالا تھا پیار کرتا تھا اس سے صرف اسی کے لیے شہر دھکے کھانے گیا تھا۔ وہ بھی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مگر پھر بھی اس نے تیرے بیٹے کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس جرم کے لیے ٹھکرا دیا تھا مجھے جس میں میرا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ تو وہ دن بھول سکتی ہے اماں! میرے دل پر لکھے ہیں میں نہیں بھول سکتا۔ اگر اس وقت اس سے حسین سارے گاؤں میں کوئی نہیں تھا تو اب بھی کوئی نہیں ہے میں کل بھی کچھ نہیں تھا آج بھی نہیں ہوں۔ ویسے بھی میری اپنی بیوی ہے بچے ہیں ہمارے درمیان کچھ غلط فہمیاں ضرور ہیں مگر وہ مجھ سے الگ نہیں ہے نہ ہی میں کرنا چاہتا ہوں پلیز۔"

از حد جذباتی ہوتے اس نے دل کی بات کہہ دی تھی۔

سائرہ چپ چاپ کھڑی سنتی رہ گئی۔ تنور میں لگی روٹی جل کر راکھ ہو گئی تھی مگر اسے خبر نہ ہوئی اگر زائر اپنی ضد کا پکا تھا تو وہ بھی اپنی ضد کی پکی تھی اور یہ زائر کو بھی پتا تھا کہ وہ جس بات کی ضد کر لیتی تھی اسے پھر حاصل کر کے ہی رہتی تھی۔

زائر چھت پر جا چکا تھا وہ پُرسوچ انداز میں تنور کے اوپر کھڑی جانے کیا کیا پلان بناتی رہی۔

☆......☆☆......☆

ثانیہ عباس اشعر حسن کے ساتھ گاؤں سے شہر شفٹ ہو چکی

www.paksociety.com

تھیں نہ زائر ملک اگر بچوں کو اس سے چھین کر لے کر دور ہو جانا چاہتا تھا تو وہ کبھی بھی اس کی یہ خواہش پوری کرنے والی نہیں تھی۔

اشعر نے اس کے لیے بہت اچھا گھر ہائیر کیا تھا۔ آفس بھی بہت اچھی جگہ پر سیٹ کیا گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی اور خوش کیوں نہ ہوتی اشعر اس کی ہر فرمائش ہونٹوں سے نکلنے سے پہلے پوری کرتا تھا۔ اس کی ہر خوشی اور کامیابی میں وہ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ثانیہ کو حیرت ہوتی تھی بھلا اس کی بیوی زنیرہ نے اتنے اچھے انسان کی قدر کیوں نہیں کی تھی۔ مگر اگلے ہی پل اسے اپنا خیال آتا تو دکھ سے مسکرا دیتی۔

وہ بھی تو بہت اچھی تھی۔ اسے اپنے آپ کو مٹی بنا لیا تھا۔ اس نے زائر ملک کے لیے۔ جس رنگ میں اس نے ڈھالنا چاہا اسی رنگ میں ڈھل گئی تھی پھر بھی...... پھر بھی وہ اس کی وفا نہیں پا سکی تھی۔ کیا کیا زیادتیاں نہیں کی تھیں اس شخص نے اس کے ساتھ کس کس انداز میں نہیں ستایا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اسے دل و دماغ سے نکال نہیں پائی تھی۔

اگر اتنی وفا کے باوجود وہ بے مراد تھی تو اشعر حسین کو مراد کیسے مل سکتی تھی۔ حقیقت ہی اسے اشعر حسین پر بڑا ترس آیا تھا اور خود پر بے پناہ غصہ بھی۔ ملک نے کیوں اسے ٹھکرا کر پاکستان کی راہ لی نہ وہ پاکستان آتی نہ زائر ملک ملتا نہ اس کی زندگی اور دل برباد ہوتے مگر سارے معاملات انسان کے اختیار میں کہاں ہوتے ہیں۔ جتنا بھی طاقت ور انسان ہو تقدیر اور دل کے فیصلوں کے سامنے ہمیشہ بے بس ہی ہوتا ہے سو وہ بھی بے بس تھی۔

اشعر حسین کسی پارٹی میں گیا ہوا تھا جبکہ وہ اپنے کمرے میں مقید بیڈ پر دونوں پاؤں سمیٹ کر بیٹھی بس روئے جا رہی تھی۔ جانے کیوں اس لمحے اسے تنہائی کا احساس بہت شدت سے ستا رہا تھا چاند اور ثریا کی یاد بھی بے قرار کر رہی تھی۔ وہ دونوں ہی اس وقت اسے بہت یاد آ رہے تھے مگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

اگلے ہفتے تک اس نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا۔ اشعر حسین کی اپنی مصروفیات تھیں۔ اکثر رات گئے ہی وہ گھر واپسی کی راہ لیتا تھا۔ کبھی فارغ ہوتا تو ثانیہ کو گھمانے لے جاتا۔ کبھی شاپنگ اور کبھی ڈنر کے لیے لے جاتا۔ اس کی کوشش تھی کہ جلد از جلد وہ ثانیہ عباس کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ جائے اسی لیے اس نے ڈائمنڈ کی رنگ خرید کر ثانیہ کی انگلی میں پہنا دی تھی۔ دونوں ہی آج کل اپنی شادی کی تیاریوں میں بے حد مصروف تھے۔

ثانیہ کا کاروبار تقریباً سیٹ ہو چکا تھا۔ اشعر حسین کے تعاون کی وجہ سے وہ اس پر اندھا اعتبار کرنے لگی تھی۔ بزنس بھی تقریباً اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اس روز بھی وہ اس کے ساتھ کسی پارٹی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ بلیک پینٹ شرٹ پر کھلے بالوں والا انداز اس کے سراپے کو چار چاند لگا رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اداس تھی۔ اجنبی شہر کے شناسا راستے اسے کوئی بھی خوشی دینے میں ناکام تھے۔

پارٹی میں اشعر اسے یونہی متعارف کروا رہا تھا جیسے وہ کوئی ماڈل ہو۔ بے باک نگاہوں میں اس کے لیے ستائش ہی ستائش تھی مگر کتنی عجیب بات تھی کہ اسے یہ ستائش اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس ستائش کے بدلے وہ تھپڑ جو چند روز قبل زائر نے اسے اشعر حسین کے سنگ پھرنے پر مارا تھا اسے بے حد اچھا لگا تھا۔ ہر تعلق توڑ لینے کے باوجود وہ شخص اس کی عزت پر کوئی سمجھوتا نہیں کر رہا تھا۔ جبکہ اشعر حسین جس کے ساتھ اس کا انگیجمنٹ ہونے جا رہا تھا اسے اس کی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔

اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنی دقیانوسی کیوں ہو رہی ہے۔ پانچ ٹائم نماز پڑھنے کے باوجود اس نے تو کبھی ایسی بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔

رات جس وقت وہ لوگ گھر واپس لوٹے کافی ٹائم ہو گیا تھا۔ ثانیہ سونا چاہتی تھی مگر اشعر کا ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ وہ بے حد خوش اور فریش تھا۔ آج پارٹی کے دوران اس نے دو لوگوں سے ثانیہ کی بزنس کے حوالے سے اہم ملاقات کروائی تھی۔ اگر ثانیہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی ڈیل فائنل کر دیتی تو اس کے وارے نیارے ہو جاتے۔

اپنے سامنے شراب کی بوتل دھرے وہ اسے جانے کیسے کیسے خواب دکھا رہا تھا۔ ثانیہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ خود اشعر کے اعصاب پر بھی نشہ اثر کر رہا تھا۔ اسی نشے میں وہ اٹھ کر اس کے پہلو میں صوفے پر آ بیٹھا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ثانیہ کے کندھوں کے گرد تھا جسے نیند کے غلبے کی وجہ سے اس نے محسوس ہی نہیں کیا۔

"ثانیہ" اچانک اس کے کندھوں پر دباؤ بڑھاتے ہوئے اس نے اسے پکارا تھا۔

"ہوں۔"

"آج تم بہت پیاری لگ رہی ہو قسم سے۔" اپنا منہ اس کے کانوں میں گھساتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تھی۔ ثانیہ کو لگا اس کے سارے وجود پر جیسے چیونٹیاں رینگنا شروع ہو گئی ہوں۔

"دیکھو رات بھی کتنی حسین ہوتی جا رہی ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔ بہت پاگل تھا وہ سالا جس نے تم جیسے انمول ہیرے کو کھو دیا۔ قسم سے۔" اس کا ہاتھ حرکت میں آ چکا تھا ثانیہ کی نیند پل میں اڑ گئی۔ بے ساختہ اس لمحے اسے اپنی دادی کی نصیحت بھرے الفاظ یاد آئے تھے۔

"وہ تو دادی یہ سب دقیانوسی باتیں ہیں جس ملک سے میں آئی ہوں وہاں ایسی چھوٹی موٹی باتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔" کیا واقعی وہ اتنی ہی بے باک اور آزاد منش لڑکی تھی کہ اپنی عزت و حرمت کے بارے میں کوئی بات اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

ایک لمحے سے پہلے اس نے اشعر حسین کا ہاتھ پرے جھٹکا تھا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے سو جاؤ تم بھی۔"

"او کم آن ثانی...... ہماری شادی ہونے والی ہے پلیز بیٹھو۔" وہ ابھی اٹھ بھی نہ پائی تھی کہ اشعر نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے اوپر گرا لیا۔ ثانیہ کو لگا جیسے اس کے سارے وجود پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہوں۔

"اشعر پلیز بہتر ہوگا اگر تم اپنی حد میں رہو۔" غم و غصے سے وہ کپکپا رہی تھی۔ مگر اشعر حسین نے پروا نہیں کی۔

"حد...... کون سی حد؟ پلیز ثانی ہماری شادی ہونے والی ہے کیا فرق پڑتا ہے اگر......؟"

"جسٹ شٹ اپ۔" اشعر حسین کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ دھاڑی تھی اور ایک جھٹکے سے خود کو چھڑواتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اس رات بہت دیر تک وہ جاگتی رہی تھی اور روتی رہی تھی۔

☆......☆☆......☆

اگلی صبح اشعر اس کے بیدار ہونے سے قبل ہی اٹھ کر ناشتا تیار کر چکا تھا۔ وہ نماز سے فارغ ہو کر نیچے آئی تو سامنے ہی اشعر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"گڈ مارننگ۔" وہ شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔ ثانیہ محض سر کے اشارے سے جواب دیتی ٹیبل کے قریب آ گئی۔

"ناراض ہو؟" ثانیہ کے چہرے پر غصہ آ گیا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کل رات جو حرکت تم نے میرے ساتھ کی اس کے بعد مجھے تم سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔"

"ایم سوری ثانیہ آئی سویئر مجھے بالکل ہوش نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ بس کل رات نشے نے مت مار رکھی تھی۔ پلیز معاف کر دو تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ میں ایسا نہیں ہوں۔" وہ شرمندہ تھا ثانیہ کی پیشانی کی سلوٹیں کم پڑ گئیں۔

"اٹس او کے مگر میں نے فیصلہ کیا ہے جب تک ہماری شادی نہیں ہو جاتی ہم اکٹھے نہیں رہیں گے۔"

چائے دانی سے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے اس نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔ اشعر کے چہرے کا رنگ جیسے ایک دم پھیکا پڑ گیا۔

"ٹھیک ہے جو تم مناسب سمجھو میں تو پہلے بھی صرف تمہاری خوشی کے لیے ہی یہاں رہ رہا تھا۔"

"تھینک یو۔"

"چلو جلدی سے ناشتا کرو پھر شاپنگ کے لیے نکلتے ہیں آج برائیڈل ڈریس بھی خریدنا ہے سچ میں ثانیہ میں بہت ایکسائٹڈ ہو رہا ہوں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں میرے دل میں تمہارے لیے کتنی عزت اور محبت ہے اگر تم اس چینیوٹ سے شادی کی حماقت نہ کرتیں تو آج ہم دونوں ایک بے حد حسین زندگی بسر کر رہے ہوتے۔" اب وہ اپنے لیے چائے نکال رہا تھا۔ ثانیہ محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ جانے کیوں پھر سے زائر کے ذکر نے اس کے دل میں چٹکی کاٹی تھی۔

تقریباً چالیس منٹ کے بعد وہ اشعر حسین کے ساتھ اپنی شادی کی فائنل شاپنگ کر رہی تھی۔ آج موسم میں ہلکی سی تمازت تھی۔ دھوپ اتنی شدید نہیں تھی کہ چبھتی مگر اسے چبھ رہی تھی جانے ایک رات میں ہی کیا ہوا تھا کہ اس کا دل بجھ کر رہ گیا تھا۔ شاپنگ کے بعد مارکیٹ سے واپسی پر اس نے گاڑی گاؤں کے راستے پر ڈال دی تھی۔ اشعر راستے میں ہی اتر گیا تھا۔ حویلی پہنچی تو چوہدرانی جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔

"ست بسم اللہ...... میری دھی کو حویلی یاد آ ہی گئی؟" وہ بڑے سے صحن میں بیٹھی کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔ ثانیہ لبوں پر پھیکی سی مسکان سجائے چپ چاپ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"میں چاہوں بھی تو حویلی سے اپنا تعلق ختم نہیں کر سکتی دادو! میرے بابا کی خوشبو بسی ہے ان در و دیوار میں......" بہت عرصے کے بعد اپنے باپ کا ذکر کرتے ہوئے وہ آبدیدہ ہوئی تھی۔

چوہدرانی کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

"ہوں یہ تو ہے انسان چلے جاتے ہیں مگر...... در و دیوار سے ان کی خوشبو ہمیشہ آتی رہتی ہے۔"

"جانتی ہوں دادو شاید اسی لیے آپ یہ حویلی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔" آنسو صاف کرتے ہوئے اگلے ہی پل وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ دادو نے سر جھکا لیا۔

"سچ کہتی ہو ثانیہ تم یقین نہیں کرو گی مگر میں ہر روز یہیں اس حویلی میں تمہارے دادا جی تمہارے بابا اور تایا سب کو دیکھتی ہوں کبھی یہاں جامن کے اس پیڑ تلے تو کبھی وہاں مردان خانے کے اس طرف کئی بار سوتے سے جگایا ہے انہوں نے مجھے۔" سر جھکائے اسے بتاتے ہوئے وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرا بھی رہی تھیں۔ ثانیہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"زرگی کا کیا ہوا؟" اگلے ہی پل وہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں دادو اشعر نے شادی کی تیاری مکمل کر لی ہے شاید اسی ہفتے ہم شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔ اسی لیے بہت سے کام ہیں جو ابھی کرنے باقی ہیں۔ کارڈز بھی پرنٹ کروانے ہیں میرج ہال بھی بک کروانا ہے اشعر شاید انگلینڈ بھی جائیں اپنی تیاری کے لیے۔" نظریں چرائے وہ انہیں بتا رہی تھی۔ دادی کے لبوں کی مسکراہٹ پل میں معدوم ہوگئی۔

"چلو اچھی بات ہے۔ کبھی نہ کبھی یہ فیصلہ تو کرنا ہی تھا تمہیں...... مگر...... جانے کیوں مجھے اشعر حسین پسند نہیں ہے۔ کسی بھی لحاظ سے وہ مجھے تمہارے قابل نہیں لگتا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے دادو وہ بہت اچھا انسان ہے بہت سالوں سے پسند کرتا ہے مجھے میرا خیال ہے جتنا وہ مجھے سمجھتا ہے شاید کوئی دوسرا کبھی نہ سمجھ سکے۔" دل کی بے چینی کے باوجود اس نے اشعر حسین کا دفاع کیا تھا۔

چوہدرانی سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو میں اپنی بچی کو اس حویلی سے اپنے ہاتھوں سے رخصت کروں گی۔" وہ اپنی خواہش بتا رہی تھیں۔ ثانیہ آنکھوں کے گوشوں میں چمکتی نمی لیے فوراً رخ پھیر گئی۔

رات عشاء کی نماز کے بعد وہ کمرے سے اٹھ کر باہر صحن میں چلی آئی تھی۔ جانے کیوں اسے ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ کافی دیر صحن میں کھلے آسمان تلے ٹہلنے کے بعد اچانک وہ اٹھی اور بلیک شال اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر حویلی سے باہر نکل آئی۔

چوہدرانی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دوا لے کر سوئی تھیں۔ چاندنی رات میں حویلی کے باہر کچے راستوں پر گھٹن سی گھٹن سی تھی۔ ساکن ہوئے درختوں اور کھیتوں سے کبھی اسے بہت خوف آتا تھا مگر اب ویسی کیفیت نہیں رہی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد اچانک کوئی پتھر اس کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے ٹکرایا تھا۔ چھوٹی تراش خراش سے بڑھا ہوا ناخن ٹوٹا تھا۔ ثانیہ کی آنکھیں پانیوں سے بھر آئیں۔ تبھی فضا میں کسی کی درد بھری صدا ابھری تھی۔

وہ پتھر چناں دا وے
ساڈا کلا کوکن من کے روندے تیر پہاڑاں وے
ساڈا کوکن من کے روندے تیر پہاڑاں وے

وہ مسحور کن سی گھمبیر آواز میں عجیب سی بیکلی تھی درد تھا تڑپ تھی ثانیہ کو اپنے پیر کی تکلیف بھول گئی۔

کونے دے وہ میں یاراں وے
ساڈا کوکن من کے روندے تیر پہاڑاں وے

لمحہ لمحہ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ ثانیہ میں چلنے کی سکت بھی نہ رہی۔

اجڑے رلیاں وفتاں میں
تیرے باجھوں وے دی بیلیا شالا تیرو تے بہاراں نے
تیرے باجھوں وے دی بیلی......
دن لنگ گئے بہاراں وے
ساڈا کوکن من کے روندے تیر پہاڑاں وے
ساڈا کوکن من کے......

پرسوز آواز کے ساتھ ہی ٹریکٹر کے بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ تبھی کندھے سے ڈھلکتی شال کو سنبھالتے ہوئے وہ آگے بڑھ آئی عین اسی پل زائر ٹریکٹر سے نیچے اترا تھا۔ ثانیہ اسے مقابل پا کر جیسے ٹھٹک گئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ اتنی پیاری پرسوز آواز زائر ملک کی ہوگی دوسری طرف وہ بھی جیسے فریز ہو گیا تھا۔

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

جھیل، کنارہ، کنکر

نازیہ کنول نازی

عیدالاضحی عیدالاضحی عیدالاضحی عیدالاضحی عیدالاضحی عیدالاضحی

ابھی آرزوؤں کے صحرا ہیں پیاسے
مگر آنسوؤں کا یہ جام آخری ہے
مریضِ محبت کی اے چارہ سازو
تمہارے نگر میں یہ شام آخری ہے

عزیز قارئین!

آداب وتسلیمات!

جھیل کنارہ کنکر کی آخری قسط پیش خدمت ہے۔ اب تک اس ناول کی پسندیدگی کا گراف حوصلہ افزا رہا۔ منطقی انجام پر آپ کی حتمی رائے کا انتظار رہے گا۔ میں جانتی ہوں ڈائجسٹ پڑھنے والی بہت سی بہنیں رومانوی تحریروں کو زیادہ پسند کرتی ہیں مگر جس ماحول اور معاشرے میں ہماری عصر جدید کی رائٹرز سانس لے رہی ہیں وہاں حقیقت سے نگاہیں چرا کر خوابوں کی دنیا کا ذکر کرنا بہت مشکل ہے۔

میں ایک محب وطن رائٹر ہوں اور میرا قلم میری تلوار ہے۔ میرا پاکستان میرا جنون ہے۔ اسی لیے آج اس کی تباہ حالی مجھے خون کے آنسو رلاتی ہے بالکل ویسے جیسے ادارہ آنچل کے سرپرست انکل مشتاق احمد قریشی کے الفاظ حب الوطنی کی چاشنی میں ڈوبے خون کے آنسو رلاتے ہیں۔

قارئین! ڈیگال فرانس کا ایک عظیم لیڈر قرار دیا جاتا ہے۔ فرانسیسی قوم اس کا وہی احترام کرتی ہے جو ترک "طیب اردگان" اور امریکی ابراہم لنکن کا کرتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد فرانس کلی طور پر ایک تباہ حال ملک تھا۔ اس کی معیشت تباہ ہوچکی تھی۔ داخلی بدامنی نے ہر بستی ہر شہر میں سر اٹھایا ہوا تھا۔ جبکہ بے روزگاری فرانس کا سب سے بڑا مسئلہ بن چکی تھی۔ فرانسیسی کشکول میں ڈالے گئے سکوں سے ملک چلا رہے تھے۔ ایسے میں فرانس یورپ کی پچھلی نشستوں پر براجمان کند ذہن بچے کا منظر پیش کررہا تھا۔ اسی پس منظر میں "ڈیگال" نے فرانس کی قیادت سنبھالی۔ اس کا سب سے پہلا کام فرانس سے باہر اپنے سارے اثاثے ملک میں منتقل کرنا تھا۔ اس نے افریقا میں اپنی ساری جائیدادیں بیچ دیں مراکش میں اپنے ریستوران فروخت کردیے۔ "طنجہ" میں واقع اپنے ہوٹلوں کی چین اونے پونے داموں نمٹادی۔ حاصل ہونے والا سارا روپیہ اس نے ملک میں خرچ کردیا۔ اس نے کہا میرا جینا مرنا سب فرانس کے ساتھ ہے اگر یہ ڈوبتا ہے تو میں بھی ڈوبوں گا اگر ترقی کرتا ہے تو میں بھی بچ جاؤں گا۔ اس نے فرانس کے تمام رئیسوں اور شریک اقتدار کو قائل کیا کہ وہ بیرون ممالک سے اپنا سارا سرمایہ فرانس لائیں ملک کی سرد ہوتی رگوں میں یہ سرمایہ خون بن کر دوڑنے لگا۔ فرانس کی ترقی میں یہ وہ پہلا پتھر تھا جو ڈیگال نے رکھا تھا۔ اس نے جان توڑ محنت اور ریاضت کو اپنا شعار بنالیا اس کی زندگی سادگی اور درویشی کی علامت بن گئی۔ اس نے ترقی کے نقشے اور منصوبے بنائے اور ان میں حقیقت کے رنگ بھر کر ملک کے طول وعرض سے غربت کا خاتمہ کردیا۔

داخلی شورشوں کے دروازے فرانس پر بند کردیے گئے۔ ہر فرانسیسی مالا مال ہوگیا۔ جبکہ ملک دوسرے ملکوں کو امداد دینے کے قابل ہوگیا یہی وجہ تھی کہ جب اس کا انتقال ہوا تو فرانسیسی قوم نے یوں ماتم کیا جیسے ان کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہو سارا فرانس یتیم ہوگیا ہو۔

آج پاکستان بھی اسی ڈگر سے گزر رہا ہے مگر افسوس صد افسوس کہ ہماری قسمت میں کوئی ڈیگال نہیں ہے آئندہ سالوں میں بھی جانے ہوگا یا نہیں۔ مگر ایک حسرت اور خواہش ضرور ہے کہ کاش اس باصلاحیت ہنرمند غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل قوم کو کوئی دوسرا قائداعظم کوئی دوسرا ڈیگال نصیب ہوجائے، آمین۔ جو عوام کو کڑوی گولیاں کھلا کھلا کر ان کی کمر توڑنے کی بجائے انہیں پرسکون اور خوشحال زندگی دے سکے۔ لاکھوں شہیدوں کی ان سیکڑوں بے مثال شہادتوں اور قربانیوں کا کیا فائدہ اگر قیادتیں دانشمندانہ فیصلہ نہ کریں۔ اس وقت پاکستان بہت سے مسائل کا شکار ہے۔ جن میں غربت اور بدامنی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

اپنی اس تحریر کے ذریعے میں خادم اعلیٰ پنجاب سے درخواست کرتی ہوں کہ خدارا تھانہ کچہری کے نظام کو بہتر بنائیں

کیونکہ اس نظام کی بربادی نے قوم کے نوجوانوں کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ آپ کی سیاسی مجبوریاں اپنی جگہ مگر پلیز بے جا تشدد اور جھوٹی ایف آئی آر کے سلسلے کا قلع قمع کرکے ایسے پولیس افسران کے خلاف سخت ایکشن لیں جو اپنے فرض اور پیشے سے مخلص نہیں کیونکہ ریاست کے عوام کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے اگر ایسا نظام تشکیل پاگیا تو مجھے یقین ہے کہ کوئی ماں کا لعل بے گناہ پھانسی نہیں چڑھے گا نہ ہی قیمتی جانیں جھوٹے پولیس مقابلوں کی نذر ہوں گی اور ان شاءاللہ اس سے دہشت گردی کے خاتمے میں بھی خاطر خواہ مدد ملے گی۔

اس کے بعد میں صدر اوباما سے درخواست کرتی ہوں کہ خدارا ڈرون حملے روک دیں۔ مجھے نہیں پتا کہ ان حملوں میں طالبان مرتے ہیں یا نہیں۔ مگر عام معصوم پاکستانی شہری بہت مر رہے ہیں اور جو معصوم بے گناہ لوگ مر رہے ہیں اس سے امریکا کے دشمنوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نفرت کا گراف بھی بڑھ رہا ہے۔

اوباما صاحب! ایک صدر کی حیثیت سے آپ پر ملک اور اپنے لوگوں کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے آپ امریکا کی سرحدوں کو مضبوط کریں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ جو ممالک معاشی دہشت گردی میں ملوث ہیں تو ان کی معاشی حالت سدھارنے میں ان کا ساتھ دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ دہشت گردی جیسا لفظ کسی کو یاد بھی نہیں رہے گا۔ مجھ سمیت تمام مسلمان کسی بھی مذہب اور ملک کے خلاف نہیں آخر میں!

سدرہ صدیق بڑگواہ سے آپ کی محبتیں مجھ پر قرض ہیں۔ آپ فیس بک پر جب چاہیں مجھ سے رابطہ کرسکتی ہیں۔ ڈیئر نبی خان! دانیہ امتیاز! آنچل روز! فروا طاہر! میرب فاطمہ! جھیل کنارہ کنکر کے لیے آپ سب کی انمول محبتوں کا بے حد شکریہ۔ آخر میں بہاول پور کے ڈاکٹر رانا طارق محمود صاحب آپ کو انسانی فرشتہ کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی غریبوں کی زندگی کا وجود قائم ہے۔ انسانیت کے لیے آپ کی مسیحائی اور غیر معمولی خدمات کے لیے میرا قلم آپ کو سلام پیش کرتا ہے۔

اپنی محبتوں اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

فی امان اللہ

❁......❁......❁

اے محبت تیری قسمت کہ تجھے مفت ملے
ہم سے منہ زور جو کمالات کیا کرتے تھے
خشک مٹی کو بھی عمارات کیا کرتے تھے
اے محبت یہ تیرا بخت کہ بن مول ملے
ہم سے انمول جو ہیروں میں تلا کرتے تھے
ہم جو لوگوں سے سوالات کیا کرتے تھے
ہم جو سو باتوں کی اک بات کیا کرتے تھے
تیری تحویل میں آنے سے ذرا پہلے تک
ہم بھی اس شہر میں عزت سے رہا کرتے تھے
ہم بگڑتے تو کئی کام بنا کرتے تھے
اور اب تیری سخاوت کے گھنے سائے میں
خلقت شہر کو ہم زندہ تماشا ٹھہرے
جتنے الزام تھے مقسوم ہمارا ٹھہرے
اے محبت ذرا انداز بدل لے اپنا
تجھ کو آئندہ بھی عشاق کا خون پینا ہے
ہم تو مر جائیں گے تجھ کو مگر جینا ہے
اے محبت......

"ثانیہ عباس......!"

ٹریکٹر سے اترتے ہی اس کی نظر ثانیہ عباس پر پڑی تھی۔ جو ہلکی ہلکی پھوار میں بھیگتی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ رات کے اس پہر بھلا وہ وہاں کیا کررہی تھی؟

کاٹن کا ٹراؤزر جو اس وقت اس نے زیب تن کر رکھا تھا ہلکی ہلکی پھوار میں بھیگ کر اس کے وجود سے چپک گیا تھا۔ زائر کو سمجھ نہ آئی کہ یہ اس کا الوژن ہے یا حقیقت؟ بارش کسی بھی لمحے تیز ہوسکتی تھی۔ وہ جیسے ٹرانس کی کیفیت میں چلتا عین اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ ثانیہ کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کے ٹوٹے ہوئے ناخن سے خون رس رس کر بند ہوگیا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ کیا نہیں تھا اس وقت اس کی آنکھوں میں؟ ثانیہ چاہنے کے باوجود اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا پائی تھی۔ تبھی وہ بولا تھا۔

"اتنی رات گئے اتنے خراب موسم میں تم یہاں کیا کررہی ہو؟"

"یہی سوال میں بھی پوچھ سکتی ہوں تم سے۔" تیز بارش اور سرد ہواؤں کے سبب اس نے دونوں بازو سینے پر لپیٹ رکھے تھے۔ زائر اس کے لہجے کی ترشی محسوس کرکے لب بھینچ گیا۔

"میں مرد ہوں، صبح سے رات تک مختلف کاموں کے لیے سو جگہ جانا پڑتا ہے مجھے تمہارا اس وقت گھر سے باہر کوئی کام نہیں ہے۔"

"سو واٹ میں کسی کی پابند نہیں ہوں۔ میرا جب جہاں دل چاہے گا میں جاؤں گی۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں جو عورت بھرپور محبت کے باوجود اپنے شوہر کو دھوکا دے کر اس کی زندگی سے نکل سکتی ہے اس کے لیے

یوں خراب موسم میں رات کے وقت گھر سے نکلنا کیا مشکل ہے۔"

"جسٹ شٹ اپ۔"

زائر ملک کے طنز اُس کی کنپٹیاں سلگا دی تھیں۔ تبھی وہ دہاڑی تھی مگر زائر نے اثر نہیں لیا۔

"تمہارے یوں چلانے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ مگر پھر بھی ایک وقت آئے گا جب تمہیں چادر اور چار دیواری کی حرمت کا احساس ہوگا۔ تم نہیں جانتیں مسلمان عورت پر اللہ رب العزت کا کتنا بڑا احسان ہے۔ چادر اور چار دیواری کا تحفظ اس کے لیے کتنی بڑی نعمت ہے۔ عورت کی زندگی سے اگر ان دو چیزوں کو نکال دیا جائے تو وہ عورت نہیں رہتی تماشا بن جاتی ہے۔"

"بکواس بند کرو زائر ملک تم جیسے گھٹیا اور کمینے شخص کے منہ سے یہ باتیں بالکل اچھی نہیں لگ رہیں تم جانتے ہو جو کچھ تم نے میری زندگی کے ساتھ کیا ہے۔ تمہی وہ شخص ہو جس نے مجھ سے میری شخصیت کا وقار چھین کر مجھے تماشا بننے پر مجبور کیا صرف تمہاری وجہ سے آج میں زندگی کی اس سیڑھی پر کھڑی ہوں کہ نہ جی سکتی ہوں نہ مر سکتی ہوں۔" وہ روہانسی ہوئی تھی۔ زائر کا دل دکھ کی شدت سے بھر گیا۔

"بہرحال مجھے تم سے نہ کوئی حساب کتاب کرنا ہے نہ شکوہ گلہ۔ میں صرف اتنی گزارش کروں گی کہ خدارا میرے بچوں کو مجھ سے ملنے دو وہ بہترین تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے ہیں میں نہیں چاہتی تمہارا گنوار پن اور فضول کی ضد میرے ساتھ ساتھ میرے بچوں کی زندگی بھی برباد کردے۔ وہ یہاں کے اجڈ ماحول کے عادی نہیں ہیں۔ انہیں اپنے جیسا جنگلی جانور مت بناؤ پلیز۔"

"تم بھول رہی ہو ثانیہ عباس کہ تم بھی اسی شخص کی اولاد ہو جسے یہاں کی مٹی نے پروان چڑھایا تھا۔"

"جانتی ہوں اسی لیے میری ماں نے اس شخص کو میری پیدائش کے بعد یہاں سے کوچ کر جانے پر مجبور کردیا تھا اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو یقیناً آج میں بھی تمہاری طرح گنوار یہیں پل بڑھ کر گاؤں کی کسی دیوار پر اپلے تھوپ رہی ہوتی۔" اس کے لہجے میں گاؤں کے قدرتی ماحول کے لیے اتنی نفرت تھی کہ وہ دم بخود رہ گیا تھا۔

"میرے بچے یہاں کے ماحول میں بہت خوش ہیں ثانیہ عباس۔ جہاں تک ان کی تعلیم و تربیت کی بات ہے تو اس کے لیے تمہیں اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ سوہنے کی مہربانی سے ان کے باپ میں اتنا دم ہے کہ وہ تم سے زیادہ مہنگے اداروں میں ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرسکتا ہے۔"

"ہونہہ..... خوب واقف ہوں میں آپ کی ہمت اور دولت سے۔ جو شخص اپنے بچپن کی منگ اور محبت کو پانے کے لیے دوسروں کے گھروں میں ڈاکے ڈالے دن رات کولہو کے بیل کی طرح کھیتوں میں پسینہ بہا کر بھی اپنا ٹھکانہ تک نہ بدل سکے وہ میرے بچوں کو کیا دے سکتا ہے سوائے ناکام حسرتوں کے۔"

"وہ میرے بھی بچے ہیں۔ تمہیں ان کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ضرورت ہے۔" ایک دم سے وہ چلائی تھی۔

"ماں ہوں میں ان کی میرا بھی ان پر اتنا ہی حق بنتا ہے جتنا کہ تمہارا۔"

"ماں.....؟" ثانیہ کے طنز نے اس کے دل پر نشتر کا کام کیا تھا۔

"وہ ماں جو بنا کسی قصور کے ان ننھے فرشتوں کی پیدائش سے پہلے ہی انہیں اپنی کوکھ سے گرانے چلی تھی۔ وہ ماں جس نے صرف اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے ان معصوم پھولوں کو ان کے باپ سے دور کردیا۔ وہ ماں جو صرف اپنے نفس کی بھوک کے لیے ساری حدود و قیود بھلا کر ایک قطعی غیر محرم مرد کے ساتھ زندگی کے شب و روز گزارتے ہوئے اپنی پاکیزگی اور نسوانیت پر سوالیہ نشان لگا رہی ہے۔ اس ماں کے حق کی بات کر رہی ہو تم؟"

نشتر لگانے میں اس شخص کا بھی کوئی ثانی نہیں تھا۔ ثانیہ عباس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ بولی تو اس کا لہجہ بھاری ہو رہا تھا۔

"اس فکر میں گھلنا چھوڑ دو زائر ملک کہ میں کیا ہوں کیسی ہوں بس اتنا یاد رکھو کہ میں جیسی بھی ہوں تمہارے بچوں کی حقیقی ماں ہوں اور یہ سچائی تم چاہو بھی تو بدل نہیں سکتے؟"

"جانتا ہوں میں اسی بات کا دکھ ہے مجھے بہرحال میرے بچے میرے گھر میں بہت خوش ہیں گاؤں کی زندگی میں ان کے لیے جو مزہ اور تھرل ہے وہ شاید تمہارے اے سی روم اور قیمتی کارپٹ سے سجے محل میں نہیں ہے اس لیے میں چاہ کر بھی انہیں تمہارے حوالے نہیں کرسکتا۔ ہاں تم چاہو تو کسی بھی وقت ان سے مل سکتی ہو روکوں گا نہیں۔" وہ شخص مکمل بے حس ہو چکا تھا۔ ثانیہ نے رخ پھیر لیا۔

بارش کے سرد قطروں کے ساتھ اس وقت جو آنسو اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے وہ جیسے آگ تھے۔

بارش کی تیزی کے ساتھ ہی بجلی بھی زور و شور سے چمکنا اور بادل گرجنا شروع ہوگئے تھے۔ تبھی وہ بولا تھا۔

"موسم کے تیور ٹھیک نہیں ہیں۔ میرے خیال میں اب تمہیں یہ ایڈونچر ترک کرکے گھر چلنا چاہیے۔"

"چلی جاؤں گی تمہیں میری فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ضرورت کیوں نہیں ہے صرف تمہارے ختم کرلینے سے ہمارا تعلق کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔" وہ بہت نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

ثانیہ کا غصہ پھر عود آیا۔

"کس تعلق کی بات کر رہے ہیں آپ..... ہوں..... کیا ہے ہمارے بیچ؟"

"کیا نہیں ہے ہمارے بیچ؟" گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے مضبوط ہاتھ ثانیہ عباس کے کندھوں پر جما دیے۔

"تم کیا سمجھتی ہو مجھ سے اور میرے ماحول سے جان چھڑانے کے لیے تم نے ساری دنیا میں یہ ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ میں نے تمہیں طلاق دے دی ہے۔ جبکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ایسا نہیں ہے پھر بھی ہمارا تعلق ٹوٹ جائے گا۔ میں تم سے اور تمہاری ذات سے دستبردار ہو جاؤں گا کبھی نہیں۔" وہ کہہ رہا تھا اور ثانیہ کی آنکھیں اس کے انکشاف پر جیسے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

"کیا کہا تم نے..... میں نے ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹا کہ تم نے مجھے طلاق دے دی؟"

"ہاں.....!"

"جسٹ شٹ اپ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے گھٹیا انسان ثابت ہوسکتے ہو طلاق کے وہ پیپرز جو تم نے مجھے بھجوائے تھے وہ میں نے سائن نہیں کیے تھے تم نے کیے تھے۔" بایاں ہاتھ پوری قوت سے اس کے سینے پر مارتے ہوئے وہ دہاڑی تھی۔

"تم نے بے آسرا کیا میرے بچوں کو باپ کے ہوتے ہوئے محرومیوں کے ساتھ جینے پر تم نے مجبور کیا۔ کتنی کوشش کی تھی میں نے اور میری مما نے اس تعلق کو بچانے کے لیے مگر کوئی کوشش بارآور ثابت نہ ہوسکی جس طرح اپنی مرضی سے زبردستی تم نے مجھے اپنی زندگی میں شامل کیا اسی طرح اپنی مرضی سے چپ چاپ نکال بھی دیا۔" بھرائے لہجے کے ساتھ کہتی وہ اب رو رہی تھی۔ زائر ملک شاکڈ انداز میں یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

"کیا بکواس ہے یہ میں نے کوئی پیپرز نہیں بھجوائے تھے طلاق کے۔"

"بکواس تم کر رہے ہو صرف تمہاری وجہ سے تمہارے دیے ہوئے دکھ کی وجہ سے میری ماں مر گئی۔ تم بھول سکتے ہو مگر میں وہ لمحات کبھی نہیں بھول سکتی جب دیار غیر میں دو ننھے بیمار بچوں کے ساتھ میں قطعی سرد ماحول میں اکیلی انہیں لے کر بیٹھی تھی اور وہاں کوئی مجھے تسلی دینے والا نہیں تھا۔"

"ثانیہ میں سچ کہہ رہا ہوں میرا یقین کیوں نہیں کر رہی تم؟" اب وہ روہانسا ہو چلا تھا ثانیہ نے بھیگی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

"بس کرو زائر ملک مت اتنے گناہ اپنے سر لو کہ بخشش مشکل ہو جائے۔ میری ماں اس طلاق کی گواہ تھی جو تم نے مجھے دی۔ اشعر بھی گواہ ہے اور خود تمہاری ماں بھی نہیں یقین آتا تو جا کر پوچھ لو اپنی ماں سے۔"

جتنی بے خوفی اور اعتماد سے وہ کہہ رہی تھی زائر برف ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر وہ بنا اس کی طرف دیکھے برستی بارش میں آگے بڑھ گئی تھی۔ زائر سن سا کتنی ہی دیر وہیں کھڑا رہا۔

❀.....❀.....❀

چاند سیڑھیوں سے گر گیا تھا اور اس کی بائیں ٹانگ پر چوٹ آئی تھی۔ تب سے وہ مما مما چلا رہا تھا۔ زائر نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس کے قابو بھی نہیں آ رہا تھا۔ گڑیا الگ پریشان ہوگئی تھی۔

سائرہ گرم دودھ لے کر آئی تو اس نے ہاتھ مار کر وہ اسی پر گرا دیا تبھی "سی" کی آواز کے ساتھ اس نے ایک تھپڑ اسے جڑ دیا تھا۔ زائر ہکا بکا رہ گیا۔

"کم بخت منحوس مارے میں کوئی ملازمہ ہوں جو ہر وقت ان کے ناز اٹھاتی رہوں اتنے ہی نازوں پلے ہیں تو رہیں شہر میں اپنی ماں کے پاس یہاں میری جان عذاب میں ڈالنے کیوں آ گئے ہیں۔" وہ جھنجلائی تھی۔ زائر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے بیٹے کو تھپڑ مارنے کی؟" تن کر سائرہ کے سامنے کھڑا وہ پہاڑ ہی تو لگ رہا تھا وہ بھی غصے میں آ گئی۔

"اپنے بیٹے کا تھپڑ نظر آ گیا میرا جلا ہوا بازو اور پاؤں دکھائی نہیں دے رہا۔"

"وہ بچہ ہے تکلیف ملی ہے تم اس کا مقابلہ کرو گی؟"

"میں نے تکلیف نہیں دی ہے اسے جو تمہارے یہ بچے تگنی کا ناچ نچا کر رکھیں مجھے سارا دن جیسے میں انہیں سنبھالتی ہوں مجھے ہی پتا ہے۔ تمہیں تو ان کی ماں کا سوگ منانے سے ہی فرصت نہیں ہے۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو سائرہ میں اپنے بچوں کے لیے ایسا رویہ برداشت نہیں کرسکتا۔"

"برداشت نہیں کرسکتے تو جا کر شہر چھوڑ آؤ ان کو واپس پہلے ہی ان کی ماں کی وجہ سے کم اذیت میں نہیں ہوں میں جو تم نے

انہیں بھی لاکر میرے سر پر بٹھادیا ہے۔"

"چٹاخ۔"

ابھی وہ بات پوری بھی نہ کرپائی تھی کہ زائر کے بھرپور طمانچے نے اس کا دماغ چکرا کر رکھ دیا۔

"اتنی ہی تنگ اور عاجز ہو میرے بچوں سے تو کرو شادی اور دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ میں نے کوئی ٹھیکہ نہیں اٹھا رکھا تمہیں ساری عمر بٹھا کر کھلانے کا۔ یہ گھر میرا اور میرے بچوں کا ہے۔ یہ جب تک چاہیں گے یہاں رہیں گے دیکھتا ہوں کون نکالتا ہے انہیں یہاں سے۔" اماں جو قریب ہی بیٹھی تھیں۔ اس کے چہرے سے امڈتا جلال دیکھ کر سہم گئیں۔ بڑے دنوں کے بعد سائرہ نے بھی اپنے رنگ دکھائے تھے۔ صرف ایک لمحے کی صورت حال نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ زائر گھر سے نکل چکا تھا۔ سائرہ بھی تیزی سے امڈتے آنسوؤں کے ساتھ رسوئی میں چھپ گئی تھی وہ روتے ہوئے چاند کو گود میں لیے بہت کچھ سوچ گئیں۔ ابھی کل رات گھر واپسی پر انہوں نے زائر کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ صبح جب وہ فجر کی نماز ادا کررہی تھیں تو وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ ان کے قریب آکر مصلے پر بیٹھ گیا تھا۔

"اماں۔" جونہی انہوں نے دعا مکمل کی اس نے پکار لیا۔ جواب میں وہ اس کا چہرہ دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئی تھیں۔

"ماں صدقے جائے کیا ہوا؟"

"اماں کیا میں نے آپ کے سامنے ثانیہ کو طلاق دی تھی؟" وہ رو رہا تھا۔ وہ دہل گئیں۔

"اللہ رحم کرے ایسا تجھ سے کس نے کہا؟"

"جس نے بھی کہا ہو تو بتا نا اماں کیا میں نے کسی بھی طریقے سے اسے خود سے علیحدہ کیا؟" سرخ بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ جس طرح وہ روتے ہوئے پوچھ رہا تھا ان کا کلیجہ منہ کو آگیا۔

"نہیں بالکل نہیں۔"

"تو پھر وہ کیوں کہتی ہے کہ آپ اس طلاق کی گواہ ہیں جو میں نے اسے دی تھی۔" ایک دم سے وہ بلکا تھا۔ ماں بیٹے کا ایسا حال دیکھ کر اندر سے کٹ گئی۔

"میں نہیں جانتی ضرور وہ کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہوگئی ہے۔ خدا گواہ ہے میری اس سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔" اماں کا چہرہ اور ان کا لہجہ ان کی سچائی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ زائر نے سختی سے آنکھیں بند کرلیں۔

"وہ ایسا کیوں کررہی ہے میرے ساتھ اماں میں نہیں جی سکتا اس کے بغیر۔"

ان کا وہ شیر بیٹا جو کبڈی اور کشتی میں گاؤں کے دس لڑکوں کو بھی ایک ساتھ چند لمحوں میں زمین چٹا دیتا تھا۔ وہ ان کے سامنے بے بسی کی تصویر بنا رو رہا تھا اور وہ بھی ایک عورت کے لیے انہیں لگا جیسے ان کا دل اپنے بیٹے کے دکھ پر غم کی شدت سے پھٹ جائے گا۔

"کہاں ملی وہ تجھے؟" اگلے ہی پل انہوں نے پوچھا تھا۔

مگر زائر نے ان کا سوال نہیں سنا۔ نم آنکھوں کے ساتھ وہ اٹھا تھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔ سارا دن وہ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہیں اور اب یہ نیا تماشا ہوگیا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا وہ اب سائرہ کو رخصت کرنے میں زیادہ دیر نہیں کریں گی۔

❁......❁......❁

ثانیہ جب سے زائر سے مل کر شہر واپس آئی تھی بے حد اداس رہنے لگی تھی۔ پہلے والی بے چینی اور نفرت کی جگہ یاسیت نے لے لی تھی۔ گو اچھی طرح دل کا غبار نکال کر وہ ہلکی پھلکی ہوگئی تھی مگر کوئی چیز تھی جو اسے خوش رہنے نہیں دے رہی تھی۔ اشعر نے شادی کی تیاری مکمل کرلی تھی۔ لوگوں اور قریبی دوستوں میں کارڈز بھی بٹ گئے تھے۔ ہنی مون کی ٹکٹس بھی فائنل ہوگئی تھیں۔ اس نے سوچ لیا تھا اشعر سے شادی کے بعد وہ دوبارہ کبھی پاکستان کا رخ نہیں کرے گی۔

اشعر بہت خوش تھا۔ یا شاید اسے ہی ایسا محسوس ہورہا تھا۔ مگر وہ خوش نہیں تھی۔ اس رات ان کی مہندی کی تقریب تھی۔ ثانیہ نے پارلر سے مہندی لگوائی تھی اور خوب رنگ آیا تھا۔ اشعر آنے والے مہمانوں کو خود ہی سنبھال رہا تھا۔ وہ اسٹیج پر سر جھکائے بیٹھی اپنے بائیں ہاتھ میں پڑی انگیجمنٹ رنگ سے کھیلتی رہی۔ مہندی کی تقریب بہت شاندار ہوئی تھی۔

تھکن سے چور وہ اشعر کو مہمانوں کے درمیان چھوڑ کر سر درد کا بہانہ کرتی اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اچانک کسی نسوانی قہقہے کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ حلق میں جیسے پیاس کی شدت سے کانٹے اگ آئے تھے۔ بوجھل سر کو سنبھالتی وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بہت بڑے کھلاڑی ہو تم اشعر حسین ورنہ سچ میں میں بہت ڈر گئی تھی۔ مجھے لگا تم سچ مچ ثانیہ میں دلچسپی لینے لگے ہو اور شاید اب کبھی لوٹ کر انگلینڈ کا رخ نہ کرو مگر مجھے کیا پتا تھا تم یہاں میرے اور بچوں کے لیے اتنی خوب صورت بساط بچھائے بیٹھے ہو۔" کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور باہر لاؤنج سے روشنی کی ہلکی سی

لکیر ادھ کھلے دروازے سے اندر آرہی تھی۔ ثانیہ کی نظر بے ساختہ سامنے لگے وال کلاک پر پڑی۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ بھلا اس وقت وہاں کوئی عورت کیا کررہی تھی؟ تبھی اشعر کی آواز آئی تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو اشعر حسین نے دنیا نہیں دیکھی۔"

"دیکھی ہے مگر ثانیہ عباس کوئی عام لڑکی نہیں ہے اسے دھوکا دینا اتنا آسان نہیں، پتا نہیں کیسے تم نے اس کی آدھی سے زیادہ جائیداد ہتھیالی اور اب اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں نکاح کے جعلی پیپرز اگر کسی کو پتا چل گیا تو؟"

"پاگل ہو تم اور کچھ نہیں، جب طلاق کے جعلی پیپرز کا پتا نہیں چلا تو نکاح کے جعلی پیپرز کا کیسے پتا چل سکتا ہے۔ جبکہ قاضی اور فرینڈز بھی میرے ساتھ ہوں، پتا ہے آنٹی پر جب فالج کا اٹیک ہوا تھا تو وہ بار بار میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں یوں جیسے کہہ رہی ہوں کہ میں ثانیہ کو سب کچھ سچ سچ بتادوں، مگر میں کوئی پاگل ہوں جو اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیتا۔ جس طرح اس نے مجھے ٹھکرا کر میری توہین کی تھی میں وہ بے عزتی کبھی نہیں بھول سکتا۔ اسی لیے اب ثانیہ عباس کا جو نقصان میرے ہاتھوں ہوگا وہ اس کی خود ذمہ دار ہوگی۔"

"ہوں، ویسے کتنی عجیب بات ہے کہ اب تک اس کے شوہر نے اسے سچائی نہیں بتائی۔"

"کیسے بتا سکتا ہے۔ ثانیہ تو اس کی شکل دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتی۔"

"گڈ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ویسے اب آگے کیا پلان کرنا ہے۔"

"پلان تو کیا ہوا ہے کل فرضی نکاح کے بعد میں اسے ہنی مون کے بہانے ابروڈ لے کر جارہا ہوں وہاں ایک تاجر سے بات کی ہے میں نے ثانیہ کو بھی ملوایا ہے اور اسے ثانیہ بہت پسند بھی آئی ہے ساڑھے تین کروڑ میں سودا طے ہوا ہے۔ سودے کے بعد پاکستان اطلاع بھجوادوں گا کہ ثانیہ کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہوگئی یہاں کون ہے ایسا جو اتنی دور اس کی شکل دیکھنے جائے گا۔ یوں اس کی موت کی خبر پھیلا کر اس کی باقی ماندہ جائیداد پر بھی میرا قبضہ ہوجائے گا۔ کہو کیسا لگا پروگرام؟" اشعر حسین تفاخر سے پوچھ رہا تھا اور نسوانی قہقہے نے ایک مرتبہ پھر اس کی حوصلہ افزائی کی تھی ثانیہ کو لگا جیسے اس کے سارے بدن پر چیونٹیاں چڑھ آئی ہوں اور اب اسے کاٹ کاٹ کر کھا رہی ہوں۔ یہ کیسی حقیقت تھی جس میں اس کی بربادی کے ذمہ دار خود اس کے اپنے تھے وہ اپنے جن سے ان کا خون کا رشتہ تھا۔

دنیا میں ماں سے زیادہ انسان کا اپنا اور کوئی نہیں ہوتا مگر...... اسے تکلیف پہنچا کر برباد کرنے والی اس کی اپنی ماں ہی تھی۔

اسے لگا جیسے اس کا وجود بلاسٹ ہو کر ہوا میں تحلیل ہوگیا ہو تیزی سے گھومتے سر کو بمشکل دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے وہ دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

❁......❁......❁

اگلی صبح اشعر اس کے کمرے میں آیا تو وہ جاگ رہی تھی۔ وہ بے تکلفی سے بیڈ پر اس کے قریب ہی ٹک گیا۔

"اٹھ گئی میری پری؟" وہ بے حد مسرور تھا۔ ثانیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

"ہوں۔"

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا رات بھی جلدی سوگئی تھیں؟"

"ہوں ٹھیک ہے۔"

"گڈ چلو جلدی سے اٹھ کر تیار ہوجاؤ پارلر بھی جانا ہے۔"

"نہیں...... میں پہلے اپنے بچوں سے ملنے جاؤں گی۔"

"او کم آن ثانیہ بچے نہیں آجائیں گے ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"جانتی ہوں مگر مجھے اپنے بچوں سے ملنا ہے پلیز۔"

"تم بے کار کی ضد کررہی ہو ثانیہ۔ تم جانتی ہو اس وقت اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"تمہیں نہیں ہے مجھے ہے۔" پہلی بار سرخ آنکھیں اٹھاتے ہوئے وہ چلائی تھی۔ اشعر حیران سا دیکھتا رہ گیا تھا۔

"ہوا کیا ہے تمہیں؟"

"کچھ نہیں ہوا بس مجھے بچوں سے ملنا ہے میں جارہی ہوں۔"

"سوری نکاح سے پہلے تم کہیں نہیں جاسکتیں۔" ایک لمحے میں اس نے اپنا روپ بدلا تھا۔ وہ ششدر رہ گئی تھی۔

"تم مجھے پابند نہیں کرسکتے اشعر حسین۔"

"کرچکا ہوں۔" اس کے دہاڑنے کا اثر لیے بغیر وہ خباثت سے مسکرایا تھا۔

"اتنا پاگل نہیں ہوں میں جتنا تم نے مجھے سمجھ لیا ہے بچوں سے ملنے کے بہانے تم وہاں جاؤ گی اور آگے وہ ہوگا تمہارا سابقہ شوہر زائر ملک...... کہاں واپس آنے دے گا وہ تمہیں۔"

"تم بھول رہے ہو اشعر حسین کہ تم سے شادی کا فیصلہ میرا اپنا ہے۔ کسی نے مجبور نہیں کیا تھا مجھے جواب بھاگ جاؤں گی مجھے زائر ملک سے بدلہ لینا ہے تم سے شادی کے بعد میں دوبارہ کبھی

پاکستان نہیں آؤں گی۔ اسی لیے آخری بار اپنے بچوں سے ملنا چاہتی ہوں۔ تمہیں اعتبار نہیں ہے تو چلو ساتھ۔" اس کا لہجہ اتنا پختہ تھا کہ وہ ڈگمگا گیا۔

"ایسی بات نہیں ہے ثانیہ بس میں تمہیں کھونے سے ڈرتا ہوں۔"

"مت ڈرو میں بیس پچیس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لوں گی۔"

"سچ کہہ رہی ہو نا؟"

"ہوں۔" اشعر حسین جیسے بندے کے ساتھ ساتھ رہتے رہتے وہ بھی کھلاڑی بن گئی تھی۔ وہ اطمینان سے ہنس دیا۔

"شکریہ۔ میں نکاح کا بندوبست کرتا ہوں تم جلدی سے واپس آ جانا۔"

"ٹھیک ہے۔" متورم نگاہیں جھکا کر اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا اور اپنا پرس اٹھا کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

"یہ کیا کیا اشعر تمہیں اس وقت اسے یوں جانے نہیں دینا چاہیے تھا۔" ثانیہ کے گھر سے نکلتے ہی اشعر کی بیوی اس کے مقابل آ گئی تھی۔

"کیوں؟"

"زائر ملک کو اگر اس کی تم سے شادی کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دے گا۔"

"پتا ہے مجھے تم کیا سمجھتی ہو میں یہاں دونوں آنکھیں بند کر کے بیٹھا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کی بچی زائر فی الحال گاؤں میں نہیں ہے۔ اسلام آباد گیا ہوا ہے اپنے کسی ضروری کام سے جب تک وہ واپس لوٹے گا چڑیاں کھیت چگ کر اڑ چکی ہوں گی اور پھر عین ٹائم پر میں کسی بھی طرح سے ثانیہ کو ناراض کر کے اپنے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں کرنا چاہتا۔ اگر اسے ذرا سا بھی مجھ پر شک ہو گیا تو وہ مجھے زمین چٹانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کرے گی۔"

اشعر کے لہجے میں ذہانت چھلک رہی تھی۔ اس کی بیوی کو بے ساختہ قائل ہونا پڑا۔ کتنی آسانی سے اس نے ثانیہ کا ہمدرد بن کر اسے بے وقوف بنا لیا تھا بیوی کو طلاق دینے کا جھوٹ بول کر اس کی جھوٹی ہمدردیاں بھی حاصل کر لی تھیں۔ وہ خوش تھا کہ ثانیہ کو تاحال اس کی سازشوں کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ مگر ایسا نہیں تھا۔

عین وقت پر قدرت نے ثانیہ عباس کی آنکھوں پر پڑے دبیز پردے ہٹا دیے تھے اور اب کئی سیاہ راتوں کے بعد ایک روشن اجلی صبح اس کی منتظر تھی۔

❁......❁......❁

اس وقت وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش میں شام ڈھلے ہوٹل سے وہ اپنے دوست کامران سے ملنے کے لیے اس کی رہائش گاہ پر آیا تھا۔ جب اسے ثانیہ عباس کی شادی کی اطلاع ملی۔ کامران اشعر حسین کے قریبی جاننے والوں میں سے تھا۔ تبھی اس وقت جب وہ اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کامران نے اس سے کہا تھا۔

"یار...... مجھے تو سمجھ نہیں آتی۔ آخر زندگی کے اتنے اہم معاملات پر یہ عورتیں عقل سے کام کیوں نہیں لیتیں؟"

"کیوں کیا ہوا؟" ڈھیلے ڈھالے انداز میں صوفے پر بیٹھا چائے کی چسکی لیتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

"ہونا کیا ہے میرے پارٹنر اشعر حسین کو تو جانتے ہو تم ایک نمبر کا عیاش اور کمینہ بندہ ہے۔ مجھ سے اس کی کوئی بات بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اب اس کی جو گرل فرینڈ ہے ثانیہ عباس وہ پوری طرح سے اس کے فریب میں آئی ہوئی ہے۔ اس شخص کی وجہ سے اس نے اپنے شوہر سے طلاق لی۔ دو پھول جیسے معصوم بچوں کو چھوڑا اور اب یہ اشعر اسی کی آدھی سے زیادہ جائیداد ہتھیا کر اس سے شادی رچانے جا رہا ہے جبکہ پہلی بیوی کو بھی اس نے طلاق نہیں دی۔ میرا دل تو بہت کڑھ رہا ہے یقیناً شادی کے بعد یہ ثانیہ عباس کو بہت ذلیل کرنے والا ہے۔" کامران کہہ رہا تھا مگر زائر کے بدن سے تو جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم' ثانیہ عباس اور اشعر حسین کی شادی؟"

"ہاں یار! ابھی کل ہی انویٹیشن آیا ہے مجھے آج مہندی کی تقریب ہے مگر میں نہیں جا سکا۔ میرے بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے ایک لحاظ سے یہ ٹھیک ہی ہو رہا ہے کیونکہ ثانیہ اب تک بنا نکاح کے ایک ہی چھت تلے اس کے ساتھ رہ رہی ہے۔ تم خود سوچو اشعر جیسے عیاش بندے نے کیا کیا نہیں کیا ہو گا اس کے ساتھ۔" اس وقت کامران کے منہ سے نکلنے والے وہ الفاظ سانپ بچھو بن کر اس کے وجود سے لپٹ گئے تھے۔ مارے اشتعال کے اس کا چہرہ لال سرخ ہو گیا تھا۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟

ثانیہ عباس اس کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی تھی؟

اتنی سنگدلی اور بے وفائی...... کیا وہ اس حد تک بھی جا سکتی تھی کہ ان کے تعلق کا کوئی وجود ہی باقی نہ رہتا؟ وہ جرم جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوا تھا اس جرم کے لیے وہ اسے اتنی بڑی سزا کیسے دے سکتی تھی؟

یکلخت امڈ کر آنے والے غصے کے ساتھ اسے ثانیہ عباس کی ذات سے بے حد نفرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ اٹھا تھا اور پھر کامران کے روکنے کے باوجود طوفان بنا وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔

❁......❁......❁

ٹک...... ٹک...... ٹک

فجر کی اذان ہوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ وہ ابھی فجر کی نماز پڑھ کر کچن میں جانے کا ارادہ کر رہی تھی مگر دروازے پر ہونے والی دستک نے اس کا ارادہ منسوخ کر دیا تھا۔ تین دن ہوئے تھے زائر گھر نہیں آیا تھا نہ ہی خیر خبر کی کوئی اطلاع دی تھی۔ تبھی اس کے لیے پریشان تھے۔ اس وقت بھی اس کا دل دھڑکا تھا اور وہ تیزی سے دروازے کی طرف آئی تھی۔

"کون......؟"

کنڈی گراتے ہوئے اس نے پوچھ لیا تھا۔ مگر اگلے ہی پل ثانیہ عباس کو اپنے مقابل کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"تم......!"

"ہوں! مجھے اماں اور زائر سے ملنا ہے۔" محلوں میں پلنے والی وہ شہزادی اس وقت کسی فقیر سے کم دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سائرہ کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

"وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے بعد میں آنا۔" تنک کر کہنے کے ساتھ ہی اس نے دروازہ ثانیہ عباس کے منہ پر بند کر دیا تھا۔ ثانیہ کٹ کر رہ گئی۔

"میری بات سنیں پلیز۔" اگلے ہی پل درد کی انتہا پر کھڑے ہوئے اس نے پھر دروازہ پیٹا تھا۔ جواب میں سائرہ نے کھٹ سے دونوں پٹ وا کر دیے۔

"کیا ہے؟ کیوں صبح صبح چین سکون حرام کرنے چلی آئی ہو کہہ جو دیا ہے کہ زائر گھر پر نہیں ہے پرسوں آیا تھا بچوں کو لے کر شہر چلا گیا۔ اب جان چھوڑو میری وہ لڑکی اس کی سوچ سے زیادہ بدتمیز اور منہ پھٹ تھی۔ ثانیہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"میں اس سے صرف ایک بار ملنا چاہتی ہوں پلیز۔"

"میں نے ٹھیکہ نہیں لیا ہوا تم دونوں کو ملانے کا ویسے بھی وہ تمہاری شکل دیکھنے کو تیار نہیں ہے میری اور اس کی شادی ہو رہی ہے چند روز بعد۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اپنا یہ خوب صورت چہرہ لے کر جہاں سے آئی ہو وہیں واپس لوٹ جاؤ مہربانی ہوگی۔"

"سائرہ کون ہے دروازے پر؟" ثانیہ ابھی جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ زائر کی ماں سائرہ کی تیز آواز پر چونک کر دروازے کی طرف چلی آئی۔ سائرہ دروازے بند کرنا چاہتی تھی مگر وہ اس سے پہلے ہی اس کے سر پر پہنچ گئی تھیں۔

"ثانیہ پتر...... تو یہاں؟" ان کا پوچھنا تھا اور ثانیہ کے آنسوؤں میں مزید شدت آ گئی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ اماں کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"سب خیریت تو ہے نا زائر کہاں ہے؟" وہ پریشانی سے اس کے پیچھے دیکھ رہی تھیں۔ سائرہ کے چہرے کی سرخی بڑھ گئی۔

"پتا نہیں' میں انہی سے ملنے یہاں آئی ہوں۔" گھٹی گھٹی سسکیوں کے درمیان اس نے بتایا تھا اماں متفکر سی اسے اندر لے آئیں۔

"آؤ اندر آ جاؤ' زائر گھر پر نہیں ہے۔" سائرہ کی نسبت ان کے لہجے میں اپنائیت اور مٹھاس تھی۔ سائرہ نے ان کے پیچھے زور سے دروازہ بند کر کے اپنا غصہ نکالا۔ اماں ثانیہ کو اپنے کمرے میں لے آئی تھیں۔

"ہاں اب بتا' کیا چل رہا ہے تیرے اور زائر کے بیچ۔ کیوں اس کا امتحان لے رہی ہے تو ثانیہ۔ کتنے سال ہو گئے ہیں میرے بیٹے کے لبوں سے مسکراہٹ روٹھ گئی ہے۔ بہت رویا ہے وہ تیرے لیے کیوں کر رہی ہے تو اس کے ساتھ ایسا؟" ثانیہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے بے حد آزردہ تھیں۔ وہ ملول سی نظریں جھکا گئی۔

"میں بھی اس کے لیے بہت روئی ہوں اماں' میرا خدا جانتا ہے۔ بہت بے سکون رہی ہوں میں اس سے دور رہ کر مگر سارا قصور میرا نہیں تھا میرے اور زائر کے بیچ بہت بڑی غلط فہمی کی دیوار حائل ہو گئی تھی۔" وہ رو رہی تھی اور پھر بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس نے گزرے پانچ سال کا احوال ان کے گوش گزار کر دیا تھا۔ اماں اپنا دل تھام کر رہ گئیں۔ جبکہ سائرہ جو بظاہر ناشتے کی تیاری کر رہی تھی مگر اس کے اندر غم و غصے کے ابال اٹھ رہے تھے۔ ثانیہ عباس کے ہوتے ہوئے وہ اپنی منزل کبھی نہیں پا سکتی تھی۔ لہٰذا اس وقت اگر اس کے دماغ میں کوئی خیال تھا تو صرف ثانیہ عباس کو راستے سے ہٹانے کا جو اس کے خوابوں کی دنیا درہم برہم کرنے کے لیے پھر سے اس کی اور زائر کی زندگی میں آ گئی تھی۔

❁......❁......❁

دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔

ثانیہ اپنی ساری روداد اماں کے سپرد کرنے کے بعد اب آسودہ سی ان کے کندھے سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ خونی رشتوں سے فریب کے بعد اسے ان رشتوں کی قدر واہمیت کا پتا چلا تھا جو سونے کی طرح خالص تھے۔ جنہیں اس کی ذات اور اسٹیٹس سے کوئی لالچ نہیں تھا۔ اللہ رب العزت کی پاک ذات کے بعد جو اس کی عزت کی حفاظت کرنا جانتے تھے۔ ایک ہفتہ قبل اشعر حسین کو چکر دے کر وہ سیدھی حویلی چلی آئی تھی اور پھر بنا کچھ بتائے دادی ماں کے گلے لگ کر اتنا روئی تھی کہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ پورے تین دن لگے تھے اسے خود کو سنبھالنے میں اس دوران اشعر نے اس سے بات کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ اس کی شکل دیکھنے کو بھی تیار نہیں تھی۔ چوتھے روز جو سب سے پہلا کام اس نے کیا وہ اشعر حسین پر فراڈ کی ایف آئی آر درج کروانے کا تھا۔ اشعر حسین جو راتوں رات باہر بھاگنے کی تیاری کررہا تھا پھنس کر رہ گیا۔ محبت کے نام پر کسی کے اعتبار کا خون کرنے کی سزا تو ملنی ہی تھی اسے تاہم اس نے اپنی ساکھ خراب ہونے کے ڈر سے اس سے معافی مانگ کر اس کی تمام جائداد واپس اس کے نام کروادی تھی۔ اس کام سے فراغت کے بعد دادی ماں کی نصیحت اور ڈھارس بندھانے پر اس نے زائر کے گاؤں کا رخ کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اسے معاف کرے گا یا نہیں مگر وہ ایک بار اس کے قدموں میں گر کر اس سے معافی ضرور مانگ لینا چاہتی تھی۔

✿......✿......✿

بارش ہورہی تھی!

پچھلے کئی دنوں کے شدید حبس کے بعد اس روز بارش ہوئی تھی۔ پورے پندرہ دن ہوگئے تھے زائر نے گاؤں کا رخ نہیں کیا تھا۔ وہ تو جیسے گاؤں آنے والا راستہ ہی بھول بیٹھا تھا ثانیہ روز اس کا انتظار کرتی اور روز اس کی آس ٹوٹ جاتی۔ زائر کے ماں باپ کی خدمت کو اس نے اپنا نصب العین بنالیا تھا مگر دل کو چین نہیں تھا۔

سائرہ ہر وقت منہ پھلائے پھرتی تھی۔ آج کل اس نے گاؤں کے نائی کے بیٹے کے ساتھ دعا سلام کررکھی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس دعا سلام کے پیچھے اس کا کیا مقصد کارفرما تھا۔ ثانیہ کے آنے کے بعد اس نے گھر کے کام کاج سے بھی ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ سارا سارا دن گھر کی چھت پر بیٹھی وہ جانے کیا کیا پلان بنائی رہتی تھی۔

پورے پندرہ دن کے بعد اس روز زائر نے گھر کا رخ کیا تھا۔ ثانیہ اس وقت کپڑے دھونے میں مصروف تھی ساتھ ہی اس نے تندور جلا رکھا تھا۔ سائرہ گھر پر نہیں تھی لہٰذا وہ اکیلی ہی بھاگ بھاگ کر سب کچھ سمیٹ رہی تھی جب وہ ادھ کھلے دروازے سے گھر کے اندر چلا آیا۔

"اماں...... دروازہ کیوں کھلا ہے کتنی بار کہا ہے دروازہ کھلا مت چھوڑا کریں مگر آپ کو......!" قدرے خفگی سے کہتا وہ ابھی دو قدم ہی اٹھا پایا تھا کہ سامنے کپڑے سمیٹتی ثانیہ عباس کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ منہ کے لفظ بھی منہ میں ہی رہ گئے تھے۔

"تم یہاں؟" ثانیہ کی آنکھیں اسے دیکھتے ہی آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ فقط چند روز میں ہی کتنا بدل گیا تھا وہ چہرے کا سارا حسن اور جاذبیت جیسے ماند پڑگئی تھی۔ ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو اور بکھرے بالوں نے اس کے اندر کا حال اس پر خوب واضح کردیا تھا۔ وہ شخص واقعی محبت کرنا جانتا تھا۔ ثانیہ نے ہاتھ میں پکڑے کپڑے دوبارہ تار پر ڈال دیے۔

"سائرہ......!" اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتی اس نے فوراً دھاڑ کر سائرہ کو آواز دے ڈالی تھی۔ مگر وہ گھر پر ہوتی تو جواب دیتی۔ تبھی راستے میں پڑی کپڑوں کی بالٹی کو ٹھوکر مارتے ہوئے وہ اماں کے کمرے کی طرف بڑھ آیا تھا۔

"اماں......!"

"ماں صدقے جائے کیوں چلا رہا ہے۔" وہ ابا کو کپڑے تبدیل کروارہی تھیں تبھی اس کے دھاڑنے پر فوراً لپکتے ہوئے باہر آگئیں۔

"کہاں تھا اتنے دن نہ خیر نہ خبر حال بھی فقیروں جیسا بنا رکھا ہے۔"

"میرے حال کو چھوڑیں۔ سائرہ کہاں ہے؟" اس کے چہرے پر سرخی تھی۔ اماں گھبرا گئیں۔

"یہیں محلے میں کسی کے گھر گئی ہوگی بات کیا ہے؟"

"بلا کر لائیں اسے الو کی پٹھی کو نہ اپنی عزت کا خیال ہے نہ کسی اور کی۔" شدید غصے میں بنا ثانیہ کی ذات کو کوئی اہمیت دیے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ثانیہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد سائرہ گھر آئی تو وہ اس پر چڑھ دوڑا۔

"کہاں تھیں تم؟" اس کی آنکھوں میں تیرتی غصے کی سرخی نے سائرہ کو بھی پریشان کردیا تھا۔

"کیوں؟ ایسے کیوں پوچھ رہا ہے تو؟"

"جو پوچھا ہے اس کا جواب دے زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ایک مرتبہ پھر وہ دھاڑا تھا۔ سائرہ کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

"اللہ دتا ئی کے گھر تھی۔ اس کی بیٹی نے بلایا تھا۔"

"چٹاخ۔" اس کے کہنے کی دیر تھی کہ زائر کے تھپڑ نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔

"تم کیا سمجھتی ہو اگر میں گاؤں میں نہیں ہوں تو مجھے تمہارے کرتوتوں کی کوئی خبر نہیں۔" وہ چلا رہا تھا ثانیہ سہم کر رہ گئی۔ جبکہ سائرہ کو تو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ اسے تھپڑ بھی مار سکتا ہے۔ تبھی وہ حیران کھڑی اماں کی طرف مڑا تھا۔

"میں نے کہا تھا آپ سے اس کی شادی فائنل کردیں مگر آپ کو مفت میں فارغ بیٹھ کر کھانے کی عادت پڑگئی ہے۔ نہیں رکھوالی کرسکتیں تو کیوں رکھا اسے گھر میں؟" اب وہ اپنی ماں کی خبر لے رہا تھا۔

"ہوا کیا ہے زائر کیوں اتنا ہنگامہ کررہا ہے تو۔"

"ہنگامہ......؟ میرا بس چلے تو میں گولی ماردوں جو ایک مرتبہ پھر میری عزت کا جنازہ نکالنے پر تلی ہوئی ہے اور آپ بھی دیکھ لیجیے گا اس بار ابا کے بعد یہ مجھے چار پائی پر ڈالے گی۔" اس کا غصہ کسی طور کم نہ ہورہا تھا۔ اماں نے اپنا کلیجہ تھام لیا۔

"ہائے اللہ نہ کرے ایسے کیوں کہہ رہا ہے تو۔"

"پاگل ہوگیا ہوں اس لیے۔" تنک کر کہتا وہ فوری گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ ثانیہ بے آس و نامراد کھڑی رہ گئی تھی۔

وہ بے نیاز سا جیسے گھر آیا تھا ویسے ہی نکل گیا۔ یوں جیسے اسے ثانیہ کے آنے نہ آنے سے کوئی فرق ہی نہ پڑا ہو۔ سائرہ اسے نفرت سے گھورتی کچن میں جا گھسی تھی۔ وہ گم صم سی وہیں کھڑی رہی۔

❁......❁......❁
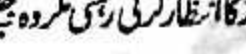
ساون شروع ہوگیا تھا۔

دن میں دو دو تین تین بار وقفے وقفے سے بارشیں ہورہی تھیں۔ اس روز رات میں ثانیہ کی آنکھ کھلی تو زائر اسی کمرے میں اس سے کچھ فاصلے پر سورہا تھا۔ پتا نہیں وہ کب آیا تھا اماں آج کل سائرہ کی شادی کے لیے خاصی سرگرم تھیں۔ وہ سارا سارا دن پاگلوں کی طرح زائر کا انتظار کرتی رہتی مگر وہ جیسے ادھر آنا ہی بھول چکا تھا۔

ایک سزا تقدیر نے اسے دی تھی اور ایک سزا اب زائر ملک اسے دے رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر گھلنا شروع ہوگئی۔ زائر نے بچے شہر میں ہوسٹل میں چھوڑ دیے تھے تاکہ ان کی تعلیم کا حرج نہ ہو۔ باہر صحن میں پھر بارش ہورہی تھی۔

ثانیہ خاموشی سے اٹھی اور زائر کی چار پائی کے قریب چلی آئی۔ کروٹ کے بل لیٹا وہ بے خبر سورہا تھا جب اس نے خاموشی سے آنسو بہاتے ہوئے اپنے ہونٹ اس کے پیروں پر رکھ دیے وہ جاگا تھا اور پھر فوراً سے پیشتر اس نے اپنے پاؤں اوپر سمیٹ لیے تھے۔

"زائر پلیز مجھے معاف کردو پلیز۔"

"کس بات کے لیے؟" اس کے لہجے میں اب بھی کاٹ تھی۔ ثانیہ کے آنسوؤں میں مزید شدت آگئی۔

"تم جانتے ہو میں تم سے کس بات کی معافی مانگ رہی ہوں۔"

"مت مانگو کیونکہ مجھے تمہاری معافی کی ضرورت نہیں ہے۔" تنک کر کہتا وہ فوراً کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ ثانیہ بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

"زائر میں بہت شرمندہ ہوں میری بات سن لو پلیز پھر جو چاہے سزا دے دینا میں اف بھی نہیں کروں گی۔"

"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی کیونکہ جس ثانیہ عباس کو میں نے اپنی عزت بنایا تھا وہ تم نہیں ہو۔" وہ اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا تبھی ثانیہ اس کی آنکھوں سے ٹوٹتے آنسوؤں کو نہیں دیکھ سکی تھی۔

"زائر پلیز میں نے تمہاری عزت کے ساتھ کوئی سودا نہیں کیا ہے۔"

"اچھا پانچ سال دیار غیر میں ایک قطعی غیر محرم شخص کے ساتھ شب و روز گزار کر اس کے ساتھ شادی کی پلاننگ کرکے تم سمجھتی ہو تم نے میری عزت کا سودا نہیں کیا۔" اس بار وہ اس کی طرف پلٹا تھا اور ثانیہ اس کی آنکھوں سے ٹوٹتے آنسو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔

"میں قصوروار تھا نا تمہاری نظر میں میں نے دھوکا دیا تھا نا تمہیں تو تمہیں مجھ سے لڑنا چاہیے تھا سارا حساب کتاب کلیئر کرنا چاہیے تھا فرار اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔" قطعی جنونی انداز میں اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے وہ جذباتی ہوا تھا۔ ثانیہ کے لبوں کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ وہ پلٹا تھا اور پھر کمرے میں جاکر اس نے اندر سے چٹخنی لگالی تھی۔ ثانیہ فجر تک وہیں صحن میں بیٹھی بھیگتی رہی تھی۔

❁......❁......❁

شہر میں زائر کا بنگلہ تکمیل پا گیا تھا لہٰذا آج کل وہ شہر آیا ہوا تھا۔ بنگلے کی ملکیت اس نے ثانیہ عباس کے نام کردی تھی۔

اس روز موسم بہت اچھا تھا۔ ثانیہ چھت پر بیٹھی مسلسل زائر کے بارے میں سوچے جارہی تھی۔ جب سائرہ اس کے لیے دودھ کا گلاس لیے کر وہیں چلی آئی۔ شام میں دودھ دوھنا اور پھر سب گھر والوں کو تقسیم کرنا اسی کی ذمہ داری تھی۔ ثانیہ نے قدموں کی چاپ پر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"یہ لو دودھ خالہ نیچے بلا رہی ہیں تمہیں۔" اس کے دیکھنے تک وہ قریب آ چکی تھی۔ ثانیہ نے رخ پھیرلیا۔

"نہیں..... آج دل نہیں چاہ رہا۔"

"دل نہیں چاہ رہا تھا تو سر شام ہی منع کر دیتیں۔ اب اس میں چینی مکس ہوگئی ہے کہاں سنبھال کر رکھوں بتاؤ؟" وہ فوراً ہی بے حد تلخ ہوگئی تھی۔ ثانیہ نے جھگڑے سے بچنے کے لیے گلاس تھام لیا۔

"ٹھیک ہے میں پی لوں گی۔ اماں سے کہہ دو ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے گلاس لے آنا ساتھ۔" لٹھ مار لہجے میں کہتی وہ واپس پلٹ گئی تھی ثانیہ کتنی ہی دیر گلاس تھامے وہیں بیٹھی رہی۔ اسی دوران اس نے تین چار گھونٹ دودھ کے بھرے تھے۔ وہ ابھی سیڑھیوں پر تھی کہ اس کا سر چکرانا شروع ہوگیا۔ دودھ کا آدھا بھرا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

سامنے کا منظر بھی دھندلانے لگا۔ مزید سیڑھیاں کراس کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہ رہا تھا۔ عین اسی لمحے کرم داد نے دروازے پر دستک دی تھی جبکہ اماں جو کمرے میں بیٹھی ابھی نماز سے فارغ ہوئی تھیں۔ دھڑام سے کچھ گرنے کی آواز پر فوراً باہر کی طرف لپکی ثانیہ درد سے بے حال اپنا پیٹ پکڑے سیڑھیوں پر گری پڑی تھی۔ ان کے پاؤں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔

زائر اس وقت شاپنگ کر رہا تھا جب اسے کرم داد کا فون گیا۔ وہ اماں کے ساتھ ثانیہ کی حالت غیر ہونے پر اسے شہر لے کر آ رہا تھا۔ زائر ہکا بکا رہ گیا۔ ابھی کل ہی تو وہ گھر سے آیا تھا تب تک وہ ٹھیک تھی۔ پھر ایک ہی دن میں ایسا کیا ہوگیا تھا؟

بچے اس کے ساتھ تھے اس نے فوراً انہیں ہوسٹل واپس چھوڑا اور بائیک مطلوبہ اسپتال کی طرف دوڑا دی۔ جس وقت کرم داد اماں اور ثانیہ کے ساتھ اسپتال پہنچا اس کا رنگ خطرناک حد تک زرد پڑ چکا تھا۔ راستے میں دو بار قے بھی ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود اسے دیکھ کر زائر کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ ایمرجنسی وارڈ میں فوری ایڈمٹ کرنے کے باوجود ڈاکٹرز کچھ بھی کہنے سے قاصر تھے۔ فوراً سے پیشتر اس کا معدہ واش کیا گیا تھا مگر اب بھی اس کی حالت تسلی بخش نہیں تھی۔ زائر کو لگا جیسے کسی نے اس کے بدن سے جان کھینچ لی ہو لاکھ بے وفائیوں اور عداوتوں کے باوجود وہ لڑکی اس کی زندگی تھی اور اب تو اماں کی زبانی اس کی ساری کہانی سن کر وہ اس کی طرف سے اپنا دل بھی کسی حد تک صاف کر چکا تھا۔ پھر ایک دم سے اچانک یہ کیا ہوگیا تھا؟

ثانیہ کی رپورٹ آ چکی تھی زائر فوراً ڈاکٹر کی طرف لپکا۔

"ڈاکٹر صاحب اب کیسی حالت ہے ثانیہ کی؟"

"ابھی بے ہوش ہے جب تک وہ ہوش میں نہیں آ جاتیں ان کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔"

"لیکن ہوا کیا ہے ابھی کل تک تو وہ بالکل ٹھیک تھی۔"

"جی ہاں کل تک ٹھیک تھا مگر ابھی کچھ گھنٹے قبل انہیں زہر دیا گیا ہے اسی کی وجہ سے ان کی حالت خطرناک صورت حال سے دوچار ہے۔ آپ دعا کریں انہیں جلد از جلد ہوش آ جائے۔ نہیں تو کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوگا۔" خالص پیشہ وارانہ انداز میں ڈاکٹر نے کہا تھا اور پھر آگے بڑھ گیا تھا۔ زائر بت بنا جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ قریب کھڑی اماں اور کرم داد بھی ہکا بکا رہ گئے تھے۔

"میں ابھی آتا ہوں اماں آپ پلیز ثانیہ کا خیال رکھیے گا۔" اگلے ہی پل کچھ سوچتے ہوئے اس نے اماں سے کہا اور پھر کرم داد کے پکارنے کے باوجود تیزی سے وہاں سے نکل آیا۔ تقریباً چالیس منٹ کے بعد جس وقت وہ گھر پہنچا سائرہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔ اس کے لبوں پر اس لمحے ایک عجیب سی پرسکون مسکراہٹ تھی۔ زائر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"ارے تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ ثانیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ماسی اسے لے کر شہر گئی ہے بتایا نہیں تمہیں کسی نے؟"

"چٹاخ۔" ابھی وہ بات پوری بھی نہ کر سکی تھی کہ زائر کے زوردار تھپڑ نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے۔

"کیوں زہر دیا تم نے ثانیہ کو بولو؟" وہ اس کے دراز بالوں کو مٹھیوں میں جکڑے دہاڑ رہا تھا۔ سائرہ بلبلا کر رہ گئی۔

"بال چھوڑو میرے۔"

"چٹاخ۔" بجائے بال چھوڑنے کے اس نے اسے ایک اور تھپڑ رسید کر دیا تھا۔

"کیا سمجھتی ہو تم میں مرنے دوں گا اسے آسانی سے..... اسے..... جو میری زندگی ہے میرے بچوں کی ماں ہے..... تمہیں کیوں نہ ماردوں میں اس کے بدلے میں تاکہ سارا قصہ ہی پاک ہو جائے۔" قہر کی علامت بنا وہ نہایت نفرت آمیز لہجے

میں کہہ رہا تھا۔ سائرہ کی جان پر آ گئی۔

"چھوڑو مجھے۔"

"یار کر چھوڑوں گا اتنی آسانی سے چھوڑ دیا تو ہلکائے کتے کی طرح پھر کسی کو کاٹ کر مار ڈالو گی تم۔" قطعی جنونی انداز میں اب وہ اس کا گلا دبا رہا تھا۔ سائرہ کے ہاتھ پیر سرد پڑ گئے۔ وہ تو سمجھی تھی ثانیہ کو راستے سے ہٹا کر وہ زائر کو پالے گی مگر یہ زائر..... تو اس کا زائر رہا ہی نہیں تھا۔ یہ تو صرف ثانیہ عباس کا ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ضد کی پکی تھی مگر..... اس کی تقدیر نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

ایک لمحہ لگا تھا اسے شکست تسلیم کرنے میں اور اس نے چپ چاپ خود کو زائر ملک کے سپرد کر دیا۔ محبت کی حویلی جو صرف اس کی ملکیت تھی اس نے خود اسے غیر آباد کر کے وہاں کسی اور کو بسنے کا موقع دیا تھا تو پھر اب گلہ کس سے کرتی؟ زائر نے اس کی حالت بگڑنے پہلے سے حقارت سے پرے پھینک دیا تھا۔

"یاد رکھنا سائرہ افضل اگر میری ثانی کو کچھ ہوا تو اس سے پہلے خود اپنے ہاتھوں سے تمہیں زندہ زمین میں گاڑ دوں گا اور یہ محض دھمکی نہ سمجھنا۔" جتنی حقارت اس کے لہجے میں تھی اس سے کہیں زیادہ حقارت اس کی آنکھوں میں تھی۔ سائرہ افضل نے پہلی بار خود کو مٹی ہوتے دیکھا تھا۔

❀.....❀.....❀
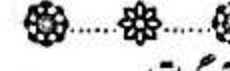
ثانیہ عباس کو ہوش آ گیا تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو اس کے دونوں بچے دائیں بائیں اس کے پاس بیٹھے تھے۔ جبکہ زائر عجیب دیوانوں سے حال میں دونوں بازو سینے پر باندھے قریب کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس نے زبردستی اماں کو کرم داد کے ساتھ گاؤں واپس بھیجا تھا۔ کیونکہ وہاں سائرہ کے ساتھ ساتھ اس کا بوڑھا بیمار باپ تھا جسے دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔

چاندنی کی نظر اس کی کھلی آنکھوں پر پڑی تو اس نے فوراً جھک کر اس کا گال چوم لیا۔

"اٹھیے نا مما، پاپا کہتے ہیں اچھے بچے اتنی دیر تک نہیں سوتے۔" اس کی نصیحت پر گڑیا نے بھی جھک کر ماں کا گال چوما تھا۔

"جی مما اور آپ کو پتا ہے پاپا کب سے رو رہے ہیں۔ کھانا بھی نہیں کھایا انہوں نے۔" گڑیا کو باپ کی فکر تھی ثانیہ نے اس کی اطلاع پر نظر اوپر کی تو زائر اس کے سرہانے کھڑا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ خوب صورت آنکھوں کے گوشوں میں چھلکتی نمی اس سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔ اس نے آہستہ سے پلکیں موند لیں۔

"ثانیہ۔" اگلے ہی پل وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے پکار رہا تھا۔ ثانیہ کی بند پلکوں سے آنسو ٹوٹ کر گالوں پر پھسل آئے۔

"ایم سوری پلیز۔" اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ ذرا سا جھکا تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔

"سوری کس لیے؟" مدت کے بعد اس کی قربت پر وہ قدرے کنفیوژ ہوئی تھی جب وہ بولا۔

"ہر اس تکلیف کے لیے جو میری وجہ سے تم نے برداشت کی۔"

"نہیں میں آپ کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کروں گی۔"

"کیوں؟" وہ قدرے مزید جھک گیا تھا۔ ثانیہ بچوں کی موجودگی کی وجہ سے گھبرا گئی۔

"بعد میں بتاؤں گی۔" اور اس کی گھبراہٹ پر وہ ہنسا تھا۔

تین روز کے بعد اسپتال سے ڈسچارج کروا کر وہ اسے شہر والے بنگلے میں لے آیا تھا۔ ثانیہ گاڑی سے اتری تو حیران رہ گئی۔

"یہ..... یہ کیا ہے؟"

"سرپرائز.....!" وہ مسکرا رہا تھا۔

"مطلب؟" وہ الجھی تھی۔ تبھی زائر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تمہیں گاؤں کے ماحول سے الجھن ہوتی ہے نا اسی لیے میں نے شہر میں یہ گھر تمہارے لیے بنایا ہے تاکہ تمہیں اور بچوں کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔" بظاہر دیہات کے ماحول میں پرورش پانے والا وہ شخص اپنے قد میں کتنا بڑا تھا۔ یہ ثانیہ عباس نے اس وقت جانا تھا۔ بچے ان کے ساتھ نہیں تھے تبھی وہ پلٹی تھی اور اس نے پورے استحقاق سے اس کا گال چوم لیا تھا۔

"غلط..... مجھے کبھی بھی گاؤں کے ماحول سے الجھن نہیں رہی۔ بس آپ سے الگ ہونے کے بعد دانستہ میں اس ماحول سے بھاگتی تھی کیونکہ میرا دل میرے قابو میں نہیں تھا۔ کوئی آتش فشاں سا تھا جو ہر لمحہ میرے اندر پھٹنے کو تیار رہتا تھا۔ اسی آتش فشاں کے زیر اثر میں نے صرف آپ کو دکھانے کے لیے اشعر حسین سے شادی رچانا چاہی تھی۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے زائر میں نے کتنا کرب جھیلا ہے، جس روز مما نے بتایا کہ آپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اس روز میں اتنا روئی کہ اسپتال کے در و دیوار بھی ہل کر رہ گئے تھے میرا بس نہ چلتا تھا کہ میں آپ کی جان لے لیتی۔ خیر مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے۔ اسی دس مرلے کے خوب صورت کشادہ گھر میں جہاں ہر چیز خالص ملتی ہے۔ پچھلے پانچ سالوں میں اس ماحول کو ترس کر رہ گئی ہوں میں یہ محل نما یہ

سی یہ اسٹائلش کچن باتھ ان کی خوب صورتی اس گھر کی کچی چار دیواری رسوئی اور غسل خانے کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ جانتے ہیں کیوں؟ کیونکہ اس گھر میں میرا زائر رہتا ہے۔ جس کے دل پر میری حکمرانی ہے۔ جس کے جذبے جس کے خواب صرف میری ملکیت ہیں اور میں نے بہت دیر سے یہ جانا ہے زائر اس دنیا میں وہی عورت معتبر ہے جسے ایک خالص احساسات والا مرد سچا پیار کرتا ہے۔" عورت کا اظہار محبت کتنا خوب صورت ہوتا ہے یہ زائر نے اس روز جانا تھا۔ تبھی ایک دلفریب سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھولیا۔

"پاگل لڑکی پہلے یہ اظہار نہیں کرسکتی تھیں خوامخواہ اتنا خرچہ کروادیا۔"

"ہاہاہا۔" وہ ہنسی تھی اور زائر کو لگا جیسے کائنات میں رنگ ہی رنگ بکھر گئے ہوں۔ اماں نے بتایا تھا ان کی گاؤں واپسی سے قبل ہی سائرہ گھر چھوڑ کر کہیں نکل گئی۔ شاید اس میں ثانیہ اور زائر کا دوبارہ سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

زائر نے سنا تھا اور گہری سانس بھر کر رہ گیا تھا۔

اگلی صبح ثانیہ کی خواہش پر وہ اسے لے کر گاؤں کے لیے نکل آیا۔ ہلکی ہلکی برسات میں ثانیہ کے ساتھ نے اس کے اندر خوشیوں کے پھول کھلا دیے تھے۔ ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو اس نے ابھی تک صاف کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی جب وہ گنگنایا۔

"دو پتر چناراں دے
ساڈا دکھ کن سن کے رونڈے پتھر پہاڑاں دے"

عادت سے مجبور ڈرائیو کرتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تبھی ثانیہ نے اس کے مضبوط کندھے پر ہلکا سا مکا رسید کیا۔

"اب بھی؟"

وہ ہنسا تھا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا تھا۔ ثانیہ نے اپنے دونوں بازو اس کے بازو میں ڈال کر اپنا سر اس کے مضبوط کندھے پر ٹکا دیا تھا۔ بے شک ہجر کی لمبی مسافت کے بعد محبت کے سایہ دار درخت تلے آرام کرنا اس کا حق تھا۔

❀......❀......❀

حورعین کئی روز کے بعد آج ہی آفس آئی تھی۔

اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ مگر آفس آنا بھی بے حد ضروری تھا۔ بہت سی اہم میٹنگز تھیں جن میں اس کی شرکت بے حد ضروری تھی۔ وہ ابھی ایک میٹنگ سے فارغ ہو کر دوسری میٹنگ کے لیے تیاری کر رہی تھی۔ جب اس کی سیکرٹری نے اسے عمیر نامی وزیٹر کا بتادیا۔ سیکرٹری کی اطلاع پر اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"ٹھیک ہے آنے دیں۔" بنا میٹنگ کو کوئی اہمیت دیے اس نے فوری حکم جاری کیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں عمیر ہمدانی اس کے مقابل بیٹھا تھا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام کیسے ہو عمیر؟"

"آپ کو کیسا نظر آرہا ہوں۔" اس کے خلوص پر ایک تلخ مسکراہٹ عمیر ہمدانی کے لبوں پر بکھری تھی۔ وہ بے ساختہ نظریں چرا گئی۔

"میں جانتی ہوں تم مجھ سے ناراض ہو مگر......!"

"میں آپ سے ناراض نہیں ہوں نہ ہی میرے لیے آپ اتنی اہمیت رکھتی ہیں کہ آپ سے ناراض ہوا جائے۔" بنا اس کی پوری بات سنے بے حد تلخ لہجے میں اس نے کہا تھا۔ حورعین حیران سی اسے دیکھتی رہی۔

"میں یہاں اس وقت آپ سے کوئی گلہ شکوہ کرنے نہیں آیا ہوں۔ صرف اتنا بتانے آیا ہوں کہ چھکو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا کہ انسانوں کے مکر و فریب کو سمجھ سکے۔ سارا گھر اس کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ مگر اس کی حالت بہتر نہیں ہو رہی۔ وہ صرف آپ کو پکار رہا ہے۔ انسانیت کے ناتے اگر اپنی مصروفیات ترک کرکے تھوڑا سا ٹائم اسے دے سکیں تو ہم سب آپ کے بے حد شکر گزار ہوں گے کیونکہ زبی میں ہم سب کی جان ہے۔ جتنا وقت آپ اسے دیں گی ہم آپ کو آپ کے اس قیمتی وقت کی پے منٹ کریں گے۔ یہ لیں بینک چیک جتنی رقم چاہیں آپ اپنی مرضی سے بھر سکتی ہیں۔" ترش لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی اس نے جیب سے چیک نکال کر حورعین کے سامنے رکھ دیا تھا حورعین کو لگا جیسے اس نے اس کے چہرے پر جم کر طمانچہ رسید کیا ہو۔ اہانت کے شدید احساس نے اس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتے ہوئے وہ گلوگیر لہجے میں بولی تھی۔

"کہاں ہے زبی؟"

"اسپتال۔"

"ٹھیک ہے میں ابھی چلتی ہوں۔" فوری فیصلہ کرتے ہوئے اس نے انٹر کام پر اپنی سیکریٹری کو چند ضروری ہدایات دی تھیں پھر عمیر کے ساتھ آفس سے نکل آئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد جس وقت عمیر کی ہمراہی میں اس نے زبیر کے کمرے میں قدم رکھا وہاں سمیر نمیر عذیر بھی موجود تھے۔ عذیر اس کے اوپر جھکا اس کا بخار چیک کر رہا تھا جب قدموں کی آہٹ پر اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا اور پھر حورعین پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔ سمیر اور نمیر کے چہروں پر ایک پل میں جیسے رونق آئی تھی۔ سبھی پریشان تھے مگر عذیر کی آنکھوں کے گوشوں کی ہلکی سی نمی نے اسے بے چین کردیا تھا۔

حیران حیران سی نگاہیں حورعین کے چہرے سے ہوکر عمیر کی طرف اٹھی تھیں۔ مگر وہ فوری نظریں چرا گیا تھا۔ حورعین قدرے نروس ہوتی فوراً زبیر کے بستر کی طرف بڑھ آئی۔

کتنے دن ہوگئے تھے اسے اس ننھے سے وجود کو مس کرتے ہوئے کتنی راتیں تڑپ کر جاگتے ہوئے گزاری تھیں مگر...... اس کے دل کا حال سوائے خدا کے اور کون جانتا تھا۔ اگلے ہی پل زبیر کے بیڈ پر اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے وہ بے ساختہ رو پڑی تھی۔ عذیر نے تنفر سے منہ پھیر لیا۔ دادی اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہٰذا سمیر اور نمیر گھر کے لیے نکل گئے تھے۔ عذیر عمیر کو زبیر کا خیال رکھنے کی تلقین کرتا خود بھی وہاں سے نکل آیا۔

رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا ٹائم تھا جب اس کی دوبارہ اسپتال واپسی ہوئی تھی۔ زبیر کے کمرے میں حورعین بالکل کسی ماں کی طرح اسے اپنی گرم آغوش میں لیے بیڈ پر بیٹھی سوگئی تھی۔ زبیر کے چہرے پر اگر زردی اور نقاہت تھی تو ویسی ہی زردی اور نقاہت حورعین عبدالسمیع کے چہرے پر بھی تھی۔ فقط چند ہی دنوں میں اس کی آنکھوں کے تلے بھی حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کے گھر سے دور رہ کر وہ لڑکی بھی کب خوش رہ پائی تھی۔

عذیر زبیر کی دوائیاں چیک کرنے کے دوران کتنی ہی دیر بے مقصد سا اسے دیکھے گیا۔ بے شک وہ لڑکی حسن اور جاہت میں اپنی مثال آپ تھی۔ جانے یہ بہترین ٹریٹمنٹ کا اثر تھا یا حورعین کی آغوش کے لمس کا اثر تھا کہ اگلے ہی روز صبح صبح زبیر کا بخار ٹوٹ گیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ عذیر جو بیڈ سے ملحقہ کرسی پر ہی بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا زبیر کی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی جو حورعین کی گود میں لیٹا تھا اور حورعین اس کے چہرے پر جھکی اسے پیار کر رہی تھی۔ اتنا مکمل اور خوب صورت منظر تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود نظر نہیں ہٹا سکا تھا۔

"زبی کی طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے۔ میں یہاں اس کے پاس ہوں آپ گھر جاکر آرام کرلیں پلیز۔" کچھ لمحوں کے بعد اس نے کہا تھا۔ حورعین نے چونک کر اسے دیکھا پھر نظریں جھکالیں۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں آپ چاہیں تو گھر جاسکتے ہیں۔"

"مگر میں آپ کو مزید تکلیف نہیں دینا چاہتا۔"

"میں تکلیف میں نہیں ہوں یو ڈونٹ وری۔" اسی کے لہجے میں اسے جواب دینے کے بعد وہ پھر سے زبیر کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ جو اسے اپنے پاس پاکر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ عذیر لب بھینچتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوکے نمیر یا عمیر میں سے کوئی بھی آجائے گا پھر چلی جائیے گا آپ۔" وہ اسے حکم دے رہا تھا مگر حورعین نے سنی ان سنی کا مظاہرہ کرکے اثبات میں سر ہلا دیا۔ عذیر باہر گاڑی میں آکر بیٹھا تو بے حد تھکن محسوس ہو رہی تھی۔

اگر وہ اور اس کے گھر والے حورعین عبدالسمیع کے بغیر خوش نہیں تھے تو شاید وہ بھی ان کے بغیر خوش نہیں تھی تو پھر...... اس نے انہیں چھوڑنے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟

اتنی ساری محبتوں کو ٹھکرا کر بے رخی سے چلے جانے کی کوئی وجہ تو تھی مگر کیا؟ وہ چاہتی تو ساری زندگی سکون و عافیت کے ساتھ ان کے ساتھ رہ سکتی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا کیوں؟ کیا واقعی دولت وہ وجہ تھی جس کے باعث وہ انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی؟

وہ یقین کرنا چاہتا تھا مگر جانے کیوں اس کا دل یہ تاویل ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ دولت پر مرمٹنے والی لڑکی نہیں تھی۔ تو پھر اس نے یہ سب کیوں کیا تھا۔ جتنا وہ سوچتا جاتا تھا الجھتا جاتا تھا۔ تقریباً چالیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ گھر پہنچا تو عمیر ناشتا لے کر اسپتال کے لیے نکل چکا تھا۔ جبکہ نمیر دادی اماں کے پاس بیٹھا ان کو سوپ پلا رہا تھا۔ وہ سیدھا وہیں چلا آیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے دادو؟"

"ٹھیک ہوں۔" حورعین کے جانے کے بعد وہ بہت چپ ہوکر رہ گئی تھیں۔ بیمار بھی رہنے لگی تھیں۔ عذیر نمیر کو دوا کھلانے کی ہدایت کرتا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ سارا بدن تھکن سے ٹوٹ رہا تھا۔ تبھی پہلے اس نے ٹھنڈے پانی سے شاور لیا پھر کچن میں چلا آیا۔ اپنے لیے ایک کپ گرما گرم چائے بنائی اور بستر میں گھس گیا۔ سنڈے کی چھٹی کے باعث آفس جانے کی پریشانی بھی نہیں تھی۔

دوپہر کو تقریباً ایک بجے اس کی دوبارہ آنکھ کھلی تو سمیر اور نمیر کا زبردست جھگڑا ہو رہا تھا۔ سمیر کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اسے جاب پر واپس جانا تھا۔ وہ اسی کی تیاری میں تھا مگر نمیر کا کہنا تھا کہ

اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لہٰذا عمیر اس کا ہاتھ بٹا کر جائے۔ کچن ڈھیروں گندے برتنوں سے اٹا پڑا تھا۔ کیونکہ پچھلے تین چار روز سے انہوں نے برتن دھونے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ یہی حال کپڑوں اور گھر کی صفائی کا بھی تھا۔

اس سے پہلے کہ ان کا جھگڑا مار پیٹ کی شکل اختیار کرتا عذیر نے بستر چھوڑ دیا۔ سمیر ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتا گھر سے نکل چکا تھا۔ عذیر نے نمیر کو بھی کچن سے نکال دیا۔ واقعی حورعین عبدالسمیع نے ان کی عادتیں بہت بگاڑ دی تھیں۔

شرٹ کے بازو فولڈ کرکے سب سے پہلے اس نے گندے برتنوں کا ڈھیر صاف کیا۔ پھر کپڑوں کی طرف آ گیا۔ سمیر، نمیر اور عمیر سمیت اس کا بھی ایک جوڑا ایسا نہیں رہا تھا جسے پہن کر وہ آفس جا سکتا۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ لوگ اپنے کپڑے دھوبی سے دھلوا رہے تھے مگر کب تک؟

پیٹ میں بھوک لگی تھی کیونکہ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اس نے سوائے ایک کپ چائے کے دوسری کوئی چیز حلق میں نہیں اتاری تھی۔ تاہم بھوک کو پس پشت ڈال کر اس نے مشین لگائی اور اکیلا ہی میلے کپڑوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرتا رہا' شام چار بجے اس کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

عمیر اسپتال سے آیا تو آٹا گوندھ چکا تھا اور اب سالن بنانے کے لیے پیاز کاٹ رہا تھا۔ پینٹ کے پائنچے کافی اوپر تک بھیگے ہوئے تھے جب کہ اسے زکام بھی ہو رہا تھا' عمیر نے آتے ہی روٹی بنائی' دادی ماں کو کھچڑی بنا کر دی اور عذیر کے دھلے ہوئے کپڑوں کو پریس کرنے بیٹھ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک کھانا تیار ہوا تو دونوں بھائی ڈائننگ ٹیبل پر آ گئے' نمیر کی آنکھ بھی کھل چکی تھی۔ تینوں نے مل کر کھانا کھایا پھر عذیر کھانا نکال کر خود اسپتال کے لیے نکل آیا اور عمیر کو آرام کی تلقین کی۔

سمیر گھر واپس آیا تو عمیر سو رہا تھا' جب کہ نمیر دادی ماں کو دوا کھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک نظر ان دونوں پر ڈال کر کچن میں چلا آیا' بھوک کا احساس خوب زوروں پر تھا مگر ہاٹ پاٹ میں صرف ایک ہی روٹی بچی ہوئی پڑی تھی وہ بھی جلی ہوئی۔ اسے غصہ تو بہت آیا مگر پھر صبر شکر کرکے وہی روٹی پیٹ میں اتار لی وہاں کون سی ماں یا بیوی تھی جو نیند سے اٹھ کر تازہ روٹی بنا کر دیتی جب کہ باہر سے کھانا کھانے کی ان بھائیوں میں کسی کو بھی عادت نہیں تھی۔

عذیر کھانا لے کر اسپتال پہنچا تو حورعین زبیر کے بیڈ پر اس کے پہلو میں ہی مزے سے سو رہی تھی۔

فضا میں خنکی کافی بڑھ گئی تھی' زبیر گرم کمبل میں دبکا سو رہا تھا مگر حورعین کے پاس سوائے دوپٹے کے اور کوئی چیز نہیں تھی' تبھی کھلی کھڑکی سے اندر آتے ہوا کے سرد جھونکوں نے اسے خاصا کپکپا رکھا تھا۔ عذیر نے آگے بڑھ کر کھانا بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے' پچھلے چوبیس گھنٹوں سے وہ لڑکی اپنی ہر مصروفیت کو پس پشت ڈالے وہاں زبیر کے ساتھ تھی اور اس دورانیے میں ایک مرتبہ بھی اس نے گھر جا کر آرام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

کتنی ہی دیر وہ اسے یک ٹک دیکھتا رہا تھا پھر اچانک ہی آگے بڑھ کر اس نے اپنا گرم کوٹ اس کے اوپر ڈال دیا۔ اگلے روز اس نے آفس سے چھٹی کی تھی۔

دادو کا چیک اپ کروانے کے ساتھ ساتھ اسے بازار سے گھر کے لیے سودا سلف بھی لانا تھا کہ یہ اسی کی ذمہ داری تھی۔ ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر اس نے گھر کی صفائی شروع کر دی' وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگ پل پل حورعین کو یاد کریں اور آپس میں لڑتے رہیں شام تک تھکن سے چور وہ اپنے کمرے میں آیا تو جسم کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا' پتا نہیں حورعین یہ سب کام اتنی آسانی سے کیسے کر لیتی تھی۔ شاور لے کر اپنے لیے چائے بنانے کے بعد وہ بستر پر آیا تو نظر نیلے کور والی اس خوب صورت ڈائری پر جا پڑی جو آج صفائی کے دوران اسی کے کمرے سے برآمد ہوئی تھی' تبھی وہ اسے گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ حورعین عبدالسمیع کی اب تک گزری ہوئی زندگی کے تمام لمحات لفظوں میں قید ہو کر اس کے سامنے تھے اب تک جو جو صعوبتیں اس نے برداشت کی تھیں' ابوغریب جیل میں جس طرح سے اس کی عزت کی دھجیاں اڑائی گئیں' ایاد عبدالہادی نے جس طرح اس کا ساتھ دیا سب درج تھا۔ ازحد اذیت کی گرفت میں اس نے لکھا تھا۔

"میں نے زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے ایسی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں گی' وطن سے محبت کی اتنی کڑی قیمت چکانی پڑے گی' میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ زمانہ طالب علمی میں جب بھی کہیں کوئی ملی نغمہ سنتی' میری رگوں میں پاکستانی خون جوش مارنے لگتا تھا' میرا دل چاہتا تھا میں پاکستان کی طرف اٹھنے والی ہر میلی نگاہ کو پاؤں تلے کچل کر پھینک دوں' کوئی نہیں سمجھ سکتا پاکستان میرے لیے کیا ہے' اس وقت تو ویسے بھی میرا جنون تھا پاکستان مگر اس جنون کی بہت کڑی قیمت چکائی ہے میں نے اور اب...... اپنی عزت کی دولت لٹانے کے بعد جانے

کیوں میرے حوصلے دم توڑ گئے ہیں اس ملک کی عوام کی قیمت میں گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کر مرنا لکھ دیا گیا ہے بھیس بدل بدل کر مختلف مداریوں کے اشاروں پر ناچنا لکھ دیا گیا ہے' یہ فرانس نہیں ہے جسے کوئی ڈیگال آ کر سنوار دے۔ یہاں کوئی تاریخ رقم نہیں ہو سکتی' بندھے ہوئے مقروض ذہنوں کے مالک یہ لوگ کوئی انقلاب نہیں لا سکتے' اتحاد ایمان اور یقین کا سکہ یہاں چلنے والا نہیں ہے۔ اس پاک وطن کا یہی مستقبل ہے کہ یہاں تاریکیاں چھائی رہیں' زلزلے آتے رہیں' ڈیموں کے بند ٹوٹ ٹوٹ کر لاکھوں پاکستانی شہریوں کو لقمہ اجل بناتے رہیں' مختلف فرقوں اور مسلکوں کی آگ جلا کر انہیں راکھ کرتی رہے' یہاں ان کے اپنے نہیں غیر حکومت کریں' جیل کی اونچی چار دیواروں میں انمول ہیرے چپ کی بکل مارے خاک کے سپرد ہوتے رہیں' یہاں کوئی نظام کبھی تبدیل نہیں ہوگا بس مجھ جیسے دیوانے منٹو کے مرکزی کردار منگو کی طرح تبدیلی کی حسرت لیے جل جل کر ختم ہوتے رہیں گے' بہرحال میں جانتی ہوں آج کے بعد آپ میری شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کریں گے پھر بھی میرا دل کٹ رہا ہے' جانے کیوں اس گھر کے در و دیوار سے عجیب سی انسیت ہو گئی ہے۔ میں جانتی ہوں جو کچھ میرے ساتھ ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ بہت اچھے ہیں' بہت شفاف کردار کے مالک آپ کی ہم سفر بھی ایسی ہی کوئی شفاف لڑکی ہونی چاہیے مجھ جیسی داغ دار لڑکی آپ کے قابل نہیں ہے۔ ہو سکے تو مجھے میری ناکردہ خطاؤں کے لیے معاف کر دیجیے گا احسان مند ہوں گی۔" ایک ایک لفظ عذیر ہمدانی پر سوچ کے نئے در وا کرتے ہوئے گزرا تھا۔

تھکے تھکے سے انداز میں گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے آہستہ سے پلکیں موندیں۔ تو یہ وجہ تھی' جس کے سبب اس لڑکی نے اس کا گھر چھوڑا تھا؟ الجھن کو سرا مل گیا تھا مگر اندر ایک اور جنگ چھڑ گئی تھی کیا اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ ایک داغ دار لڑکی کو اپنی ہم سفر کے طور پر ہمیشہ کے لیے قبول کرتا؟ شاید نہیں......

❁......❁......❁

بارش ہو رہی تھی۔

وہ بیرونی دروازہ اچھی طرح بند کرنے کے بعد لاؤنج میں آ بیٹھی' بہت دنوں کے بعد آج پھر آسمان بارش کے سرد قطروں کی صورت اپنی قیمتی متاع لٹا رہا تھا۔ گرما گرم کافی کا مگ ہاتھ میں لیے وہ دونوں پاؤں صوفے پر رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ فضا میں ٹھنڈک کا احساس تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا' وقت نے کتنا اکیلا کر دیا تھا اسے؟

حورعین عبدالسمیع جو کبھی محفلوں کی جان ہوا کرتی تھی' آج تنہائی کی گود میں کیسے مٹی کی مورت بن کر رہ گئی تھی؟ کتنا بدل دیا تھا وقت نے اسے؟

ثانیہ عباس اور ہانیہ صفدر سے اس کا رابطہ بھی کب کا ختم ہو چکا تھا' بھری دنیا میں کہیں کوئی بھی تو نہیں تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتی۔ قبرستان گئے بھی کتنے دن ہو گئے تھے' جب سے وہ اسپتال سے واپس آئی تھی اداسی اور بے چینی مزید بڑھ گئی تھی' دو ماہ ہونے کو آئے تھے مگر وہاں سے دوبارہ کسی نے اس کے ساتھ رابطہ نہیں کیا تھا۔

حورعین نے سوچ لیا تھا وہ پاکستان میں نہیں رہے گی' اسی لیے آج کل وہ اپنا بزنس وائنڈ اپ کرنے کا سوچ رہی تھی۔ رات کی تاریکی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی مگر نیند کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

کافی کا کپ خالی کرکے وہ ابھی کچن میں رکھنے جا رہی تھی جب دروازہ پر دستک نے اسے چونکا دیا' بھلا اتنی رات کو کون آ سکتا ہے؟ پریشان سی وہ دروازے تک آئی تھی۔

"کون......؟"

"دروازہ کھولیں بھابی' میں ہوں سمیر۔"

"سمیر......" زیر لب دہراتے ہوئے اس نے دروازہ کھول دیا تھا' سامنے وہ بارش میں بھیگا کھڑا تھا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام خیریت۔"

"نہیں بھابی خیریت نہیں ہے' دادو کو فالج کا اٹیک ہوا ہے' ہم سے سنبھالی نہیں جا رہیں' عذیر بھائی ملک سے باہر ہیں میں خود بھی کل ہی گھر واپس آیا ہوں اگر آپ کو کوئی مسئلہ نہ ہو تو پلیز ابھی میرے ساتھ چلیے' سب بہت پریشان ہیں۔" پریشانی اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی' وہ لڑبڑا گئی۔

"اس وقت؟ اچھا آپ اندر آئیں۔"

"نہیں بھابی! اتنا ٹائم نہیں ہے' دادو ابھی اسپتال میں ہی ہیں' پلیز۔"

"اچھا میں چلتی ہوں۔" اسے سوچنے سمجھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور وہ سمیر کے ساتھ چل پڑی تھی' دادو کو واقعی فالج کا اٹیک ہوا تھا مگر اس وقت ان کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ حورعین نے رات بھر ان کا ایسے ہی خیال رکھا جیسے بیٹیاں ماؤں کا رکھتی ہیں۔

صبح اس نے سمیر کو گھر بھیج دیا تو نمیر ناشتہ لے کر آ گیا‘ تقریباً تین روز کے بعد دادو کو گھر شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اس بار وہ بھی ان کے ساتھ ہی گھر آ گئی تھی‘ عذیر کو تاحال کسی بات کی خبر نہیں تھی‘ حورعین نے دیکھا گھر کا پہلے سے بھی بدتر حال ہوا پڑا تھا۔

دادو کے سونے کے بعد وہ ان کے کمرے سے باہر آئی تو زبیر اسکول اور عمیر یونیورسٹی جا چکا تھا۔ نمیر کا جاب کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا لہٰذا ناشتہ بنا کر رکھنے کے بعد وہ بھی گھر سے نکل چکا تھا۔ سمیر البتہ گھر پر تھا اور اپنے کمرے میں پڑا سو رہا تھا۔ حورعین کچن میں آئی تو اس کا حال دیکھ کر اس کا دل متلا اٹھا‘ برتنوں اور چولہے کا حال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ تبھی بنا ناشتہ کیے وہ کچن کی صفائی میں جت گئی تھی‘ ایک کامیاب بزنس مین لڑکی‘ کتنی سلیقہ مند تھی کاش کوئی جان پاتا۔ اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں کچن چمک اٹھا تھا‘ تبھی اپنے لیے چائے کا ایک کپ بنا کر چائے پینے کے بعد وہ عذیر کے کمرے کی طرف آ گئی جس کا حال کچن سے بھی بدتر تھا‘ بیڈ کی چادر جانے کتنے دنوں سے نہیں بدلی گئی تھی۔ عذیر کے استعمال شدہ کپڑوں کا ڈھیر وارڈ روب سے اُنڈ اُنڈ کر باہر آ رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کی ساری چیزیں الٹ پلٹ تھیں‘ قالین بھی نہایت گندا ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کافی دنوں سے وہاں کسی نے صفائی کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ سمیر اور نمیر وغیرہ کے کمروں کا حال بھی عذیر سے کچھ مختلف نہیں تھا تبھی سب سے پہلے اس نے مشین لگائی تھی پھر جھاڑن پکڑ کر ایک ایک کمرے کو خوب صاف کیا‘ عمیر جب تک کالج سے آیا وہ سارا گھر صاف کر کے کپڑے بھی دھو چکی تھی اور اب کچن میں کھڑی ان سب کے لیے کھانا بنا رہی تھی۔ وہ حیران ہی تو رہ گیا تھا۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" کچن میں داخل ہوتے ہی اس نے پوچھا تھا جواب میں حورعین نے گردن موڑ کر ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد دوبارہ توجہ آٹے پر مبذول کر دی جسے وہ گوندھ رہی تھی۔

"وہی جو بشار الاسد شام میں اور مصری فوج مصر میں کر رہی ہے۔"

"مگر یہ آپ کا کام نہیں ہے جو احسان ہم آپ سے لے چکے ہیں وہی کافی ہے۔"

"کوئی بات نہیں جہاں اتنے احسان ہو گئے وہاں ایک اور سہی۔"

"مگر کیوں؟"

"بس...... مجھے عادت ہے احسان کرنے کی۔"

"مگر میں آپ سے مزید کوئی احسان نہیں لینا چاہتا‘ باوجود اس کے کہ میں آپ کی ڈائری پڑھ چکا ہوں۔" وہ قریب آیا تھا‘ حورعین ٹھٹک گئی۔

"وہ ڈائری تمہارے لیے نہیں تھی۔"

"جانتا ہوں میں پڑھنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر اتفاقیہ ہاتھ لگ گئی تو رہ بھی نہیں سکا‘ آپ کیا سمجھتی ہیں وطن کی محبت میں اگر آپ نے انسانیت کے دشمنوں کے ہاتھوں اپنی عزت گنوا دی تو آپ ہمارے لیے محترم نہیں رہیں؟"

"عمیر میں......"

"بس حورعین آپی پلیز...... اپنی صفائی میں مزید ایک لفظ بھی مت کہیے گا پلیز۔" وہ دکھی ہوا تھا حورعین نے لب بھینچ لیے۔

"آپ اس گھر میں صرف عذیر بھیا کی بیوی نہیں ہیں‘ ہماری بہن بھی ہیں وہ بہن جس کے کردار پر کوئی اور فخر کرے نہ کرے مگر میں فخر کرتا ہوں۔ عذیر بھیا اگر آپ کے ساتھ زندگی بسر نہیں بھی کرتے تب بھی آپ ہماری بہن ہیں اور رہیں گی۔ چاہے ایک دمڑی بھی نہ ہو آپ کے پاس۔" وہ جذباتی ہوا تھا‘ حورعین کی آنکھیں پل میں آنسوؤں سے بھر آئیں آگے بڑھ کر اس نے فوراً عمیر کو گلے لگا لیا تھا۔

اگلے کئی دنوں تک وہ عمیر کے ساتھ اس کے اصرار پر قبرستان جاتی رہی تھی پھر مصروفیات کے پیش نظر رفتہ رفتہ اس معمول میں کمی آتی گئی زبیر اب اس کا ایک لمحے کے لیے بھی اعتبار نہیں کرتا تھا۔ صبح اسکول بھی روز وعدہ لے کر جاتا کہ وہ اس کے آنے تک کہیں جائے گی نہیں‘ حورعین کے لیے اب ان محبتوں کے بغیر رہنا بہت مشکل ہو رہا تھا مگر وہ خود کو زبردستی کسی کی زندگی پر مسلط نہیں کر سکتی تھی۔

دادو اس سے بہت خوش تھیں انہیں یقین تھا کہ ضرور عذیر نے حورعین سے کسی جھگڑے کے پیش نظر ان سے اس کے بارے سب جھوٹ کہا تھا‘ سمیر نمیر اور عمیر کی زندگیاں بھی سکون میں آ گئی تھیں۔ حورعین آفس کا ایک چکر لگانے کے باوجود گھر کے کسی کام میں کوتاہی نہیں کرتی تھی‘ نمیر کو بھی اس نے اپنے ہی آفس میں زبردستی جاب دے رہی تھی جس پر وہ بے حد خوش تھا۔ سمیر اپنی آفس کولیگ پر دل ہار بیٹھا تھا مگر دادو سے شیئر کرتے ہوئے شرم محسوس کر رہا تھا‘ کافی سوچنے کے بعد اس نے اپنا مسئلہ حورعین کے سامنے رکھ دیا تھا‘ جس نے ایک ہی ملاقات میں لڑکی اوکے کر کے اس کی منگنی بھی کروا دی تھی۔

عذیر کو ایک ایک پل کی خبر تھی مگر دانستہ وہ گھر سے دور دیار غیر میں انجان بنا بیٹھا تھا۔ کتنے ماہ ہو گئے تھے اسے خود سے لڑتے ہوئے مگر وہ ابھی تک حورعین کے بارے کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ گھر کال کرنے کے دوران بھی وہ اس سے بات نہیں کرتا تھا اب تک جتنے دن بھی اس نے گھر سے باہر بسر کیے تھے ان دنوں میں بہت سی لڑکیوں کو پرکھا اور خود سے قریب کیا تھا‘ ابتداء میں لگتا جیسے اسے ملنے والی لڑکی ہی اس کی منزل ہے مگر جیسے جیسے کچھ وقت گزرتا اسے اس لڑکی میں خامیاں نظر آنے لگتیں اور وہ اکتا کر اسے چھوڑ دیتا۔ دن ہفتوں‘ ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں ڈھلتے گئے تھے مگر وہ واپسی کا فیصلہ نہ کر سکا‘ اسی دوران دادو اس کے بچوں کو گود میں جھلانے کی حسرت دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو گئیں تو اسے مجبوراً پاکستان آنا پڑا۔

دادو کی موت پر اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے گھر میں حورعین کا کردار دیکھا تھا‘ غم کی شدت سے نڈھال ہونے کے باوجود وہ جیسے اپنا فرض ادا کر رہی تھی‘ ہر مہمان کو سنبھال رہی تھی وہ حیران رہ گیا۔

دادو کے چالیسویں کے بعد سمیر نے بیرون ملک جانے کا پروگرام بنا لیا‘ تاہم اس کے سسرال والوں کی خواہش تھی کہ وہ شادی کر کے جائے۔ دادو کے بعد گھر کا ماحول ویسے ہی بہت افسردہ ہو رہا تھا تبھی عذیر نے سمیر کی خوشی کے لیے یہ فریضہ ادا کرنے کی ٹھان لی۔ ساتھ ہی اس کی یہ سوچ بھی تھی کہ سمیر کی دلہن کے گھر آ جانے کے بعد اسے اور اس کے گھر والوں کو حورعین کی زیادہ ضرورت نہیں رہے گی یوں وہ اس کے بارے میں آسانی سے فیصلہ کر لے گا تبھی جٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق سمیر کی دلہن رخصت ہو کر ان کے گھر آ گئی۔

حورعین نے اس موقع پر بھی ان کا پورا پورا ساتھ دیا تھا‘ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود وہ شادی کی شاپنگ سے لے کر دلہن کی رخصتی تک اس گھر کا حصہ بنی رہی تھی۔ عذیر سمیت کسی کو بھی کسی چیز کی فکر نہیں تھی‘ تمام فنکشنز کے لیے جسے جو چیز مطلوب ہوتی وہ اسی سے آ کر مانگتا اور حورعین سب کو فوری وہ چیز مہیا کر دیتی۔

اس روز سمیر کا ولیمہ تھا‘ رات دیر تک جاگ کر وہ ان سب کے کپڑے پریس کرتی رہی تھی‘ ڈھیر سارے مہمانوں کو اکیلے سنبھالنا بھی اس کی ہمت تھی۔ رات تک وہ تھکن سے چور ہو گئی‘ عذیر باہر کے معاملات نپٹا رہا تھا‘ سمیر نے زبردستی اسے کندھوں سے تھام کر عذیر کے کمرے میں بھیج دیا تاکہ وہ تھوڑی دیر آرام کر سکے‘ نمیر اور عمیر کے کمروں سمیت دادو کے کمرے پر بھی مہمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ تبھی مجبوراً وہ عذیر کے کمرے میں آئی تھی اور بیڈ پر گرتے ہی گہری نیند کی دلدل میں اترتی چلی گئی۔

رات تقریباً دو بجے کا ٹائم تھا جب عذیر سارے کام نپٹا کر تھکا ہارا اپنے کمرے میں آیا اور دروازہ لاک کر کے بستر پر ڈھے گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حورعین بھی وہیں سو رہی ہو گی۔ وہ تو جب اس نے کمبل سیٹ کرنا چاہا تو حورعین پر نظر پڑی جو اسی کی طرح تھکن سے بے حال بنا کپڑے تبدیل کیے ایک طرف سمٹ کر سو رہی تھی۔ مٹا مٹا سا میک اپ اس کے پُرنور چہرے پر چاندنیاں بکھیر رہا تھا۔ عذیر کا دل زور سے دھڑک اٹھا‘ پہلی مرتبہ وہ اس کے اس قدر قریب سو رہی تھی اور یہ قرب اس وقت اس کے اندر جیسے اک حشر بپا کر رہا تھا‘ بنا کمبل کے شدید سردی میں سمٹ کر سوئی وہ ہولے ہولے کپکپا رہی تھی جب کہ کمبل اس کے نیچے دبا تھا۔

عذیر کچھ دیر یک ٹک اسے دیکھتا رہا پھر خود بھی کمبل کے بغیر سیدھا لیٹ گیا‘ حورعین کا بازو اس کے کندھے کے ساتھ ٹچ ہو رہا تھا۔ وہ بے خود سا ہو کر اس پر جھک گیا‘ نہایت آہستگی سے اس نے اس کے کانوں سے ایئر رنگز اتارے تھے پھر گلے میں پہنے گولڈ کے سیٹ پر ہاتھ رکھ دیا مگر اس سے پہلے کہ وہ سیٹ اتارتا حورعین نے کروٹ بدل لی اب اس کا پُرنور چہرہ اسی کی طرف تھا سرخ لپ اسٹک سے سجے یاقوتی لب اس کی برداشت ختم کر رہے تھے جانے یہ کیسا طلسم تھا کہ وہ اس کی ساری ہسٹری بھول گیا‘ یاد رہا تو محض اتنا کہ وہ اس کی بیوی ہے تبھی بے خود ہوتے ہوئے اس نے کھینچ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ حورعین اس اچانک افتاد پر ہڑبڑا کر فوراً بیدار ہوئی تھی‘ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اسے عذیر کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا تبھی خود کو اس آہنی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے چیخنا چاہا تھا مگر اس سے پہلے ہی عذیر نے اپنا ہاتھ مضبوطی سے اس کے لبوں پر جما دیا۔

"شش......"

شدید سردی کے باوجود اس کی پیشانی اور چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ وہ بھونچکا ہی تو رہ گئی مگر اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتی عذیر اس کے چہرے پر جھک چکا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر اس لمحے اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی‘ تھکن سے ٹوٹتے ہوئے چور جسم پر عذیر ہمدانی اپنی تھکن انڈیل رہا تھا اور وہ بے بس سی بس اس کی پیاس بجھائے جا رہی

تھی۔ گرم سانسوں کا طوفان جیسے سب کچھ بہا کر لے گیا تھا۔

اگلی صبح جب وہ بیدار ہوا تو حورعین کمرے میں نہیں تھی مگر وہ بے حد فریش تھا۔ تمہارا غیر دانستہ طور پر جو کچھ اس سے سرزد ہوا' اس نے اس کا اضطراب مزید بڑھا دیا تھا۔ کمرے سے نکلا تو پتا چلا کہ حورعین کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہٰذا وہ علی الصبح وہاں سے چلی گئی تھی' سمیر کے کمرے کا دروازہ ہنوز بند تھا۔ زبیر اور نمیر بھی سو رہے تھے' صرف عمیر تھا جو کچن میں کام کر رہا تھا اور اسی نے اسے حورعین کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ گہری سانس فضا کے سپرد کرتا ٹیرس پر چلا آیا مگر ایک بے چینی سی تھی جو اس کے اندر بہت دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔

❀......❀......❀

دو ماہ ہو گئے تھے اسے دوبارہ فرانس آئے مگر دل کی بے کلی تھی کہ دل و جان سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔ سمیر کی شادی کے تیسرے دن وہ فرانس آ گیا تھا کیونکہ اس میں حورعین عبدالسمیع سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ اب زیادہ دن تک اسے اپنے ساتھ باندھ کر نہیں رکھے گا گھر سنبھالنے کے لیے گھر میں ایک اور عورت آ گئی تھی' وہ اب مزید اسے اپنا پابند نہیں رکھ سکتا تھا۔

طلاق کے کاغذات سب تیار ہو گئے تھے' اس شام وہ جیم کر کے آیا تو پاکستان سے عمیر کا خط اس کا منتظر تھا' رات کھانے کے بعد بیڈ پر آ کر اس نے وہ خط کھولا تھا۔

لکھا تھا۔

''میں جانتا ہوں آپ یقیناً میرا خط دیکھ کر حیران ہوں گے مگر بات ہی کچھ ایسی تھی کہ آپ کو خط لکھنا ضروری ہو گیا ہے' حورعین آپی ایبروڈ جا رہی ہیں ان کا خیال ہے کہ اب ہمارے گھر کو ان کی ضرورت نہیں ہے۔ سمیر بھیا کی وائف نے کوشش کی ہے ان کی جگہ لینے کی مگر میں آپ کو بتا رہا ہوں عذیر بھائی! اس گھر میں حورعین آپی کی جگہ کبھی کوئی نہیں لے سکتا۔ میں مانتا ہوں وہ آپ کو قابل قبول نہیں' بہتر سے بہترین لڑکی مل سکتی ہے آپ کو مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ بہتر سے بہترین لڑکی آپ کے گھر کے لیے بھی اتنی ہی بہترین ثابت ہو' حورعین آپی ہر لحاظ سے بہت اچھی ہیں پلیز بھیا انہیں اس گناہ کی سزا مت دیجیے جو ان سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ میری ایک بات یاد رکھیے گا عذیر بھائی آپ کو لڑکیاں بہت مل جائیں گی مگر ڈھونڈنے سے بھی دوسری حورعین عبدالسمیع نہیں ملے گی اس سے پہلے کہ وہ چلی جائیں پلیز انہیں روک لیں' پلیز مخلص آپ کا بھائی عمیر۔'' خط کیا تھا

سوچ کا ایک نیا در تھا' عذیر ساکت سا بیٹھا رہ گیا تھا۔ بے شک فیصلے کی گھڑی آ پہنچی تھی۔

❀......❀......❀

حورعین کی ٹکٹ کنفرم ہو گئی تھی۔

رات زبیر کو سلاتے ہوئے بہت دیر تک وہ روتی رہی تھی' گھر میں کوئی بھی اس کے اندر پیدا ہونے والی تبدیلی کو نہیں جان پایا تھا مگر کچھ روز قبل ہی اپنے تفصیلی چیک اپ کے بعد اس نے جانا تھا کہ عذیر ہمدانی کی ذات کے ساتھ اس کا رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا تھا تاہم وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں کسی کو بھی اس بات کا پتا لگے تبھی اس نے فوری پاکستان سے فرار کا پروگرام بنایا تھا کیونکہ پاکستان میں رہتے ہوئے اس گھر سے دور رہنا اور ان سے کوئی خبر چھپانا اس کے لیے ممکن ہی نہیں رہا تھا۔

رات تھنے زبیر کو سلانے کے بعد اس نے اپنی پیکنگ کی تھی۔ سمیر کی بیوی نے سارا گھر سنبھال لیا تھا اور یہ بات اس کے اطمینان کے لیے کافی تھی سمیر نے زبیر کو بورڈنگ بھجوانے کی تیاری بھی مکمل کر لی تھی۔ نمیر جاب میں مصروف ہو گیا تھا مگر عمیر بہت اداس تھا۔ مصر اور شام میں انسانی بربریت کا دکھ ہی کافی تھا کہ اس پر حورعین نے بھی دیار غیر میں جا کر بسنے کی خبر سنا دی تھی تاہم وہ ڈائریکٹ اسے روکنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد زبیر کو اسکول روانہ کر کے وہ عمیر کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

''عمیر۔''

''جی آپی۔'' وہ جو مطالعے میں مصروف تھا فوراً چونکا تھا۔

''ناشتا نہیں کیا تم نے؟''

''بس دل نہیں چاہ رہا۔'' کتاب بند کر کے وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا تبھی وہ پاس بیٹھ گئی۔

''یہ تو اچھی بات نہیں ہے' میں جانتی ہوں تم شام اور مصر کے حالات پر پریشان ہو مگر صرف تم پریشان نہیں ہو عمیر! ہر صاحب فکر مسلمان' جس کے دل میں ذرا سی بھی انسانیت اور نرمی ہے وہ پریشان ہے مگر اس پریشانی کا یہ حل نہیں ہے کہ انسان کھانا پینا چھوڑ دے' اللہ رب العزت نے ہر انسان کو عمر کی نقدی دے کر دنیا کے بازار میں اعمال کی خریداری کے لیے بھیجا ہے جب جس روز یہ نقدی ختم ہو جائے گی ہر انسان اپنے کندھے پر اپنے اعمال کی گٹھری لاد کر راہ عدم کا مسافر ہو جائے گا۔ روز محشر یہ گٹھری جب کھلے گی تو تم تصور بھی نہیں کر سکتے عمیر جو انسان کا حال ہو گا۔ لذتوں اور غفلتوں کا خمار اترنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی پھر تم

دیکھنا وہاں ان کا حشر کیا ہو گا۔ دنیا کا قالین تو بس سمٹنا ہی چاہتا ہے ہم گمراہ نہیں ہیں جو یہ بات اپنے دل و دماغ میں بٹھا لیں کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں ہو سکتی' نہ ہی اس غلط فہمی کو سر پر سوار کر سکتے ہیں کہ ایک بار دنیا سے رخصت ہونے کے بعد دوبارہ کوئی جنم ہو گا' ہماری موت سعادت کی موت ہے عمیر! تم ذرا ان لوگوں کا سوچو' ان کا کیا بنے گا؟'' اس کا انداز ڈھارس بندھانے والا تھا' عمیر کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔

''ہم دوبارہ جنم کی امید پر کوئی غفلت افورڈ نہیں کر سکتے میرے بھائی نہ ہی اپنے فرض سے کوتاہی برت سکتے ہیں کیونکہ روز محشر جب اعمال کی گٹھری کھلے گی تو ہر شخص یہ چاہے گا اس کی گٹھری میں بخشش کا سامان ہو مگر اس وقت یہ سامان کہاں سے آئے گا؟ دنیا کی کھیتی میں جانفشانی سے جتنی محنت کریں گے آخرت میں اتنی ہی اچھی فصل کاٹنے کو ملے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر اس بے سرو پا بدامنی کا کوئی مقصد بھی تو ہو۔''

''مقصد ہے ناں پچھلے گیارہ سالوں میں جو جنگ عالمی طاقتوں کی طرف سے لڑی جا رہی ہے اس کا مقصد کوئی دہشت گردی' کوئی طالبان نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد اور ہدف صرف اور صرف انسانیت کا قتل اور اسلامی دنیا کی واحد ایٹمی قوت پاکستان کا ایٹم بم ہے' جس کو ہتھیانے کے لیے واشنگٹن سے لے کر جنیوا اور لندن سے لے کر برسلز تک تمام کفریہ طاقتیں سر جوڑے بیٹھیں ہمہ وقت گہری سازشوں میں مصروف ہیں۔ پتا ہے ناں کسی بھی ملک کا ایٹم بم اس کی پہچان' اس کے مضبوط و مستحکم دفاع کا سگنل اور اسٹریٹجی مہارت کی علامت سمجھا جاتا ہے' ساری دنیا حیران ہے کہ جو ملک ایک معیاری سیل تک نہیں بنا سکتا اس نے ایٹم بم کیسے بنا لیا۔ ہم نہیں جانتے عمیر کہ ایٹم بم کی آڑ میں ہم پر کون سی قیامت مسلط کی جا رہی ہے۔ آج دنیا کی پہلی اسلامی ایٹمی قوت عالم کفر کے نرغے میں ہے۔ پوری قوم نیٹو افواج کے بھاری بوٹوں تلے روندی جا رہی ہے' بم دھماکوں نے ساری پاکستانی قوم کا سکون غارت کر چھوڑا ہے' سوات سے کراچی تک ایک ہی بساط بچھی ہے موت کی بساط' ایک قطعی پرائی جنگ میں اب تک ہزاروں بے گناہ پاکستانی شہریوں کے ساتھ افواج پاکستان کے سیکڑوں جوان اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں' ذرا سوچو عمیر! کیا امریکہ کے کسی اور اتحادی ملک میں یہ واقعات اور حادثات پیش آئے؟ اگر نہیں تو پاکستان میں ہی ایسا کیوں' کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک جنگ جو ہماری ہے ہی

نہیں' ہم وہی جنگ خود اپنے شہریوں کی لاشوں پر' کسی اسامہ بن لادن' کسی بیت اللہ محسود' کسی ملا عمر کے خلاف نہیں بلکہ خود اپنے ہی خلاف لڑ رہے ہیں' یہ جنگ ہمیں اس ڈگر پر لے آئی ہے جہاں صرف اندھیرے ہی اندھیرے ہیں وہ پاکستان جو عالم اسلام کا قلعہ اور مسلمانوں کی امیدوں کا واحد مرکز ہے وہ پاکستان جو معدنی وسائل اور افرادی قوت سے مالا مال ہے۔ دنیا میں واحد ایٹمی قوت ہے جو بیک وقت امریکہ' اسرائیل اور بھارت سے ٹکر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی پاکستان کو یہ فرعونی قوتیں ناکام ریاست ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہیں تاکہ کل یہ ہمارے کہوٹہ پلانٹ کو خدانخواستہ نشانہ بنا کر یو این او کے ذریعے ہمارا ایٹم بم اٹھا لیں اور جواب میں نہایت آسانی سے یہ کہہ سکیں کہ پاکستان ایک غیر محفوظ اور ناکام ریاست ہے یوں نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر الحمدللہ ہمارا ایٹم بم محفوظ ہاتھوں میں ہے آپی! کسی کی مجال نہیں کہ میلی نظر بھی ڈال سکے اس پر۔''

''ہوں' صحیح کہہ رہے ہو مگر ذرا سوچو ابھی چند روز پہلے صرف ایک معمولی شخص نے جس طرح دارالحکومت میں ہماری سیکورٹی کا پول کھول کر رکھ دیا' اس کے بعد کیا ہمیں فکر مند نہیں ہونا چاہیے؟ تم دیکھو عمیر! بالکل اچانک سے امریکی افواج ہمارے دارالحکومت کے قریب دھاوا بول دیتی ہے' ہمارا ریڈیو سسٹم اس حد تک خراب ہے کہ ہمیں اپنے قلب میں اسامہ بن لادن کی موجودگی کا پتا ہی نہیں چلتا مگر امریکیوں کو اس کی اطلاع ہوتی ہے اور وہ ہماری آنکھوں کے سامنے آپریشن کر کے اپنا ہدف حاصل کر لیتی ہے کیا اس کے بعد بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم محفوظ ہیں؟ یہ کافر لوگ تو چاہتے ہی یہی ہیں کہ وطن عزیز میں انتشار پھیلا کر یہاں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کی جائے اور اسے غیر مستحکم قرار دے کر اسے ایٹم بم سے محروم کر دیں' اس ایٹم بم سے جس کے لیے ہم نے اقتصادی فاقے کیے' سامراج کی معاشی بدمعاشیاں برداشت کیں جس کے لیے محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہالینڈ کی مستقل شہریت اور اپنی بیٹیوں کا شاندار مستقبل پس پشت ڈال کر لاکھوں ڈالرز کی تنخواہ کو ٹھوکر مار کر یہیں کے ہو رہے جس کے لیے ذوالفقار علی بھٹو جیسے کہنہ مشق' مدبر لیڈر جنوں کی حد تک دیوانہ وار سرگرم رہے' بے نظیر بھٹو جیسی زیرک لیڈر یورپی یونین کے سامنے ڈٹی رہیں' عصر حاضر کے بادشاہ میاں محمد نواز شریف کسی طور کلنٹن

کے دباؤ میں نہیں آئے اور تو اور جنرل ضیاء جیسے لیڈر نے بھی دوٹوک انداز میں امریکیوں کو یہ کہہ کر خاموش کروادیا کہ Topic Is Out Of Discassion وہی ایٹم بم اب ان عالمی قوتوں کی آنکھ میں کنکر بن کر چبھ رہا ہے ساری جنگ اسی کی ہے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا ڈرامہ جس میں پانچ ہزار افراد کی ہلاکتوں کی اطلاع ملی' اس جنگ کا بنیادی پوائنٹ تھا یہ لوگ سازشوں کے تحت تمام مسلم ممالک کو غیر مستحکم کرنے کے بعد فائنل راؤنڈ پاکستان میں کھیلنا چاہتے ہیں عمیر کیونکہ یہ بساط حقیقت میں بچھائی ہی پاکستان کے لیے گئی ہے۔'' بولتے بولتے حورعین کا گلا خشک ہوگیا تھا' عمیر نے اسے گلاس میں پانی انڈیل دیا۔

''میں نے سنا تھا آپی ایٹم بم ایک نہایت مہلک' ضرر رساں اور خطرناک ہتھیار ہے۔ 68 سال پہلے 1945ء میں جنگ عظیم دوئم کے دوران امریکہ نے جاپان کے دو شہروں ناگاساکی اور ہیروشیما پر جو نیوکلیئر بم برسائے تھے اس کے نتیجے میں آج تک وہاں کی زمین بنجر اور فضا آلودہ ہے۔ وہاں پیدا ہونے والے بچے آج بھی لولے لنگڑے اور معذور پیدا ہورہے ہیں' دنیا بھر میں آج جو ملک بھی اس ٹیکنالوجی سے مالا مال ہے' ساری دنیا اسے عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے کسی کی جرأت نہیں کہ اس کی پالیسی کے خلاف ہلکی سی گستاخانہ نگاہ بھی ڈال لے' ان کے کسی شہری کے خلاف ایکشن لے لے تو پوری عالمی برادری سیخ پا ہوجاتی ہے جب ہم اللہ پاک کی نصرت اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے عظیم انسان کی بدولت اس ٹیکنالوجی کے مالک بنے تو میرا دل خوشی سے پھٹ رہا تھا۔ منٹو کے مرکزی کردار منگو کوچوان کی طرح ہزاروں پاکستانیوں کی آنکھوں میں جانے کیسے کیسے خواب آبسے تھے اک جوش تھا کہ اب ہم بھی سر اٹھا کر چل سکیں گے اک ولولہ تھا کہ اب ہم بھی سینہ تان کر عزت و آبرو کے ساتھ جئیں گے خود مختاری' خود کفالت اور خود انحصاری کے قابل ہوجائیں گے مگر افسوس صد افسوس آپی کہ ایسا کچھ نہ ہوسکا۔ ایٹمی قوت ہوتے ہوئے بھی آج ہم ذلیل و خوار ہیں' کل ہندو بنیا ہمیں دھمکاتا تھا اور آج تیسری دنیا کا ایک نقاب پوش مسخرہ بات بات پر ہمیں جانے کیسی کیسی دھمکیاں دیتا ہے۔''

''یہ تو ہونا ہی تھا عمیر! تم نے وہ کہانی نہیں سنی کہ افغانستان کے ایک دیہات میں چوری ڈکیتی بہت ہوتی تھی تو وہاں ایک کسان نے سوچا کہ اس کے پاس اپنی اور اپنے گھر والوں کی حفاظت کے لیے ایک بندوق ہونی چاہیے چنانچہ اس نے اپنا تمام مال ومتاع ڈھور ڈنگر سب بیچ کر ایک بندوق خرید لی' رات میں چور آئے تو کسان کی بیوی نے کسان کو جگایا اور بتایا کہ گھر میں چور گھس آئے ہیں تب کسان نے سوچا کہ اس کی سب سے قیمتی چیز تو اس کی بندوق ہی ہے لہٰذا اسے چھپایا جائے یہ سوچ کر دونوں میاں بیوی نے بندوق کو بستر کے نیچے چھپایا اور اس کے اوپر لیٹ گئے' صبح اٹھے تو بہت خوش ہوئے کہ انہوں نے بندوق بچالی جو ان کی سب سے قیمتی متاع تھی' گاؤں کے لوگوں کو اس بات کا پتا چلا کہ رات کسان کے گھر چور آئے تھے اور اس نے اپنی بندوق چھپالی تو سب اس پر بہت ہنسے' انہوں نے کسان سے کہا کہ ایسی بندوق خریدنے کا کیا فائدہ جس کی حفاظت بھی تمہیں خود کرنی پڑے' بات کسان کی سمجھ میں آگئی اور وہ بے حد شرمندہ ہوا' ہمارا ایٹم بم بھی کسان کی وہی بندوق ہے عمیر! جو بجائے اس کے کہ ہماری حفاظت کرے الٹا ہم خود اس کی حفاظت کررہے ہیں۔'' لبوں پر دھیمی سی مسکان سجائے وہ عمیر کو کہہ رہی تھی' عمیر اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

''خیر...... اس موضوع پر جتنا بھی خون جلالیں کم ہے میری ہالینڈ کے لیے ٹکٹ کنفرم ہوگئی ہے اگلے ہفتے فلائٹ ہے' صبح ثمیر' زبیر کو ہوسٹل چھوڑ آئے گا تو میں ساتھ ہی چلی جاؤں گی' بہت سے معاملات کو ہینڈل کرنا ہے ابھی' مجھے خوشی ہے کہ ثمیر کی بیگم نے میری جگہ لے لی ہے۔''

''نہیں آپی' اس گھر میں آپ کی جگہ کبھی کوئی نہیں لے سکتا' میں بہت مس کروں گا آپ کو۔'' اچانک اس کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی ہلکی سی' چھلکی تھی' حورعین کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''مس تو میں بھی تمہیں بہت کروں گی عمیر' کیونکہ تم راہ حق کے مسافر ہو' تم جیسے نوجوانوں کی اس ملک کو بہت ضرورت ہے۔''

''اور آپ جیسی شخصیات کی بھی بہت ضرورت ہے اس ملک کو' مجھے حقیقتاً آپ پر بہت فخر ہے آپی! میں ہمیشہ آپ سے اپنے احساسات و جذبات شیئر کرکے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہوں۔'' نم آنکھوں کے ساتھ وہ مسکرایا تھا جواب میں حورعین بھی اس کے گال پر اپنا ہاتھ رکھ کر دھیمے سے مسکرا دی۔

❀......❀......❀

جس شام وہ ہمدانی ہاؤس سے رخصت ہوئی اسی رات اس گھر کے مکینوں نے ثمیر کی بیوی لائبہ کا نیا روپ دیکھا تھا' حورعین کی موجودگی میں بڑھ چڑھ کر ہر کام کرنے والی لائبہ بیگم

اس کے گھر سے رخصت ہوتے ہی خرابی طبیعت کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں قید ہوگئی تھی نئی نئی شادی تھی لہٰذا سمیر اس کا موڈ فریش کرنے کے لیے اسے باہر ڈنر کروانے لے گیا۔ اگلی صبح بھی دیر تک ان کے بیڈ روم کا دروازہ بند رہا' عمیر کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ حورعین کے اس گھر سے چلے جانے کو اس نے بہت دل پر لیا تھا' شاید اسی ٹینشن اور غم کی وجہ سے اسے بخار نے آلیا تھا۔ اس میں ناشتا بنانے کی ہمت نہیں تھی' نمیر بھی بنا ناشتے کے آفس کے لیے نکل گیا تھا' کل رات کا کھانا بھی اسی نے بنایا تھا' اگلے دو روز تک یہی معمول رہا تو عمیر نے عذیر کو شکایت لگادی' لائبہ نے گھر کا کام یوں ترک کردیا تھا جیسے اسے منع ہوگیا ہو۔ صبح ناشتے کے بعد وہ اپنی کسی نہ کسی دوست کو بلا لیتی اور دن بھر کمرا بند کر کے اسی کے ساتھ گپ شپ لگاتی رہتی یا ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتی' سمیر نے جاب جوائن کرلی تھی چونکہ اس کا ٹرانسفر دوسرے شہر ہوگیا تھا۔ لہٰذا وہ ہفتے کی رات گھر آتا اور اتوار کی رات پھر واپس چلا جاتا۔ اس روز بھی ہفتہ تھا جب عذیر نے اسے کال کر کے لائبہ کا بتایا۔ سفر سے تھکا ہارا وہ گھر آیا تو لائبہ کمرہ بند کیے حسب عادت سو رہی تھی جب کہ عمیر نے طبیعت کی خرابی کے باوجود مشین لگا رکھی تھی۔

سمیر نے کمرے میں جا کر لائبہ کا کمبل کھینچا اور اسے ڈانٹا تو وہ اس پر چڑھ دوڑی۔

"آتے ہی کان بھر دیے بھائیوں نے؟"

"جسٹ شٹ اپ۔"

"یو شٹ اپ..... میں اس گھر میں تمہاری بیوی بن کر آئی ہوں' نوکرانی بن کر نہیں۔" نمیر نے ابھی ابھی آفس سے واپسی پر لاؤنج میں قدم رکھا تھا جب لائبہ کے چنگھاڑتے لہجے نے سمیر اور عمیر کے ساتھ ساتھ اسے بھی حیران کردیا۔

"گھر کا کام کرنے سے کوئی نوکر نہیں بن جاتا۔"

"تو کون سا کام نہیں کیا میں شادی کے ابتدائی دنوں میں کولہو کے بیل کی طرح کام کیا ہے میں نے اچھا بھلا سارے بھائی اپنا کام کرتے تھے اب کیا ہوگیا' مائنڈ اٹ سمیر! میں تمہاری بیوی ہوں تمہارے بھائیوں کی خدمت مجھ پر فرض نہیں ہے نہ ہی کوئی مجھے حورعین بھابی جیسا سمجھنے کی کوشش کرے اکلوتی بیٹی ہوں اپنے ماں باپ کی میں نے تو کبھی اپنے گھر میں ہل کر پانی بھی نہیں پیا۔"

"نہیں پیا تھا تو شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی' رہتیں اپنے ماں باپ کے گھر۔"

"رہ رہی تھی مگر یہ تم ہی تھے جس سے اپنے جذبات سنبھالے نہیں جارہے تھے۔"

قطعی گستاخانہ لہجے میں اس نے اتنی کھلی بات سمیر کے منہ پر دے ماری تھی کہ وہ بے ساختہ بغلیں جھانکنے پر مجبور ہوگیا۔ نمیر اور عمیر بھی ایک دوسرے سے نظریں چرا گئے تھے۔ اگلے پندرہ منٹ کے بعد نمیر کپڑے تبدیل کر کے کچن میں آگیا اور یہی لائبہ چاہتی تھی بھی سکون سے اونچی آواز میں ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی۔ اس کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ سمیر سے دور نہیں رہ سکتی تھی جب کہ سمیر کسی طور اسے اپنے ساتھ لے جانے کو تیار نہیں تھا' اس کی یہی خواہش تھی کہ وہ حورعین کی طرح اس کا گھر سنبھالے اور اسی بات پر اس کا سمیر سے جھگڑا ہوا تھا جس کی سمیر نے مطلق پروا نہیں کی تھی۔ اس کے بعد ہی اس نے گھر کے کاموں سے ہاتھ کھینچا تھا مگر اب بھی بات بنتی نظر نہیں آرہی تھی تبھی اس کی دوست نے اسے ایک اور نئی راہ دکھائی تھی۔

سمیر سنڈے کی چھٹی ٹینشن میں گزار کر پیر کو واپس آیا تو حورعین کا فون آگیا' پرسوں رات اس کی فلائٹ تھی لہٰذا اس نے ان سب کو اپنے گھر پر انوایٹ کیا تھا' نمیر کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہٰذا آفس سے واپسی کے بعد وہ کمرا بند کر کے سوگیا تو لائبہ عمیر کے ساتھ حورعین کے پاس چلی آئی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ہی سر چکرانے کا بہانہ کر کے وہ وہاں سے اٹھ آئی' عمیر نے ساتھ آنا چاہا تو اس نے سہولت سے منع کردیا۔ جلدی جلدی گھر آ کر اس نے نمیر کے کمرے کا لاک کھولا جس کی چابی اس کے پاس تھی' اندر وہ بے خبر اپنے بیڈ پر پڑا سو رہا تھا تبھی اس نے گاڑی سے شراب کی بوتل نکالی اور اپنی فرینڈ کی ہدایت کے عین مطابق ایک گلاس بھر کر باہر پودوں میں گرادیا پھر آدھا گلاس بھر کر نمیر کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور شراب کی بوتل بھی ساتھ ہی رکھ دی۔ پانچ منٹ کے بعد اس کی مخروطی انگلیاں سمیر کا نمبر پریس کر رہی تھیں جو ابھی تھک ہار کر آفس سے اپنے فلیٹ پر واپس آیا تھا۔

"ہیلو۔" تیسری ہی بیل پر اس نے کال ریسیو کرلی تھی ادھر صوفے پر اطمینان سے بیٹھی لائبہ نے دھواں دھار رونا شروع کردیا۔

"سمیر آپ کہاں ہیں پلیز جلدی سے گھر واپس آجیے۔"

"کیوں خیریت؟ کیا ہوا ہے؟"

"خیریت نہیں ہے نمیر نے شراب پی رکھی ہے اس کا دماغ کام نہیں کر رہا میں ابھی حورعین بھابی کے گھر سے واپس آئی تو

اس نے میرے ساتھ بدتمیزی شروع کردی' بڑی مشکل سے میں اپنی عزت بچا کر اپنے کمرے میں خود کو لاک کرنے میں کامیاب ہوئی ہوں۔ سمیر میں یہاں اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتی' ابھی اپنے پاپا کو فون کر کے بلا رہی ہوں میں۔" اس کی ایکٹنگ اتنی زبردست تھی کہ سمیر کو اس پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا' اپنے بھائیوں کو اچھی طرح جاننے کے باوجود وہ اس کے فریب میں آگیا تھا۔

"نہیں پاپا کو فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں آرہا ہوں۔" اس نے کہا تھا اور لائبہ نے فوراً کال ڈس کنکٹ کردی تھی تقریباً ایک گھنٹے کے بعد عمیر گھر آیا تو وہ بال بگاڑے اپنی شرٹ بازوؤں سے پھاڑے لاؤنج میں دونوں پاؤں صوفے پر رکھے رو رہی تھی جب کہ اس کا دوپٹہ اندر نمیر کے بیڈ پر پڑا تھا اور اس کی شرٹ بھی نیچے زمین پر پڑی تھی' وہ شاکڈ ہی تو رہ گیا تھا۔

"بھابی..... کیا ہوا؟"

مگر وہ بنا اس کی طرف دیکھے روئے جارہی تھی' تھوڑی ہی دیر میں سمیر بھی گھر پہنچ گیا تھا پریشانی اس کی شکل سے ہی ظاہر ہورہی تھی۔ لائبہ کو روتے دیکھ کر وہ تیزی سے نمیر کے کمرے کی طرف بڑھا تھا اور کمرے کا حال دیکھ کر غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے اس نے نمیر کو گریبان سے پکڑ کر نیند سے جگادیا۔

"گھٹیا' ذلیل' کمینے انسان..... شرم نہیں آئی تمہیں اپنے ہی گھر کی عزت پر ہاتھ ڈالتے ہوئے؟" جگانے کے ساتھ ہی اس نے اسے دو تھپڑ بھی رسید کردیے تھے' وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"کھل کیا ہوا ہے؟" اس کی آنکھوں میں سرخی تھی جب کہ سر درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا' تبھی وہ چنگھاڑا۔

"زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنے گھٹیا ثابت ہوگے۔" مارے اشتعال کے اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا' نمیر کا سر گھوم گیا۔

"بس..... زیادہ چنگھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے' میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے تمہیں مجھ پر یوں ہاتھ اٹھانے کی ضرورت پیش آئے۔"

"ضرورت کے بچے جو حرکت تم نے کی ہے میرا دل چاہ رہا ہے میں تمہاری جان لے لوں۔" نمیر نے پہلی بار اسے یوں آپے سے باہر ہوتے دیکھا تھا۔ تبھی اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھی شراب کی بوتل اور لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی روتی ہوئی لائبہ پر پڑی تھی جس کا دوپٹہ اسی کے بیڈ پر پڑا ازل رہا تھا' وہ حیران ہی تو رہ گیا' ایک پل میں اسے ساری کہانی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ حیران تھا کہ اس کا کمرا تو لاکڈ تھا پھر وہاں شراب کی بوتل اور لائبہ کا دوپٹہ کیسے آگیا تھا؟

"لے لو جان' مگر میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں میں نے نہ تمہاری بیوی کو ہاتھ لگایا ہے نہ شراب کی بوتل کو' یہ سارا کھیل تمہاری اپنی بیوی کا رچایا ہوا ہے' میرا کمرا لاک تھا اور میں سلیپنگ پلز لے کر سو رہا تھا۔"

"بکواس بند کرو۔"

"بکواس نہیں کر رہا ہوں میں' بکواس وہ ہے جو تمہاری بیوی کر رہی ہے میرا خدا جانتا ہے میں نے کبھی حورعین آپی اور اس لڑکی کو اپنی سگی بہنوں سے کم نہیں سمجھا اور میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں کہ اپنی سگی بہن کی عزت پر ہاتھ ڈالوں گا۔" اس کے لہجے کی مضبوطی اس کی سچائی کی دلیل تھی' سمیر نے رخ پھیر کر لائبہ کی طرف دیکھا وہ فوراً نظر چرا گئی' اگلے ہی روز بات حورعین اور عذیر کے علم میں بھی آگئی تھی۔ اپنی اپنی جگہ پر دونوں شاکڈ رہ گئے تھے حورعین ساری مصروفیات پس پشت ڈال کر وہاں آئی تھی' جہاں نمیر نے دل برداشتہ ہوکر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی مگر عمیر کی مداخلت نے اسے بچالیا تھا۔

لائبہ بے حد شرمندہ تھی جب کہ سمیر تو کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہا تھا' حورعین کتنی ہی دیر نمیر کے پاس بیٹھی اس کی ڈھارس بندھاتی رہی۔

❁.....❁.....❁

تُو اگر سن نہیں سکتا تو مجھے غور سے دیکھ
بات ایسی ہے کہ دہرائی نہیں جائے گی

حورعین کی فلائٹ کا ٹائم قریب آ پہنچا تھا۔ نمیر اور عمیر دونوں اسے سی آف کرنے آئے تھے جب کہ سمیر کل رات ہی لائبہ کو ساتھ لے کر اپنی ڈیوٹی پر واپس چلا گیا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار میں گاڑی سے اتر کر ان دونوں کو پیار کرنے کے بعد وہ ائیرپورٹ کی عمارت کی طرف بڑھی تو اس کے قدم من من کے ہورہے تھے جب کہ نمیر اور عمیر دونوں کی آنکھیں بھی بھرآئی تھیں۔

کتنا مشکل تھا اس ملک' اسی شہر اور ان لوگوں سے دور رہنا جو اب اس کی پہچان بن چکے تھے مگر وہ پلٹ کر دیکھنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی اگر اس نے ایک بار بھی پلٹ کر انہیں دیکھ لیا تو یہاں سے کبھی نہیں جاسکے گی۔ ہلکی ہلکی پھوار نے اس کے کپڑے خاصے بھگو دیے تھے تبھی کسی نے اسے پکارا تھا۔

"حورعین....." اور وہ جو تیزی سے عمارت کی طرف بڑھ رہی تھی ٹھٹک کر رک گئی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کا دل بہت تیزی سے دھڑکا تھا مگر وہ اب بھی پلٹ کر نہ دیکھ سکی تبھی وہ

قریب آیا تھا۔

"کہاں جارہی ہو؟" اس بار حورعین نے نظریں اٹھائی تھیں کیونکہ وہ اس کے مقابل ہی تو کھڑا تھا۔

"لیبروڈ۔"

"اتنی ساری محبتوں کو چھوڑ کر؟"

"نہیں، چھوڑ کر نہیں، ساتھ لے کر۔"

"کیوں، جانا ضروری ہے؟"

"ہوں۔"

"او کے مگر سامان کہاں ہے؟" اور اس بار وہ چونکی تھی اسے خبر ہی نہ ہو سکی تھی کہ اس نے گاڑی سے اپنا سامان تو نکالا ہی نہیں تھا۔ بچھڑ جانے کی یہ کیسی اذیت تھی کہ بنا سامان کے وہ پیدل ہی آگے بڑھی جارہی تھی، ایک دم سے پلٹ کر اس نے پیچھے دیکھا مگر اب وہاں نمیر اور عمیر کی گاڑی نہیں کھڑی تھی۔

"او...... مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ سامان نکالنا ہے۔"

"چچ چچ چچ اب تو پھر بنا سامان کے ہی جانا پڑے گا۔" وہ اس کی پریشانی سے لطف اٹھا رہا تھا، حورعین نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر قدم آگے بڑھا دیئے۔ فلائٹ کے لیے اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی، اس کے قدموں کی رفتار میں تیزی آ گئی۔

"بات سنو۔" ایک مرتبہ پھر اس کی صدا نے اس کے قدم باندھ دیئے تھے، وہ ٹھٹک گئی۔

"جی۔"

"میری امانت تو واپس کرتی جاؤ۔"

"وہاٹ؟" عذیر کی جگر جگر کرتی نگاہوں کو دیکھتے ہوئے وہ الجھ ہی تو گئی تھی۔

"کیسی امانت؟"

"تمہیں نہیں پتا؟" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا، حورعین گھبرا گئی۔

"نہیں۔" اس کا کہنا تھا کہ اسی لمحے ہلکی ہلکی بوندا باندی نے اچانک تیز بارش کا روپ دھار لیا۔

"شیور......؟" ایک نظر اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اس کے قریب ہوا تھا۔ حورعین جیسے اس کی نظر کے طلسم میں بندھ کر رہ گئی، لوگ بارش کی وجہ سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے مگر وہ ساکت کھڑی عذیر کی نگاہوں میں دیکھ رہی تھی جو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ تھامے کھڑا اسے بہت گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ حورعین ان نگاہوں کی گرفت سے اپنی نظریں چھڑانے کی ہمت ہی نہ کر سکی یہاں تک کہ بارش نے ان دونوں کو پور پور بھگو دیا۔ تبھی عذیر ذرا سا اس کی طرف جھکا تھا اور اس نے اپنے لب اس کی دمکتی پیشانی پر رکھ دیئے تھے۔

"تمہیں پتا ہے تم میرا دل ساتھ لے کر جارہی تھیں۔" بے حد گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے وہ اس کے کان کی طرف جھکا تھا۔ حورعین کے جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی تاہم اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ضرور پھسلے تھے۔

"اب نہیں حورعین، بہت لٹا دیا ان انمول موتیوں کو اب اور نہیں۔" فوراً سے پیشتر اپنے ہاتھوں سے اس نے اس کے آنسو صاف کیے تھے، حورعین ضبط کے سارے ہتھیار گرا کر اس کے سینے سے لگی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ عذیر نے نرمی سے اپنے بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیئے۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی مگر دونوں کو ہی جیسے اس کی پروا نہیں تھی بہت دیر کے بعد انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ پبلک پلیس پر کھڑے ہیں تبھی حورعین کسمسا کر اس کی گرفت سے نکلی تھی جس پر عذیر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

اگلے تیس منٹ کے بعد عذیر نے گاڑی ہمدانی ہاؤس کے سامنے پارک کی تھی، حورعین گاڑی سے نکلی تو بھیگے کپڑوں میں اس کے جسم کا ایک ایک حصہ نمایاں ہو رہا تھا تبھی عذیر نے شرارتی نگاہوں سے ایک نظر اس کے بھیگے سراپا پر ڈالنے کے بعد اپنا کوٹ اتار کر اسے پہنا دیا پھر دونوں ہاتھ اس کے شانوں کے گرد حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ گھر کے اندر لے آیا۔

صد شکر کہ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا مگر نمیر کے کمرے سے اس کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں ضرور آ رہی تھیں۔

"میں بتا رہا ہوں عمیر! میں نے آج کے بعد پوچا نہیں لگانا، صبح ناشتا بھی تم نے بنایا کرنا ہے روز آفس سے لیٹ ہو جاتا ہوں، یہی حالات رہے ناں تو جلد ہی آفس والوں نے جاب سے فارغ کر دینا ہے، بھول جاؤ اب حورعین آپی والی عیش! وہ تو کوئی پری تھیں جو راستہ بھول کر بس تھوڑے دن کے لیے ہی ہماری دنیا میں آ گئی تھیں۔"

"اور کیا ساری عادتیں ہی خراب کر دیں ہماری، کاش عذیر بھائی انہیں روک لیتے مگر وہ کیوں روکیں گے انہیں تو ہر کام وقت پر ریڈی مل جاتا ہے۔ میں بتا رہا ہوں نمیر! میرا بائیکاٹ ہے عذیر بھائی سے زبیر بھی وہاں ہوسٹل میں سیٹ نہیں ہو رہا، جب بھی فون کر و رونے لگ جاتا ہے میرا تو دل کٹ رہا ہے۔ کسی کی مجال تھی کہ حورعین آپی کے ہوتے ہوئے کوئی ہم پر ایسا گھٹیا الزام لگاتا جو لائبہ بھابی نے لگایا، میں نے سوچ لیا ہے اب جب بھی عذیر بھائی آئے ہم نے ان کا کام نہیں کرنا۔" نمیر کے کمرے سے اٹھتی آوازوں پر عذیر نے حورعین کی طرف دیکھا تھا اور وہ قطعی بے ساختگی میں کھلکھلا کر اپنے پیچھے بیرونی دروازہ بند کر گئی تھی، بے شک وہ گھر ایک جنت تھا اور حورعین عبدالسمیع اپنے پیارے رب کی خاص رحمت سے اس جنت میں اپنا مقام پا گئی تھی۔

❁......❁......❁

ذرا دیکھو تو دروازے پر دستک کون دیتا ہے؟

محبت ہو تو کہہ دینا یہاں اب ہم نہیں رہتے

بارش خوب زور و شور سے ہو رہی تھی۔ ہانیہ کافی کا بڑا سا مگ ہاتھ میں لیے ٹیرس پر آ کھڑی ہوئی، ایسا ہی ایک برستا بھیگتا موسم اس کے اندر بھی تو ٹھہر گیا تھا۔ نہال حسن نے کہا تھا۔

"ترسو گی ہانیہ ڈیئر! نہال حسن کے ساتھ بھی بارشوں کے حسن کو محسوس کرنے کے لیے ترسو گی۔" اور وہ واقعی ترس گئی تھی۔

کتنا عرصہ ہو گیا تھا اسے بارشوں میں بھیگے ہوئے، سرد قطروں کے لمس کو اپنی ہتھیلیوں پر محسوس کیے ہوئے۔ بارشیں واقعی کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتیں۔

کھڑکیوں کے شیشوں پر

رینگتے ہوئے قطرے

یوں پھسلتے ہیں جیسے

میرے اور بادل کے درمیان کوئی ہے

جو میرے اور بادل کے راز کو سمجھتا ہے

جب گھٹائیں چھائیں تو صرف وہ نہیں روتیں

آنکھیں بھی برستی ہیں، کھڑکیاں بھی روتی ہیں

کتنا وقت ہو گیا تھا اسے نہال حسن کے لیے روتے ہوئے اب تو آنکھوں کے آنسو بھی پتھر ہو گئے تھے مگر وہ تاحال اسے بھولنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی، کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی بات کے حوالے میں وہ اسے یاد آ ہی جاتا تھا۔ کبھی بارشوں کو دیکھ کر کبھی دیوار پر کسی چھپکلی کو دیکھ کر کبھی کچن میں کوئی کاکروچ دیکھ کر اور کبھی اپنے بیٹے کی صورت تصور میں لا کر جو ہو بہو نہال کی کاپی تھا۔

بے شک وہ ایک آئیڈیل انسان تھا اور اس کی رفاقت ہانیہ صفدر کی زندگی پر گہری چھاپ چھوڑ گئی تھی، اپنی محبت اور شخصیت کے لحاظ سے وہ کسی افسانوی ہیرو سے کم نہیں تھا مگر کتنی عجیب بات تھی کہ پھر بھی وہ اسے کبھی ویسے نہیں چاہ سکی تھی جیسے میکال حسن کو چاہا تھا۔

بارش کی تیزی میں مزید شدت آ گئی تھی۔ ہانیہ نے کھڑکی کے پردے برابر کر دیئے جانے کیوں اب بارشوں میں اس کا دل جیسے پھٹنے لگتا تھا۔ نہال حسن کے بعد زندگی کی جھیل پر جیسے کائی لگ گئی تھی، اندر کے برف موسموں نے اسے ٹھٹھرا کر رکھ دیا تھا۔ بہت اکیلی پڑ گئی تھی وہ زندگی کے دکھوں کے سامنے، پچھلے تین سال سے صرف ایک لفظ داشتہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا، میکال حسن کے لبوں سے نکلا یہ لفظ اس کی قبر بن گیا تھا جس میں وہ روز دفن ہوتی تھی۔

جاذب اور ہادیہ روز اسکائپ پر اس سے بات کرتے تھے، ہادیہ نے دو جڑواں بیٹوں کو جنم دیا تھا اور وہ انہی میں بے حد مصروف ہو کر رہ گئی تھی، حسن صاحب اور ان کی بیگم کا فون بھی آ جاتا تھا کبھی کبھار مگر اسے اب کسی کے یاد کرنے نہ کرنے سے فرق ہی کہاں پڑتا تھا، فارحہ کی بیٹی اس کا بہت خیال رکھتی تھی، صفدر صاحب کی دوسری بیگم بھی اسی کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس کے باوجود گزرے ہوئے ماہ و سال میں جس طرح سے دل پر پتھر رکھ کر اس نے اپنے بیٹے کو بھلایا تھا اس کے لیے صبر کیا تھا صرف وہی جانتی تھی۔

اور اب جب اسے صبر آنے لگا تھا تو وہ پھر اس کے سامنے آ گیا تھا اور اس کے اندر کی ماں تا اس کی معصوم شکایات سن کر جیسے تڑپ اٹھی تھی، کسی کروٹ قرار نہیں تھا نہ کچھ کھانے کو دل چاہ رہا تھا نہ پینے کو کام کاج میں اس کی دلچسپی بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی اس ایک رشتے کے سوا کائنات میں اب اس کا اور رہ بھی کیا گیا تھا؟

❁......❁......❁

ہانیہ صفدر جب سے اس کے گھر سے ہو کر گئی تھی میکال حسن کو کسی کروٹ قرار نہیں آ رہا تھا۔ سنان علی آج بھی اس کا انتظار کرتے کرتے بھوکا ہی سو گیا تھا۔ حفیظ بابا بھی تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے کوارٹر میں گئے تھے تبھی آفس سے واپسی پر پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کرنے کے بعد وہ صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا تھا۔ اگلے ہی پل اس نے فل آواز میں ٹی وی کھول لیا مگر اس کی توجہ ٹی وی اسکرین پر نہیں تھی، نظر کی اسکرین پر اگر کوئی سین جھلملا رہا تھا تو وہ ہانیہ صفدر کا تھا جسے آج شام میں اس نے مارکیٹ میں شاپنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

پچھلے چھ ماہ کے بعد ہانیہ صفدر سے یہ اس کا دوسرا ٹکراؤ تھا، اسے تو شاید خبر بھی نہیں تھی مگر وہ اب بھی اس کے شب و روز پر بہت گہری نظر رکھے ہوئے تھے، نہال کی موت کو تین سال ہو گئے تھے اور ان تین سالوں میں وہ ایک بار بھی اس کے خواب

میں نہیں آیا تھا۔

میکال حسن کو اب ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے تھے روز رات میں مسلسل نیند کی دوائی کھا کھا کر اس کا دماغ سن ہوگیا تھا۔ اب تو گولیاں بھی اپنا اثر کھو بیٹھی تھیں اس کے بیڈ کی دونوں سائیڈوں پر ہانیہ اور نہال کی تصویریں لگی تھیں اور اس کا بیٹا روز ان تصویروں سے ڈھیروں باتیں کر کے سوتا تھا۔ پچھلے تین سالوں میں اس نے کتنی کوشش کی تھی ہانیہ صفدر کو اپنے دل و دماغ سے نکالنے کی مگر وہ لڑکی جیسے کسی آسیب کی طرح اس کی روح سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔

گزرے ہوئے تین سالوں میں اگر وہ بدلی تھی تو وہ بھی بہت بدل گئی تھی‘ تین سال سے اس کی زندگی میں کسی لڑکی کا کوئی گزر نہیں رہا تھا۔ مختلف محفلوں‘ تقریبات میں جانا بھی چھوڑ دیا تھا اس نے‘ اس کی زندگی صرف اپنے بیٹے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی‘ روز آفس سے واپسی کے بعد وہ اسے کہیں نہ کہیں گھمانے پھرانے لے جاتا تھا‘ گھر واپسی کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ کھلاتا پھر حفیظ بابا کے سپرد کر کے اپنے کمرے میں چلا آتا‘ کبھی کبھی مصروفیات زیادہ بڑھ جاتیں تو وہ بالکل ہی اس کے لیے ترس کر رہ جاتا تھا۔

گزرے پچھلے تین سالوں میں اگر اس نے مکمل توجہ اور تن دہی سے کام کیا تھا تو وہ صرف بزنس کی اسٹیبلشمنٹ تھی جسے اس نے بنا کسی کی مدد کے اپنی قابلیت اور شبانہ روز محنت سے بامِ عروج تک پہنچایا تھا اور یہ اسی محنت کا صلہ تھا کہ آج بزنس کی دنیا میں اس کا ایک نام تھا لوگ اس سے محض چند لمحوں کی ملاقات کے لیے ترستے تھے مگر اسے اب لوگوں میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔

پچھلے ہفتے اس نے ایک نئی کمپنی کا چارج سنبھالا تھا جس میں ہانیہ صفدر پانچ سال کے کنٹریکٹ پر کام کر رہی تھی مگر اسے خبر نہیں تھی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

ٹیلی وژن اب بھی فل آواز میں چل رہا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں رات کے تین بجا رہی تھیں‘ وہ اٹھا اور اس نے فریج سے شیمپین کی بوتل نکال لی‘ بزنس میں محنت کے ساتھ وہ آج کل شراب کا استعمال بھی بہت شدت سے کرنے لگا تھا‘ حفیظ بابا دیکھتے تھے اور دل مسوس کر رہ جاتے تھے۔

اذیت حد سے بڑھنے لگے تو انسان گھبرا کر کسی نہ کسی پناہ گناہ کی تلاش کرتا ہے‘ کوئی روحانیت کے رستے پر چل پڑتا ہے تو کوئی شیطانیت کے‘ اس نے بھی دوسرے رستے کا انتخاب کیا تھا۔

اگلے تین منٹ میں پوری بوتل ختم کرنے کے بعد اس نے کچن سے چھری اٹھالی تھی‘ چند لمحے وہ اپنی خوب صورت کلائیوں کو غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے بازوؤں سمیت جسم کے مختلف حصوں پر چھوٹے چھوٹے کٹ لگانے شروع کر دیئے تھے‘ ہر کٹ کے ساتھ ملنے والی اذیت اس کے اندر لگی آگ پر جیسے پھوار کا کام کر رہی تھی جو ظلم اس نے اپنی زندگی اور دل کے ساتھ کیا تھا اس کی سزا شاید اس سے بہتر کوئی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

جز بھی ایک پھول ہے
بس فرق صرف اتنا ہے
کہ اسے نمائش سے نفرت ہے

پچھلے کئی دنوں سے ہانیہ صفدر کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہٰذا وہ آفس نہیں جا پا رہی تھی‘ تقریباً ایک ہفتے کے بعد اس روز وہ آفس آئی تو اسے سب سے پہلی جو خبر ملی وہ کمپنی کے ایم ڈی کے تبدیل ہونے کی تھی۔

خبر کیا تھی پریشانی کا بم تھا جو عین اس کے سر پر پھٹا تھا جانے نیا ایم ڈی کس طبیعت اور مزاج کا شخص تھا۔ اس کمپنی میں ذہین اور محنتی لوگوں کی کمی نہیں تھی اس کے باوجود کمپنی کے سابقہ ایم ڈی افتخار راؤ صاحب اس کا خصوصی خیال رکھتے تھے اور خاصی رعایت بھی دیتے تھے۔ سارا دن وہ یہی سوچ سوچ کر کڑھتی رہی تھی کہ جانے اب کیا ہوگا؟

دوپہر میں لنچ کے بعد افتخار راؤ صاحب نے اسے اپنے آفس میں طلب کیا تھا‘ جیسے ہی وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی ان کی سیٹ پر میکال حسن کو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئی‘ قدم جیسے دہلیز پر ہی چپک گئے تھے تبھی افتخار صاحب کی نگاہ اس پر پڑی تھی۔

”ارے مس ہانیہ! پلیز آئیں ناں‘ رک کیوں گئیں؟“ افتخار صاحب بھی اس کے قریب ہی کھڑے تھے‘ ہانیہ بمشکل خود کو سنبھالتی آگے بڑھ آئی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام! کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“

”جی ٹھیک ہوں۔“

”گڈ‘ یہ میکال صاحب ہیں میکال گروپ آف انڈسٹریز کے مالک! میرے بہت اچھے دوستوں میں شمار ہوتا ہے ان کا اس ہفتے سے انہوں نے اس کمپنی کا چارج سنبھال لیا ہے۔“

”کیوں؟“ افتخار صاحب کو اس سے اس سوال کی توقع نہیں تھی تبھی ذرا سا چونک کر مسکرائے تھے۔

”میں اصل میں ابروڈ جا رہا ہوں مس ہانیہ! میرے بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ وہاں بالکل اکیلا ہے پھر یہاں بہت نقصان بھی ہو رہا ہے میکال صاحب کے ففٹی پرسنٹ شیئرز تو تھے ہی اب مکمل چارج ان کے ہاتھ میں آ گیا ہے‘ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں آپ ان کو مجھ سے بڑھ کر اچھا پائیں گی۔“

”ایسا تو تب ہوگا سر جب میں یہاں مزید کام کروں گی‘ میں آج ابھی اسی وقت اس جاب سے ریزائن کرتی ہوں۔“

”مگر کیوں؟“ افتخار صاحب پر حیرتوں کے پہاڑ گر پڑے تھے جبکہ میکال ٹکٹکی باندھے بس اسے دیکھے جا رہا تھا‘ ہانیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

”کیوں کی وضاحت نہیں دے سکتی سر مگر یہ حقیقت ہے اس لفظ ابروڈ نے ہم مشرقی لوگوں سے ہمارے بہت سے انمول رشتے چھینے ہیں‘ بہت ہی انمول۔“

”مگر مس ہانیہ آپ ایسا کیسے کر سکتی ہیں‘ دیکھیں میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر آپ کا یہ فیصلہ درست نہیں ہے اس کمپنی کے ساتھ آپ نے پانچ سال کا کنٹریکٹ کیا ہے‘ ابھی وہ پانچ سال پورے نہیں ہوئے ہیں۔“

”میں جانتی ہوں سر مگر اس کے باوجود مجھے اس شخص کے ساتھ ایک پل کے لیے بھی کام نہیں کرنا‘ ایم رئیلی ویری سوری۔“

”اوکے پلیز کول ڈاؤن‘ میں نہیں جانتا مسٹر میکال کے بارے میں آپ کن تحفظات کا شکار ہیں مگر میں آپ سے درخواست کروں گا پلیز ابھی جذبات میں آ کر کوئی حتمی فیصلہ مت کریں‘ چند دن ریسٹ کریں پھر اچھی طرح سوچ سمجھ کر جو فیصلہ آپ کرنا چاہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ ہانیہ کی آنکھوں سے نکلتی غصے اور نفرت کی چنگاریوں نے جہاں میکال کے چہرے پر سرخی پھیلائی تھی وہیں افتخار صاحب بھی بوکھلا کر رہ گئے تھے تبھی وہ پلٹی تھی اور تیزی سے ان کے آفس سے نکلتی چلی گئی تھی۔

باہر موسم سرد تھا مگر وہ بنا سرد ہواؤں کی پروا کیے پیدل ہی چلتی رہی آنسو تھے کہ قطار در قطار بہتے ہی چلے جا رہے تھے‘ کیا ضروری تھا کہ وہ شخص اب یوں بار بار اس کا ضبط آزمانے کو اس کے سامنے آتا؟

آج کل اس کے گھریلو حالات بھی ٹھیک نہیں چل رہے تھے پچھلے دنوں بیماری پر بہت پیسہ لگا تھا اس کا گھر کا راشن بھی ختم ہو رہا تھا۔ اوپر سے نمی (اس کی بیٹی جو فارحہ نے اسے گود دی تھی) کا ٹرپ شمالی علاقہ جات کو جا رہا تھا اور وہ ساتھ جانے کے لیے بضد تھی‘ مگر ہانیہ کے اکاؤنٹ میں صرف چند ہزار رہ گئے تھے جن میں ابھی اسے سردیوں کے لیے کپڑے بھی خریدنے تھے۔ پہلے جاذب اسے ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم آن لائن کروا دیا تھا مگر بعد میں جب اس کے کاروباری حالات اچھے نہ رہے تو ہانیہ نے خود ہی اسے منع کر دیا۔

زندگی تاحال اسے مشکلات اور مسائل کی چکی میں پیسے جا رہی تھی‘ مگر وہ بھی کہ کسی صورت ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

جس وقت وہ گھر پہنچی سارے گھر پر ایک عجیب سی خاموشی کا راج تھا۔ زکیہ بیگم کچن میں کھانا بنا رہی تھیں‘ وہ بیک سائیڈ پر رکھتی لاؤنج میں صوفے پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ نمی فارحہ کی طرف گئی ہوئی تھی‘ زکیہ بیگم اس کی آہٹ پر فوراً کچن سے نکل آئیں۔

”آج جلدی گھر آ گئیں ہانیہ! خیریت؟“

”جی خیریت ہی ہے بس طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو گھر آ گئی‘ آپ کیا بنا رہی ہیں۔“

”آلو کی بھجیا بنا رہی ہیں‘ نمی فرمائش کر رہی تھی۔“

”اچھا‘ مگر وہ ہے کہاں‘ دکھائی نہیں دے رہی۔“

”فارحہ کی طرف گئی ہے کئی روز سے بلا رہی تھی۔“

”چلیں اچھی بات ہے میں تھوڑی دیر سونا چاہوں گی‘ وہ آئے تو پلیز اسے کھانا کھلا دیجیے گا۔“ الجھن بھرے انداز میں بال سمیٹتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی‘ زکیہ بیگم اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں اس رات ایک مرتبہ پھر وہ نہیں سو سکی تھی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

میکال بہت دنوں کے بعد اس روز کلب آیا تھا۔ ہر طرف وہی رنگینیاں تھیں‘ جو اس ماحول کا حصہ تھیں مگر اس کے اندر جیسے آگ لگی تھی ہانیہ صفدر کی آنکھوں سے نکلتی نفرت کی چنگاریوں نے اس کا سارا وجود جلا کر راکھ کر ڈالا تھا‘ اس کا توہین آمیز لہجہ اس کی رگوں میں خون ابال رہا تھا‘ کس درجہ حقارت سے ایک تھرڈ پرسن کے سامنے اس نے اس کی عزت اتار کر رکھ دی تھی جتنا وہ سوچتا جاتا تھا اتنا ہی اس کا دماغ پھٹتا جاتا تھا۔ کافی دیر ڈرنک سے شغف کرنے کے بعد بھی دماغ کی کھولن کم نہ ہوئی تو وہ بار سائیڈ کی طرف چلا آیا تبھی رحیم صاحب کلب میں داخل ہوئے تھے۔

”ارے میکال! بھئی کہاں ہو آج کل‘ نہ دعا نہ سلام۔ کلب بھی نہیں آ رہے ہو ٹھیک تو تھے ناں؟“ وہ بیئر پی رہا تھا یقیناً کوئی فرسٹریشن تھی۔

"جی میں ٹھیک ہوں' بس کچھ مصروفیات بڑھ گئی تھیں آپ سنائیں آپا ٹھیک ہیں؟"

"ہوں اسے کیا ہونا ہے' تمہیں بہت یاد کررہی تھی۔"

"میں بھی آپ دونوں کو بہت مس کررہا تھا' ایک دو روز میں چکر لگاؤں گا۔" دو گلاس خالی کرنے کے بعد وہ اب وہ تیسرے کا آرڈر دے رہا تھا جب رحیم صاحب نے منع کردیا۔

"آج کے لیے بس اتنا کافی ہے تمہاری آپا فش بریانی بنارہی ہیں آج چلو ل کر کھاتے ہیں۔"

"نہیں آج نہیں' پھر کبھی سہی پلیز۔"

"پھر کبھی کس نے دیکھا ہے یار! بس چلو اٹھو۔" زبردستی اس کے شانوں کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے وہ اسے وہاں سے نکال لائے تھے۔ تقریباً پچیس منٹ کے بعد وہ دونوں گھر پہنچے تو مسز رحیم کچن میں مصروف تھیں۔ رحیم صاحب کے ساتھ میکال کو دیکھ کر فوراً لاؤنج میں چلی آئی تھیں۔

"ارے میکال! کتنے دنوں کے بعد شکل دکھائی ہے سب خیریت تو تھی ناں؟"

"جی آپا خیریت ہی تھی آپ سنائیں کیسی ہیں؟"

"میں تو ٹھیک ہوں' تمہیں بہت یاد کررہی تھی' رحیم صاحب بھی صرف تمہارے لیے کلب جاتے ہیں روز۔"

"ایم سوری' میں اصل میں بزنس ٹور پر تھا اسی لیے چکر نہ لگا سکا۔"

"چلو کوئی بات نہیں' یہ بتاؤ ہانیہ سے بات ہوئی؟" گیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتے ہوئے وہ اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ میکال کے اندر پھر بھونچال اٹھ گیا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟ مجھے پرسوں ملی تھی مارکیٹ میں' بہت اداس لگ رہی تھی' اصل میں آج کل اس کے گھریلو حالات ٹھیک نہیں ہیں' اپنے بیٹے کے لیے بھی بہت بے چین ہے' تم کیوں پریشان کررہے ہو اسے۔"

"میں نے کیا پریشان کیا ہے۔ جو آسائشات میں اپنے بیٹے کو فراہم کرسکتا ہوں وہ نہیں کرسکتی پھر میں کیوں اسے اس کے حوالے کروں۔"

"وہ ماں ہے اس کی اپنا پیٹ کاٹ کر بھی اس کی خواہشات پوری کرنی پڑی تو کرے گی' تم اکیلے نہیں لائے اسے دنیا میں پھر جس طرح سے تم نے اس پر ظلم کیا ہے' اس کا دل دکھایا ہے' بے گناہ اس کے کردار کو نشانہ بنا کر کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کیا' اس کے بعد تم اسے نفرت کے قابل سمجھتے ہو؟"

"وہ سمجھتی ہے میں نہیں سمجھتا اور میں نے کسی اور کو زندگی میں شامل کیا تو کیا اس نے نہیں کیا؟ اس نے بھی تو نہال سے شادی رچالی۔"

"اس کی اور تمہاری شادی میں بہت فرق ہے' تم نے اپنے لیے کسی اور سے شادی کی مگر اس نے اپنے لیے نہیں کی' اس نے نہال کی خوشی بلکہ اس کی زندگی کے لیے اس سے شادی کی وہ بھی صرف اس لیے کہ وہ مر رہا تھا اور وہ مر گیا۔" مسز رحیم کی آنکھیں پل میں نم ہوگئی تھیں' میکال کے لبوں کو چپ لگ گئی۔

"بجائے اس کے کہ تم اس کے زخموں کا تدارک کرتے تم نے اسے اور زخم دے دیئے' لوگوں کی باتوں میں آ کر دو کوڑی کا کردیا اسے آج وہ کتنی تنہا ہو کر رہ گئی ہے۔"

"آپا! سارا قصور صرف میرا تو نہیں تھا' یہ ٹھیک ہے کہ مجھ سے دھوکا کیا گیا مگر وہ چاہتی تو اس غلط فہمی کو ختم کرسکتی تھی' کیوں نہیں کی اس نے؟"

"موقع دیا تھا تم نے اسے غلط فہمی ختم کرنے کا؟ کیا نہیں کیا تم نے اس کے ساتھ' کبھی پوچھو تنہائی میں اپنے ضمیر سے۔"

"پوچھا ہے اور بہت شرمندہ بھی ہوں مگر وہ مجھے ازالے کا کوئی موقع نہیں دے رہی ہے' ابھی چند روز پہلے بھی اس نے آفس میں میری اتنی بے عزتی کی ہے۔"

"تو تم نے بھی تو اسے بارہا ذلیل کیا ہے' وہ بھی اپنے گھر والوں کے سامنے بقول تمہارے کیا کیا نہیں کیا تم نے اس کے ساتھ؟" مسز رحیم آج اس کی فل کلاس لینے پر تلی ہوئی تھیں۔ میکال کی آنکھیں ایک دم سے بھیگ گئیں۔

"وہ برداشت کرسکتی ہے آپا! میں نہیں کرسکتا۔"

"نہیں کرسکتے تو بھول جاؤ اسے' کیا مسئلہ ہے؟"

"یہ بھی نہیں کرسکتا آپا! پلیز آپ اس سے کہیں ناں مجھے معاف کردے پلیز۔" دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اپنی آنکھوں کے کنارے دباتا وہ صوفے سے اٹھ کر ان کے پاس نیچے زمین پر آ بیٹھا تھا' مسز رحیم نے اذیت سے منہ پھیر لیا۔

"بہت مشکل ہے میکال! جتنے فاصلے تمہارے اور ہانیہ کے بیچ حائل ہوچکے ہیں انہیں سمیٹنا اب کسی کے لیے بھی مشکل ہے' بہتر ہوگا اگر تم خود اس سلسلے میں ہانیہ سے بات کرو۔"

"میں نہیں کرسکتا آپا! بہت دیر ہوچکی ہے اب میں تھک گیا ہوں بہت تھکن فیل ہورہی ہے۔" نشے سے سرخ آنکھوں کے کنارے دباتا فوراً ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ تبھی رحیم صاحب بولے تھے۔

"کھانا کھا کر جاؤ میکال! تمہیں فش بریانی پسند ہے ناں۔"

"نہیں آج نہیں پھر کبھی سہی' ابھی بس سوؤں گا جا کر' اللہ حافظ۔" نشہ اس کے اعصاب پر اثر کررہا تھا لہٰذا بہت روکنے کے باوجود وہ وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔

❁......❁......❁

ایک ہفتہ شدید خواری کے باوجود بلآخر اسے کسی اچھی کمپنی میں جاب نہ مل سکی تو مجبوراً اس نے ایک معمولی سی کمپنی میں بہت کم پیسوں والی نوکری قبول کرلی۔ ڈیوٹی آورز بھی زیادہ تھے مگر وہ خوش تھی کیونکہ میکال حسن کا سامنا کرنے سے ہزار درجے بہتر تھا کہ وہ بھوک سے مرجاتی' مسز صفدر بھی خاموش تھیں کیونکہ وہ ہانیہ کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اس روز جب وہ آفس کے لیے تیار ہورہی تھی اچانک اس کا بیٹا دروازہ کھول کر اس کے سامنے آ گیا تھا۔

"ممّا......" اور وہ جو گیلے دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتی کچن سے باہر آ رہی تھی ایک دم سے ٹھٹک گئی۔

"علی تم یہاں؟"

"جی ممّا! ابھی پاپا چھوڑ کر گئے ہیں' کہہ رہے تھے اب میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔"

"وہاٹ؟" بچہ جتنا پُرجوش ہورہا تھا وہ اتنی ہی حیران رہ گئی تھی بھلا میکال حسن اتنا اچھا کیسے ہوسکتا تھا؟ تبھی لپک کر اپنے بیٹے کو خود سے لپٹاتے ہوئے رو پڑی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سارا دن اپنے بیٹے کے ساتھ گزارے مگر ایک اجنبی جگہ پر جاب کے آغاز میں ہی وہ کوئی بدمزگی نہیں چاہتی تھی تبھی کچھ دیر رک کر اپنے بیٹے کو ڈھیر سارا پیار کرنے کے بعد وہ آفس کے لیے نکل آئی تھی مگر تقدیر کی سیاہی نے ابھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا' جیسے وہ آفس میں داخل ہوئی اسے منیجر صاحب کی طرف سے بلاوا آ گیا۔

"السلام علیکم سر!"

"وعلیکم السلام! نام دیکھا ہے آپ نے؟"

"سوری سر' وہ اصل میں......"

"دیکھیں مس ہانیہ! یہ کمپنی کوئی بہت بڑی کمپنی نہیں ہے یہاں کام کرنے والے سارے ورکرز غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں' بہت معذرت یہاں آپ جیسے نوابی لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"سر میری بات سنیں پلیز' میں......"

"دروازہ اُدھر ہے پلیز......"

اس درجہ اہانت...... ہانیہ سے اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا دشوار ہوگیا' کتنی بے رحمی سے بنا اس کی وضاحت سنے اسے باہر کا راستہ دکھادیا گیا تھا' ایک مرتبہ پھر لمبی مسافت تھی اور اس کے زخمی پاؤں......

❁......❁......❁

گھر کا بچا کھچا راشن تیزی سے ختم ہوتا جارہا تھا' تبھی ذکیہ بیگم نے ہانیہ کو بتائے بغیر اپنے وہ کڑے فروخت کردیے تھے جو صفدر صاحب نے انہیں شادی کی پہلی رات گفٹ کیے تھے۔ ہانیہ کے استفسار پر اس نے بتایا تھا کہ جاذب کے حالات پہلے سے بہتر ہوگئے ہیں لہٰذا اس نے خود ہی انہیں رقم بھجوادی۔ ہانیہ کے لیے یہ خبر بے حد خوشی کی خبر تھی اگلی جاب کے لیے اسے کچھ وقت مل گیا تھا' تبھی ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر روتے ہوئے اس نے فوراً وضو کیا اور سجدے میں گر گئی۔

اس روز اس نے بہت سا وقت اپنے بیٹے کے ساتھ گزارا تھا' رات دیر تک وہ اسے مختلف جگہوں پر گھمانی پھراتی رہی تھی' رات میں کہانی سناتے ہوئے جب وہ اس کے بال سہلا رہی تھی اچانک اس نے پوچھا تھا۔

"ممّا کیا آپ پاپا سے ناراض ہیں؟"

"نن...... نہیں تو...... کیوں؟" اچانک وہ ایک دم سے ٹھٹک گئی تھی۔

"پاپا روز رات میں آپ کی اور نہال چاچو کی تصویر سے باتیں کرتے ہیں اور روتے رہتے ہیں' کبھی کبھی تو بہت ڈرنک بھی کرتے ہیں اور سگریٹ بھی پیتے ہیں' مجھے ان کے منہ سے بہت بُری بدبو آتی ہے۔"

غنودگی کے عالم میں وہ اسے بتا رہا تھا' ہانیہ کا دل شدت سے دھڑک اٹھا' اس کا بیٹا سوچکا تھا مگر اس رات ایک مرتبہ پھر وہ بہت دیر تک جاگ کر روتی رہی تھی۔ اگلے روز ذکیہ بیگم اس کے بیٹے کو چپس بنا کر دے رہی تھیں' جب وہ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے لاؤنج میں آ بیٹھی۔

ابھی اس نے ٹی وی آن کیا تھا کہ ایک دم سے وہ سامنے آ گیا' کوئی ٹاک شو تھا جس میں اسے خصوصی طور پر انوائٹ کیا گیا تھا۔ ہانیہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہینڈسم دکھائی دے رہا تھا مگر اس کی آنکھیں بجھ کر رہ گئی تھیں۔ فارحہ نے بتایا تھا کہ لڑکیاں مرتی تھیں اس پر ایک لڑکی نے تو

آفس میں اسے خودکشی کی دھمکی بھی دے دی تھی مگر وہ کسی پر نگاہ غلط ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ عجیب بے نیازی اور بے حسی کا خول چڑھالیا تھا اس نے فارحہ کے ہی بقول وہ اپنے والٹ میں ہر وقت اس کی تصویر رکھتا تھا جب بھی زیادہ بے چینی ہوتی' وہ ڈرائیونگ کے دوران بھی گاڑی روک کر ایک نظر اسے دیکھتا اور پُرسکون ہوجاتا۔

ساری باتیں اپنی جگہ پر ٹھیک تھیں مگر صرف ایک لفظ داشتہ اسے جینے نہیں دے رہا تھا وہ مر سکتی تھی مگر میکال حسن کو اس کی بے وفائی کے لیے معاف کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

❁......❁......❁

شام ڈھل رہی تھی آسمان پر سیاہ بادل کسی بھی پل برسنے کو تیار دکھائی دے رہے تھے۔ میکال حسن نے تھکی تھکی سی نظر اٹھا کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور نگاہیں پھر سے عائشہ برہان کے خوب صورت چہرے پر ٹکادیں جو آسمان کی طرح اپنی آنکھوں کے گھیرے سیاہ بادل لیے کسی گزرے ہوئے طوفان کی مانند خاموش بیٹھی تھی۔

"تو یہ طے ہے میکال کہ تمہاری زندگی میں ہانیہ صفدر کے علاوہ اب کوئی اور لڑکی کبھی نہیں آسکتی؟"

"ہوں۔"

"تو پھر جھک کر منا کیوں نہیں لیتے اسے؟"

"وہ مجھ سے ناراض نہیں ہے عائشہ! بدگمان ہے' بدگمانیاں بھی ایسی ہیں کہ میں چاہتے ہوئے بھی اس کا دل صاف نہیں کرسکتا' مگر میں اس کے بغیر خوش بھی نہیں ہوں' میری سانسیں اس کی سانسوں میں الجھی ہیں کچھ سمجھ نہیں آیا مجھے کہ میں نے اس سے انتقام لیا ہے یا خود سے۔"

"میں اس سے بات کروں گی۔"

"نہیں تم اس سے مت ملنا پلیز پتا نہیں وہ اس بات کو بھی کس رنگ میں لے۔"

"میکال! تم اتنا ڈرتے ہو اس سے؟"

"ہوں' جن سے محبت کی جاتی ہے ان سے ڈر ہی لگتا ہے' ہمیشہ کے لیے کھودینے کا ڈر......"

"کیا وہ بھی اتنا ہی پیار کرتی ہے تم سے؟"

"پتا نہیں یار! ایبروڈ میں بھی سکون نہیں ہے اب تو' مجھے لگتا تھا عائشہ تمہارے بعد میری زندگی میں کبھی کوئی لڑکی نہیں آئے گی مگر میں غلط تھا' ہانیہ صفدر کو کھونے کے بعد لگتا ہے جیسے تمہیں کھودینے کا درد کوئی درد ہی نہیں تھا۔" کتنے سکون سے وہ کہہ رہا تھا'

عائشہ ٹھٹک گئی' پھر آہستہ سے رخ پھیرتے ہوئے بولی۔

"ہوں' وقت بدل جائے تو ہر چیز بدل جاتی ہے میکال پھر چاہے وہ احساسات اور جذبات ہی کیوں نہ ہوں' محبت تو ویسے بھی بہتی ندی اور چلتی ٹرین کا نام ہے جس کا ہر پڑاؤ خوب صورت ہوتا ہے بہرحال میں چلتی ہوں اب ارتج اور بچے میرا انتظار کررہے ہوں گے۔" ایک نظر ہاتھ پر بندھی ریسٹ واچ پر ڈالتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی جب میکال نے کہا۔

"تھوڑی دیر رک جاؤ پلیز! ابھی تو آئی ہو۔"

"نہیں میکال! گھر بتا کر نہیں آئی ارتج پریشان ہورہے ہوں گے۔"

بیگ اٹھا کر ایک آخری تفصیلی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے وہ پلٹ گئی تھی' میکال بے کل سا اسے دیکھے گیا' ابھی دو روز پہلے ہی وہ پاکستان آئی تھی اور آتے ہی اس نے میکال کو فون کردیا تھا' اس کا خیال تھا شاید اب بھی وہ اس کے غم میں نڈھال ہوگا مگر ایسا نہیں تھا محبت کی وہ حویلی' جہاں سے اس کے حالات اور تقدیر نے اسے در بدر کیا تھا اب اس کی ملکیت نہیں رہی تھی تاہم ارتج اس کے حق میں بہت اچھا شوہر ثابت ہوا تھا' قدرت نے دو پیارے پیارے بیٹے بھی دیے تھے' کسی چیز کی کمی نہیں مگر بس دل کا ایک کونا کہیں خالی تھا تاہم آج اس وقت اسے لگا وہاں اس کونے میں بھی میکال حسن کی جگہ ارتج احمر نے قبضہ کرلیا ہو۔ ملال کے بادل چھٹ گئے تھے اور اب عائشہ برہان کی زندگی میں سکون ہی سکون تھا۔

❁......❁......❁

اس روز اپنے بیٹے کی ضد و فرمائش پر وہ اسے مارکیٹ لائی تھی۔ اس کے صرف پانچ ہزار روپے تھے جن میں ابھی اسے گھر کے لیے بھی کچھ ضروری چیزیں خریدنی تھیں مگر اس کا بیٹا جن چیزوں کی فرمائش کررہا تھا ان کی قیمت پانچ ہزار سے اوپر شروع ہورہی تھی' وہ پریشان ہوکر ہی تو رہ گئی تھی' زندگی کبھی ایسے کسی دوراہے پر بھی لائے گی اس نے سوچا تک نہیں تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے بیٹے کو بہلا رہی تھی اور وہ ناراض ہورہا تھا' جب میکال اچانک اس کے سامنے چلا آیا۔ ہلکی ہلکی بڑھی شیو اور رف سے ٹراؤزر میں اس کی پرسنالٹی غضب کی تھی' بس ایک نظر پریشان حال ہانیہ صفدر پر ڈالتے ہوئے وہ پنجوں کے بل اس کے بیٹے کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے پرنس! کیوں تنگ کررہے ہو مما کو۔"

"پاپا مجھے وہ اسپائیڈر مین لینا ہے۔" باپ کو دیکھتے ہی

کے چہرے پر بہار آ گئی تھی۔ ہانیہ عجیب مجرمانہ انداز میں سر جھکائے کھڑی رہی۔

"ٹھیک ہے لے لیتے ہیں چلو۔" فوراً اپنے بیٹے کی انگلی تھام کر وہ آگے بڑھ گیا تھا جب کہ ہانیہ شکستہ قدموں کو گھسیٹتی شاپ سے باہر نکل آئی آنسو تھے کہ ابل ابل کر آنکھوں سے باہر آنے کو بے چین ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر اس کے مقابل تھا۔

"میں مانتا ہوں ہانیہ کہ چھٹکو پر تمہارا حق زیادہ ہے مگر اکیلی ماں بھی کبھی بچوں کو وہ سب نہیں دے سکتی جو ایک باپ دے سکتا ہے۔" اپنے بیٹے کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے قدرے ناصحانہ انداز میں اس نے کہا تھا اور پھر ذرا سا رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

"چھٹکو میرے لیے دوسرا نہال حسن ہے اسی لیے میں چاہتا ہوں اس کی زندگی میں کوئی کمی نہ رہے تم مائنڈ مت کرنا پلیز یہ تم پر کوئی احسان نہیں ہے۔"

وہ کتنا بدل گیا تھا مگر ہانیہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا چھٹکو کا ہاتھ تھام کر وہ پلٹی تھی اور ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑا ہی رہی تھی جب ایک دم سے بارش شروع ہوگئی میکال ابھی بھی وہیں کھڑا تھا۔

"مما..... میرا اسپائڈر مین۔"

چھٹکو کو فوراً اپنے اسپائڈر مین کی فکر لاحق ہوئی تھی تبھی منہ بسور کر اس نے ہانیہ کی طرف دیکھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر فوراً میکال کی طرف بھاگ گیا پھر اس کی شاندار گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے اپنا اسپائڈر مین گاڑی کے اندر رکھ دیا۔ ساون کی بارشوں نے سارے شہر کو وقت پڑا ہوا تھا ہانیہ پریشان ہوگئی کیونکہ دور دور تک کسی ٹیکسی کا کوئی نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

"مما! پاپا کی گاڑی میں آ جائیں پلیز۔" چھٹکو تیز بارش میں بھیگتے ہوئے اس کے قریب آیا تھا اور اب اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کھینچ رہا تھا جب اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

"آپ کو جانا ہے تو آپ جاؤ علی! مجھے نہیں جانا۔"

"کیوں؟ رات تو آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ پاپا سے ناراض نہیں..."

"...سے ناراض نہیں ہوں آپ جاؤ کیونکہ جو چیزیں ...پاپا لے کر دے سکتے ہیں وہ میں نہیں خرید سکتی۔" ...ہوئے بھی وہ جذباتی ہوگئی تھی چھوٹا سا بچہ جیسے سہم گیا۔ آنکھیں بھی فوراً آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

"سوری مما! مجھے اسپائڈر مین نہیں چاہیے۔"

ہانیہ کا دل اس کے آنسوؤں پر تڑپ اٹھا تھا لپک کر فوراً اس نے اسے گود میں اٹھا لیا بارش مزید تیز ہوگئی تھی میکال نے ایک نظر اوپر برستے آسمان کی طرف دیکھا پھر تیزی سے ہانیہ کے قریب چلا آیا۔

"بارش تیز ہو رہی ہے ابھی تھوڑی دیر میں یہاں کوئی بھی نظر نہیں آئے گا میں تمہاری بات نہیں کروں گا مگر چھٹکو بارش میں بھیگ کر اکثر بیمار پڑ جاتا ہے لہٰذا اس وقت میں ایسا کوئی رسک نہیں لوں گا۔" چھٹکو کو اس کی گود سے لیتے ہوئے اس نے ہانیہ کا بازو تھام کر اسے بھی ساتھ ہی کھینچ لیا تھا وہ انکار کرنا چاہتی تھی مگر میکال نے اسے کوئی موقع ہی نہیں دیا کچھ بولے گا تقریباً بیس منٹ کی تیز ڈرائیو کے بعد اس نے اس کے گھر کے سامنے گاڑی بریک کی تھی۔

"چھٹکو ضدی بچہ ہے اور ابھی چھوٹا ہے اس لیے مجبوریوں کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتا یہ اس کے اکاؤنٹ کا اے ٹی ایم کارڈ ہے آئندہ جب بھی ضرورت پڑے پلیز اسے استعمال کر لینا۔" والٹ سے اے ٹی ایم کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولا تھا جب ہانیہ چھٹکو کا ہاتھ تھام کر گاڑی سے باہر نکل آئی۔

"بہت شکریہ میں اپنے بیٹے کی ہر خواہش خود پوری کر سکتی ہوں بس ابھی میرے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔"

قدرے ترش لہجے میں کہتے ہوئے وہ گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی میکال حیران سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ اگلے چند دن اس کے بے حد اذیت میں گزرے تھے تبھی اسے کمال کی کال آ گئی وہ اسے انگلینڈ بلا رہا تھا کیونکہ حسن صاحب کی طبیعت بہت خراب تھی نہال کی موت کے بعد وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ میکال جانا نہیں چاہتا تھا مگر چلا گیا تھا اور ہانیہ صفدر کے پاس سے ہمیشہ کے لیے فرار کا بس یہی ایک موقع تھا فارحہ کی بیٹی اسے واپس کر کے وہ زکیہ بیگم اور چھٹکو کے ساتھ وہ شہر ہی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

❀......❀......❀

چار سال ہو گئے تھے اسے کراچی چھوڑے ہوئے اور ان چار سالوں میں اس نے کسی بھی اپنے سے رابطہ نہیں کیا تھا گزرے ہوئے چار سالوں میں اپنے بیٹے کی بہترین تعلیم و تربیت کے لیے کیا کیا نہیں کیا تھا اس نے تین تین جگہوں پر جاب کرنے کے باوجود فاقے پریشانیاں ہر چیز برداشت کی تھی اس نے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ آج ایک سرکاری اسپتال کے سستے سے کمرے کے بیڈ پر پڑی ہوش و حواس سے بیگانہ تھی اور اس کا بچہ جواب دس سال کا ہو چکا تھا اس کے سرہانے کھڑا رو رہا تھا جب کہ زکیہ بیگم خود بیماری کے باوجود اس کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔

ہانیہ کا ایک گردہ قطعی ناکارہ ہو چکا تھا اسے آپریشن کی ضرورت تھی اور آپریشن کے لیے پیسوں کی جو زکیہ بیگم کے پاس نہیں تھے۔ زندگی کے مسائل اور تقدیر کی بے رحمی سے لڑتے لڑتے وہ لڑکی بالآخر ہار گئی تھی۔

❀......❀......❀

ایک لمبے عرصے کے بعد میکال ان دنوں ملتان آیا تھا۔ اس کا بزنس ملکوں تک پھیل چکا تھا ایک دنیا اس کی پرستار تھی مگر وہ اب زندگی جی نہیں رہا تھا گھسیٹ رہا تھا۔ چار سال ہو گئے تھے اس نے ہانیہ صفدر اور اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا تھا کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تھا اس نے ان دونوں کو مگر جانے وہ دنیا کے کس گوشے میں جا چھپی تھی۔ پچھلے چار سال میں کوئی رات ایسی نہیں تھی جب وہ رو کر نہ سویا ہو۔

اگر اسے خبر ہوتی کہ ایک چھوٹی سی مہربانی پر ہانیہ اتنا بڑا قدم اٹھا لے گی تو وہ کبھی اس روز مارکیٹ میں اس کے سامنے نہ آتا کم از کم شہر کی فضاؤں میں اس کی سانسوں کی خوشبو تو آتی رہتی۔ کتنا ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا وہ پچھلے سال میں جانے کتنے ایسے ادارے تھے جن کو ہر ماہ وہ کروڑوں کی امداد دیتا تھا وجہ صرف یہ تھی کہ وہاں چھوٹے چھوٹے معصوم بچے کفالت پا رہے تھے اور اسے ہر بچے میں اپنا بچہ نظر آتا تھا۔

اس وقت وہ اپنے دوست کے ساتھ سائٹ پر آیا تھا جب اس نے کمپنی کے ایک افسر کو ایک چھوٹے سے بچے پر برستے ہوئے دیکھا۔

"تمہاری عمر نہیں کام کرنے کی جاؤ یہاں سے پتا نہیں کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں اٹھ کر۔"

"نہیں مجھے کام کرنا ہے میری مما کو پیسوں کی ضرورت ہے۔" بچے کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی میکال کے قدم خود بخود اس کی طرف اٹھ گئے۔

"کیا بات ہے؟" اس نے افسر سے پوچھا۔

"کچھ نہیں سر اس بچے کو دیکھیں دس سال عمر ہے اور مزدوری کرنے چلا آیا۔"

افسر اسے بتا رہا تھا تبھی بچے نے اس کی طرف دیکھا تھا اور میکال کو لگا جیسے اس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا ہو اس کا لخت جگر جو اربوں کی جائداد کا مالک تھا وہاں چند پیسوں کے لیے مزدوری کرنے چلا آیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی ہمت کے ساتھ پنجوں کے بل زمین پر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کو کندھوں سے تھاما تھا اور پھر اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا ارد گرد کھڑے لوگ یہ منظر دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے۔

"مما کہاں ہیں؟" کچھ دیر کے بعد سر اٹھاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا جب اس کے بیٹے نے بتایا۔

"اسپتال میں..... نانو کہتی ہیں جب تک پیسے نہیں ہوں گے مما ٹھیک نہیں ہوں گی اسی لیے میں چوری چوری یہاں آ کر کام کر رہا تھا مجھے مما کے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا پاپا۔" پھول سا چہرہ کملایا ہوا تھا میکال کا دل کٹ کر رہ گیا کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے وہ اسے بے تحاشا چومتا چلا گیا تھا۔

"مما ٹھیک ہو جائیں گی آپ چلو میرے ساتھ۔" فوراً آنسو پونچھتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا تھا پھر بنا کسی کو کچھ بتائے کسی کی پروا کیے وہ اسے گاڑی تک لایا اور اگلے ہی پل وہاں سے رخصت بھی ہو گیا۔

❀......❀......❀

جس وقت اس نے سرکاری اسپتال کے کوریڈور میں قدم رکھا ہانیہ کو گردہ عطیہ کرنے کے بعد اس کے بیڈ پر لٹایا جا رہا تھا بڑے سے ہال کمرے کی ملگجی سی روشنی میں وہاں تقریباً کوئی چالیس پچاس بستر تھے جہاں بھانت بھانت کے لوگ اپنے اپنے مریضوں کے ساتھ سرکاری امداد کے رحم و کرم پر علاج کروا رہے تھے۔ وہ کمرے میں آیا تو ہانیہ کو بستر پر لٹا دیا گیا تھا مگر جو تکلیف وہ جھیل رہی تھی اسی تکلیف کے زیر اثر اس کا جسم بستر سے دو دو فٹ اوپر اچھل رہا تھا میکال کے قدموں تلے سے جیسے زمین کھسک گئی تھی۔ جونہی اس نے کمرے میں قدم رکھا اس کا بیٹا بھاگ کر ہانیہ کے قریب چلا گیا۔

"مما..... دیکھیں پاپا آئے ہیں۔" وہ جوش سے بتا رہا تھا مگر وہ ہوش میں کہاں تھی جو اس کی پکار سنتی تاہم زکیہ بیگم نے ضرور حیرانی سے پلٹ کر دیکھا تھا۔

"میکال..... تم یہاں؟"

"جی آنٹی! دنیا اتنی بھی بڑی نہیں ہے کہ یہاں کسی ایک شخص کو زندگی بھر تلاش ہی نہ کیا جا سکے۔" اس کی آنکھوں کے گوشوں میں چمکتی نمی نے انہیں شرمندگی سے سر جھکانے پر مجبور کر دیا بھلا ہانیہ صفدر کے کسی معاملے میں وہ کچھ کہنے کی مجاز کہاں

تھیں۔ تبھی وہ قریب آیا تھا چند سیکنڈ پہلے لگنے والے نشہ آور انجکشن کے زیر اثر وہ اب غنودگی میں جارہی تھی میکال کی ہمت چند قدم آگے بڑھ کر جواب دے گئی بے حد لاغر وجود کے ساتھ حالات کی ستم ظریفی کی مکمل تصویر بنی وہ اس کے سامنے تھی زرد چہرہ آنکھوں کے نیچے پڑے گہرے حلقے بدرنگ بکھرے بال جسم پر بے حد پرانے کپڑے بیڈ کے نیچے پڑی اس کی بے حد معمولی چپل چیخ چیخ کر واضح کررہی تھی وہ کن بدتر حالات کا شکار رہی ہوگی۔

چہرے کا گلابی پن بھی سورج کی تپش اور کڑی مشقت کے اثرات نے بدل کر سانولے رنگ میں ڈھال دیا تھا وہ تڑپ کر ہی تو رہ گیا۔ جسم میں اتنی سی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ ایک قدم پر ہی اٹھا سکتا مگر پھر بھی وہ پلٹا تھا اور ڈیوٹی پر موجود انتظامیہ سے بات کرنے کے بعد وہ اس کے بستر کے قریب آیا اور جھک کر اس کے لاغر وجود کو اپنی مضبوط بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"میں اسے گاڑی میں لٹاتا ہوں آنٹی! آپ پلیز سارا سامان سمیٹ کر جلدی باہر آجائیں۔" پلٹ کر زکیہ بیگم کو کہتے ہوئے وہ فوراً کمرے سے نکل گیا تھا اسی رات شہر کے بہترین اسپتال میں اس کا آپریٹ ہوگیا صد شکر کہ اس کے صرف ایک گردے کو نقصان پہنچا تھا دوسرا بالکل محفوظ تھا ورنہ میکال نے اسے اپنا ایک گردہ دینے کی مکمل تیاری کرلی تھی آپریشن سے ایک گھنٹے کے بعد اسے سی آئی سی یو روم میں شفٹ کردیا گیا۔

وہی اس کی شخصیت تھی وہی تکلیف تھی مگر کاغذ کے چند ٹکڑوں نے فقط ایک رات میں ہی اس کی حیثیت بدل کر رکھ دی تھی۔ زکیہ بیگم اس کا شکریہ ادا کرتے نہ تھک رہی تھیں اور وہ اپنے حقیقی معبود کا جس کی رحیم و کریم ذات نے خاص رحمت سے چار سال کی خواری کے بعد بلآخر اسے ہانیہ صفدر اور اپنے بیٹے سے ملا دیا تھا۔

جس وقت ہانیہ کی آنکھ کھلی کمرے میں بے حد خاموشی اور سکون تھا۔ زکیہ بیگم اور سنان وہاں نہیں تھے تاہم میکال اس کے بیڈ کے قریب دھرے صوفے پر بیٹھا ضرور سو گیا تھا۔ ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ اس کے چہرے پر کھنڈی زردی صاف دیکھی جاسکتی تھی وہ ٹھٹک گئی۔ جس شخص کے سائے سے بچنے کے لیے وہ پچھلے چار سال سے بھٹک رہی تھی بلآخر وہ شخص اس تک پہنچ گیا تھا۔ ہانیہ نے بے ساختہ پلکیں موند لیں پلکوں کی باڑ سے ایک آنسو ٹوٹ کر بائیں گال پر پھسل آیا تھا اسے لگا وہ اس شخص کے عکس سے بھی دور نہیں بھاگ سکے گی تبھی میکال حسن کی آنکھ کھلی تھی ہانیہ صفدر کو اپنی طرف دیکھتے پاکر وہ فوراً اس قریب آیا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے ہانیہ؟" وہ اس پر جھکا تھا مگر ہانیہ جواب دینے کی بجائے پھر سے پلکیں موند لیں تبھی وہ بیڈ پر کے پہلو میں ٹک گیا تھا۔

"میں جانتا ہوں ہانیہ! تم مجھ سے بہت نفرت کرتی ہو مگر نہیں جانتی کہ میں تم سے بھی زیادہ خود سے نفرت کرتا ہوں نفرت کہ شاید تم اس کا اندازہ بھی نہ کرسکو اسی لیے میں نے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں چھوڑا جسے کاٹ کر جلا یا نہ ہو واقعی محبت نہال نے تم سے کی تم اسی کی حق دار تھیں مگر پھر بھی یہ سچ ہانیہ! میں تمہیں کھو کر ایک سانس بھی نہیں لے سکتا پچھلے میں جس اذیت میں گزارے ہیں تم اس کا اندازہ بھی نہ کرسکتیں ساری دنیا کو ترک کردیا ہے میں نے میرے بس نہیں ہے کہ میں گزرے ہوئے وقت کے گھوڑے کی لگام کرا سے واپس لاسکوں جو ظلم میں نے تمہارے اور نہال ساتھ کیا اس کا ازالہ کرسکوں مگر میں تم سے درخواست کرسکتا ہوں ہانیہ! میرے ضبط اور ہمت کا مزید امتحان مت لو میرے لیے کسی چھنگو کے لیے ہی سہی پلیز مجھے معاف کردو پلیز۔" ایک سے اس کا ہاتھ تھام کر وہ بچوں کی طرح رو پڑا تھا ہانیہ کے اندر بھونچال اٹھ گیا۔

"کرچکی ہوں معاف میرا بیٹا کہاں ہے؟" اس کے میں اب بھی کوئی لچک نہیں تھی میکال نے خود کو سنبھال لیا۔

"سو رہا ہے تمہیں پتا ہے تمہاری جان بچانے کے لیے مزدوری کررہا تھا۔"

"کیا......؟" وہ شاکڈ رہ گئی تھی تبھی زکیہ بیگم وہاں چلی آئیں تو میکال اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"میکال حسن سے آپ نے رابطہ کرکے اسے بلایا تھا؟" کے جاتے ہی اس نے زکیہ بیگم سے تفتیش شروع کردی۔

"نہیں سگی ماں ہوتی تو شاید بلالیتی مگر مجھ سوتیلی ماں کو اختیار کہاں تھا کہ تمہارے کسی بھی معاملے میں اپنی مرضی کروں وہ تو سنان علی کے ساتھ آیا تھا میں تو خود اسے دیکھ حیران رہ گئی تھی۔" وہ طنزاً انہیں کہہ رہی تھیں مگر پھر بھی ہانیہ شرمندہ ہوکر رہ گئی تھی۔

"میں جانتی ہوں تمہارا دل میری طرف سے کبھی صاف نہیں ہوگا مگر تم یہ نہیں جانتی کہ میری کن مجبوریوں نے مجھے صفدر صاحب سے دوسری شادی پر مجبور کیا بالکل ویسے ہی جیسے تم نہیں جانتیں کہ میکال نے کن وجوہات اور احساسات کی بنا پر علیحے نامی اس ماڈل سے شادی کی تم بہت احمق اور خود پسند لڑکی ہو ہانیہ! تمہیں اپنے جذبات حق اور درد کے سامنے کسی اور کا درد کبھی نظر نہیں آیا۔"

پہلی بار وہ اس کے سامنے یوں کھل کر بول رہی تھیں ہانیہ حیران سی یک ٹک انہیں دیکھے گئی مگر وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔

"تم نے ساری زندگی صرف انہی رشتوں سے محبت کی اور امید وابستہ رکھی جن کو تم نے قابل اعتبار جانا مگر زندگی کوئی دو سطری کہانی نہیں ہے جس کا منطقی انجام کوئی انسان لکھ کر ہاتھ جھاڑ لے بہت تلخ حقیقتیں ہیں زندگی کی اور اس سے بھی زیادہ روپ نہاں ہر انسان ایک ہی طرز کی محبت نہیں کرتا۔ میں اپنی بات نہیں کروں گی مگر تمہاری زندگی کی بات ضرور کروں گی تم نے نہال حسن کی محبت کو سمجھا مگر میکال کی محبت کو نہیں کیونکہ دونوں کی محبت کا انداز اور روپ بہت مختلف تھا میں اگر تمہاری سگی ماں ہوتی تو کبھی میکال حسن سے تمہاری علیحدگی نہ ہونے دیتی اور اب جب وہ دوسرا نہال بننے جارہا ہے تو کبھی تم کو اس سے یوں بدگمان نہ رہنے دیتی مگر افسوس اسی بات کا ہے کہ میں تمہاری سگی ماں نہیں ہوں۔" اب ان کے لہجے کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھیں بھی بھیگ چکی تھیں مگر اس سے پہلے کہ وہ ان سے کوئی استفسار کرتی وہ فوراً اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھیں ہانیہ کا دماغ جیسے سن ہوگیا یہ کیسے چابک تھے لفظوں کے جو وہ اس کے منہ پر مار کر چلی گئی تھیں۔

بے شک گزرے ہوئے وقت میں جب سگا بھائی اور بھابی بھی اس سے بے نیاز ہوچکے تھے انہوں نے سگی ماؤں سے بڑھ کر اس کا ساتھ نبھایا تھا پچھلے چار سال میں کیسی کیسی تکلیفیں برداشت نہیں کی تھی انہوں نے اس کے لیے مگر کبھی زبان پر ایک حرف تک نہیں لائی تھیں انہوں نے کبھی اس کے کسی فیصلے میں مداخلت نہیں کی تھی نہ ہی اسے اس کی انا کے قلعے میں اکیلا مرنے کے لیے چھوڑا تھا حالانکہ وہ چاہتیں تو صفدر صاحب کی رحلت کے بعد بھی وہیں رہ سکتی تھیں جاذب کے ساتھ مگر وہ نہیں رہی تھیں انگلینڈ جیسے ملک کے ٹھاٹ باٹ چھوڑ کر صرف اس کے لیے پاکستان چلی آئی تھیں مگر ہانیہ نے کبھی ان نزاکتوں اور قربانیوں کو سمجھا ہی نہیں تھا واقعی وہ بے حد خود پسند ثابت ہوئی تھی اسے یک لخت خود سے شرمندگی محسوس ہوئی اور اب ایک شخص مزید سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

میکال حسن نہال بننے جارہا تھا؟ زکیہ بیگم اس کے اس جملے کے پیچھے کیا تھا؟ سوچ سوچ کر شریانیں تھک گئیں تو اس نے آنکھیں بند کرلیں تقریباً ایک ہفتے کے بعد نہال انہیں واپس کراچی لے آیا تھا۔ ہانیہ ہوش میں نہیں تھی ورنہ شاید کبھی وہاں "حسن پیلس" نہ آتی حفیظ بابا کو جیسے ہی خبر ہوئی مارے خوشی کے ان کے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے وہ اس گھر کے دیرینہ ملازمین میں سے تھے اور وہاں کے ایک ایک فرد کے ساتھ ان کا محبت کا رشتہ تھا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب ہانیہ کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اسپتال کی بجائے گھر میں تھی اور جس کمرے میں تھی اس کے بیڈ کی سائیڈ پر دونوں اطراف میں اس کی اور نہال حسن کی تصویر لگی ہوئی تھی نیند میں ڈوبی آنکھیں ایک دم سے مکمل کھل گئیں۔ سارے کمرے کی دیواروں پر سوائے اس کی تصویروں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

یہ وہ کہاں آگئی تھی؟ جانے خواب تھا یا حقیقت؟ اس کا دل بہت شدت سے دھڑک رہا تھا جب کہ حلق میں پیاس کی شدت سے جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔ وہ اٹھی تھی اور ادھ کھلے دروازے سے باہر نکل آئی ساتھ والے کمرے میں جو کبھی حسن صاحب کا کمرا ہوا کرتا تھا زکیہ بیگم اور اس کا بیٹا گہری نیند میں سو رہے تھے باہر لاؤنج میں مکمل اندھیرا تھا اس نے لائٹ جلائی اور کچن میں آکر پورے دو گلاس پانی غٹاغٹ پی گئی کچن کے قریب ہی نہال کا کمرا تھا جو اب مقفل تھا جب کہ سیڑھیوں کے دہانے کے بائیں طرف اس کا الگ کمرا تھا جس میں سے کسی کے درد سے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

ہانیہ کچن سے نکل کر کمرے میں آنے کی بجائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ آئی تھی اس کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا تاہم فل لائٹ وہاں بھی آن نہیں تھی ادھ کھلے دروازے کو آہستہ سے دھکیلتے ہوئے جونہی وہ اندر داخل ہوئی ٹھٹک کر رہ گئی نظر کے سامنے ہی فرش پر بیٹھا میکال بلیڈ سے اپنا جسم چیر رہا تھا اور پھر بہتے خون پر نمک چھڑک کر اپنا درد ضبط کرنے کی کوشش میں اپنی چیخوں کا گلا گھونٹتا۔ قریب ہی شراب کی خالی بوتل پڑی رل رہی تھی وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی زکیہ بیگم نے صحیح کہا تھا نہال اور میکال دونوں کی محبت کے انداز میں بہت فرق تھا مگر دونوں نے ہی اسے بہت چاہا تھا وہ بھول گئی کہ اس نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا اسے کیا کیا کہا تھا یاد رہا تو صرف اتنا کہ اس کے دل نے بھی اس شخص کو بہت شدت سے چاہا تھا اب نہال کے بعد وہ اسے

کی جان اس کی محبت نے لے لی تھی اور اب ایک یہ شخص تھا جس کی جان اس کی نفرت لے رہی تھی محبت کے سوکھے چشمے ایک دم سے پھوٹے تھے اور وہ لپک کر اس کے قریب چلی آئی تھی۔

''چھوڑو میکال! یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس کے ہاتھ سے بلیڈ چھینتے ہوئے وہ چلائی تھی' وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''تم......'' اس وقت اسے اپنا بھی ہوش نہیں تھا مگر وہ اس کی حیرانی کی پروا کیے بغیر فوراً کمرے سے نکل آئی تھی۔ شدت سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ بلیڈ پھینک کر اس نے فرسٹ ایڈ باکس تلاش کیا اور دوبارہ اسی کمرے میں چلی آئی میکال اب بھی دیوار سے ٹیک لگائے اسی پوزیشن میں بیٹھا تھا جب اس نے سختی سے آنکھیں رگڑتے ہوئے ٹھنڈے پانی سے اس کے زخموں کو صاف کرنے کے بعد وہاں کریم لگادی تبھی میکال نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔

ایک مدت کے بعد اس کے درد نے ہانیہ کے دل میں چٹکی کاٹی تھی تبھی وہ اس کے مضبوط کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی تھی۔

''بس کرو میکال! بہت سزا کاٹ لی ہم نے محبت کی اور محبت میں بدگمانیوں کی' اب اور نہیں۔'' موتی اس کی آنکھوں سے بھی ٹوٹ کر بکھر رہے تھے تبھی میکال نے اسے کندھوں سے پکڑ کر خود سے لگایا اور پھر ڈھیر سارا رودیا۔ ایک مدت کے بعد بالآخر عشق کی عدالت نے اس کا جرم بے وفائی معاف کرکے اسے اذیت کی قید سے رہا کردیا تھا۔

❁......❁......❁
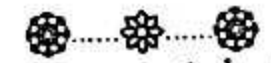
بہت دنوں کی بارش کے بعد اس روز خاصی چمکیلی دھوپ نکلی تھی۔

ہانیہ پردے سمیٹنے کے بعد بیڈ کی طرف چلی آئی جہاں میکال تکیہ بانہوں میں لیے الٹا لیٹا اسی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے فریج سے ٹھنڈے یخ پانی کی بوتل نکالی اور آرام سے اس پر انڈیل دی' وہ ہڑبڑا کر گہری نیند سے بیدار ہوا تھا' ہانیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''آٹھ بج گئے ہیں جناب! اٹھ جائیں' آپ کے صاحب زادے اسکول کے لیے تیار ہوچکے ہیں اور پاپا کی کال بھی آچکی ہے دوبارہ' دس بجے کی فلائٹ سے وہ اور مما پاکستان پہنچ رہے ہیں۔''

''اچھا...... وہ حقیقت ہے [illegible] ٹھنڈا پانی کیوں ڈالا ہے؟'' تکیہ بانہوں میں دبائے وہ بیڈ پر اٹھ بیٹھا تھا' ہانیہ مسکراتے ہوئے وارڈ روب کی طرف چلی آئی۔

''جذبات ٹھنڈے کرنے کے لیے۔''

''وہ نہیں ہوسکتے۔'' فوراً بیڈ سے اترتے ہوئے وہ اس کے پیچھے آیا اور اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

''کم از کم تمہارے لیے تو کبھی نہیں ہوسکتے۔'' اب وہ اسے تنگ کررہا تھا عین اسی ٹائم اس کا بیٹا بیگ اٹھائے کمرے کی دہلیز پر چلا آیا۔

''پاپا مجھے اسکول سے دیر ہورہی ہے۔''

''اوسوری علی! وہ میں آپ کی مما کو نیکلس پہنا رہا تھا۔'' بیٹے کی آمد پر فوراً اسے چھوڑتے ہوئے وہ بوکھلایا تو ہانیہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''فکر نہ کرو ابھی اسے چھوڑ کر واپسی پر خبر لیتا ہوں تمہاری۔'' آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کرتا وہ چھٹکو کے پیچھے ہی کمرے سے نکل چکا تھا جواب میں ہانیہ نے منہ بسور کر اسے مزید چڑ لیا اس کی منزل یہی تھی جتنی بھی کٹھن مسافت طے کرلیتی اسے لوٹ کر یہیں آنا تھا۔ جاذب اور ہادیہ نے زکیہ بیگم کو اپنے پاس بلالیا تھا' ایک ماہ پہلے میکال حسن سے اس کی شادی کے بعد وہ ہانیہ کے اصرار پر بھی وہاں نہیں رکی تھیں تاہم ہانیہ نے ان کے لیے اپنی محبت کا اظہار ضرور کردیا تھا۔

باہر میکال کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آرہی تھی اس نے وارڈ روب کھول کر وہاں رکھی نہال حسن کی تصویر نکالی وہ مسکرا رہا تھا۔ یوں جیسے ہانیہ صفدر کی زندگی کی خوشیوں کے لیے اس کی دعائیں مستجاب ہوگئی ہوں' ہانیہ نے نہایت پیار سے اس کی تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھڑکی کے اس پار دیکھا جہاں کئی روز کی بارشوں کے بعد بالآخر چمکیلی دھوپ نکل آئی تھی۔

بارشیں واقعی کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتیں تاہم اس کی زندگی میں اب بارشوں کے موسموں کی جگہ سنہری دھوپ نے لے لی تھی' تبھی نہال کی تصویر وارڈ روب میں رکھتے ہوئے وہ کمرے سے نکل آئی' ابھی میکال نے واپس آکر آفس کے لیے تیاری کرنی تھی پھر ایئر پورٹ جانا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہر روز کی طرح آج بھی اسے دیر ہو' بے شک بھر کی لمبی مسافت کے بعد اس نے رشتوں کے حسن اور ان کی اہمیت کو محسوس کرنا سیکھ لیا تھا۔